قرآن وحدیث کی روشنی میں تحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ عباد الرحمن

جلد ششم

مُفتی عبد الرحمن مُلا خیل صاحب دامت برکاتہم
رئیس دار الافتاء والتحقیق خطیب ابوبکر صدیق مسجد ڈیفنس

دار الافتاء والتحقیق
ابوبکر صدیق مسجد۔ فیز II ڈی ایچ اے کراچی

قرآن وحدیث کی روشنی میں تحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ عباد الرحمٰن

جلد ششم

مفتی عبد الرحمٰن ملاخیل صاحب دامت برکاتہم
رئیس دار الافتاء والتحقیق خطیب ابوبکر صدیق مسجد ڈیفنس

دار الافتاء والتحقیق
ابوبکر صدیق مسجد۔ فیز ۲ ڈی ایچ اے کراچی

ناشر: مفتی عبدالرحمن ملاخیل صاحب رئیس دارالافتاء والتحقیق ابوبکر صدیق مسجد فیز۲ ڈی ایچ اے
مطبع: ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی فون نمبر: 32630051

مسائل معلوم کرنے کے لئے مفتی صاحب سے مندرجہ ذیل نمبروں پر رابطہ کر سکتے ہیں براہ کرم نماز اور آرام کے اوقات کا خیال رکھیں۔

برائے رابطہ فون نمبر: 02135804388

موبائل: 03132775126 0333-2251145

☆ ملنے کے پتے ☆

ناشر: مفتی عبدالرحمن ملاخیل (مندرجہ بالا تینوں نمبرز)

ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی فون نمبر: 32638114

دارالاشاعت اردو بازار کراچی فون نمبر: 32631861

اسلامی کتب خانہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

قرآن محل اردو بازار ڈیرہ اسماعیل خان

مولوی سیف الرحمن عبدل خیل ڈیرہ اسماعیل خان فون نمبر: 03139341266

مکتبہ جاوید میانوالی شہر

مکتبہ رشیدیہ ۳ شیش محل روڈ لاہور فون نمبر: 04237364516

مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ فون نمبر: 0812662263

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
96	﴿باپ اگر زمین کی تقسیم پر راضی ہو تو بیٹوں کا اعتراض مسموع نہیں ہوگا﴾	125
97	﴿مدعی اور مدعی علیہ میں سے کسی ایک کی غیر موجودگی میں قاضی کے فیصلہ کا حکم﴾	127
98	﴿عرصہ دراز کے بعد زمین پر دعوی کرنا﴾	131
99	﴿اپنے حق کے وصولیابی کیلئے حق سے زیادہ کا دعوی کرنا﴾	133
100	﴿کتوں کی نشاندہی کرنے سے کسی کو چور قرار نہیں دیا جا سکتا﴾	134
101	﴿کسی دوسرے پر کسی چیز کو لازم کرنے کیلئے گواہوں کی گواہی یا مدعی علیہ کا اقرار ضروری ہے﴾	135
102	﴿دوسرے کی ملکیت میں کسی کو دعوی کرنے کا حق نہیں ہے﴾	136
103	﴿مصارف مقدمہ جھوٹے مدعی کے ذمہ ہیں﴾	137
104	﴿كتاب الحوالة﴾	138
105	﴿حوالہ کرنے کی ایک صورت﴾	138
106	﴿حوالہ میں دین کا معلوم ہونا ضروری ہے﴾	140
107	﴿امانت ضائع ہونے کی صورت میں حوالہ کا حکم﴾	140
108	﴿حوالہ کا مسئلہ﴾	141
109	﴿باب الاحتكار﴾	142
109	﴿ذخیرہ اندوزی کا بیان﴾	142
110	﴿چینی کی ذخیرہ اندوزی کا حکم﴾	142
111	﴿ذخیرہ اندوزی سے متعلق سوال وجواب﴾	143
112	﴿سگریٹ کی ذخیرہ اندوزی کرنے کا حکم﴾	144
113	﴿كتاب الشهادة والقضاء﴾	146
114	﴿گواہی کی شرائط﴾	146

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
115	﴿ویڈیو وغیرہ کے ذریعے سے اثبات جرم﴾	146
116	﴿تنہا عورت کی گواہی معتبر نہیں﴾	147
117	﴿ماں کی گواہی بیٹوں کے حق میں قابل قبول نہیں﴾	148
118	﴿راستے میں پان، سگریٹ کھانے پینے سے مردود الشہادت نہیں ہوتا﴾	148
119	﴿کیا غیر عالم بااثر شخص کو شرعاً ثالث مقرر کرنا جائز ہے؟﴾	149
120	﴿کتاب الاجارات﴾	150
120	﴿ملازمت کرنے اور کرایہ پر لینے، دینے کا بیان﴾	150
121	﴿امامت پر اجرت لینا جائز ہے﴾	150
122	﴿امام مسجد کی بیماری کے دنوں کی تنخواہ﴾	151
123	﴿طاعات پر اجرت لینے کا مسئلہ﴾	152
124	﴿غیر حاضری کے دنوں کی تنخواہ کا حکم﴾	155
125	﴿درزی اگر لمبائی و چوڑائی میں کمی بیشی کر دے تو کیا حکم ہے﴾	155
126	﴿ملازم کے لئے وقت سے پہلے گھر آنے کا حکم﴾	156
127	﴿غیر مسلم کے لئے اجرت پر کام کرنا جائز ہے﴾	158
128	﴿کفار کے ہاں ملازمت کی ایک خاص صورت کا بیان﴾	159
129	﴿گائے چرانے کی اجرت اس کے دودھ اور نسل میں سے مقرر کرنا﴾	160
130	﴿گائے پالنے کی اجرت اس کی قیمت میں سے مقرر کرنا﴾	161
131	﴿شراب کی فیکٹری میں کام کرنا منع ہے﴾	162
132	﴿بقدر مسافت ٹیکسی کے کرایہ کا حکم﴾	163

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
228	سودی ادارے کوز مین یا مکان کرایے پر یا ملکیۃ دینا کیسا ہے؟	254
229	اشیاء کا کرایہ وصول کرنا سود نہیں ہے	254
230	کمیشن کی رقم دے کر گاہک بڑھانے کا حکم	256
231	دلال (کمیشن ایجنٹ) کے پاس ایڈوانس جمع کی ہوئی رقم کا حکم	256
232	دلال کے لئے کمیشن کے علاوہ منافع رکھنا جائز نہیں	257
233	سامان دلانے پر کمیشن لینا جائز ہے	260
234	پڑوسی سے گیس کنکشن لگانا جائز نہیں	261
235	**کتاب الوديعة والعارية والغصب**	262
236	امانت کی رقم بغرض حفاظت بڑے نوٹوں میں تبدیل کرنا	262
237	امانت کی رقم سے کوئی چیز خریدنا خیانت ہے رقم لوٹانا واجب ہے	263
238	امانت رکھی ہوئی چیز خراب ہو رہی ہو تو کیا کیا جائے؟	265
239	محکمہ کی گاڑی کو ذاتی کام کیلئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے	266
240	عاریہ مؤقت کا حکم	266
241	امانت میں تصرف کرنے کا حکم	267
242	امانت دار کو امانت میں تصرف کا حق حاصل نہیں	268
243	امانت کی حفاظت پر اجرت لینا جائز ہے	269
244	مستعار چیز میں نقص آنے کا حکم	269
245	مستعار چیز کے ہلاک ہونے کی صورت میں ضمان کا حکم	270
246	مرمت کرنے والے کے پاس دوسروں کا سامان امانت ہے	271

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

﴿باب خیار العیب﴾

﴿تمام عیوب سے براءت کے ساتھ کسی چیز کو بیچنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل بعض دکانداروں نے اپنی دکان پر یا جس چیز کو وہ بیچنا چاہتے ہیں اس پر لکھا ہوتا ہے کہ "خریدا ہوا مال واپس نہیں ہوگا" اور جب خریدار ان سے کوئی چیز خریدتا ہے تو بائع اس وقت صراحتا کہہ دیتا ہے کہ بھائی یہ چیز ہے اس کو چیک کر لیں لے جانے کے بعد اگر اس میں کسی بھی قسم کی خرابی کے بارے میں آپ کو علم ہو تو میں واپس نہیں لونگا کیا دکانداروں کا اس طرح سے کسی چیز کو بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ حالانکہ ہم نے تو سنا ہے کہ خریدنے کے بعد اگر کسی شئ مبیعہ (سامان) میں کوئی خرابی نظر آ جائے تو خریدار اس کو واپس کر سکتا ہے۔ مستفتی: فخر الزمان

﴿جواب﴾ کسی چیز کی فروخت کے وقت اگر فروخت کرنے والے نے یہ کہہ دیا کہ یہ چیز ہے اس کو آپ اچھی طرح چیک کر لیں بعد میں اگر اس میں کوئی خرابی نکلی تو میں واپس نہیں لوں گا تو دکانداروں کے لئے شرعا اس طرح معاملہ کرنے کی اجازت ہے اور فروخت کنندہ کے اس طرح کہہ دینے سے مشتری بائع کو وہ چیز واپس نہیں لوٹا سکتا۔

اسی طرح اگر بائع نے کہا تو نہیں لیکن دکان پر لکھا ہوا آویزاں ہے کہ "خریدا ہوا مال واپس نہ ہوگا" اور دکانداروں کے عرف میں بھی اس طرح لکھ لینے سے بیچی ہوئی چیز کو واپس نہیں لیا جاتا اور مشتری (خریدار) کو اشیاء خریدتے ہوئے اس آویزاں تحریر کے بارے میں علم بھی ہو جائے تو ایسی صورت میں بھی مشتری کو خریدی ہوئی چیز شرعا واپس لوٹانے کا حق نہیں، البتہ اگر خریدتے وقت بائع نے اس طرح کے الفاظ نہ کہے ہوں اور خرید و فروخت کا معاملہ مطلق ہوا ہو پھر خریدنے والے کو اس خریدی گئی شئے میں کسی ایسی خرابی کا علم ہو جائے جو کہ بیچنے سے قبل فروخت کنندہ کے پاس اس شئے میں موجود تھی تو خریدنے والے کو ایسی صورت میں واپس لوٹانے کا حق حاصل ہے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۵/۴۲، طبع سعید)

(وصح البیع بشرط براءة من کل عیب و ان لم یسم) خلافا للشافعی لان البراءة عن الحقوق المجهولة لا یصح عنده و یصح عندنا لعدم افضاءه الی المنازعة (ویدخل فیه الموجود و الحادث) بعد العقد (قبل القبض فلا یرد بعیب)

وفی الشامیة:بان قال بعتک هذاالعبدعلی انی بری، من کل عیب..... الخ:
ولاخصوصیة لهذااللفظ بل مثله کل مایؤدی معناه.....ومنه ماتعورف فی زماننا فیما
اذاباع دارامثلافیقول بعتک هذه الدارعلی انهاکوم تراب،وفی بیع الدابةیقول مکسرة
محطمة،وفی نحوالثوب یقول حراق علی الزنادویریدون بذلک انه مشتمل علی جمیع
العیوب فاذارضیه المشتری لاخیارله لانه قبله بکل عیب یظهرفیه.

ولمافی الهدایةوحاشیتها:(۲/۲۱،طبع رحمانیه)

اوباع بالرقم واعلمه فی المجلس "الرقم"فی الاصل الکتابة والختم والتاجریرقم
الثیاب ای یعلمهابان ثمنهاکذاوالمرادمن البیع بالرقم هوان یعلم البائع علی الثوب
بعلامة یعلم بهاالدلال اوغیره بان ثمن الثوب کذادرهماولایعلم المشتری ذلک
القدرفیقول صاحب الثوب اوالدلال اوغیره بعتک هذاالثوب برقمه فقال المشتری
قبلت من غیران یعلم مقداره ینعقدالبیع فاسداثم لوعلم المشتری قدرذلک الرقم فی
المجلس وقبله ینقلب البیع جائز:بالاتفاق.

ولمافی الاشباه والنظائر:(ص۹۹،طبع قدیمی)

المبحث الثالث: العادة المطردةهل تنزل منزلة الشرط؟قال فی اجارة الظهیریة:
والمعروف عرفاکالمشروط شرعاً.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفااللہ عنہ

۱۴۳۱ھ　　　　فتوی نمبر:۲۶۷۰

﴿ضمانت کے باوجود مبیع میں عیب نکلنے کی صورت میں خریدار کس سے رجوع کریگا؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے ایک شخص نے کہا کہ فلاں جگہ آپ کا مطلوبہ سامان ہے، چل کر خرید لیتے ہیں، چنانچہ میں ان کے ساتھ گیا جب میں نے سامان دیکھا تو کچھ شک سا ہو گیا کہ یہ سامان دونمبر ہے اور میں نے اس شک کا اظہار لیکر جانے والے شخص سے بھی کیا تو اس نے کہا کہ آپ خرید لیں اگر کوئی عیب ثابت ہو گیا تو میں ذمہ دار ہوں گا، لہذا میں نے ان کے کہنے پر خرید لیا اپنے گودام میں پہنچاتے ہی وہاں پر موجود دوسرے کاروباری حضرات نے مجھ سے کہا کہ یہ تو واقعی دونمبر سامان ہے۔

لہذا میں نے وہ سامان اٹھایا اور اس شخص کے گودام میں اتار دیا جس کے کہنے پر میں نے لیا تھا، پہلے تو وہ کچھ بھی نہیں مان رہا تھا لیکن جب درمیان کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ آدھا مال آدھی رقم کے بدلے میں آپ کا ہوگا اور آدھا مال آدھی رقم کے بدلے میں دوسرے کا تو وہ راضی ہو گیا،

اب وہ سارا مال اسکے گودام میں تھا کہ اچانک رات کو غائب ہو گیا، پہلے تو وہ یہ کہہ رہا تھا کہ چوری ہو گیا لیکن اب وہ یہ کہہ رہا ہے کہ صلح اس بات پر ہوئی تھی کہ آدھی رقم دیکر سارا سامان میں لوں گا جبکہ فیصلہ وہی ہوا تھا جو اوپر ذکر کیا گیا، پوچھنا یہ ہے کہ میرے لئے اس سے نصف سامان لینے کا شریعت میں کیا طریقہ ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ جب آپ لوگوں کے درمیان صلح اس بات پر ہوگئی کہ آدھا مال آدھی رقم کے بدلے ایک کا ہوگا اور بقیہ آدھا مال آدھی رقم کے بدلے دوسرے کا تو اب دوسرے آدمی پر لازم ہے کہ وہ آدھی رقم آپ کو ادا کر کے آدھا مال لے لے اور بقیہ آدھا مال آپ کو دے۔

اب اگر وہ انکار کرتا ہے کہ صلح اسطرح نہیں ہوئی تھی تو آپ پر لازم ہے کہ آپ گواہوں کی گواہی کے ذریعے ثابت کریں کہ صلح اسطرح ہوئی تھی اور اگر گواہ نہ ہوں تو وہ اسطرح مصالحت سے انکار کے ساتھ قسم کھالے تو آپ کا دعویٰ رد ہوگا، البتہ وہ قسم کھانے سے انکار کرے تب آپ کے لئے اس سے نصف رقم اور نصف سامان لینے کا حق شریعت کی طرف سے حاصل ہوگا۔

لما فی التنویر مع الدر(۵/۵۴۷-۵۴۸،طبع سعید)

(فان اقر)فیها(اوانکرفبرهن المدعی قضی علیه)بلاطلب المدعی(والا)یبرهن (حلفه) الحاکم(بعدطلبه)اذلابدمن طلب الیمین فی جمیع الدعاوی.

ولمافی الهدایة:(۲۱۰/۳،طبع رحمانیه)

واذاصحت الدعوی سأل القاضی المدعی علیه عنهالینکشف وجه الحکم فان اعترف قضی علیه بهاوان انکرسأل المدعی البینةوان احضرهاقضی بها.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:سلمان احمد

۱۴صفر الخیر ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر:۲۸۷۸

﴿خیار شرط میں وراثت جاری نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد صاحب نے شکیل احمد سے موٹر سائیکل خرید العوض ۲۵۰۰۰ روپیہ کے والد صاحب نے ان سے کہا کہ تین دن کا مجھے اختیار رد و پسند آیا تو ٹھیک ہے ورنہ واپس کرونگا۔ لیکن اچانک میرے والد صاحب اس دنیا فانی سے رخصت ہو گئے۔ اب میں موٹر سائیکل واپس کرنا چاہتا ہوں، تو کیا شرعاً مجھے واپس

کرنے کا اختیار حاصل ہے؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: راجہ ابرار الحق

﴿جواب﴾ آپکے والد مرحوم کو تین دن تک موٹر سائیکل لینے یا رد کرنے کا اختیار تھا، انہوں نے اپنی حیات میں رد کرنے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا، اب انکے انتقال کے بعد آپ لوگوں کو رد کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے، لہذا آپ اس خیار شرط کی بنیاد پر واپس نہیں کر سکتے۔

لما فی التنویر الابصار: (۵۸۱/۴، طبع: سعید)

(وتم العقد بموته) ولا يخلفه الوارث كخيار رؤية وتعزير (قوله بموته) أي موت من له الخيار بائعا كان او مشتريا (قوله ولا يخلفه الوارث) لانه ليس الا مشيئة وارادة ولا يتصور انتقاله والارث فيما يقبل الانتقال هدايه.

ولما فی الهداية: (۴۴/۳، طبع: رحمانیه)

واذا مات من له الخيار بطل خياره ولم ينتقل الى ورثته

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوہائی

۲۷ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:

﴿خریدی ہوئی عیب دار چیز کے منافع کا حق خریدار کو حاصل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے بکر کو ایک گاڑی فروخت کی، اور بکر نے یہ گاڑی آگے زیادہ قیمت پر قسطوں میں حامد کو فروخت کی، حامد نے کچھ قسطیں اداء کی اور اس گاڑی سے تقریباً ۷۰ ہزار روپے نفع بھی کمایا، پھر اس گاڑی کے کاغذات میں عیب نکلا، جس کی وجہ سے یہ گاڑی حامد نے بکر کو اور بکر نے زید کو واپس کر دی، عرض سوال یہ ہے کہ گاڑی سے جو ۷۰ ہزار روپے نفع حاصل کیا ہے وہ کس کا ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں گاڑی سے جو نفع حاصل ہوا ہے وہ مشتری ثانی یعنی حامد کا حق ہے، کیونکہ خدانخواستہ حامد کے پاس گاڑی کا کوئی نقصان اگر ہوتا تو اس کی تلافی بھی حامد کے ذمہ ہوتی لہذا نفع بھی اسی کا حق بنتا ہے۔

لما فی سنن ابی داؤد: (۱۳۹/۲، طبع: رحمانیه)

عن عائشةؓ ان رجلاً ابتاع غلاماً فاقام عنده ماشاءالله ان يقيم ثم وجد به عيباً فخاصمه الى النبي صلى الله عليه وسلم فرده عليه فقال الرجل يا رسول الله قد استغل غلامي فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم الخراج بالضمان.

ولما فی الأشباه والنظائر ص:۱۲۸ طبع: قدیمی کراچی

قال ابو عبید: الخراج فی هذا الحدیث غلة العبد یشتریه الرجل فیستعمله زماناثم یعثر منه علی عیب دلسه البائع فیرده ویأخذ جمیع الثمن و یفوز بغلته کلها، لأنه کان فی ضمانه، ولو هلک هلک من ماله (انتهی)

ولما فی الشامی ۱۹،۱۸/۵ طبع: سعید

والمنفصلة نوعان: متولدة کالولد ...... وغیرمتولدة ککسب وغلة و هبة وصدقة، فقبل القبض لا تمنع الرد فاذا رد فهی للمشتری بلا ثمن عنده ولا تطیب له و عندهما للبائع ولا تطیب له و بعد القبض لا تمنع الرد ایضاو تطیب له الزیادة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۱۹ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۵۳۱

﴿خیار عیب کی وجہ سے ضمان لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میں نے ایک کپڑا خریدا اور اس کو کاٹ لیا پھر معلوم ہوا کہ اسکی ایک طرف مکمل خراب ہے جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے جو سینے کے قابل نہیں تو کیا اب میں کپڑا واپس کرسکتا ہوں، اگر کپڑا واپس نہیں کرسکتا تو مجھے جو نقصان پہنچا ہے اس کا ضمان لے سکتا ہوں؟

مستفتی: محمد یوسف

﴿جواب﴾ معاملہ کے وقت واقعی یہ کپڑا اگر زیادہ مقدار میں پھٹا ہوا تھا اور آپ پر یہ عیب مخفی رہا تو آپ کو واپس کرنے کا حق حاصل تھا لیکن آپ نے رد کرنے سے پہلے کاٹ لیا ہے اب تو بائع لینے کو تیار نہیں ہوگا، البتہ مارکیٹ میں اتنا پھٹا ہوا کپڑا جتنے کا ملتا ہے صرف اتنے پیسے بائع اپنے پاس رکھ سکتا ہے باقی زائد رقم واپس کرنا شرعا اس کی ذمہ داری ہے اس صورت میں کپڑا آپ ہی کا ہوگا۔ اور بائع چاہے تو کٹا ہوا پورا کپڑا اپنے پاس رکھے اور پوری رقم واپس کردے۔

لما فی الردالمحتار:(۵/۵، طبع: سعید)

لا بد فی العیب ان لا یتمکن من ازالته بلا مشقة فخرج احرام الجاریة ونجاسة ثوب لا ینقص بالغسل وان یکون عند البائع ولو لم یعلم به المشتری ولم یکن البراءة منه خاصا أو عاما، ان لا یعلم به عند القبض ولم یوجد من المشتری ما یدل علی الرضا به بعد العلم بالعیب

ولما فی التنویروالدر:(۱۹/۵ طبع: سعید)

(وله الرد برضا البائع) الا لمانع عیب أو زیادة (کان اشتری ثوبا فقطعه فاطلع علی عیب رجع به) ای بنقصانه لتعذر الرد بالقطع (فان قبله البائع کذلک له ذلک لانه اسقط حقه

ولما فی الردالمحتار:(۵/۱۹، طبع: سعید)

(قوله کان اشتری ثوبا)تمثیل لاصل المسألة لا للزیادة (قوله فقطعه)ووطء الجاریة کالقطع بکرا کانت أو ثیبا (قوله فاطلع علی عیب)ذکر الفاء یفید ان القطع لو کان بعد الاطلاع علی العیب لا یرجع بالنقصان.

ولما فی الهندیة: (۳/۸۲، طبع:قدیمی)

رجل اشتری ثوبا فقطعه ولم یخط فوجد به عیبا فلیس له ان یرده فان قال البائع انا اقبله کذلک کان له ذلک

ولما فی البحر الرائق:(۶/۴۹طبع: سعید)

(قوله ومن اشتری ثوبا فقطعه فوجد به عیبا رجع بالعیب)ای بنقصان العیب القدیم لان القطع عیب حادث (قوله وان قبله البائع کذلک فله ذلک)لان الامتناع لحقه وقد رضی به.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاءالحق انگی

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۰۹

﴿خریدنے کے بعد انڈوں کا خراب نکلنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دکاندار ہوں، میری دکان پر کھانے پینے کی اشیاء زیادہ تر فروخت ہوتی ہیں، ان اشیاء میں سے مرغیوں کے انڈے بھی ہوتے ہیں، بعض لوگ انڈے لے جاتے ہیں، اور بعض انڈے توڑ کر واپس لاتے ہیں، جو کہ اندر سے انڈے خراب نکلتے ہیں ہمیں انڈا فروخت کرتے وقت یہ علم نہیں ہوتا کہ آیا یہ انڈا صحیح ہے یا خراب لیکن دکان پر پڑے ہوئے کچھ دن گزر جاتے ہیں، جسکی وجہ سے خرابی پیدا ہو جاتی ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ جو گاہک خراب انڈے واپس لاتے ہیں، کیا شریعت کی روشنی میں ان لوگوں کا واپس کرنا اور ہمیں واپس لینا درست ہے؟ مستفتی: محمد زبیر معاویہ

﴿جواب﴾ انڈے پڑے پڑے آپ کے پاس خراب ہو گئے تھے البتہ خراب ہونے کا علم توڑنے کے بعد ہوا، اس لئے یہ آپ کا نقصان ہے گاہک کو پوری رقم واپس لینے کا حق ہے، البتہ آپ کو گاہک کی بات پر اطمینان نہ ہو تو الگ بات ہے، اگر آپ جانتے ہیں کہ گاہک آپ کے پاس سے ابھی انڈے لیکر گیا اور وہ خراب نکلے ہیں تو پوری رقم واپس کر دینا ضروری ہے۔

لما فی الهندیه:(۳/۸۴طبع: رشیدیه)

ومن اشتری بیضا أو بطیخا أو قثاء أو خیارا أو جوزا أو قرعا أو فاکهة فکسره غیر عالم

بالعيب فوجده فاسدا فان لم ينتفع به كالقرع المرء والبيض المزر يرجع بثمن كله لانه ليس بمال فيكون بيعه باطلا بخلاف ما لو كسره عالما بالعيب لا يرده.

ولما في التنوير مع الدر:(۵/۲۵ طبع: سعيد)

(شرى نحو بيض وبطيخ)كجوز وقثاء (فكسره فوجد فاسدا ينتفع به)ولو علفا للدواب (فله)ان لم يتناول منه شيئابعد علمه بعيبه(نقصانه)الا اذا رضى البائع به ولو علم بعيبه قبل كسره فله رده(وان لم ينتفع به اصلا فله كل الثمن)لبطلان البيع ،ولو كان اكثره فاسدا جاز بحصته عندهما نهر.

ولما في البحر الرائق:(۶/۴۲طبع: سعيد)

(قوله ولو اشترى بيضاأوقثاء أو جوزافوجده فاسدا ينتفع به رجع بنقصان العيب والا بكل الثمن)اى ان لم يكن منتفعا به فانه يرجع بجميع الثمن لانه ليس بمال فكان البيع باطلا.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بندہ شاہ جہان ڈیروی

۲۸ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر:۳۲۶۱

﴿خریدار کو عیب کے بقدر رجوع کا حق حاصل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا کپڑے کا ایک کارخانہ ہے،میرے ایک دوست جولیدر کی جیکٹس تیار کر کے ایکسپورٹ کرتے ہیں ان جیکٹس میں استعمال ہونے والا کپڑا مجھ سے خریدتے ہیں، ہمارے درمیان یہ معاہدہ طے ہوا تھا کہ میں مخصوص کیمیکل سے رنگا ہوا کپڑا فروخت نہیں کروں گا، کپڑا خریدنے کے بعد بسا اوقات لیبارٹری میں چیک بھی کرواتے ہیں لیکن ایک مرتبہ کپڑا خریدنے کے بعد لیبارٹری میں چیک کئے بغیر اس نے جیکٹس تیار کر کے ایکسپورٹ کی، جب اس ملک میں جا کر کپڑا چیک ہوا تو پتا چلا کہ ممنوعہ کیمیکل استعمال ہوا ہے،خریدار نے وہ کپڑا اتار کر دوسرا کپڑا لگایا اور جیکٹس کو فروخت کر دیا، اب اس کا کہنا ہے کہ اس سارے عمل کے دوران ۸ لاکھ روپے کا نقصان ہوا ہے۔

لہٰذا آدھا نقصان تم برداشت کرتے ہوئے چار لاکھ روپے ادا کرو، پوچھنا یہ ہے کہ میرے دوست کا یہ مطالبہ درست ہے یا نہیں؟ نیز میرے ذمہ اس نقصان کی ضمان ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ میں نے اپنے دوست کو یہ کپڑا تقریباً ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے کا فروخت کیا تھا۔

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپکے دوست کا مطالبہ کہ چار لاکھ روپے کا نقصان آپکو برداشت کرنا ہوگا صحیح نہیں ہے،البتہ کپڑے میں مطلوبہ معیار نہ ہونے کی وجہ سے صرف کی

(عیب) کی بقدر قیمت کم کرنے کا انہیں حق حاصل ہے مثلاً یہ کپڑا بغیر عیب کے اگر ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے کا تھا تو اس عیب کے ہوتے ہوئے بھی آخر مارکیٹ میں کچھ قیمت تو ہوگی، لہٰذا ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے میں سے عیب دار کپڑے کی قیمت کے برابر رقم لینا آپکا حق ہے، وہ اپنے پاس رکھ لیں باقی رقم اپنے دوست کو واپس کر دیں چار لاکھ روپے ان کو ادا کرنا آپ کے ذمہ واجب نہیں ہے۔

لمافی الهداية:(۴۴/۳،طبع رحمانيه)

فان قطع الثوب وخاطه اوصبغه احمراولت السويق بسمن ثم اطلع على عيب رجع بنقصانه لامتناع الرد بسبب الزيادة.

ولمافی مجمع الضمانات:(ص۳۹۵،طبع دار الكتب العلمية بيروت)

ولواشترى ثوبافصبغه اوقطعه اوخاطه اوطحن الحنطة لايردفان باعه له يرجع بالنقصان.

ولمافی التنويرمع الدر:(۲۰/۵،طبع ايچ ايم سعيد)

(فلوقطعه)المشترى(وخاطه)......(ثم اطلع على عيب رجع بنقصانه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری عفااللہ عنہ

۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۲۰۵

﴿خیار عیب کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ میں نے ایک اپارٹمنٹ رہائشی مقصد کے لئے پسند کیا اور اس سلسلے میں تین چار مرتبہ اپنی فیملی کو بھی وہاں لے گیا، اس نے ہمیں دکھایا، میرے اور دوسری پارٹی کے ایجنٹ پر یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ مجھے رہائشی مقصد کے لئے اپارٹمنٹ کی ضرورت ہے اور اسی مقصد سے مجھے وہ دکھا رہے تھے پھر ایک اپارٹمنٹ پسند آ گیا جو کہ انھوں نے مجھے چار دفعہ دکھایا تھا، اسکے میں نے 5 لاکھ روپے بیعانہ کی صورت میں ادا کئے اور دو ماہ بعد پوری رقم ادا کرنی تھی، مجھ پر کسی نے بھی یہ بات واضح نہیں کی تھی بیعانہ لیتے وقت کہ یہ اپارٹمنٹ رہائشی نہیں ہے بلکہ کمرشل ہے، جب مکمل ادائیگی کا وقت آیا تو میرے میٹر کے بارے میں پوچھنے پر کہ یہ میٹر 3 فیز والا ہے یا نہیں؟ یہ بات کھلی کہ یہ میٹر اور بلکہ پورا اپارٹمنٹ ہی کمرشل پراپرٹی ہے اور اب اسکا رہائش میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اب پوری صورت حال آپ کے سامنے ہے جبکہ میرے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور مجھے بالکل

اس پراپرٹی کے عیب کے بارے میں بتایا ہی نہیں گیا تو کیا میں اپنا بیعانہ واپس مانگنے میں حق بجانب ہوں یا نہیں؟

مستفتی: مسعود خان

﴿جواب﴾ نیک و معتمد اسٹیٹ ایجنٹوں سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ بعض علاقوں میں کمرشل پلاٹ میں رہائش کی اجازت ہوتی ہے اور بعض میں رہائش اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، سو آپکا یہ پلاٹ اگر ایسے علاقہ میں ہے جہاں رہائش کی قطعا اجازت نہیں تو اس صورت میں یہ عیب شمار ہوگا (جسکا آپکو پہلے علم نہیں تھا) لہٰذا آپ پلاٹ واپس کرسکتے ہیں اور بیعانہ کی رقم واپس لوٹانا انکے ذمہ لازم ہے۔

لمافی الهندية: (۶۶/۳، طبع رشيديه)

واذااشترى شيئالم يعلم بالعيب وقت الشراء ولاعلمه قبله والعيب يسيراوفاحش فله الخياران شاء رضي بجميع الثمن وان شاء رده.

ولمافي الهندية: (۷۲/۳، طبع رشيديه)

رجل اشترى شاةفوجدهامتطوعةالاذن ان اشتراهاللاضحية كان له ان يردها وكذلك كل مايمنع التضحيةوان اشتراهالغيرالأضحيةلايكون له ان يردهاالاان يكون ذلك عيباعندالناس.

ولمافي الهندية: (۷۲/۳، طبع رشيديه)

اشترى ارضاونخلاليس لهماشرب ولم يعلم به له الخيار. كذافي الوجيز للكردي

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرہ اللہ

۲۵ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۸۱۴

﴿گاڑی کے کاغذات میں فرق ہونا عیب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبھی ہم کسی دوست پر اعتماد کرکے اس سے گاڑی خرید لیتے ہیں پھر کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کاغذات میں فرق ہے، آیا ہم اس کو گاڑی واپس لینے پر مجبور کرسکتے ہیں اور اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس دوران گاڑی استعمال بھی ہوئی ہے اور پندرہ، بیس ہزار روپے بھی ہم نے اس پر خرچ کئے ہیں، اس کا کیا ہوگا؟ کاغذات میں کبھی فرق اس کو معلوم ہوتا ہے اور کبھی اس کو بھی معلوم نہیں ہوتا۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں خرید وفروخت کے وقت اگر گاڑی بیچنے والے نے ہر قسم کے عیوب سے براءت کا اظہار کیا ہو کہ یہ گاڑی ہے اور یہ اس کے کاغذات ہیں اچھی طرح دیکھ لو

بعد میں اگر کوئی عیب نکل آیا تو ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے اس طرح اگر اس نے کہا ہو پھر تو خریدار کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بائع کو گاڑی واپس لینے پر مجبور کردے۔

ہاں اگر بائع مشتری (خریدار) پر احسان کر کے اپنی خوشی سے گاڑی واپس لینا چاہے تو واپس لے سکتا ہے۔ اور اگر خرید وفروخت کے وقت عیوب سے برأت کا اظہار نہ کیا ہو اور پھر خریدار کے پاس کاغذات کے اندر یا گاڑی کے اندر کوئی پرانا عیب نکل آئے تو اس صورت میں خریدار کو یہ اختیار ہوگا چاہے تو پوری قیمت میں گاڑی اپنے پاس رکھے یا اس عیب کی وجہ سے یہ گاڑی بائع کو واپس کردے اور اپنی پوری رقم بائع سے وصول کرے اور اس بارے میں فقہاء کرام نے یہ ضابطہ بیان فرمایا ہے" کہ ہر وہ چیز جو تاجروں کی عادت میں نقصان ثمن (قیمت کی کمی) کا باعث ہو وہ عیب ہے"۔

رہی یہ بات کہ گاڑی خریدنے کے بعد استعمال ہوئی ہے اور خریدار نے اس پر پندرہ، بیس ہزار روپے خرچ کئے ہیں اس سے مراد اگر ایسے خرچے ہیں جو کہ گاڑی کے استعمال کے سلسلہ میں کرنے پڑتے ہیں مثلاً پیٹرول، آئل، ڈیزل وغیرہ تو ایسے خرچے خریدار وصول نہیں کرسکتا اور اگر رنگ یا انجن میں کام کیا ہے تو ایسی صورت میں گاڑی بائع کو واپس نہیں کی جائے گی، البتہ عیب کے بقدر رقم خریدار بائع سے وصول کرے گا جس کی قیمت ٹرانسپورٹ والے لگائیں گے۔

لمافی شرح المجلۃ للأتاسی:(۲/۲۱۰، المادة ۳۳۶،طبع رشیدیہ)

البيع المطلق يقتضى سلامة المبيع من العيوب يعنى ان بيع المال بدون البراءة من العيوب بلا ذكرانه معيب أوسالم يقتضى ان يكون المبيع سالماخاليامن العيب لأن الشراء انما شرع لدفع الحاجة، ودفع الحاجة على التمام انمايكون بالسالم من العيب غالباًفكان قصدالمشترى الى السالم هوالغالب فكان وصف السلامة كالمشروط فيتخير عند فقده كيلايتضرربالزام مالم يرض به ولان السلامة من العيب لماكانت الاصل فى المخلوق انصرف مطلق العقداليها(افاده فى الفتح)المادة ۳۳۷.مابيع مطلقااذاظهرفيه عيب قديم يكون المشترى مخيراان شاء قبله بثمنه المسمى۔

ولمافى فتح القدير:(۱۲/۶،طبع رشيديه)

(فامتنع اصلاوليس للبائع ان ياخذه)وان رضى المشترى بترك الزيادة(لان الامتناع) لم يتمحض لحقه بل لحقه وحق الشرع بسبب ماذكرنامن لزوم الربا ورضاه باسقاط حقه لايتعدى الى حق الشرع بالاسقاط.

وکذافی الدرالمختار:(۷/۱۶۸-۱۸۹،طبع امدادیہ ملتان)وھکذافی الھندیۃ:(۳/۶۶-۷۷،طبع رشیدیہ کوئٹہ)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۸ربیع الاول ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۷۲

﴿گاڑی میں عیب ظاہر ہوجائے تو خریدار کو واپس کرنے کا اختیار ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک شخص سے ایک گاڑی خریدی گاڑی کا ظاہری رنگ وروغن بہت اچھا تھا کیونکہ کچھ عرصہ قبل نیا کروایا تھا فروخت کرتے وقت بائع نے کہا کہ رنگ بھی ابھی کیا ہے اور انجن بھی، اسکی وجہ سے اس نے گاڑی کی قیمت زیادہ بتائی اور میں نے ان تمام صفات کو سن کر اور گاڑی کو دیکھ کر اسکی بتائی ہوئی قیمت مناسب سمجھی اور خریدلی لیکن چند دنوں کے بعد ایک ماہر مکینک کے ذریعے پتہ چلا کہ گاڑی میں وہ صفات نہیں ہیں جو بائع نے بتائی تھیں، انجن پرانا تھا صرف رنگ کیا گیا تھا۔

پوچھنا یہ ہے کہ کیا شرعاً میں اس گاڑی کو واپس کرسکتا ہوں جبکہ میں نے چند دن گاڑی استعمال کر کے کچھ پیسے بھی کمائے ہیں۔ برائے مہربانی مسئلے کا شرعی حل بیان فرمائیں۔

﴿جواب﴾ جب آپ نے بائع کی بیان کردہ صفات کی وجہ سے اسکی بتائی ہوئی قیمت کو مناسب سمجھ کر گاڑی خریدی اور بعد میں گاڑی کو ان صفات کا حامل نہ پایا تو آپ کو اختیار ہے کہ اگر آپ چاہیں تو گاڑی کو دی ہوئی یعنی پوری قیمت کے عوض لے لیں یا واپس کرنا چاہتے ہیں تو گاڑی کو لوٹا کر بائع سے پوری قیمت واپس لے لیں کیونکہ انجن وغیرہ کا کمزور اور پرانا ہونا عرفاً ایک عیب ہے جسکی وجہ سے گاڑی کی قیمت میں غیر معمولی کمی ہوتی ہے۔

اور جو پیسے آپ نے گاڑی کو استعمال کر کے کمائے ہیں ان کے آپ مالک ہیں کیونکہ بیع تام ہونے کے بعد آپ چونکہ گاڑی کے باقاعدہ مالک قرار پائے تھے اور اپنی مملوکہ گاڑی وغیرہ کے ذریعے اگر کوئی کچھ کمائے تو وہی اس کا مالک ہوتا ہے کسی دوسرے کا اسمیں کوئی حق نہیں ہوتا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۵/۵،طبع سعید)

(من وجد بمشریہ ماینقص الثمن)ولو یسیرا جوھرۃ(عندالتجار)المراد بھم ارباب المعرفۃ بکل تجارۃ وصنعۃ قالہ المصنف(أخذہ بکل الثمن اوردہ)

ولما فی البحر الرائق (٣٦/٦ طبع سعید)

(قوله ومن وجد بالمبیع عیبا اخذه بکل الثمن او رده) لان مطلق العقد یقتضی وصف السلامة فعند فوته یتخیر کیلا یتضرر بلزوم ما لا یرضی به ولیس له امساکه واخذ النقصان لان الاوصاف لا یقابلها شیء من الثمن فی مجرد العقد

ولما فی سنن ابی داؤد (١٣١/٢ طبع رحمانیه)

حدثنا احمد بن یونس حدثنا ابن ابی ذئب عن مخلد بن خفاف عن عروة عن عائشة قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الخراج بالضمان۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی عفا اللہ عنہ

٢٠ ربیع الاول ١٤٣٠ھ　　　　فتویٰ نمبر: ٢٠٥٨

﴿کسی مکان میں جنات کا ہونا بھی عیب ہے﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی نے مکان کرائے پر لیا لیکن ساتھ خیارِ عیب کی شرط بھی لگا دی پھر وہ آدمی دو دن تک اس مکان میں رہا، مکان میں بظاہر تو کوئی عیب نہ تھا لیکن وہاں جنات تھے جو مختلف طریقوں سے پریشان کرتے تھے تو کیا یہ جنات کا ہونا عیب شمار کیا جائے گا؟ اور کیا اسکی وجہ سے اجارہ فسخ ہو جائے گا؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ جنات اگر کسی مخصوص آدمی کیساتھ ہیں کہ اسکے داخل ہونے کی وجہ سے پریشان کرتے ہیں تو یہ عیب شمار نہ ہوگا اور اسکی وجہ سے اجارہ فسخ نہ ہوگا اور اگر جنات کسی آدمی کیساتھ خاص نہیں ہیں بلکہ مکان میں ہیں اور خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں تو یہ عیب شمار ہوگا اور اسکی وجہ سے اجارہ فسخ ہو جائے گا۔

لما فی الشامی (٨١/٦ طبع سعید)

قال الخیر الرملی ویؤخذ منه ان الرجم الذی یقع کثیرا فی البیوت ویقال انه من الجان عذر فی فسخ الاجارة لما یحصل من الضرر الخ ما ذکره اهـ أقول یظهر منه ان الرجم لذات الدار أما لو کان لشخص مخصوص فلا وقد أخبرنی بعض الرفقاء ان أهل زوجته سحروا أمه فکلما دخلت داره یحصل الرجم واذا خرجت ینقطع والله تعالی اعلم تأمل

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

١٠ ربیع الثانی ١٤٢٧ھ　　　　فتویٰ نمبر: ١٣٦

﴿باب الاقالۃ﴾

﴿ثمن اول سے کمی وزیادتی کے ساتھ اقالہ کرنا باطل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو قسطوں پر 41 لاکھ روپے پر ٹرک دے دیا، تو خریدار کچھ مہینے کے بعد نادم ہو کر ٹرک واپس کرنا چاہتا ہے بائع تیار ہے لیکن ٹرانسپورٹ کے اصول کے مطابق 4 لاکھ روپے کٹوتی آتی ہے، آیا یہ معاملہ جائز ہے اگر جائز نہیں تو اسکی جائز صورت کیا ہوگی؟ مستفتی: وزیرستانی

﴿جواب﴾ ایجاب وقبول سے بیع تام ہو جاتی ہے، بیع مکمل ہو جانے کے بعد خریدار یا بائع کو کسی شرعی وجہ کے بغیر رد کرنے کا کوئی اختیار نہیں رہتا البتہ باہمی رضامندی سے واپس کرنا چاہیں تو کمی بیشی کے بغیر فسخ کر سکتے ہیں، شرعی اصطلاح میں اسے اقالہ کہتے ہیں، اقالہ کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے ثواب کا کام ہے، لیکن اسی ریٹ پر واپس کرنا ضروری ہوتا ہے کمی بیشی جائز نہیں ہوتی۔

فسخ بیع یعنی اقالہ کے علاوہ نیا عقد یعنی الگ سودا بھی اسی چیز کا جائز ہوتا ہے اور نئے عقد میں باہمی رضامندی سے معاوضہ جو بھی طے کرنا چاہیں کر سکتے ہیں لیکن نیا عقد اس صورت میں جائز ہوتا ہے جبکہ پہلا معاملہ بے باق ہو چکا ہو، خریدار نے پورا پیسہ اداء کر دیا ہو، خریدار کے ذمہ پیسے اداء کرنا اگر باقی ہے۔ تو صرف اقالہ کی گنجائش ہوتی ہے نیا سودا اس شخص سے جائز نہیں ہوتا۔ لہذا خریدار کے ذمہ چونکہ ابھی کافی قسطیں اداء کرنا باقی ہیں تو اس صورت میں اقالہ ہی جائز ہے ٹرانسپورٹ کے اصول کے تحت کٹوتی کر کے واپس کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

جائز صورت یہ ممکن ہے کہ تیسرا کوئی آدمی مثلاً یہ گاڑی اس خریدار سے 4 لاکھ کم میں خرید لے یعنی 37 لاکھ میں ادھار خرید لے پھر 37 لاکھ میں بائع اول اس تیسرے شخص سے یہ گاڑی ادھار خرید لے اور بطور حوالہ اس کا مطالبہ اپنے مقروض یعنی خریدار اول کی طرف منتقل کر دے، دونوں کے قرضے آپس میں برابر ہیں اس لئے تیسرے شخص کا معاملہ ختم ہو جائے گا اور خریدار اول کے ذمہ 4 لاکھ روپے باقی رہ جائیگا اور پہلے سے اگر ادا کر دیا ہے تو کچھ باقی نہ رہے گا، بہر حال اس صورت میں بائع اول کیلئے 4 لاکھ کی بچت ہو جائیگی۔

لما في سنن ابي داؤد :(۱۳۲/۲طبع رحمانیه)

عن ابي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من اقال مسلما اقاله الله عثرته يوم القيامة.

ولما في فتح القدير :(۲۲۸/۶طبع رشيديه)

قوله (الاقالة جائزة في البيع بمثل الثمن الاول) عليه اجماع المسلمين لقوله ﷺ "من اقال نا دما بيعته اقال الله عثرته يوم القيامة" اخرجه ابوداود وابن ما جه الخ.

ولما في البحر الرائق:(۱۰۲/۶ طبع سعيد كراچی)

(قوله وتصح بمثل الثمن الاول وشرط الأكثر او الاقل بلا تعيب وجنس آخر لغو ولزمه الثمن الاول) هذا عند ابي حنيفة لان الفسخ يرد على عين ما يرد عليه العقد فاشتراط خلافه باطل ولا تبطل الاقالة كما قدمنا قيد بقوله بلا تعيب اذ لو تعيب بعده جاز اشتراط الاقل ويجعل الحط بازاء ما فات بالعيب ـــ

ولما في الهنديه :(۱۵۶/۳ طبع رشيديه)

باع جارية بالف درهم وتقايلا العقد فيها بالف درهم صحت الاقالة وان تقايلا بالف و خمسمائة صحة الاقالة بالف ويلغو ذكر خمسمائة ـــ

ولما في المحيط البرهاني:(۳۸۱/۹طبع ادارة القرآن)

يجب ان يعلم ان شراء ما باع الرجل بنفسه ـــ باقل مما باع ـــ قبل نقد الثمن لايجوز اذا كان السلعة على حالها لم ينتقض بعيب وكذلك ان بقي عليه شئ من (ثمنه) ان قل ـ للحديث المعروف ولاجل شبهة الربا ۔

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :نصرت اللہ بنوی غفرلہ ولوالدیہ

۸ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ فتویٰ نمبر:۳۶۶۸

﴿اقالہ کی صورت میں پوری رقم واپس کرنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں نے ایک شخص سے ایک ٹیکسی خریدی لیکن چند دن کے بعد مجھے پسند نہ آئی تو میں نے واپس کرنا چاہی لیکن بائع نے کہا کہ میں پورے پیسے واپس نہیں کروں گا بلکہ کچھ رقم روک کر باقی رقم دوں گا کیونکہ تم نے گاڑی کو چند دن چلایا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اس شخص کا ایسا کرنا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ آپ نے ٹیکسی خرید لی ہے، اب بائع کی رضامندی کے بغیر واپس نہیں کر سکتے بائع بخوشی آپ سے لینے کے لئے اگر تیار ہے تو پوری رقم واپس کرنا اس کے ذمہ ہے، البتہ آپ کے چلانے سے ٹیکسی میں کوئی عیب آگیا ہو تو بقدر نقصان رقم روکنے کا اسے اختیار ہے۔

لما فی الشامی:(۱۲۵/۵،طبع سعید)

(قوله وبالسکوت عنه)المرادان الواجب هو الثمن الاول سواء سماه اولا.

ولما فی فتح القدیر:(۲۲۸/۶،طبع رشیدیه)

قوله:(الاقالة جائزة فی البیع بمثل الثمن الاول)علیه اجماع المسلمین لقوله ﷺ:"من اقال نادما بیعته اقال الله عثرته یوم القیامة".اخرجه ابوداؤدوابن ماجه الخ.

ولما فی البحر:(۱۰۱/۶-۱۰۲،طبع سعید)

واما شرائط صحتها فمنها رضا المتعاقدین لان الکلام فی رفع عقدلازم— قید بقوله بلاتعیب اذلوتعیب بعده جازاشتراط الاقل ویجعل الحط بازاء مافات بالعیب ولابدان یکون النقصان بقدرحصة الفائت ولایجوزان ینقص من الثمن اکثر منه.

واللہ اعلم بالصواب:نثارمحمود بن سیتار گل کوہاٹی الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

فتوی نمبر:۲۰۵۳ ۱۹ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

﴿خریدی ہوئی گاڑی واپس کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک گاڑی ایک لاکھ ستر ہزار کی خریدی، ستر ہزاراس میں ادا کر چکا ہوں اور گاڑی میں کچھ کام بھی کر چکا ہوں، اب ایک مہینہ بعد واپس کرنا چاہتا ہوں لیکن بیچنے والا اس شرط پر واپس لیتا ہے کہ دی ہوئی رقم میں سے کچھ کٹوتی کرینگے مزید پیسے آپ نے گاڑی پر لگائے ہے وہ بھی واپس نہیں کئے جائینگے تو کیا اس شرط پر گاڑی واپس کرنا میرے لئے جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی:ارشاداحمد ڈیفنس فیز۲

﴿جواب﴾ مسلمان کے قول وفعل کو اللہ نے بڑا مقام دیا ہے ایجاب وقبول ہونے کے بعد سودا پختہ ہوجاتا ہے، اب بغیر شرعی وجہ کے واپس نہیں ہوسکتا، ہاں بائع مشتری دونوں باہمی رضامندی سے واپس کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں جس کو اقالہ کہتے ہیں اقالہ دراصل فسخ بیع سے عبارت ہے، اس لئے بائع پر لازم ہے کہ پوری رقم واپس کردے اور خریدار وہی چیز ویسے ہی واپس کردے جس طرح اس نے لی تھی، البتہ استعمال کیوجہ سے کوئی کمی آگئی ہو تو مارکیٹ میں رائج اس نقصان کی قیمت کے برابر بائع خریدار کو پیسے کم دے سکتا ہے۔

لیکن مذکورہ صورت میں خریدار نے گاڑی میں چونکہ کام کیا ہے، یہ کام اگر ایسا ہو کہ اب گاڑی سے دوبارہ الگ بھی ہوسکتا ہو مثلاً ٹائر وغیرہ ڈالدیئے ہوں تو بائع کو اختیار ہے کہ چاہے تو

اسکی قیمت دیکر گاڑی واپس لے اور چاہے تو گاڑی واپس نہ لے، اور یہ کام اگر الگ ہونے والا نہ ہو مثلا رنگ وغیرہ کر دیا ہے تو اب واپسی ممکن نہیں، البتہ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ خریدار کے ذمہ اگر بقایا ہے تو پہلے وہ پورا دیدے پھر بائع کیساتھ باہمی رضامندی سے نیا سودا کرے جس طرح دونوں چاہیں سودا کر سکتے ہیں۔

لمافی الدر المختار:(۱۲۱/۵،طبع سعید)لان من شرائطها اتحاد المجلس ورضا المتعاقدین۔

ولمافی الهداية:(۴۲/۳-۴۳،طبع رحمانیه)

فان شرط اكثر منه اوقل فالشرط باطل..... الاان يحدث في المبيع عيب فحينئذ جازت الاقالة بالاقل

ولمافی الهداية:(۴۲/۳،طبع رحمانيه)وكل مااوجب نقصان الثمن في عادة التجار فهو عيب.

ولمافی التنوير مع الدر:(۱۲۶/۵،طبع سعید)

وكذا في(الاقل)الامع تعيبه فتكون فسخا بالاقل لو بقدر العيب لاازيد ولاانقص قبل الا بقدر مايتغابن الناس فيه۔

ولمافی الشامی:(۱۲۵/۵،طبع سعید)

قدمنا عن الخلاصة ان مايمنع الرد بالعيب يمنع الاقالة،وقدمنا ايضا ان الرد بالعيب يمتنع في المتصلة الغير المتولدة مطلقا....ان الرد بالعيب يمتنع لو الزيادة متصلة لم تتولد—ككسب وغلة لايمنع الرد والفسخ بسائر اسبابه اه.....وهذا اذا تقابلا على ان يكون الثوب للبائع والخياطة للمشترى يعنى يقال للمشترى افتق الخياطة وسلم الثوب لمافيه من ضرر المشترى فلورضى يكون الخياطة للبائع بان يسلم الثوب اليه كذلك نقول تصح اه —ولقد سئلت في مبيع استغله المشترى هل تصح الاقالة فيه فاجبت بقولي نعم وتطيب الغلة له والغلة اسم للزيادة المتصلة كأجرة الدار وكسب العبد

ولمافی تقريرات الرافعي:(۱۵۲/۵،طبع سعید)

الصحة مخالفة لاطلاق ماتقدم عن الخلاصة والفصولين وفيها الربا—وقدتقدم في خيار العيب للشارح انه مالو رضيا بالرد لايقضي القاضي به لحق الشرع لحصول الربا ففي قوله اذا سلم المشترى الثوب الى البائع تصح الاقالة نظر.

ولمافی المحيط:(۲۸۱/۹،طبع ادارة القرآن)

يجب ان يعلم ان شراء ماباع الرجل بنفسه.....بأقل ماباع—قبل نقد الثمن لايجوز،اذا كان السلعة على حالها لم ينتقض بعيب،وكذلك ان بقي عليه شيء من [ثمنه]،وان قل ..... فللحديث المعروف،ولاجل شبهة الربا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن کوہائی

یکم ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

فتویٰ نمبر: ۳۰۰۴

﴿اقالہ میں فسخ بیع کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک شخص کو دو مکان فروخت کئے اور دونوں کی الگ الگ قیمت متعین کی اور رقم کی ادائیگی کے لئے ایک مدت مقرر کرلی، اس شخص نے مجھے ایک مکان کی قیمت ادا کی دوسرے مکان کی بہت معمولی رقم دے دی، باقی کے لئے مہلت لے لی، اور مہلت پر مہلت لیتا رہا، یہاں تک کے ایک سال گزرگیا لیکن یہ شخص مکان کی قیمت ادا نہیں کرسکا، مکان کا قبضہ ابھی تک میں نے اسے نہیں دیا ہے بار بار وعدوں پر وعدوں سے میں اب تنگ آگیا ہوں، اب میں نے کہا کہ میں مزید مہلت نہیں دے سکتا، ایک مکان کی رقم آپ نے پوری دی ہے فقط وہی مکان آپ کو دیتا ہوں اور دوسرے مکان کی تھوڑی سی رقم جو آپ نے دی ہے وہ واپس کردیتا ہوں تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے لیکن اب میں اپنی دی ہوئی رقم سے زیادہ لوں گا اس لئے کہ مارکیٹ کی ویلیوز زیادہ ہوگئی ہے تو کیا شرعاً اس کا یہ مطالبہ درست ہے؟ مستفتی: خالد بلوانی ابوبکر صدیق ؓ مسجد

﴿جواب﴾ خریدار پہلی مرتبہ مقررہ مدت پوری ہونے پر حسب وعدہ آپ کو پیسے پورے نہ دے سکا، تو اسی وقت آپ بیع واپس کرتے، یہ آپ کا حق ہے، البتہ مزید مہلت پر مہلت دینا آپ کا احسان ہے، بہرحال اب تک اگر اس نے رقم پوری نہیں دی ہے تو آپ اس کو صرف اپنی رقم واپس کردیں، اس کو زیادہ رقم کے مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہے، یہ فسخ بیع کی صورت ہے طے شدہ رقم سے زیادہ یا کم کرنے کی شرعاً ہرگز گنجائش نہیں ہے، خلاف کرنے کی صورت میں زائد یا کم لینا دینا کسی طرح جائز نہیں ہے البتہ قبضہ کرنے کے بعد وہ کسی تیسری پارٹی کو فروخت کرتا، تو یہ نیا سودا شمار ہوتا اور زیادہ پیسوں کے بدلے بھی بیچنا جائز ہوتا لیکن قبضہ کرنے سے پہلے وہ کسی تیسری پارٹی کو بھی فروخت نہیں کرسکتا، چونکہ اس نے پیسے آپکو ادا نہیں کئے اس لئے مکان آپ کا اپنا ہے لہذا آپ سودا واپس کرنا چاہیں تو صرف اس کی اپنی رقم واپس کردیں زیادہ کا وہ ہرگز حقدار نہیں ہے، بالفرض وہ اپنی رقم لینے سے اگر انکار کرے تو آپ مکان جس کو چاہیں فروخت کر سکتے ہیں آپکے ذمہ صرف وہی رقم واپس کرنا لازم ہوگا جو اس نے ادا کی تھی۔

لما فی الهداية: (ج۳/۲۷، طبع رحمانیه)

الاقالة جائزة فی البیع بمثل الثمن الاول ....فان شرط اکثر منه او اقل فالشرط

باطل ویرد مثل الثمن الاول۔

ولما فی الشامی:(۵/۱۲۲،طبع سعید)

(قوله فسخ فی حق المتعاقدین)هذا اذا کانت قبل القبض بالاجماع،واما بعد فکذالک عند الامامؒ ——— والصحیح قول الامامؒ کما فی تصحیح العلامة قاسمؒ

ولما فی المحیط البرھانی:(۸/۱۸۱،طبع ادارۃ القرآن)

یجب ان یعلم ان شراء ما باع الرجل بنفسه ——— باقل مما باع ——— قبل نقد الثمن لا یجوز اذا کان سلعة علی حالها لم ینتقض بعیب،وکذالک ان بقی علیه شیئ من(ثمنه)،وان قل——— وللحدیث المعروف ولاجل شبهة الربا۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:تنویرالرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۲۲جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر:۳۷۹۷

﴿اقالہ میں بیع جدید کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور بکر نے آپس میں موٹر سائیکل کا سودا کیا یعنی زید کی موٹر سائیکل بکر نے اپنی موٹر سائیکل کے بدلے لی اور زید نے تین ہزار اضافی رقم بھی دی۔بکر نے زید کی موٹر سائیکل پر اچھا خاصہ کام کرلیا اب بکر نادم ہورہا ہے سودا فسخ کرنا چاہتا ہے زید اس شرط پر راضی ہے کہ میرے تین ہزار روپے واپس کردیں اور آپ نے جو خرچہ کیا ہے وہ میں نہیں دے سکتا تو کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟مستفتی:ایک سائل

﴿جواب﴾ زید کی مذکورہ شرط بکر کو اگر منظور ہے یعنی گاڑی میں جو کام کیا ہے اس کا معاوضہ نہیں لے رہا اور زید کو تین ہزار روپے بھی دے رہا ہے تو یہ نئے سودا کی صورت ہے باہمی رضامندی سے ہو تو جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما فی الھدایه:(۳/۷۲،طبع رحمانیه)

الاقالة جائزة فی البیع بمثل الثمن الاول ——— فان شرط اکثر منه او اقل فالشرط باطل ویرد مثل الثمن الاول۔

ولما فی البدائع الصنائع:(۵/۳۰۱،طبع سعید)

ولو تبایعا عیناً بعین وتقابضا ثم هلکت احداهما فی ید مشتریها ثم تقایلا صحت الاقالة وعلی المشتری الهالک قیمة الهالک ان لم یکن له مثل ومثله ان کان له مثل فیسلمه الی صاحبه ویسترد منه العین لان کل واحد منهما مبیع علی حدة لقیام العقد کل واحد منهما ثم خرج الهالک من ان یکون قیام العقد به فیلزم بالآخر واذا بقی

المبیع بقی محل الفسخ فیصح او نقول المبیع احدهما والآخر ثمن اذ المبیع لابد له من الثمن فاذا هلک احدهما تعین الهالک للثمن والقائم للمبیع لما فیه من تصحیح العقد وفی قلب الفساد فکان تصحیح اولیٰ فبقی البیع ببقاء المبیع فاحتمل الاقالة وکذا لو تقایلا والعینان قائمتان.

ولما فی الشامی:(۱۲۹/۵ طبع:سعید)

(قوله فی المقایضة)بالیاء المثناة التحتیة :وهی بیع عین بعین کأن تبایعا عبداً بجاریة فهلک العبد فی ید بائع الجاریة ثم اقالا البیع فی الجاریة وجب رد قیمة العبد ،ولا تبطل بهلاک احدهما بعد وجودهما ،لان کل واحد منهما مبیع ،فکان المبیع قائماً.

ولما فی الشامی :(۱۲۲/۵ طبع:سعید)

(قوله فسخ فی حق المتعاقدین)هذا اذا کانت قبل القبض بالاجماع ،واما بعده فکذالک عند الامام الا اذا تعذر بان ولدت المبیعة فتبطل ،قال ابو یوسفؒ هی بیع الا اذا تعذر بان وقعت قبل القبض فی المنقول فتکون فسخاً الا اذا تعذر ایضاً بان ولدت المبیعة والاقالة قبل القبض فتبطل وقال محمدؒ :هی فسخ ان کانت بالثمن الاول او باقل ،ولو باکثر او بجنس آخر فبیع......والصحیح قول الامام کما فی تصحیح العلامة القاسم.

ولما فی فتح القدیر:(۴۵۳/۶ طبع:رشیدیه)

ولو ولدت المبیعة ثم تقایلا بطلت الاقالة عنده لان الولد مانع من الفسخ ،هذا اذا ولدت بعد القبض ،واما اذا ولدت قبله فالاقالة صحیحة عنده ،حاصله ما ذکر فی الذخیرة ان الجاریة اذا ازدادت ثم تقایلا ،فان کان قبل القبض صحت الاقالة سواء کانت الزیادة متصلة کالسمن والجمال او منفصلة کالولد والارش والعقر ،لان الزیادة قبل القبض لا تمنع الفسخ منفصلة کانت او متصلة ،وان کانت الزیادة بعد القبض ،ان کانت منفصلة فالاقالة باطلة عند ابی حنیفةؒ لا یصححها الا فسخا وقد تعذر حقاً لشرع ،وان کانت متصلة فهی صحیحة عنده لانها لا تمنع الفسخ برضاء من له الحق فی الزیادة ببطلان حقه فیها ،والتقایل دلیل الرضا فامکن تصحیحها فسخاً.

ولما فی البنایة:(۲۲۷/۱۰ طبع:حقانیة)

(ولو ولدت المبیعة ولداً ثم تقایلا فالاقالة باطلة عنده)یعنی عند ابی حنیفةؒ (لان الولد مانع من الفسخ)لاجل الزیادة،(وعندهما یکون بیعاً).

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :تنویر الرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:۳۶۷۲

﴿باہمی رضامندی سے سودا فسخ کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ میں نے ایک صاحب کو اپنی

موٹر سائیکل قسطوں پر دی، اس پر قبضہ کرتے وقت اس نے دوسو روپے بطور قسط ادا کیے لیکن کچھ دن بعد اس معاملے پر نادم ہو کر مجھ سے معاملہ فسخ کرنے کا مطالبہ کیا، میں نے بخوشی قبول کر لیا، معاملہ فسخ ہونے کے بعد پہلی ادا کردہ قسط اس نے بخوشی مجھے دیدی، نیز موٹر سائیکل میں مرمت کا کام بھی اس کی طرف سے پیدا ہو گیا تھا، کیا میرے لئے مذکورہ رقم لینا جائز ہے؟ سائل: اسرار احمد

﴿جواب﴾ باہمی رضامندی سے سودا کو فسخ کرنا جائز ہے پھر پوری رقم واپس کر دینا ضروری ہوتا ہے، البتہ خریدار بخوشی رقم چھوڑنا چاہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

لما فی الهداية:(۴/۷۲،طبع رحمانيه)

الاقالة جائزة في البيع بمثل الثمن الاول.....فان شرط أكثر منه او اقل فالشرط باطل ويرد مثل الثمن الاول.

ولما في الشامي:(۵/۱۲۴،طبع ايچ ايم سعيد)

(قوله فسخ في حق المتعاقدين)هذا اذا كانت قبل القبض بالاجماع،واما بعده فكذلك عندالامامؒ.....والصحيح قول الامامؒ كما في تصحيح العلامة قاسمؒ.

ولما في التنوير مع الدر:(۵/۱۲۵-۱۲۶،طبع ايچ ايم سعيد)

(وتصح بمثل الثمن الاول وبالسكوت عنه.....وان شرط غير جنسه او اكثر منه او الاقل)الا مع تعيبه فتكون فسخا بالاقل لو بقدر العيب لا ازيد ولا انتقص الخ.

وفي الشامية:(قوله الامع تعيبه)اى تعيب المبيع عندالمشترى فانها تصح بالاقل، ويصار المحطوط بازاء نقصان العيب قهستاني.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد غفرلہ

۲۱ صفر المظفر ۱۴۳۰ھ   فتویٰ نمبر: ۱۹۱۷

﴿لاتجوز الاقالة باقل من الثمن الاول﴾

﴿پہلی قیمت سے کم پر اقالہ کرنا ناجائز ہے﴾

﴿سوال﴾ انى تاجر بما ابيع شيئا فيرجع المشترى به بعد يوم او يومين وهو نادم وهو راض على ان ارجع بمتاعى باقل من ثمن الاول فهل يجوز لى ان اخذ ما لى واعطيه اقل من ثمن الاول؟ سائل: حاجی قدیر شاہ

﴿جواب﴾ لاتجوز الاقالة الابالثمن الاول فان شرط البائع الحط بطلت الاقالة،نعم اذا لم يشترطاه في العقد واخذ المشترى الاقل بطيب نفسه فلاباس به

وكذا ان حدث العيب في المبيع واشترط الحط في الاقالة يصح ويجعل الحط بازاء مافات بالعيب في المبيع والله اعلم.

لمافي الهداية:(۳/۷۲-۷۳،طبع رحمانيه)

الاقالة جائزه في المبيع بمثل الثمن الاول— فان شرط اكثر منه أو اقل فالشرط باطل ويرد بمثل الثمن الاول—الا ان يحدث في المبيع عيب فحينئذ جازت الاقالة بالاقل لان الحط يجعل بازاء مافات بالعيب.

ولمافي الفقه الاسلامي:(۵/۳۷۸۲،طبع رشيديه)

فعلى قول ابى حنيفةؒ تصح الاقالة بالثمن الاول ويبطل ماشرطه المتعاقدان من الزيادة او النقصان او الاجل او الجنس الآخر—الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمہ

اا ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　　فتوی نمبر: ۲۲۲۷

﴿بیع ختم کرنے والے پر جرمانے کی شرط باطل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ زید نے بکر سے ایک موٹر کار خریدی ایک موٹر سائیکل نقد اور تیس ہزار روپے مؤجل دو ماہ تک کے عوض اور دونوں نے یہ شرط لگائی کہ جو بھی بیع پر پشیمان ہوا اور ختم کرنا چاہے تو دس ہزار روپے جرمانہ دیگر بیع کو ختم کریگا ورنہ نہیں، کیا ایسی شرط لگانا جائز ہے؟ اور بیع ختم ہونے کی صورت میں اسکا پورا کرنا ضروری ہے؟ مستفتی: سیف اللہ سواتی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں زید اور بکر کا بیع کے وقت یہ شرط لگانا کہ اس بیع کو ختم کرنے کا جو بھی مطالبہ کریگا اس سے دس ہزار روپے بطور جرمانہ وصول کرنے ہونگے، یہ شرط فاسد ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں بیع منعقد ہوگئی ہے چاہیں تو اس کو قائم رکھیں اور اگر باہمی رضامندی سے فسخ کرنا چاہیں تو کمی بیشی کے بغیر فسخ کر سکتے ہیں جرمانہ وصول کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافي الهداية:(۳/۷۲،باب الاقالة،طبع رحمانيه)

الاقالة جائزة في المبيع بمثل الثمن الاول فان شرط اكثر منه او اقل فالشرط باطل ويرد بمثل الثمن الاول.

ولمافي البحر الرائق:(۶/۱۰۲،طبع سعيد)

وقوله وتصح بمثل الثمن الاول وشرط الاكثر والاقل بلاتعيب وجنس اخر لغو ولزمه الثمن الاول هذا عند ابى حنيفة لان الفسخ يرد على عين مايرد عليه العقد فاشتراط خلافه باطل ولاتبطل الاقالة كما قدمنا.

ولما في الشامي:(۱۲۲/۵ طبع سعيد)

(قوله وحكمها انها فسخ الخ)لان حكم العقد الاثر الثابت به كالملك في المبيع، واما الفسخ بمعنى الرفع فهو حقيقتها...... هذا اذا كانت قبل القبض بالاجماع، واما بعده فكذلك عند الامام الا اذا تعذر...... والصحيح قول الامام كما في تصحيح العلامة قاسم.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۲۵ ذیقعدہ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۸۱

﴿خریدار اگر بقایا ادا نہیں کر رہا تو بائع معاملہ فسخ کر سکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی زمین فروخت کی اور خریدار سے کچھ رقم ایڈوانس لے لی۔ اب اس زمین کی قیمت میں کمی ہوگئی جس کی وجہ سے خریدار بقیہ ثمن ادا کرنے میں ٹال مٹول کر رہا ہے۔ وضاحت طلب امر یہ ہے کہ آیا اس صورت میں بائع یہ معاملہ فسخ کر کے زمین کسی اور کے ہاتھ بیچ سکتا ہے اور دوسری جگہ زمین بکنے تک ایڈوانس رقم روک سکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: عبد المعز ابوبکر صدیق مسجد فیز ۲

﴿جواب﴾ مارکیٹ ریٹ میں کمی واقع ہونے کی وجہ سے خریدار کی رغبت واقعی اگر ختم ہوگئی ہے اور وہ ثمن ادا کرنے میں اب ٹال مٹول کر رہا ہے تو خریدار کا یہ عمل اس کی طرف سے معاملہ کو فسخ کرنے پر دلالت کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں اگر بائع بھی اس معاملہ سے دست بردار ہو کر فسخ کرنا چاہے تو معاملہ فسخ ہو جائیگا اور زمین کسی اور کے ہاتھ بیچنا جائز ہوگا۔ البتہ معاملہ فسخ ہو جانے کے بعد خریدار کو اس کی ایڈوانس رقم واپس کرنا ضروری ہے۔ اس کو روکنا جائز نہیں۔

لما في الهداية:(۱۵۳/۳، طبع رحمانيه)

ومن قال لآخر اشتريت مني هذه الجارية فانكر الآخر ان اجمع البائع على ترك الخصومة وسعه ان يطأها لان المشتري لما جحد كان فسخا من جهته اذ الفسخ يثبت به كما اذا تجاحدا فاذا عزم البائع على ترك الخصومة تم الفسخ

ولما في فتح القدير:(۲۰۹/۷، طبع المكتبة الرشيدية كوئته)

الوجه الثاني التزام ان الفسخ يحصل براحد وهو قوله ولانه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري فات رضا البائع فيستبد بفسخه لفوات شرط البيع وهو التراضي

ولما في الهندية:(۱۵۹/۳، طبع المكتبة الرشيدية كوئته)

ولا يصح تعليق الاقالة بالشرط بان باع ثوبا من زيد قال زيد لشتريته رخيصا فقال ان وجدت

مشتریا بالزیادة فبعه منه فوجده فباعه بازید لا ینعقد البیع الثانی کذا فی الوجیز لکردری

ولما فی شرح المجلة: (۱-۲/۲۶۲، طبع المکتبة الرشیدیة کوئٹه)

فتصرف الغیر فی مال الغیر ممنوع الا ان تکون وصایة او ولایة او تدعو ضرورة فیجوز

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعیم اللہ شیخ غفرلہ ولوالدیہ

۹ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر ۳۹۵۴

﴿اقالہ کی صورت میں مبیع پر قبضہ کئے بغیر دوسرے کو بیچنا صحیح نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی نے ادھار ایک بکری خریدی اور اس پر قبضہ بھی کیا، پھر ایک دن بعد بائع کو کہا کہ میں بکری نہیں خریدتا اب تک بکری مشتری کے پاس ہے۔ عرض مسئلہ یہ ہے کہ بائع کیلئے اس بکری کا کسی دوسرے پر بیچنا صحیح ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مسلمان کے قول میں بڑا وزن ہے، ایجاب وقبول سے سودا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بائع کی ملکیت سے مبیع نکل جاتی ہے مشتری اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ اور اس کا عوض یعنی طے شدہ ثمن مشتری کے ذمہ واجب ہو جاتا ہے، بائع ومشتری میں سے کسی کو بھی اپنی زبان سے پھیرنے کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ البتہ مبیع میں کوئی پوشیدہ عیب تھا جسکی بعد میں مشتری کو خبر ہوئی۔ یا اس نے پہلے سے خیار شرط کے ساتھ سودا کیا تھا تو عیب کی وجہ سے اسی طرح خیار شرط کی وجہ سے سودے سے انکار کرنے کا اسے اختیار رہتا ہے۔

مذکورہ صورت میں مشتری نے پہلے سے خیار شرط کے بغیر چونکہ بکری خریدی ہے اور بکری میں کسی عیب کے ظاہر ہونے کا بھی کوئی دعویٰ نہیں کرتا لہذا بائع کی رضامندی کے بغیر وہ بکری واپس نہیں کر سکتا، ثمن ادا کرنا اس کے ذمہ ہے: البتہ بائع ومشتری کی باہمی رضامندی سے سودا فسخ ہو سکتا ہے۔

مشتری نے کہدیا ہے کہ میں بکری نہیں لیتا صرف اس کے کہنے سے سودا فسخ نہیں ہوتا، ہاں بائع کو بھی منظور ہو تو سودا فسخ ہو جائے گا، پھر بائع بکری واپس اپنے قبضے میں لے لے اور اس کے بعد وہ چاہے تو کسی اور کو فروخت کر سکتا ہے اپنے قبضہ میں واپس لئے بغیر کسی اور کو فروخت نہیں کر سکتا اسلئے کہ اقالہ (فسخ بیع) میں جب تیسرے شخص سے سودا ہو تو اس کے حق میں ان کا اقالہ بیع جدید ہے گویا بائع نے واپس وہ بکری اسی قیمت پر خرید لی اور خریدار جب تک منقولہ چیز پر قبضہ نہیں کرتا اس چیز کو آگے نہیں بیچ سکتا۔

لما فی الهداية:(۳/۱۹،۲۰،طبع رحمانیه لاهور)

البیع ینعقد بالایجاب والقبول اذا كانا بلفظ الماضی واذاحصل الایجاب والقبول لزم البیع (ويثبت الملك لكل واحد منهما)ولا خيار لواحد منهما الامن عيب اوعدم رؤية.

ولما فی الهداية:(۳/۲۲،طبع رحمانیه،لاهور)

واذااطلع المشتری علی عیب فی المبیع فهوبالخیاران شاء اخذه بجمیع الثمن وان شاء رده.

وفیه ایضا:(۳/۲۳،طبع رحمانیه،لاهور)

ومن شرط له الخیارفله ان یفسخ فی مدة الخیار وله ان یجیزفان اجاز بغیرحضرة صاحبه جاز وان فسخ لم یجز الاان یکون الآخرحاضراً.

وفیه ایضا:(۳/۴۷،طبع رحمانیه،لاهور)

لان العقد حقهمافيملكان رفعه دفعاًلحاجتهما.

ولما فی الهندية:(۳/۱۴،طبع:قدیمی)

واذاعرفت المبیع والثمن فنقول من حکم المبیع اذا کان منقولا أن لا یجوز بیعه قبل القبض،وفیه ایضا علی صفح۱۵، وهو نظیر ما اذا قضی القاضی برد العبد المشتری بالعیب علی البائع فلم یقبضه البائع حتی باعه ان باعه من المشتری یجوز وان باعه عن غیره لا یجوز کذا فی الذخیرة.

ولما فی الدر المختار:(۵/۱۲۰، طبع سعید)

وفی السراجیة لا بد (أی فی الاقالة) من التسلیم والقبض من الجانبین

ولما فی التنویر مع الدر والرد:(۵/۱۲۶،۱۲۷)

(و)الرابع (جازللبائع بیع المبیع منه)ثانیا بعدها (قبل قبضه)ولو کان بیعا فی حقهما لبطل کبیعه من غیر المشتری عینی.(قوله والرابع) صورته باع زید من عمرو شیئا منقولا کثوب، وقبضه ثم تقایلا ثم باعه زید ثانیا من عمرو قبل قبضه منه جاز البیع لأن الاقالة فسخ فی حقهما، فقد عاد الی البائع ملکه السابق فلم یکن بائعا ما شراه قبل قبضه،(قوله کبیعه من غیر المشتری)أی کما لو باعه البائع المذکور من غیر المشتری قبل قبضه من المشتری فیفسد للبیع لکون الاقالة بیعا جدیدافی حق ثالث: فصار بائعا ما شراه قبل قبضه...

وفیه ایضا علی صفح(۱۲۷، (و)انما(هی بیع فی حق ثالث)أی لو بعد القبض بلفظ الاقالة فلو قبله فهی فسخ فی حق الکل فی غیر العقار (قوله فی غیر العقار) أی فی المنقول لأنه لا یجوز بیعه قبل قبضه.

واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق سواتی

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۱۳۶۹

۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ

﴿باب القرض و الرباء﴾

﴿بیمہ زندگی کی شرعی حیثیت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ بیمہ زندگی کی شرعی حیثیت کیا ہے قرآن وسنت کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟　　مستفتی: شاہد حنیف صاحب

﴿جواب﴾ بیمہ زندگی ناجائز اور حرام ہے۔ حرام ہونے کی بنیادی دو وجوہات ہیں (۱) ربا یعنی سود (۲) قمار یعنی جوا ربا (سود) تو ہر صورت میں موجود ہے، البتہ قمار اس وقت آتا ہے جب متعینہ مدت سے پہلے کوئی حادثہ اور نقصان پیش آجائے اور قسطیں پوری نہ ادا کی ہوں، اس کو فقہاء کرام کی اصطلاح میں "تملیک علی الخطر" سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ ایک طرف سے ادائیگی واقعی اور یقینی ہو لیکن واپسی واقعی اور یقینی نہ ہو، ہوسکتا ہے مل جائیں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نہ ملیں۔ بہرحال انشورنس (بیمہ) کی تمام صورتوں میں ربا (سود) تو لازم آتا ہے اور کبھی قمار بھی، اس لیے انشورنس کی تمام صورتیں ناجائز اور حرام ہیں۔

لما فی قوله وتعالی:(ال عمران ۱۳۰)﴿یایها الذین امنوا لا تاکلوا الربوٰا اضعافا مضعف﴾
وقوله تبارك و تعالی:(سورة المائدة آیت نمبر ۹۰)
یایها الذین امنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان......
ولما فی الصحیح لمسلم:(۲۷/۲، طبع قدیمی)
عن جابرؓ قال:لعن رسول الله ﷺ اکل الربوا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال هم سواء
ولما فی جامع الترمذی:(۱۲۵/۱، طبع فاروقی کتب خانه)
عن ابن مسعودؓ قال:لعن رسول الله ﷺ اکل الربوا وموکله وشاهدیه وکاتبه
ولما فی رد المختار:(۴۰۳/۶ طبع: سعید)
(قوله لانه یصیر قمارا) لان القمار من القمر الذی یزداد تارة وینقص اخری وسمی القمار قمارا لان کل واحد من المقامرین ممن یجوز ان یذهب ماله الی صاحبه ویجوز ان یستفید مال صاحبه وهو حرام بالنص.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اکمی غفرلہ ولوالدیہ

۳ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ　　فتویٰ نمبر: ۳۲۹۳

﴿پراویڈنٹ فنڈ پر جو زائد رقم ملتی ہے وہ سود نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سرکاری ملازمین سے

تنخواہوں میں سے کچھ رقم سرکاری ادارہ ملازمین کی مرضی معلوم کئے بغیر کاٹتا ہے اگر ملازم چاہے کہ یہ رقم نہ کاٹی جائے پھر بھی کاٹی جاتی ہے، پھر ملازم کو ریٹائرمنٹ پر اسطرح ملتی ہے کہ حکومت کچھ رقم اپنی طرف سے اصل رقم کے علاوہ ملا کر دیتی ہے اور اسکو منافع کا نام دیتی ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ منافع کی وہ رقم جو حکومت اپنی طرف سے (اصل رقم کے علاوہ) دیتی ہے آیا یہ سود کی مد میں شامل؟ اور اسکا لینا ملازم کیلئے جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ صورت مسؤلہ میں جو رقم ملازم کی تنخواہ سے اسکی رضامندی کے بغیر کاٹی جاتی ہے ہو وہ درحقیقت ملازم کی خدمات کا معاوضہ ہے جو ابھی تک اس نے وصول نہیں کیا لہذا یہ ادارہ کے ذمہ ملازم کا دین ہے جب تک ملازم خود یا اپنے وکیل کے ذریعے اسپر قبضہ نہ کرلے وہ اس مال کا مالک نہیں اور نہ ہی فی الحال اسمیں ملازم کے تصرفات نافذ ہیں بلکہ اسکو صرف مطالبہ ادائیگی کا حق حاصل ہے اور فی الحال ادارہ اس مال کے ساتھ جو بھی معاملہ کر رہا ہے اپنی ملک میں کر رہا ہے ملازم کا اسکے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور ادارہ کے تمام معاملات کی ذمہ داری خود ادارہ پر ہی عائد ہوتی ہے ملازم پر نہیں اسلئے کہ یہ تصرفات نہ ملازم کے مال مملوک میں ہیں اور نہ ہی ان میں ادارہ ملازم کا وکیل ہے، لہذا جس وقت سرکاری ادارہ اپنا یہ واجب الاداء دین ادا کرتا ہے اور اسمیں کچھ اپنے طرف سے ملا کر دیتا ہے تو یہ بھی ادارہ کا اپنا یکطرفہ عمل ہے کیونکہ اول تو ملازم نے اس زیادتی ملانے کا حکم نہیں دیا تھا اور اگر دیا بھی ہوتا تو وہ شرعاً غیر معتبر تھا، لہذا جو رقم ادارہ کیطرف سے زائد ملتی ہے چاہے ادارہ اسکو جو بھی نام دے اسپر شرعی اعتبار سے سود کی تعریف صادق نہیں آتی گویا ادارہ اپنی طرف سے بجائے خاص اجرت کے اضافی اجرت دے رہا ہے لہذا اسکا لینا جائز ہے۔

مأخوذ از: (پراویڈنٹ فنڈ پر سود و زکوۃ کا مسئلہ) مؤلفہ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۱ ذی القعدۃ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۶۷

﴿پرائز بونڈ اسکیم سود جوئے پر مشتمل اسکیم ہے﴾

﴿سوال﴾ مفتی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، سلام مسنون کے بعد یہ پوچھنا

چاہتا ہوں کہ پرائز بونڈز کا شرعی حکم کیا ہے؟ اور جب پرائز بونڈز کا انعام کسی کا نکل آئے تو اس رقم کا کیا حکم ہے؟ یہ بونڈز استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ اگر استعمال نہیں کرسکتا تو اس رقم کا مصرف کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

مستفتی: حافظ کلیم اللہ بنوں

﴿جواب﴾ پرائز بونڈز اسکیم سود جوئے پر مشتمل اسکیم ہے۔ اسپر حاصل ہونے والی رقم کو اگر چہ یہ لوگ انعام کا نام دیتے ہیں لیکن یہ کوئی انعام نہیں ہے۔ شرعا یہ انعام کا حکم نہیں رکھتا لہذا اس سے بچنا ضروری ہے چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فتاویٰ عثمانی میں تحریر فرماتے ہیں "مروجہ انعامی بونڈز پر جو انعام ملتا ہے تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس میں سود کو قمار کے ذریعے تقسیم کیا جاتا ہے۔ لہذا یہ انعام وصول کرنا شرعا حرام ہے، البتہ اگر کوئی رقم اسطرح غلطی سے وصول کرلی گئی ہو تو اسے بغیر نیت ثواب کے صدقہ کردینا ضروری ہے۔ اور صدقہ ایسا ہے کہ اپنے مستحق قریبی رشتہ داروں کو بھی دیا جاسکتا ہے" (ج ۳/۱۷۵)

قال الله تعالى البقرة:(۲۷۵):﴿واحل الله البيع وحرم الربوا﴾

آل عمران (۱۳)﴿يايها الذين امنوا لاتاكلوا الربوا اضعافا مضاعفة﴾

ولما فى صحيح المسلم (۲/۱۱۷ طبع قديمى)

لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم أكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه و قال هم سواء

وفى الدر المختار (ج۵/۱۸۶ سعيد):ولا ربوا بين حربى ومسلم وذمى

وفى رد المحتار :احترز بالحربى عن المسلم الاصلى والذمى وكذا عن المسلم الحربى.

(سورة المائدة:۹):يآيها الذين امنوا انما الخمر والميسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشيطن فاجتنبوه لعلكم تفلحون.

(فى تفسير ابن كثير ج۲/۹۱):كل شئى من القمار فهو من الميسر حتى لعب الصبيان بالجو.

ولما فى الدر المختار مع رد المحتار:(۵/۱۶۸ باب الربا سعيد)

هو فضل خال عن عوض بمعيار شرعى مشروط لاحد المتعاقدين فى المعاوضة

ولما فى الدر المختار:(۵/۸۵ باب الربا سعيد):

لان سبيل الكسب الخبيث التصدق اذا تعذر الرد على صاحبه

(ولما فى القواعد الفقه ص:۱۱۵)ويتصدق بلانية الثواب وينوى به براءة الذمة

فى مجموعه قواعد الفقه (ص ۱۹۴)والانعام بلا كسر عرفا الارض التى اعطاها السلطان اونائبه

لما فى بحوث فى قضايا فقهية معاصرة(ج۲/):

الجائزة التى تمنح بدون التزام او وعد سابق :مثل ان ينجح طالب فى امتحان فيطمى

جائزة من اساتذة، او احد اقاربه، وغيرهم بعد لنجاحه، بدون ان يكون التزام بذلك في وعد سابق، وهذا تبرع وهبة بدون اى شك، ولا شبهة في حلتها.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ عفی عنہ

۱۳ صفر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۹۶

﴿قرض کیساتھ شرط لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میں ہرات میں کاروبار کرتا ہوں ایک دفعہ میں نے ایک شخص کو دس (۱۰) لاکھ روپے بطور قرض دیئے اور شرط لگائی کہ اپنے شہر میں آپ سے وصول کرونگا اور میرا مقصد راستے کے خطرات سے بچنا تھا جبکہ اس سے پہلے میں نے ایسا معاملہ نہیں کیا تھا اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس طرح قرض دینا درست ہے؟

﴿جواب﴾ قرض دینے کی احادیث میں بڑی فضیلت آئی ہے بشرطیکہ خیر خواہی اور احسان کی بنیاد پر ہو قرض دینے والا کسی دنیاوی فائدہ اور نفع حاصل کرنے کی غرض سے نہ دے، مذکورہ صورت میں اگرچہ ظاہری نفع حاصل کرنا نہیں ہے لیکن راستے کے خطرات سے بچنا بھی ایک گونہ نفع ہے شرعی اصطلاح میں اس کو "سفاتج" کہتے ہیں فقہاء کرام نے اسکو مکروہ لکھا ہے۔

لما في مصنف ابن ابي شيبه: (۸۰/۵ طبع امداديه)

حدثنا أبوبكر قال حدثنا حفص عن أشعث عن الحكم قال كل قرض جر منفعة فهو ربا.

ولما في الهداية: (۱۲۸/۳ طبع رحمانيه)

قال ويكره السفاتج وهى قرض استفاد به المقرض سقوط خطر الطريق وهذا نوع نفع استفيد به وقد نهى رسول الله عليه السلام عن قرض جر نفعا.

ولما في النهر الفائق: (۵۱۱/۳ طبع قديمي)

(وكره السفاتج)...... وهو قرض استفاد به المقرض سقوط خطر الطريق بأن يقرض ماله عند الخوف عليه يرد عليه في موضع آمن لأنه ﷺ "نهى عن قرض جر نفعا"

ولما في الفقه الاسلامي وادلته: (۴۲۰۵/۶ طبع رشيديه)

وهى ان يدفع امرؤ الى تاجر مبلغا قرضا ليدفعه الى صديقه في بلد آخر ليستفيد به سقوط خطر الطريق وهذا مكروه تحريما عند الحنفية قرض استفاد به المقرض أمن خطر الطريق وهو نفع من النفع المستفاد على حساب المقرض فقد نهى رسول الله ﷺ عن قرض جر نفعا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز اللہ آغا جنی

۱۹ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۳۵

﴿بنے ہوئے زیورات کا تبادلہ خالص سونے کے ساتھ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سیلز مین ہمارے پاس پانچ تولہ سونے کے بنے ہوئے زیورات لاتے ہیں اس کے بدلے ہم اس کو چار تولہ خالص سونے کی ڈھلی دیتے ہیں تو آیا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ اس سے ہم مزدوری بھی نہیں لیتے۔

مستفتی: قذافی صراف ٹوبہ ٹیک سنگھ پنجاب

﴿جواب﴾ سونے کی بیع سونے کی عوض ہو یا چاندی کی بیع چاندی کے عوض ہو تو اس میں برابری اور جدا ہونے سے پہلے پہلے دونوں طرف سے قبضہ کرنا شرط ہے چاہے ایک طرف سے بنے ہوئے زیورات ہوں اور دوسری طرف سے خالص سونے کی ڈھلی، لہذا صورت مسؤلہ میں چونکہ برابری نہیں ہے اس لیے یہ سودی معاملہ ہے اور ناجائز ہے۔

لما فی الھندیہ: (۲۱۸/۳ طبع رشیدیہ)

ولا یجوز بیع الذهب بالذهب والفضة بالفضة الا مثلاً بمثل تبرا کان أو مصوغاً أو مضروباً ...واذا کان الغالب علی الدراهم الفضة فهی فضة وان کان الغالب علی الدنانیر الذهب فهی ذهب ویعتبر فیها من تحریم التفاضل ما یعتبر فی الجیاد حتی لا یجوز بیع الخالصة بها ولا بیع بعضها الا متساویاً فی الوزن۔

ولما فی بدائع الصنائع: (۱۹۶/۵ طبع سعید)

الدراهم المضروبة اقسام ثلثة اما ان تکون الفضة فیها هی الغالبة ...بان کان ثلثاها فضة وثلثها صفرا أو کانت ثلاثة اربا عها فضة وربعها صفرا او نحو ذلک فحکمها حکم الفضة الخالصة لایجوز بیعها بالفضة الخالصة الا سواء بسواء وکذا بیع بعضها ببعض لایجوز الامثلا بمثل لان اعتبار الغالب ...ولان الدراهم الجیاد لاتخلو عن قلیل غش لان الفضة لا تنطبع بدونه فکان قلیل الغش مما لایمکن التحرز عنه فکانت العبرة للغلبة.

ولما فی الھدایہ: (۱۱۱/۳، کتاب الصرف، طبع رحمانیہ)

فان باع فضة بفضة او ذهبا بذهب لایجوز الا مثلا بمثل وان اختلفت فی الجودة والصیاغة لقوله علیه السلام "الذهب بالذهب مثلا بمثل وزناً بوزن یداً بید والفضل ربوا" ولا بد من قبض العوضین قبل الافتراق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۲۳ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ

فتویٰ نمبر: ۳۸۱۶

﴿قرض پر زکوٰۃ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے خالد سے قرض کا مطالبہ کیا خالد اس شرط پر قرضہ دینے پر راضی ہوا کہ اس قرض پر جو بھی زکوٰۃ آئیگی وہ آپ اپنے مال سے ادا کریں گے ،زید اس پر راضی ہوا، تو اسطرح معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ قرض کا معاملہ محض احسان اور ثواب کی بنیاد پر ہو تو شرعاً پسندیدہ اور بڑے اجر کا باعث ہوتا ہے دنیاوی مفاد حاصل کرنے کی غرض سے اگر کسی کو قرض دیدیا تو ثواب نہیں ملیگا۔

اور باقاعدہ کوئی نفع حاصل کرنا عقد میں شرطاً اگر قرار دیا تو سودی معاملہ ہو جاتا ہے جو کہ حرام ہے لہٰذا زید اور خالد نے واقعی ایسا معاملہ اگر کیا ہے تو یہ عقد ناجائز واجب الفسخ ہے۔

لما فی الدر المختار:(۱۶۶/۵ مطبع سعید)

وفی الخلاصة القرض بالشرط حرام والشرط لغو بأن يقرض اى يكتب به الى بلد كذا ليوفى دينه وفى الاشباه كل قرض جر نفعا فهو حرام

وفى الشامية قوله كل قرض جر نفعا فهو حرام)اى اذا كان مشروطا كما علم مما نقله عن البحر وعن الخلاصة وفى الذخيرة وان لم يكن النفع مشروطا فى القرض فعلى قول الكرخى لا بأس به

ولما فى خلاصة الفتاوى:(۱۰۳/۲ مطبع رشیدیہ)

وفى صرف الاصل لا بأس بقبول هدية الغريم واجابة دعوته مالم يشترط وكذا انقضى اجود من دراهمه اودونها ورضى بها ولو شرط لم يجز

وايضا فى الفتاوى الخانية الموضوع بهامش الهندية:(۲۵۲/۲ مطبع رشیدیہ)

ولو ان رجلا استقرض الدراهم المكسرة على ان يؤدى صحاحا كان باطلا وكان عليه مثل ماقبض

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: سمیع الرحمٰن دیروی

۲۸ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ	فتویٰ نمبر: ۳۴۶۳

﴿دین کا کچھ حصہ وقت کے بدلے میں معاف کرنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید پر بکر کا قرضہ تھا یا دین تھا قرضہ وصولی کی جو تاریخ مقرر تھی وہ پوری ہوگئی اور کافی دن ہوگئے اب بکر مطالبہ کر رہا ہے اور زید کے پاس پیسے نہیں ہیں زید کے پاس ایک گاڑی ہے جسکی قیمت ایک لاکھ روپے ہے لیکن

ایمرجنسی میں اگر فروخت کرنا چاہے تو اسی ہزار مل رہے ہیں بکر کہہ رہا ہے دس ہزار کا نقصان میں برداشت کروں گا اور دس ہزار کا نقصان آپ برداشت کرے کیا اس طرح جائز ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت ابراء عن الدین کی ہے اور ابراء عن الدین جب معلق بشرط نہ ہو تو جائز ہوتا ہے لھذا مذکورہ صورت میں اگر واجب الذمہ قرض ہے تو ہر وقت مطالبہ کرسکتا ہے اگرچہ قرض دیتے وقت ایک تاریخ مقرر ہوئی تھی اداء کرنا لازمی ہے اور اگر دین ہے تو پھر بھی چونکہ ادائیگی کا وقت گزر چکا ہے اس لئے ادا کرنا لازمی ہے اور بکر کا نقصان برداشت کرنا اس کی طرف سے احسان ہوگا گویا کہ زید کو دین کے ایک حصہ سے بری کر رہا ہے لہذہ یہ کوئی معاوضہ نہیں ہے ہاں دین کی صورت میں اگر وصولی کا وقت پورا نہ ہو تو یہ ابراء عن الدین معلق بشرط ہو جائے گا اور معاوضہ کی صورت ہو جائیگی بکر کی طرف سے اسقاط دین ہوگا اور اس کے معاوضے میں زید کی طرف سے اسقاط اجل ہوگا یہ چونکہ موجب ربا ہے اس لئے ناجائز اور حرام ہے۔

لما فی الهداية۳/۲۲۹ طبع قديمی

هبة الدين ممن عليه الدين جائزة قياسا واستحسانا وهبة الدين من غير من عليه دين جائزة اذا امره بقبضه استحسانا كذا فی التتارخانية هبة الدين ممن عليه الدين وابرائه يتم من غير قبول من المديون ويرتد برده ذكره عامة المشائخ رحمهم الله تعالى وهو المختار

وكذا فی البناية شرح الهداية۱۲/ ۵۲ طبع رحمانية

ولما فی تنوير الابصار۵/ ۲۴۰ طبع سعيد

قال اد الی خمس مائة غدا من الف لی عليک على انک بری من الباقی فتقبل بری وان لم يرد ذلک فی الغد عاد دينه

ولما فی الشامية على هذه الصفحة

لو قال ابراتک عن الخمسة على ان تدفع الخمسة حالة ان كانت العشرة حالة صح الابراء لان اداء الخمسة يجب عليه حالا فلا يكون هذا التعليق الابراء بشرط تعجيل الخمسة ولو موجلة بطل الابراء اذا لم يعطه الخمسة

ولما فی التنوير مع الدر۵/ ۲۳۹، ۲۴۰ طبع سعيد

ولا يصح (الصلح) عن دراهم على دنانير موجلة او عن الف موجل على نصفه حالا او عن الف سود على نصفه بيضا وفی الشرح والاصل ان الاحسان ان وجد من الداين فاسقاط وان منهما فمعاوضة وفی الشامية (قوله فمعاوضة) ای ويجری فيه حكمها فان تحقق الربا او شبهته فسدت والا صحت. قال ان وجد الاحسان من الدائن: بان صالح على الشی هو ادون من

حقه قدرا اووصفا اووقتا،وان منفيا اى من الدائن والمديون بان دخل فى الصلح ما لا يستحقه الدائن من وصف كالبيض بدل السود .او ما هو فى معنى الوصف كتعجيل المؤجل او عن جنس بخلاف جنسه

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شفقت اللہ

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۱۰۲

﴿گندم بطور قرض لینے دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے ہاں گندم کے کاشت کے زمانے میں لوگ ایک دوسرے سے گندم کی بوری قرض لے لیتے ہیں، قرض خواہ اور مقروض کے درمیان یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ گندم کی کٹائی کے بعد قرض خواہ اپنی ایک بوری گندم واپس لے لے گا، کیا شریعت کی رو سے یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: زین اللہ تورہ شاہ ضلع پشین

﴿جواب﴾ آپ کے علاقے میں گندم کی کٹائی تک بطور قرض گندم لینے دینے کا رائج معاملہ شرعاً درست ہے اس میں کوئی خرابی نہیں ہے، البتہ قرض دینے والے کو حق حاصل ہے وہ چاہے تو کٹائی سے پہلے بھی مطالبہ کرسکتا ہے اگر چہ کٹائی کے بعد واپس لینا طے ہوا تھا، اس لئے کہ قرض کے معاملہ میں مدت مقرر کرنے کا اعتبار نہیں ہوتا۔

ولما فی الهداية:(۸۳/۳،طبع رحمانيه)

واذاوجداحرم التفاضل والنساء واذاوجدأحدهماوعدم الأخرحل التفاضل وحرم النساء

ولما فی التنويرمع الرد:(۱۶۱/۵،طبع سعيد)(وصح القرض فى مثلى لافى غيره)

وفی الشامية:(قوله فى مثلى)كالمكيل والموزون والمعدودالمتقارب كالجوزوالبيض.

ولما فی الهندية:(۲۰۲/۳،طبع رشيديه)

وفي التجريد ولوأقرض مؤجلاًأوشرط التأجيل بعدالقرض فالأجل باطل والمال حال---ولافرق بين أن يؤجل قبل استهلاك القرض أوبعده".

ولما فی دررالحكام:(۸۲/۳-۸۳،طبع ماجديه كوئٹه)

وقال أحدلآخر:أعطنى خمس كيلات حنطة على أن أودى لك مثلهابعد،وأعطاه كان هذا العقدقرضاويكون هذاالعقدبيعاًحتى لوكان بيعاًفهوغيرجائزلأنه ربا--- لايبطل القرض بالشروط الفاسدة ويكون الشرط المذكورلغواً.

ولما فی الشامی:(۱۵۸/۵،طبع سعيد)

قوله(فلايلزم تأجيله)أى أنه يصح تأجيله مع كونه غيرلازم فللمقرض الرجوع عنه.

ولما فی البدائع:(۲۹۶/۷،طبع سعید)

والأجل لایلزم فی القرض سواء کان مشروطا فی العقد أو متاخرا عنہ بخلاف سائر الدیون۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عبدالباری پشینی

۱۲ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ   فتویٰ نمبر: ۲۹۷۸

﴿قومی بچت اسکیم کے نفع کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک بیوہ خاتون ہوں، میری کمائی کا کوئی ذریعہ نہیں سوائے اس کے کہ میں نے کچھ رقم ''قومی بچت'' سیونگ سینٹر میں جمع کروائی ہے اور وہاں سے مجھے فکسڈ نفع ملتا رہتا ہے جبکہ میرے بھائی وغیرہ اسے سود قرار دے کر نہ تو میرے ہاں آتے ہیں اور اگر کبھی آئے بھی تو بغیر کچھ کھائے پیئے چلے جاتے ہیں اور ان کا یہ عمل محض اس وجہ سے ہے کہ میں سودی رقم استعمال کر رہی ہوں۔

لہٰذا اب آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنی تھی کہ کیا مجھے ملنے والا نفع واقعی سود ہے اور اگر ہے تو کیا اس آمدنی سے لین دین جائز ہے کہ نہیں اور کیا اس کے مقابلے میں کوئی اسلامی ذریعہ ہے جسے اختیار کر کے مجھے بھی نفع ملتا رہے اور حلال بھی ہو، براہ کرم مذکورہ سوالات کا جواب عنایت فرما کر مشکور و ممنون فرمائیں۔   مستفتیہ: ایک خاتون بتوسط صغیر جنرل اسٹور ڈیفنس فیز ۲

﴿جواب﴾ آپکے بھائیوں کا رویہ غلط نہیں ہے، آپ قومی بچت یعنی سود سے اگر ان کو کھلاتی ہیں تو ایمان کا تقاضہ ہے کہ حرام مال کھانے سے پرہیز کریں، البتہ آپکے بھائیوں کا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ آپکی رقم اپنی نگرانی میں کسی دیانتدار، تجربہ کار آدمی کو یا وہ لوگ خود اگر کر سکتے ہوں تو مضاربت پر یہ رقم تجارت میں لگائیں جس سے حلال کمائی آئے گی، قومی بچت اسکیم سے انشاءاللہ زیادہ ملے گا برکت بھی ہوگی، آپ بھائیوں سے اس کی درخواست کرلیں اور مسائل کی تفصیل کی ضرورت اگر پیش ہوئی تو رہنمائی کے لئے دوبارہ رجوع کرلیں۔

لما فی قولہ تعالیٰ:(سورۃ البقرۃ،پارہ ۳،آیت ۲۷۵) احل اللہ البیع وحرم الربوا...الآیۃ.

ولما فی الصحیح لمسلم:(۲۷/۲،طبع قدیمی)

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال وھم سواء

ولما فی المظھری:(۳۹۹/۱،طبع رشیدیہ)

الربوا فی اللغۃ الزیادۃ قال اللہ تعالیٰ ویربی الصدقات والمعنی ان اللہ تعالی حرم

الزیادۃ فی القرض علی القدر المدفوع والزیادۃ فی البیع لاحد البدلین.

ولمافی التنویر مع الدر:(۵/۶۴۵-۶۴۶،کتاب المضاربۃ،طبع سعید)

(ھی)لغۃ مفاعلۃ من الضرب فی الارض وھو السیر فیھا وشرعا(عقد شرکۃ فی الربح بمال من جانب)رب المال (وعمل من جانب)المضارب(ورکنھا الایجاب والقبول)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفااللہ عنہ

۵ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:

﴿وزیر اعظم لون یوتھ اسکیم سے قرضہ لینا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک غریب آدمی ہوں اور میرے پاس کاروبار چلانے کیلئے ذاتی کوئی رقم نہیں ہے،لیکن اج کل وزیراعظم پاکستان نے نوجوانوں کیلئے قرضہ دینے کا حکم جاری کیا ہے اور اس کو یوتھ وزیراعظم پروگرام کا نام دیا جا۔ہا ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ اس قرضہ کو لے سکتا ہوں یا نہیں کیونکہ میرے بعض دوست علماء وطلباء ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اسکیں سود ہے؟

﴿جواب﴾ وزیراعظم صاحب کے اس پروگرام کے بارے میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہ ایک سال تک اس پر کوئی سود نہیں لیں گے اور ایک سال کے دوران اگر قرضہ نہیں لوٹایا تو ایک خاص مقدار تک ہر ماہ اس پر سود لگتا جائیگا۔قرضہ لینے والے سے اس معاہدہ پر باقاعدہ دستخط لئے جاتے ہیں اس لئے یہ معاہدہ بلاشبہ سودی معاملہ ہے جسکی شرعا کوئی گنجائش نہیں ہے۔عملی طور پر سود لینے دینے کی نوبت اگرچہ نہ آئے تب بھی سودی معاملہ ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔

(لمافی قولہ تعالی سورۃ البقرۃ مایت ۲۷۵)﴿واحل اللہ البیع وحرم الربوا۔۔۔الخ﴾

(لمافی المظھری:ج۱/۳۹۹رشیدیہ)

الربوا فی اللغۃ الزیادۃ قال اللہ تعالی ویربی الصدقات والمعنی ان اللہ تعالی حرم الزیادۃ فی القرض علی القدر المدفوع والزیادۃ فی البیع لاحد البدلین.

(لمافی المشکوٰۃ:ج۲/۲۴۴).

عن جابرؓ قال لعن رسول ﷺ اکل الربوا ومؤکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء

(لاحکام القرآن للجصاص:ج۱/۶۳۹)

فمن الربا ماھو بیع ومنہ مالیس ببیع وھو ربا أھل الجاھلیۃ وقرض المشروط فیہ الأجل وزیادۃ مال علی المستقرض

(بدائع الصنائع کتاب القرض:(۱۰/۵۹۷،۵۹۸، طبع بیروت)

لما الذی یرجع الی نفس القرض فهو أن یکون فیه جر منفعة فان کان لم یجز نحو ما اذا اقرضه دارهم غلة علی ان یر د علیه صحاحا او اقرضه وشرط شرطا له فیه منفعة لما روی عن رسول الله ﷺ انه نهی عن قرض جر نفعا، ولان الزیادة المشروطة تشبه الربا، لانها فضل لا یقابله عوض والتحرز عن حقیقة الربا وعن شبهة الربا واجب.

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ عفر لہ ولوالدیہ

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر ۲۰۱۵

﴿قرض کی واپسی میں پیسوں کی قیمت کے اتار چڑھاؤ کا اعتبار نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے عمرو کو کئی سال پہلے کچھ پیسے قرض دیئے تھے، اب جب عمرو واپس دے رہا ہے تو زید زیادہ پیسوں کا مطالبہ کر رہا ہے، اور کہہ رہا ہے کہ جس وقت میں نے دیئے تھے اس وقت پیسے کی قیمت زیادہ تھی اب کم ہوگئی، لہذا پیسے زیادہ دو، اب پوچھنا یہ ہے کہ زید کے لئے زیادہ لینا اور عمرو کے لئے زید کو زیادہ پیسے دینا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ قرض کی صورت میں جتنی رقم کسی کے ذمہ واجب الاداء ہوتی ہے اتنی ہی رقم صاحب حق کو واپس کرنا ضروری ہوتا ہے، اس میں مارکیٹ کے ریٹ کے اتار چڑھاؤ کا کوئی اعتبار نہیں اور نہ ہی قرض دینے والے کی طرف سے زیادتی کا مطالبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہے، لہذا مسئولہ صورت میں زید نے عمرو کو جتنی رقم دی تھی اتنی ہی واپس لے اور زیادتی کا مطالبہ نہ کرے، البتہ عمرو اگر اپنی طرف سے زیادہ دے تو بہتر ہے۔

لما فی قوله تعالی:(البقرة، آیت ۲۷۹)﴿وان تبتم فلكم رؤس أموالكم لاتظلمون ولاتظلمون﴾

ولما فی روح المعانی:(۳/۷۲، طبع رشیدیه)

(فلكم رؤس اموالكم)تاخذونها لا غیر (لاتظلمون)غرماءكم باخذ الزیادة.

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته:(۵/۳۷۹، طبع رشیدیه)

ای لاتظلمون باخذ زیادة علی رأس المال بل لكم ما دفعتم من غیر زیادة ولا نقصان وفیه ایضا (ص ۳۸۶)هو عقد مخصوص یرد علی دفع مال مثلی لآخر لیرد مثله.

ولما فی التنویر مع الدر:(۵/۱۶۲، طبع سعید)

(استقرض من الفلوس الرائجة والعدالی فكسدت فعلیه مثلها كاسدة

لاقیمتها)......فلا عبرة بغلانه ورخصه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: ذیشان احمد ملازئی

۲۷ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ   فتویٰ نمبر: ۲۸۱۶

﴿بینک کی ملازمت حرام کیوں ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ علماء حضرات سے سنا ہے کہ سودی بینک میں ملازمت کرنے والوں کی تنخواہ حرام ہے حالانکہ یہ انکی اپنی محنت اور پسینے کی کمائی ہوتی ہے، جو انکو تنخواہ وغیرہ کی صورت میں ملتی ہے، اس میں حرمت کی وجہ کیا ہے؟ یہ تو بالکل دوسری ملازمتوں کی طرح ایک ملازمت ہے اگر قرآن وحدیث میں اسکی حرمت کی کوئی دلیل ہو تو بیان فرمادیں۔

مستفتی: یحیی ڈیفنس

﴿جواب﴾ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بینک کے معاملات سودی ہوتے ہیں جو کہ حرام ہیں اور حرام کام میں معاون ومددگار بننا بھی حرام ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ: المائدة،(آیت ۲)

﴿وتعاونوا علی البر والتقوی ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان﴾

ترجمہ: اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر۔

بینک ملازم کا تعاون تو ظاہر ہے بلکہ بینک کا نائب بن کر ملازم ہی کام کرتا، منیجر ہے تو سودی معاملات خود ڈیل کرتا ہے، کیشئر وغیرہ ہے تو لکھنے والا ہوتا ہے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ ''اللہ کی لعنت ہو سود لینے والے پر، دینے والے پر، گواہ بننے والے پر اور اس کے لکھنے والے پر'' (حدیث) باقی یہ کہنا کہ یہ انکی محنت کی کمائی ہے تو کیا ہر محنت کی کمائی حلال ہوتی ہے؟ محنت ہی حرام ہو تو کمائی کیسے حلال ہوگی؟ مزید یہ کہ ملازمین کو محنت کی اجرت جو ملتی ہے وہ بھی تو بینک کی آمدنی سے ملتی ہے اور وہ تمام حرام ہے، معلوم نہیں اتنی واضح بات میں آپکو شبہ کیوں ہو رہا ہے؟

لمافی الصحیح لمسلم:(۲/۲۷،طبع قدیمی)

عن جابر (رضی اللہ عنہ) قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم " اکل الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال هم سواء.

وما فی التنویر مع الدر: (٦/٥٥، طبع ایچ ایم سعید)

(لا یصح الاجارة لعسب التیس) وهو نزوه علی الاناث (و) لا (لاجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عباد اللہ غفرلہ ولوالدیہ

١ ربیع الاول ١٤٣٢ھ — فتویٰ نمبر: ٢٩٤٧

﴿پڑوسیوں کا آپس میں چیزوں کا لین دین قرض ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ کسی کے گھر میں گندم ختم ہو جائے تو اپنے پڑوسی سے کہتے ہیں کہ ہمیں ایک دو من گندم دیدیں کٹائی کے موسم میں واپس کر دینگے، اسی طرح کسی کے گھر میں آٹا، چینی، پتی وغیرہ ختم ہو تو بھی یہی کرتے ہیں پھر واپس کر دیتے ہیں اور یہ لین دین عام طور پر ایک مخصوص برتن سے ہوتا ہے، شرعاً یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ اسمیں نسیئہ (ادھار) کیوجہ سے ربا یا شبہ ربا تو لازم نہیں آرہا؟

﴿جواب﴾ پڑوسیوں کے درمیان رائج لین دین کا یہ طریقہ قرض کا ہے، کوئی بیع نہیں ہے اور یہ نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ ہے، البتہ بجائے مخصوص برتن کے بہتر یہ ہے کہ رائج وزن سے یہ معاملہ کیا جائے، تاہم قرض کی واپسی کی تاریخ تک اگر اس مخصوص برتن کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو، تو کوئی حرج نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر: (٥/١٦١ طبع ایچ ایم سعید)

(وصح) القرض (فی مثلی) هو کل ما یضمن بالمثل عند الاستهلاک (لا فی غیره) من القیمیات کحیوان وحطب.

ولما فی الهندیة: (٣/٢٠١ طبع رشیدیه)

ویجوز القرض فیما هو من ذوات الامثال کالمکیل والموزون والعددی المتقارب کالبیض ولا یجوز فیما لیس من ذوات الامثال.

ولما فی الدر المختار: (٥/١٦٧ طبع ایچ ایم سعید)

وفیها استقراض العجین وزنا یجوز وینبغی جوازه فی الخمیرة بلا وزن، سئل رسول الله صلی الله علیه وسلم عن خمیرة یتعاطاها الجیران أیکون ربا فقال "ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن وما رآه المسلمون قبیحا فهو عند الله قبیح"

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عباد اللہ غفرلہ ولوالدیہ

٢٢ صفر الخیر ١٤٣٢ھ — فتویٰ نمبر: ٢٨٨٩

﴿دوکانداروں کے پاس رقم رکھوانے کی شرعی حیثیت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری دکان ہے میرے گاؤں کے کچھ لوگ تنخواہ وغیرہ لے کر میرے پاس پیسے رکھواتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر واپس لے جاتے ہیں، ان پیسے رکھوانے والوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے پیسے ہمارے پاس محفوظ رہیں اور بوقت مطالبہ ان کو ان کی رقم واپس ملے اور ان کی طرف سے استعمال کی اجازت ہوتی ہے، پوچھنا یہ ہے ان پیسوں کی شرعی حیثیت کیا ہے اور ان پیسوں کو اپنے کاروبار میں استعمال کر کے نفع حاصل کرنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

مستفتی: فخر الزمان بلال کالونی کورنگی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں لوگوں کا آپ کے پاس رقم رکھوانا قرض ہے، رقم وصول کرتے ہی آپ اس کے مالک بن گئے، لہذا آپ کا اس رقم کو اپنی تجارت میں استعمال کرنا اور اس پر نفع حاصل کرنا درست ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اہتمام ہو کہ جب بھی وہ لوگ اپنی رقم کا مطالبہ کریں تو آپ ان کو رقم واپس کریں۔

لما فی الشامی:(۵/۱۶۱، طبع سعید)

(لا يصح القرض في غير المثلي، لان القرض اعارة ابتداء حتى صح بلفظها معاوضة انتهاء، لانه لا يمكن الانتفاع به الا باستهلاك عينه، فيستلزم ايجاب المثلي في الذمة ويملكه المستقرض بالقبض كالصحيح والمقبوض بقرض فاسد يتعين للرد وفي القرض الجائز لا يتعين بل يرد المثل وان كان قائماً. وكذا في الشامي:(۵/۱۶۲، سعيد)

ولما في بدائع الصنائع:(۷/۳۹۶، طبع ايچ ايم سعيد)

واما حكم القرض فهو ثبوت الملك للمستقرض في القرض للحال وثبوت مثله في ذمة المستقرض للمقرض للحال وهذا جواب ظاهر الرواية.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۵ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ

فتویٰ نمبر: ۲۵۶۴

﴿جو چیزیں قدر و جنس میں مشترک ہوں ان میں قرض کا معاملہ کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس کچھ اضافی چینی رکھی ہوئی تھی، میں نے اپنے دوست سے کہا کہ یہ چینی لے لو اپنی ضرورت میں استعمال کرلو اور ایک ماہ بعد اتنی ہی چینی مجھے واپس کر دینا اور اسی طرح کا معاملہ گندم وغیرہ میں بھی کر لیتے

ہیں، کیا میرا اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: عمر فاروق

﴿جواب﴾ ایسی اشیاء جو قدر و جنس میں مشترک ہوں ان کی خرید و فروخت میں کمی، زیادتی اور ادھار نا جائز ہے لیکن ایسی اشیاء میں قرض کا معاملہ کیا جائے تو وہ درست ہے کیونکہ قرض کا معاملہ احسان کے طور پر ہوتا ہے اور آپکا معاملہ بھی قرض کا معاملہ ہے، چینی، گندم وغیرہ چونکہ مثلی اشیاء ہیں ان میں قرض کا معاملہ درست ہے، البتہ غیر مثلی اشیاء میں قرض کا معاملہ جائز نہیں ہے۔

ولما في التنوير مع الدر: (۵/۱۷۱-۱۷۲، طبع ایچ ایم سعید)

(علته) ای علة تحریم الزيادة (القدر مع الجنس فان وجدا حرم الفضل) ای الزيادة (والنساء) وكذا في مشكوة المصابيح: (ص ۲۲۳، طبع ایچ ایم سعید)

ولما في البدائع: (۷/۲۹۶، طبع ایچ ایم سعید)

ان القرض تبرع الا يرى انه لا يقابله عوض للحال — كان المستقرض انتفع بالعين مدة ثم رد عين ما قبض وان كان يرد بدله في الحقيقة وجعل رد بدل العين بمنزلة رد العين.

ولما في الهندية: (۳/۲۰۱، طبع رشیدیه)

يجوز القرض فيما هو من ذوات الامثال كالمكيل والموزون والعددي المتقارب كالبيض ولا يجوز فيما ليس من ذوات الامثال كالحيوان والثياب والعدديات المتفاوتة — ويجوز استقراض الذهب والفضة وزنا ولا يجوز عددا

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۱۳/ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۹۴

﴿مختلف کرنسیوں کے تبادلے میں تقابض شرط نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چین سے سامان منگواتے ہیں، رقم کی ادائیگی کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ ہم یہاں منی چینجر سے رابطہ کر کے چین کی کرنسی کے ریٹ طے کرتے ہیں پھر انکا ایک آدمی آکر ہم سے رقم لے جاتا ہے اور دو سے تین دن بعد چین میں موجود اس پارٹی کو جس سے ہم نے سامان خریدا ہے، اسکو چین کی کرنسی میں رقم دیدیتا ہے، سوال یہ ہیکہ مذکورہ طریقہ کار میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں ہے مثلاً کوئی شرط چھوٹ رہی ہو یدا بید کی یا مثلاً بمثل کی؟ مستفتی: ابو حنظلہ صدر کراچی

﴿جواب﴾ ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسرے ملک کی کرنسی سے ہو تو ایسی صورت میں

یہ ایمنی اور تقابض شرط نہیں ہے، لہٰذا مسئولہ طریقہ کار جائز ہے۔

لما في بحوث في قضايا فقهية معاصرة (۱/۱۹۷-۱۹۹ طبع دار العلوم کراچی)

ومن يجوز هذا البيع نسيئة كما هو معمول به اليوم عند كثير من التجار وعامة الناس انهم يعطون عملة بلدهم بشرط ان يؤدي الآخذ بدلها في شكل عملة بلد آخر بعد مدة مثل ان يعطي زيد عمرا الف ريال سعودي في المملكة العربية السعودية بشرط ان يؤدي عمرو بدلها اربعة آلاف روبية باكستانية في باكستان فاما عند الحنفية فيجوز هذا البيع لان الاثمان لا يشترط فيه كونه ممنوعا كما علمت انه عند البيع عندهم فيصح فيها التاجيل عند اختلاف الجنس قال شمس الائمة السرخسي ولو اشترى الرجل فلوسا بدراهم ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع فالبيع جائز لانه حيث تبيعه بثمن مؤجل فذلك جائز في الاجناس المختلفة.

الجواب صحیح عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب نعمان اقبال عفا اللہ عنہ

[illegible] ربیع الاول [illegible]ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۳۹۶

﴿ایک ملک کی کرنسی کے باہم تبادلہ میں ادھار ناجائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کھلے پیسوں کے ساتھ نوٹ کا تبادلہ کرتے وقت اگر کچھ پیسے ادھار رہ جائیں (مثلاً ہزار کے نوٹ کا تبادلہ سات سو کے ساتھ کرتے وقت تین سو ادھار رہ جائیں) تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟　　　مستفتی محمد عظیم

﴿جواب﴾ ہزار کے نوٹ کا تبادلہ سات سو روپیہ کے ساتھ کرتے وقت تین سو ادھار کر لینا درست نہیں کیونکہ ایک ملک کی کرنسی میں جانبین سے تقابض اسی مجلس میں شرط ہے اور اس صورت میں ایک جانب بدل کے کچھ حصے پر قبضہ اسی مجلس میں نہیں پایا گیا، البتہ اگر یہ معاملہ اس طرح کر لیا جائے کہ ہزار کا کھلا لیتے وقت اسی مجلس میں جتنے پیسے مثلاً سات سو روپیہ مل رہے ہوں انہی کے بقدر تبادلہ کی تصریح کی جائے اور بقیہ تین سو روپیہ بطور قرض چھوڑ دیے جائیں تو یہ صورت درست ہو جائے گی۔

لما في البدائع (۵/۲۳۷ طبع سعید)

وكذا تعينهما بالمجلس بعينه فالفلسان لا يتعينان وان عينا الا ان القبض في المجلس شرط حتى يبطل بترك التقابض في المجلس لكونه افتراقا عن دين بدين ولو قبض احد البدلين في المجلس فافترقا قبل قبض الآخر ذكر الكرخي انه لا يبطل العقد لان اشتراط القبض من الجانبين من خصائص الصرف وهذا ليس بصرف فيكتفى فيه بالقبض من احد الجانبين لان به يخرج عن كونه افتراقا عن دين

بدين يذكر في بعض شروح مختصر الطحاوي رحمه الله انه يبطل لا لكونه صرفا بل لتمكن ربا النساء فيه لوجود احد وصفي علة ربا الفضل وهو الجنس وهو الصحيح.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ریاض الرحمٰن عفا اللہ عنہ

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۲۰۶

﴿قرض اور دین کے مسائل﴾

﴿قرض خواہ مقروض سے صرف شدہ کرایہ وغیرہ وصول کرسکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں، علماء کرام اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں! کہ خالد نے بشیر سے قرض لیا، اسکے بعد ادائیگی کا جب وقت آیا تو خالد ٹال مٹول کرنے لگا اور بشیر کو قرض کی وصولیابی کے لئے بارہا اس کے پاس جانا پڑا اور آنے جانے میں خاصا کرایہ بھی صرف ہوا، پوچھنا یہ ہے کہ بشیر کی جتنی رقم کرایہ وغیرہ میں لگ چکی ہے، وہ خالد سے وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

مستفتی: محمد عظیم لکی مروت عبدل خیل

﴿جواب﴾ اگر خالد وقت مقررہ پر قرض کی ادائیگی میں تنگدستی کی وجہ سے کوتاہی کر رہا ہے تو بشیر کے لئے مناسب ہے کہ فراخی وقت تک اسکو مہلت دے دیں۔

لمافي قوله تعالى: (سورة البقرة، آيت ۲۸۰) وان كان ذو عسرة فنظرة الى ميسرة — الأية.

البتہ تاخیر تنگدستی کی وجہ سے نہیں کرتا، باوجود مالدار ہونے کے اس کا اصل مقصد دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ہے تو یہ انسانی شرافت کے خلاف ہے جس کی مذمت حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے۔

لمافي سنن ابي داؤد: (۲/۱۲۰، رحمانيه) عن ابي هريرة يقول: قال رسول الله ﷺ: مطل الغني ظلم.

ترجمہ: مالدار آدمی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

اور صورت مسئولہ کے مطابق بشیر کے لئے خالد سے صرف شدہ کرایہ وغیرہ وصول کرنا درست ہے اور بشیر کو چاہیے کہ مقررہ تاریخ پر رقم وصول نہ ہونے کی صورت میں قرضدار کو متنبہ کرے کہ اپنے حق کی وصولی کے لئے مجھے کرایہ خرچ کرنا پڑا تو وہ آپ کے ذمہ ہوگا۔

لمافي الشامي: (۸/۴۸، طبع امداديه ملتان)

وفي البزازية ويستعين باعوان الوالي على الاحضار واجرة الاشخاص في بيت المال

وقيل على المقترض وهو في منية المفتي، مؤنة المشخص قيل في بيت المال وفي الاصح على المقترض الخ وهكذا في عزيز الفتاوى: (۱/۶۲۹، طبع دارالاشاعت) وامدادالاحکام: (۳/۵۰۰، باب القرض والدين، طبع دار العلوم کراچی)

ولما في الهداية: (۳/۲۸۴، طبع رحمانيه)

واجرة رد العارية على المستعير لان الرد واجب عليه لما انه قبضه لمنفعة نفسه والاجرة مؤنة الرد فتكون عليه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۲۱ صفرالخیر ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۱۴۳

﴿سونے کو قرض پر دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ اس معاملہ کی شرعی حیثیت کیا ہے کہ میرے والد نے ایک آدمی سے ۲ تولہ سونا قرض پر لیا اور اس کے ساتھ ایک سال کا معاہدہ کیا کہ ایک سال بعد آپکو سونا واپس کردوں گا، اب اس سونے کی قیمت فی تولہ ۲۳ ہزار روپے ہے جبکہ قرض پر لیتے وقت ایک تولہ کی قیمت ۱۸ ہزار روپے تھی، اب اسکو دو تولہ سونا واپس کرنا ضروری ہے یا سونا قرض پر لیتے وقت کی قیمت ۱۸ ہزار روپے فی تولہ کے حساب سے رقم واپس کی جائے؟ اور کیا سونے کو قرض پر لینا صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ سونا بطور قرض لینا، دینا صحیح ہے اور سونا ہی واپس کرنا ضروری ہے، البتہ اس وقت کی موجودہ قیمت لینے پر اگر وہ راضی ہے تو قیمت یعنی فی تولہ ۲۳۰۰۰ روپے بھی ادا کرسکتے ہیں۔

لما في الشامي: (۵/۱۷۷، طبع سعيد)

فاذا استقرض مائة دينار من نوع فلا بد أن يوفي بدلها مائة من نوعها الموافق لها في الوزن أو يوفي بدلها وزنا لا عددا وأما بدون ذالك فهو ربا لأنه مجازفة

ولما في الدر المختار: (۵/۲۵۹، باب الصرف، طبع سعيد)

حتى لو استقرضا فأديا قبل افتراقهما أو أمسكا ما أشار اليه في العقد وأديا مثلهما جاز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ

۱۸ رجب ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۷۸

﴿قرض لینے یا ادھار چیزیں خریدنے کے بعد ادائیگی کا طریقہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱) ایک آدمی نے دوسرے سے (۱۰۰۰) روپے قرض لیا اسکے تقریباً دس سال بعد ادائیگی کرنا چاہتا ہے تو یہ شخص اس زمانے کے اعتبار سے ۱۰۰۰ روپے اداء کریگا یا موجودہ وقت میں روپوں کی مارکیٹ ویلیو کے مطابق اداء کریگا؟ (۲) ایک شخص نے دکاندار سے مختلف چیزیں بطور ادھار کے خرید لی، اس کے کئی سالوں بعد ادائیگی کر رہا ہے تو اس کی اس ادائیگی موجودہ وقت کی اشیاء کی قیمتوں کے اعتبار سے ہوگی یا اس وقت کی قیمتوں کے اعتبار سے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں جو رقم بیع یا قرض کی صورت میں کسی کے ذمہ واجب الاداء ہوئی تو اتنی ہی رقم صاحب حق کو واپس کرنا ضروری ہے اس میں مارکیٹ ویلیو (پیسے کی بازاری قیمت) کے اتار چڑھاؤ کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ ایسا معاملہ تو سود کے زمرے میں داخل ہو کر ناجائز و حرام ہوگا، البتہ قرضدار اپنی طرف سے زیادہ اداء کردے تو بہتر ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱۶۲/۵، طبع سعید)

(استقرض من الفلوس الرائجة والعدالي فكسدت فعليه مثلها كاسدة) و(لا) يغرم (قيمتها) وكذا كل مايكال ويوزن لما مرانه مضمون بمثله فلاعبرة بغلانه ورخصه وفي الشامية(قوله فلاعبرة بغلانه ورخصه)--- ولاينظرالى غلاء الدراهم ولاالى رخصها ......

والفتاوى الهندية: استقرض حنطة فاعطى مثلها بعدماتغيرسعرها يجبر المقرض على القبول۔

ولمافي الدرمع الرد:(۱۶۶/۵، طبع سعيد) وفي الاشباه: كل قرض جرّنفعا حرام.

وفي الشامية: قلت:.....ثم رايت في جواهر الفتاوى اذاكان مشروطا صار قرضا فيه منفعة وهوربا والافلاباس به.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۱۶ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر: ۱۲۱۶

﴿قرض کی بنیاد پر نفع لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے میں کہ مجھے ۳۰۰۰۰ روپے قرض کی ضرورت ہے، جس شخص سے مجھے قرضہ لینا ہے، وہ مجھے قرضہ دینے پر راضی ہے، واضح رہے کہ میں یہ مقروضہ رقم کاروبار میں لگانا چاہتا ہوں لیکن قرضہ دینے والے کا اصرار ہے کہ میں آپ کو قرضہ دے دونگا لیکن جب یہ رقم آپ اپنے کاروبار میں لگائیں گے تو منافع کی صورت میں آپ مجھے اصل رقم ۳۰۰۰۰ (تیس ہزار) کی واپسی کیساتھ ایک فی صد منافع کی رقم بھی دیں گے تو آپ

حضرات سے گزارش وعرض یہ ہے کہ مذکورہ مسئلہ میں میری رہنمائی فرمائیں کہ آیا اس شخص سے میں قرضے کے طور پر یہ رقم لے سکتا ہوں؟ اور اس شخص کا یہ مطالبہ کہ منافع کی صورت میں ایک فی صد رقم اضافی دینا ہوگی درست ہے؟ والسلام مستفتی: محمد الیاس صاحب

﴿جواب﴾ قرض کی بنیاد پر نفع لینا ہی تو سود ہے جو کہ حرام ہے، البتہ پیسے دینے والے کو آپ نفع ونقصان کی بنیاد پر کاروبار میں شریک کرلیں تو منافع میں سے جو شرح فیصد مقرر ہو لینا دینا جائز ہے مثلاً آپکی محنت ہے اور آپکے دوست کی رقم ہے ۳۰۰۰۰ تو اس رقم سے جو بھی کاروبار ہو مہینہ یا سال کے بعد مثلاً حساب کریں اس پر جو منافع ہوں پہلے سے طے شدہ شرح فیصد کے اعتبار سے تقسیم کریں بالفرض آپس میں طے کیا کہ محنت کرنے والے کو پچاس فیصد اور پیسے والے کو بھی پچاس فیصد منافع ملیں گے تو آدھے آدھے تقسیم کریں خدانخواستہ کوئی فائدہ نہیں ہوا تو کوئی بھی منافع کا مطالبہ نہیں کرسکتا اور نقصان ہوا تو اس ۳۰۰۰۰ سے پورا کیا جائیگا۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة البقرة،ایت ۲۷۵)﴿احل الله البیع وحرم الربا۔۔۔الأیة.﴾

ولما فی الشامی:(۵/۱۶۶،طبع سعید)

(قوله کل قرض جر نفعا حرام) ای اذا کان مشروطا کما علم مما نقله عن البحر وعن الخلاصة وفی الذخیرة وان لم یکن النفع مشروطا فی القرض، فعلی قول الکرخی لا بأس به.

ولما فی الهدایة:(۳/۲۶۲،طبع رحمانیه) المضاربة عقد یقع علی الشرکة بمال من احد الجانبین.

ولما فی کنز الدقائق:(ص ۳۴۴،طبع قدیمی)

وماهلک من مال المضاربة فمن الربح فان زاد الهالک علی الربح لم یضمن المضارب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا الله عنه واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زئی

۱۷ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۲۹۳

﴿نقد روپے قرض دیکر سونا وصول کرنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ میں نے ایک شخص کو چھ ہزار روپے قرض دیئے جبکہ اس وقت ایک تولہ سونا چھ ہزار کا تھا اور میں نے کہا کہ جب بھی آپ مجھے قرض واپس کروگے تو بجائے روپے ایک تولہ سونا دینا، اس نے بخوشی منظور کیا، اب وہ مجھے ایک تولہ سونا دے رہا ہے جبکہ ایک تولہ سونا تقریباً پچیس ہزار کا ہے تو کیا مجھے سونا لینا جائز ہے یا اصل قرض چھ ہزار روپے وصول کرلوں؟ مستفتیہ: ام احسان

﴿جواب﴾ قرض دیتے وقت آپ نے سونا لوٹانے کی جو شرط لگائی ہے، یہ غلط ہے، اس کا

کوئی اعتبار نہیں ہے اس شخص پر اب صرف چھ ہزار روپے ہی ادا کرنا ضروری ہے، آپ کیلئے سونا وصول کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، قرض دیتے وقت آپکو چاہیے تھا کہ چھ ہزار روپے سونا خریدنے کی غرض سے اسکو دیتے پھر وہ آپ کے لئے سونا خرید کرلاتا اور آپ وہی سونا ہی اسکو بطور قرض دیتے تو آج آپکو سونا وصول کرنے کا حق حاصل ہوتا لیکن اس وقت آپ نے روپے ہی بطور قرض دیئے تو اب چھ ہزار روپے ہی وصول کرنے کا حق آپ کو حاصل ہے سونا وصول کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱۶۵/۵ طبع سعید)

(القرض لایتعلق بالجائزمن الشروط فالفاسدمنهالایبطله ولکنه یلغوشرط ردشئی آخر فلواستقرض الدراهم المکسورة علی ان یؤدی صحیحاکان باطلا)وکذالواقرضه طعاما بشرط رده فی مکان آخر(وکان علیه مثل ماقبض)فان قضاه اجودبلاشرط جاز— وفی الخلاصة القرض بالشرط حرام والشرط لغوالخ.

ولمافی المبسوط:(ج۱۲ص۳۰ طبع دارالمعرفة لبنان)

والقرض لایتعلق بالجائزمن الشروط فالفاسدمن الشروط لایبطله ولکن یلغوشرط رد شئ آخر فعلیه ان یردمثل المقبوض.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۲۲ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر ۱۸۵۹

﴿قرض خواہ کا شئی مقروضہ کو مقروض کے ہاتھ فروخت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک غلہ والا اپنا غلہ، غلہ فروش کو قرض دیتا ہے اور اس غلہ کے اندر تصرف کی بھی اجازت دیتا ہے اور کہتا ہے جب غلہ کی قیمت بڑھ جائیگی میں آپکو فروخت کردونگا پھر جب غلہ کی قیمت بڑھ جاتی ہے تو اسی غلہ فروش کو وہ غلہ بیچتا ہے اور قیمت طے ہوتی ہے اس قسم کی بیع شرع کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: مولوی گل محمد عبدل خیل

﴿جواب﴾ شریعت کی رو سے یہ معاملہ جائز ہے کیونکہ (یہ بیع الدین ممن علیہ الدین) کے قبیل سے ہے، البتہ مقرض (غلہ والا) کا غلہ فروش سے یہ کہنا کہ آپکو بیچ دونگا، صرف وعدہ کے درجہ میں ہوتو کوئی مضائقہ نہیں ہے، شرط کے درجہ میں ہوتو یہ غلط شرط ہے لیکن معاملہ چونکہ قرض کا ہے اور قرض کے معاملہ میں فاسد شرط کا اعتبار نہیں ہوتا، اس لئے وصولی کی صورت میں مقرض غلہ

فروش سے غلہ واپس کرنے کا حق رکھتا ہے، البتہ باہمی رضامندی سے غلہ کی قیمت طے کرکے وصول کرنا چاہیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

لما فی الدرالمختار:(۳۲/۷ طبع امدادیه) فی الاشباه:بیع الدین انمایجوزمن المدیون.

ولما فی المبسوط للسرخسی:(ج۱۵ص۲۵۴ طبع دارالفکر بیروت)

فان بیع الدین من غیرمن علیه الدین لایجوزالاعلی قول مالکؒ وهویقول:کما یجوزبیعه ممن علیه فکذٰلک من غیره ولکنانقول اذاباعه منه یصیرقابضاله بذمته واذاباعه من غیره فهولایقدرعلی تسلیمه مالم یستوف ولایدری متی یستوفی فانما یبیع مالایقدرعلی تسلیمه وقدشرط للتسلیم أجلامجهولا وهوالی ان یخرجوذلک مبطل للبیع.

ولما فی الهندیة:(۱۰۲/۳ طبع رشیدیه)

واما بعدقبض البدلین حکمابأن کان لرجل علی اٰخرعشرة دراهم وللاٰخرعلیه دینارفاشتری کل واحدمنهماماعلیه بماله علی صاحبه حتیٰ کان العقد صرفاولم یکن صرفابأن کان له علی آخرفلوس أوطعام وللاٰخرعلیه دراهم فاشتریٰ کل واحد منهماماعلیه بماله علی صاحبه وتفرقاکان العقدجائز.وأمابعدقبض احدالبدلین حقیقة والآخرحکمابان کان لرجل علی رجل عشرة دراهم فاشتری من علیه الدراهم الدراهم بدینارونقدالدیناروتفرقاعن المجلس فالعقدجائز.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد طیب حسن زئی

۲صفرالخیر۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۱۸۷۹

﴿قرض وصول کرنے کی تدبیر﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام ومفتیان شرع دین متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ مجھ سے ایک شخص نے ایک مقررہ وقت کی میعاد پر قرضہ لیا ہے جبکہ میعاد مکمل ہونے کے بعد میرا مقروض قرضہ چکانے میں ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے اور مجھے پیسوں کی اشد ضرورت بھی ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ میرے لئے اپنے مقروض کا مال اپنے قرض کے بدلہ میں اسکی اجازت کے بغیر کسی بھی طریقہ سے حاصل کرکے لینا جائز ہے کہ نہیں۔ مستفتی احمد سلام ضلع تورغر

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ کو اپنے قرض کی حد تک مقروض کے مال میں سے زبردستی یا کسی بھی الکل سے وصول کرنا جائز ہے۔

لمافی التنویر مع الرد:۱۵۰/۶(سعید)

(والقاضی یحبس المرالمدیون لیبیع ماله لدینه وقضی دراهمه دینه من دراهمه)وفی

الشامية:(قوله بلاأمره)لأن للدائن أن يأخذ بيده اذاظفر بجنس حقه بغير رضاء المديين فكان للقاضي أن يعينه زيلعي

ولما في التنوير :٦/٥٠٠،٥٠١(سعيد)

وفي المجتبى لرب المال مسك مال المديون وهنا بلااذنه وقيل لاذاينس فله أخذه مكان حقه قضاء عن دينه وفي الشامية:(قوله قيل واذاينس الخ)كذاعبر في المنح وظاهره أنه من غير جنس حقه والافلومن جنسه فله أخذ قدرحقه منه بلاكلام ولاوجه لحكايته بقيل على أناقدمناه في كتاب الحجر عن المقدسي عن بعضهم أن الفتوى اليوم على جوازالأخذ.

ولمافي الشامي:٦/١٥١(سعيد)

(تنبيه)قال الحموي في شرح الكنز نقلاعن العلامة المقدسي عن جده الأشقر عن شرح القدوري للأخصب أن عدم جوازالأخذمن خلاف الجنس كان في زمانهم لمطاوعتهم في الحقوق والفتوى اليوم على جوازالأخذعند القدرة من أي مال لاسيما في ديارنالمداومتهم العقوق.

قال الشاعر :عفاء على هذاالزمان فانه. زمان عقوق لازمان حقوق ـــــ وكل رفيق غير مرافق. وكل صديق فيه غير صدوق.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فضل حق زیزاروی

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۲۲

﴿مدت میں کمی کی شرط پر دین میں کمی کرنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں ایک شخص کا کسی پر دس ہزار روپے (۱۰۰۰۰) قرضہ یا دین مؤجل ہے اور دونوں میں اَجل یعنی مدت ایک سال مقرر کی گئی ہے، اس شخص نے مدیون سے کہا کہ فی الفور صرف آٹھ ہزار روپے (۸۰۰۰) ادا کردو، باقی دو ہزار روپے معاف کرتا ہوں اور اگر فی الفور ادائیگی نہیں کرتے تو بعد میں مکمل دس ہزار روپے وصول کرونگا، اب سوال یہ ہے کہ اگر مدیون فی الفور آٹھ ہزار روپے ادا کردے تو کیا یہ جائز ہے؟

﴿جواب﴾ قرض کی صورت میں بلاشبہ یہ جائز ہے، اسلئے کہ قرض میں تأجیل (مدت مقرر کردینا) معتبر نہیں ہے اور قرض خواہ کو کسی بھی وقت مطالبہ کا حق حاصل ہے، البتہ دین مؤجل کی صورت میں یہ معاملہ ناجائز ہے، اس لئے کہ دین میں تأجیل معتبر ہے اور دائن کی طرف سے اس شرط پر حصہ دین میں کمی کردینا کہ مدیون اجل مقرر سے پہلے یا فی الفور دین ادا کردے، ناجائز ہے، اس لئے کہ اس صورت میں دونوں جانب سے معاوضہ ہے، دائن کی طرف سے حصہ

دین میں کمی کرنا اور مدیون کی طرف سے اسقاط اجل ہے اور یہ موجب ربوا ہونے کی وجہ سے حرام اور ناجائز ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵/۱۵۷-۱۵۸،طبع سعید)

(ولزم تأجيل كل دين)..... (الا القرض) فلا يلزم تأجيله وفي الشامية:أي انه يصح تأجيله مع كونه غير لازم فللمقرض الرجوع عنه لكن قال في الهداية:فان تأجيله لا يصح لانه اعارة وصلة في الابتداء الخ.

ولما في التنوير مع الدر:(۵/۶۲۰،طبع سعید)

ولا يصح(أوعن الف مؤجل على نصفه حالا)..... (اوعن الف سود على نصفه بيضا) والاصل ان الاحسان ان وجد من الدائن فاسقاط وان منهما فمعاوضة.

وفي الشامية:(قوله حالا)لانه اعتياض عن الاجل وهو حرام.....(قوله فمعاوضة)أي ويجري فيه حكمها فان تحقق الربا وشبهته فسدت والا صحت ط قال ط:بان صالح على شئ هو أدون من حقه قدرا ووصفا او وقتا وان منهما:أي من الدائن والمدين بان دخل في الصلح ما لا يستحقه الدائن من وصف كالبيض بدل السود او ما هو في معنى الوصف كتعجيل المؤجل اوعن جنس بخلاف جنسه اه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۴۵۱

﴿کسی کو قرض دیکر ماہوار متعین مقدار میں پیسے لینا سود ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک دکاندار کو کچھ رقم دی اور اسکو کہا کہ آپ اس سے کاروبار چلاتے رہو اور مجھے ماہوار ایک ہزار روپے دیا کرو، پوچھنا یہ ہے کہ یہ معاملہ سود کے زمرے میں تو نہیں آئے گا؟　مستفتی:محمد اقبال کوہائی شکردرہ

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ مضاربت فاسدہ کی ہے جسکا حکم یہ ہے کہ نفع سارا رب المال کا ہوگا اور مضارب کو اجر مثل ملیگا اور جو رقم آپ ماہانہ لے چکے ہیں وہ بلاشبہ حکما سود ہے جسکا لینا دینا حرام ہے، ابتک اگر ماہانہ پیسے دکاندار سے لئے ہیں تو واپس کرنا ضروری ہے اور آئندہ کے لئے دکاندار کیساتھ کاروبار میں شریک ہونا چاہتے ہیں تو نیا عقد ضروری ہے۔

جسکی صحیح صورت یہ ہے کہ آپ جتنی رقم دکاندار کو دینا چاہتے ہیں اسکی نسبت دکاندار کے پاس پہلے سے موجود سامان کیساتھ واضح ہو مثلا دکاندار کے پاس پہلے سے دو لاکھ کا سامان دکان میں

ہے اور مزید ایک لاکھ روپے آپ نے شامل کردیے تو آپ دکان کے سامان میں صرف ایک تہائی حصہ میں حصہ دار ہیں اور اسی نسبت سے نفع نقصان میں بھی حصہ دار ہیں نفع آپ دونوں کی رضامندی سے طے کرنا ضروری ہے مثلاً پچاس فیصد یا کم وبیش جو بھی طے ہو آپکو اپنے ایک تہائی حصہ کا نفع ملتا رہے گا اور خدانخواستہ نقصان اگر ہوگیا تو پہلے نفع سے پورا کیا جائیگا، اس سے بھی زیادہ ہوا تو سرمایہ کی نسبت سے آپکی رقم سے بھی پورا کیا جائے گا۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة البقرة،آیت۲۷۸)

﴿یاایها الذین امنوا اتقوا الله وذروا مابقی من الربوا ان کنتم مؤمنین ○فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله ورسوله......الأیة.﴾

ولما فی الشامی:(۱۶۶/۵،طبع سعید)

(کل قرض جر نفعا حرام)ای اذا کان مشروطا کما علم مما نقله عن البحر.

ولما فی التنویر مع الدر:(۱۶۸/۵تا۱۷۰،طبع سعید)

(هو فضل خال عن عوض بمعیار شرعی مشروط)ذلک الفضل(لاحد المتعاقدین فی المعاوضة)

ولما فی بدائع الصنائع :(۸۵/۱،طبع ایچ ایم سعید)

ومنها ان یکون المشروط لکل واحد منهما من المضارب ورب المال من الربح جزأ شائعا نصفا اوثلثا اوربعا فان شرطا عددا مقدرا بان شرطا ان یکون لاحدهما مائة درهم من الربح او اقل او اکثر والباقی للاخر لایجوز والمضاربة فاسدة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:نثار محمود کوہاٹی غفرلہ ولوالدیہ

۱۹ربیع الاول ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر:۲۰۷۱

﴿قرض پر متعین نفع لینا حرام ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ میں اپنے گھر کی اوپر والی منزل پر تعمیر کرنا چاہتا ہوں تاکہ کرائے پر دوں لیکن میرے پاس رقم نہیں تھی، میں نے اپنے دوست سے قرض لیا تو دوست نے کہا کہ یہ رقم جب دل کرے واپس کرنا لیکن جو کرایہ آئے اس میں سے مجھے تہائی حصہ دینا پھر جب یہ رقم ادا کردو گے پھر نہیں دینا، آیا اس طرح میرا اپنے دوست کو شریک کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی:محمد اعجاز کراسنگ

﴿جواب﴾ آپکا دوست اس شرط پر آپکو تعمیر کیلئے بطور قرض رقم دے رہا ہے کہ کرایہ میں سے

اسکو بھی ایک تہائی دینا ہے تو یہ سودی معاملہ ہے ہرگز جائز نہیں ہے، البتہ یہ شرط نہ ہو پھر آپ بخوشی اپنی طرف سے کرایہ میں سے دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں لیکن اسکو مطالبہ کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

لما فی مصنف ابن ابی شیبة:(۵/۸۰ طبع امدادیه)

حدثنا ابوبکر قال — عن ابراهیم قال: کل قرض جر منفعة فیه ربا.

ولما فی الشامی:(۵/۱۶۶ طبع ایچ ایم سعید)

کل قرض جرنفعا حرام ای اذا کان مشروطا کما علم مما نقله عن البحر وعن الخلاصة وفی الذخیرة

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۹ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۳۵

﴿مقروض سود پر رقم لیکر اگر قرضہ ادا کرے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے مجھ سے ایک سال کی میعاد پر ایک لاکھ روپیہ قرض لیا ہے جبکہ دو سال کا عرصہ مکمل ہو رہا ہے لیکن مقروض نے ابھی تک میرے پیسے واپس نہیں دیئے ہیں جب میں اس سے قرضہ کا مطالبہ کرتا ہوں تو وہ آگے سے جواب میں کہتا ہے کہ میرے پاس فی الحال کوئی رقم نہیں ہے تاکہ میں آپ کا قرضہ چکادوں، ہاں میں اتنا کرسکتا ہوں کہ کسی سے سود پر ایک لاکھ روپیہ قرض لیکر آپ کا قرضہ چکادونگا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ آیا میرے لئے اپنے مقروض سے قرض کے بدلہ میں سود کا روپیہ لینا جائز ہے کہ نہیں، براہ کرم وضاحت فرمائیں۔ مستفتی رحمت سلام

﴿جواب﴾ قرض خواہ اگر اپنے مقروض کو مہلت دے اور اس کے حالات بہتر ہونے تک قرض کا مطالبہ نہ کرے تو اسکا بہت بڑا اجر وثواب ہے، احادیث میں آیا ہے کہ ایسے بندے کے ساتھ بروز قیامت اللہ تعالیٰ رعایت کا معاملہ فرمائینگے اس لئے آپ اپنے مقروض کے ساتھ قرض کے معاملہ میں مزید رعایت فرمائیں تو زیادہ بہتر ہے اور اگر آپ مزید مہلت نہیں دینا چاہتے تو آپ کو حق حاصل ہے، مقروض کے بارے میں اگر آپ کو یقین ہے کہ اس کے پاس قرض چکانے کیلئے دوسرا کوئی انتظام نہیں ہے سود پر پیسہ لیکر ہی آپ کا قرضہ ادا کریگا تو آپ یہ مشورہ اس کو قطعاً نہ دے، پھر وہ از خود کسی سے سود پر رقم لیکر آپ کا قرضہ اگر ادا کریگا تو یہ رقم آپ کیلئے سودی نہیں ہے یعنی حرام نہیں ہے آپ تو اپنا جائز حق وصول کر رہے ہیں لیکن پوری طرح پاک بھی

کیونکہ سود کی نحوست کی وجہ سے اس میں بے برکتی ضرور ہوگی۔

لما فی احکام القرآن للجصاص:۱/۱۲۱ (طبع قدیمی)

ولو کان ذو عسرة فنظرة الی میسرة وذلک أن ذکر الاعسار والانظار قدنزل علی عین تجب له فتوبة به والانظار انما یکون الا فی حق قدثبت وجوبه وصحت المطالبة به عاجلا واما آجلا۔

ولما فی البخاری:۱/۲۷۹ (قدیمی)

عن عبیداللہ بن عبداللہ أنه سمع أباهریرة عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال کان تاجر یداین الناس فاذا رأی معسرا قال لفتیانه تجاوزوا عنه لعل اللہ أن یتجاوز عنا فتجاوز اللہ عنه۔

ولما فی البخاری:۱/۲۷۵ (طبع قدیمی)

قال حسان بن سنان مارأیت شیئا أهون من الورع دع مایریبک الی مالایریبک۔

ولما فی مسلم:۲/۲۷ (قدیمی)

عن علی رضی اللہ تعالی عنه لعن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم آکل الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال هم سواء۔

ولما فی الشامی:۹/۳۸۵ (طبع قدیمی)

کسب مغنیة کالمغصوب لم یحل أخذه وعلی هذا لو مات الرجل وکسبه من بیع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة یتورع الورثة ولا یأخذون منه شیئا وهو أولی بهم ویردونه علی أربابها ان عرفوهم والا تصدقوا بها لأن سبیل الخبث التصدق اذا تعذر الرد علی صاحبه۔

ولما فی البحر:۸/۲۰۱ (طبع سعید)

اذا کان لشخص مسلم دین علی مسلم فباع الذی علیه الدین خمرا وأخذ ثمنها وقضی الدین لایحل للدائن أن یأخذ ذلک بدینه۔

ولما فی الهندیة:۵/۳۶۷ (رشیدیة کوئٹه)

ولو کان الدین لمسلم علی مسلم فباع المسلم خمرا وأخذ ثمنها وقضاه صاحب الدین کره له أن یقبض ذلک من دینه کذا فی السراج الوهاج۔

ولما فی مجمع الانهر:۴/۲۱۲ (طبع مکتبة المنار)

ولو باع المسلم خمرا وأوفی دینه من ثمنها کره لرب الدین أخذه۔

واللہ اعلم بالصواب: فضل حق زیزاروی الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر: ۳۹۷۶ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ

اضطراری حالت کے بغیر سودی قرض لینا جائز نہیں ہے

(سوال) کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ائرلینڈ میں کئی

سالوں سے کرایہ کے مکان میں رہتا ہوں اور کمائی کا زیادہ تر حصہ کرایہ میں خرچ ہو جاتا ہے جبکہ ذاتی مکان بنانے کے لئے حکومت کی طرف سے ضابطہ اور قانون یہ ہے کہ سودی قرض لیکر مکان بنایا جاسکتا ہے، کیا میرے لئے ایسی مجبوری میں سودی قرض لے کر مکان بنانا جائز ہے؟ براہ کرم مجبوری کا حل شریعت کی روشنی میں عنایت فرمائیں۔ مستفتی: بھائی ظہور احمد کیانی

﴿جواب﴾ سودی معاملہ اور سودی لین دین بنص قطعی حرام ہے، قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعیدیں آئی ہیں، البتہ حالت اضطرار اور ضرورت شدیدہ میں جبکہ ہلاکت نفس کا خوف ہو تو بقدر ضرورت فقہاء کرام نے سودی قرض لینے کی گنجائش بتائی ہے لیکن سوال میں جو مجبوری بتائی گئی ہے، وہ اضطرار اور احتیاج شدید کی نہیں ہے، اس لئے مکان بنانے کے واسطے سودی قرض لینا جائز نہیں ہے، کرایہ کے مکان میں گزارہ کریں اور اس میں کچھ خسارہ بھی ہو تو شریعت کے پیش نظر برداشت کریں، انشاء اللہ اسی میں فلاح ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ تیار مکان حکومت سے یا کسی شخص سے زیادہ قیمت پر قسطوں پر حاصل کریں اور اگر آپ وہاں کے رہائشی مسلمان بھائیوں کی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی کوشش کریں گے تو انشاء اللہ آپکے علاوہ دوسرے مسلمان بھائیوں کے لئے بھی آسانی ہوگی مثلاً چند ساتھی مل کر ذاتی مکان بنا کر قسطوں پر مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کریں تو یہ حلال کمائی کا ذریعہ ہوگا اور مسلمان بھائی سود دینے کی لعنت سے بھی بچ جائیں گے۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة البقرة،آیت ۲۷۵، پاره ۳)﴿احل الله البيع وحرم الربوا...... الآية.﴾

ولمافی قوله تعالیٰ:(سورة،آیت ۲۷۹)﴿فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله ورسوله — الآية.﴾

ولمافی الصحیح لمسلم:(۲۷/۲،طبع قدیمی)

فی الحديث عن جابر رضی الله عنه قال: لعن رسول الله ﷺ اکل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء.

ولمافی تكملة فتح الملهم:(۲۱۹/۱،طبع دار العلوم کراچی)

قوله ﷺ (وموكله) يعنی الذی يؤدی الربا الی غيره فاثم عقد الربا والتعامل به سواء فی كل من الاخذ والمعطی — ولهذا اجاز اعطائه عند الضرورة الشديدة كما فی شرح الاشباه والنظائر للحموی وغيره.

ولمافی امداد الاحكام:(۲۸۷/۳،طبع دار العلوم کراچی)

قلت: وقد قالت الفقهاء بجواز اعطاء الرشوة للمضطر لدفع مضرة لا تندفع الا باعطائها

واما اخذ الرشوة فلا یجوز بحال والربا والرشوة من باب واحد فمقتضاه ان یجوز اعطاء الربا للمضطر لدفع مضرة لاتندفع الا باعطائه واما اخذ الربا فلا یجوز اصلا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: ریاض الرحمٰن کوہاٹی غفرلہ

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۳۰۶

﴿متعینہ برتن یا وزن کے ذریعے آٹا، چینی وغیرہ بطورِ قرض دینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں یہ طریقہ عام ہے کہ ایک گھر کی عورتیں دوسرے گھر سے آٹا، چینی اور گھی وغیرہ برتن کے ذریعے ناپ تول کر کے لے لیتی ہیں اگر واپس دینے میں تھوڑی بہت کمی وزیادتی ہو جائے تو رباشمار ہوگا یا نہیں؟ مستفتی: عبدالہادی صاحب ہمیٹی کی مروت

﴿جواب﴾ پڑوسیوں سے وقتی ضرورت پوری کرنے کے لئے آٹا چینی گھی وغیرہ بطورِ قرض لینا جائز ہے اور اس طرح لین دین میں برتن اور پتھر کا تعین اور معروف ہونا ضروری ہے چونکہ برتن اور پتھر ضائع ہونے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے، اس لئے جلد واپس کر دینا چاہیے تاکہ بعد میں جھگڑا پیدا نہ ہو، لین دین میں ناپ تول کا خاص خیال رکھا جائے، اس لئے جراب جیسی چیز کے ذریعے ناپ تول یا تر لکڑی کے ذریعے وزن کرنا جائز نہیں ہے، اس کے باوجود بھی اگر کچھ کمی بیشی ہو جائے تو رباشمار نہیں ہوگا کیونکہ ربا میں زیادہ لینے دینے کا عقد ہوتا ہے اور یہ معمولی کمی بیشی عقد میں شامل نہیں ہے، لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لما فی الھدایة: (۲۲/۳ طبع رحمانیه)

ویجوز باناء بعینه لایعرف مقداره وبوزن حجر بعینه لایعرف مقداره لان الجهالة لا تفضی الی المنازعة لما أنه یتعجل فیه التسلیم فیندر هلاکه قبله.

ولما فی فتح القدیر: (۲۶۵/۶ طبع رشیدیه)

قد قید الاناء بکونه ممالا یحتمل الزیادة والنقصان کان یکون من خشب او حدید.

ولما فی الھندیة: (۲۰۲/۳ طبع رشیدیه)

فان لم تکن المنفعة مشروطة فی العقد فأعطاه المستقرض اجود مما علیه فلا بأس به.

ولما فی الدر المختار: (۱٦۷/۵ طبع سعید)

وفیها استقراض العجین وزنا یجوز وینبغی جوازه فی الخمیرة بلا وزن سئل رسول الله ﷺ عن خمیرة یتعاطاه الجیران أیکون ربا فقال "مارأه المسلمون حسنا فهو عندالله حسن ..... الحدیث.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: اسلام بادشاہ ہمیٹی

۲٦ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۱۹۴۹

﴿سود کی حقیقت اور مثالیں﴾

﴿سوال﴾ سود کی حقیقت مثالوں سے واضح فرمائیں نیز بہت سے معاملات ہمیں صحیح نظر آتے ہیں جب علماء سے معلوم کرتے ہیں تو وہ سود بتادیتے ہیں اور بعض معاملات ہمیں سود کے نظر آتے ہیں جبکہ علماء غیر سودی قرار دیتے ہیں؟! مستفتی: بھائی شیراز صاحب کراچی

﴿جواب﴾ سود کے لئے عربی زبان میں (ربا) کالفظ استعمال ہوتا ہے جسکالغوی معنی (زیادتی) ہے اور اصطلاح فقہ میں ''ربا'' ایسی زیادتی کو کہتے ہیں کہ متعاقدین میں سے کسی ایک کے لئے عقد کے نتیجہ میں مشروط ثابت ہو اور اس کے بدلے میں دوسرے کے لئے کوئی عوض مقرر نہ ہو اور زیادتی کبھی ظاہری صورت سے نظر آتی ہے، مثلاً دس روپے کے مقابلہ میں بارہ روپے طے ہوا ہو تو دو روپیہ کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے اور کبھی ظاہری صورت کے اعتبار سے نظر نہیں آتی وہ معنوی زیادتی ہوتی ہے مثلاً دس تولہ سونا دس تولہ سونے کے مقابلہ میں طے ہوا اور ایک طرف سے دستی ہو جبکہ دوسری طرف سے کچھ عرصہ کے بعد ادائیگی ہو تو شریعت نے نقد، ہاتھ میں آنے والے سونے کو بعد میں موصول ہونے والے سونے سے زیادہ مان لیا ہے، نیز ہر کیلی (ناپے جانے والی) یا موزونی (وزن کی جانے والی) چیز کی خرید وفروخت جب اپنی جنس کے ساتھ ہو تو کمی بیشی اور ادھار سود کہلائے گا مثلاً گندم، گندم کے بدلے بیچی جائے تو برابر اور نقد بیچنا ضروری ہے ورنہ کمی بیشی یا ادھار بیع، سود شمار ہوگا۔

اس کے علاوہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں (۱) کوئی چیز قسطوں پر خریدی جائے اور عقد کے اندر یہ شرط ہو کہ بروقت ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں مزید رقم ادا کرنا ہوگی تو یہ مزید رقم محض قرض پر مشروط اضافہ ہے جو کہ سود ہے، ہاں یہ شرط نہ ہو تو جائز ہے خواہ قسطوں کی وجہ سے قیمت زیادہ مقرر کی جائے۔

(۲) کسی نے کوئی چیز قسطوار ۷۰ ہزار روپیہ میں بیچ دی پھر اسکو نقد پیسوں کی ضرورت پڑی، اس نے تیسرے شخص سے پچاس ہزار روپیہ قرضہ لے کر مشتری (خریدار) کو اس کے حوالہ کردیا اور اسے یہ کہا کہ وہ ۷۰ ہزار قسطوار آپ کو ادا کرتا رہے گا، یہ بعینہ ربوا ہے کیونکہ اس صورت میں تیسرا شخص پچاس ہزار دیکر ستر ہزار وصول کر رہا ہے جس میں بیس ہزار سود لے رہا ہے۔

(۳) ایک آدمی کو کاروبار کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی، کسی دوسرے نے کہا کہ اس شرط پر سرمایہ دونگا کہ دس فیصد منافع مجھے ضرور دوگے، لہٰذا روپے بطور قرض دیکر اس پر دس فیصد یا کوئی بھی فیصد منافع مقرر کرنا سود ہوگا، قرض دیکر سرمایہ کو محفوظ رکھا اور اسی سرمایہ کو کاروبار کا حصہ بنالیا لیکن نفع و نقصان کی بنیاد پر اگر شرکت کی تو یہ جائز ہے، اس لئے کہ سرمایہ کو خطرہ میں ڈال دیا، قرض اور کاروبار میں یہی تو فرق ہے کہ قرض میں رقم پوری محفوظ ہوتی ہے اور کاروبار میں رقم خطرہ میں ہوتی ہے۔

(۴) ایک آدمی دوسرے کو اپنے پیسوں سے گاڑی خرید کر دیتا ہے اور یہ اقرارنامہ تحریر کراتا ہے کہ سال یا دو سال کے بعد دو لاکھ کی جگہ تین لاکھ دیگا یہ بھی سودی معاملہ ہے، اس لئے کہ گاڑی خریدنے والا (پیسہ لگانے والا) مشتری کا وکیل ہے اور گاڑی کی رقم مشتری کے ذمہ قرض ہے جس پر وہ سودی منافع لے رہا ہے، البتہ یہ جائز ہے کہ پیسہ لگانے والا پہلے گاڑی اپنے لئے خریدے اور قبضہ بھی کرے پھر تین لاکھ روپے میں مشتری پر فروخت کردے۔

یہ چند مثالیں ذکر کی گئیں ہیں لیکن سود کی علتوں کو سمجھنا چونکہ عام لوگوں کے لئے انتہائی مشکل ہے، اس لئے صحیح اور جائز معاملات کے قواعد، ضوابط اور شرائط جاننے کے سلسلے میں علماء کرام، فقہاء عظام سے راہنمائی حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة،النحل،پاره،۱۷)﴿فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون.....الآیة﴾

ولمافی احکام القرآن للجصاص:(۱/۴۶۱ طبع قدیمی)

هوالقرض المشروط فیه الاجل وزیادة مال علی المستقرض.

ولمافی العنایة علی هامش الفتح:(۶/۱۴۶ طبع رشیدیه)

الربا هوالفضل المستحق لاحدالمتعاقدین فی المعاوضة الخالی عن عوض شرط فیه.

ولمافی التنویر مع الدر:(۵/۱۶۸ تا۱۷۲ طبع سعید)

الربا(هو)لغة:مطلق الزیادة وشرعا(فضل)ولو حکما فدخل ربا النسیئة والبیوع الفاسدة فکلها من الربا.....(خال عن عوض بمعیار شرعی)وهو الکیل والوزن.....(مشروط لاحد المتعاقدین فی المعاوضة).....(وعلته)القدر مع الجنس فان وجدا حرم الفضل والنساء.....(وان وجد احدهما حل الفضل وحرم النساء)

ولمافی الشامی:(۵/۱۶۶ طبع سعید)کل قرض جر نفعا حرام ای اذا کان مشروطا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: ریاض الرحمٰن عفا اللہ عنہ

۱۷ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۲۳

﴿سودی معاملہ میں گواہ خط وکتابت کرنے والا بھی برابر کا شریک ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بہن سودی بینک سے قرضہ لینا چاہتی ہے اور سارے معاملات اس نے خود کئے ہیں بس صرف میرے کو گواہ بنایا ہے، مجھے صرف دستخط کرنا ہے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہونگا اور میرا دستخط کرنا کیسا ہے؟　　مستفتی محمد عدنان کورنگی

﴿جواب﴾ قرآن وحدیث میں سود کے بارے میں بے شمار وعیدیں آئیں ہیں، قرآن کریم میں ہے کہ "سود خوروں سے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا اعلان جنگ ہے" اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "سود کھانے والا کھلانے والا اس پر گواہ اور خط وکتابت کرنے والے سب (گناہ) میں برابر کے شریک ہیں" دوسری روایت میں ہے کہ "سود میں بے شمار گناہ ہیں اور ادنیٰ گناہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کے برابر ہے"۔

لہٰذا مسئولہ صورت میں آپ بھی برابر کے شریک ہونگے ہرگز آپ اس معاملہ پر دستخط نہ کریں اور وعیدوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی بہن کو بھی اس لعنت سے منع کریں۔

لمافی مشکوۃ المصابیح:(ص ۲۴۴ طبع ایچ ایم سعید)

عن جابر قال لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء

ولمافی مشکوۃ المصابیح:(ص ۲۴۶ طبع ایچ ایم سعید)

وعن ابی ھریرۃؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: الربوا سبعون جزءً ایسرھا ان ینکح الرجل امہ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۲۱ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۲۷۰

﴿سودی معاملہ میں گواہ بننے والے پر بھی لعنت ہے﴾

﴿سوال﴾ ہمارے ایک پڑوسی نے مجھے کہا کہ میرے ساتھ شہر چلو، کچھ کام ہے، جب شہر میں گئے تو اس نے ایک بینک سے کاروبار کیلئے سودی قرضہ لیا، مجھے اور ایک اور شخص کو گواہ بنایا، میں ادھر انکار نہ کرسکا اگر شروع میں پتہ ہوتا کہ بینک سے قرضہ لینے جارہا ہے تو میں انکار کرتا، اب میں نادم ہوں، کیا میں اس صورت میں گنہگار ہوں یا نہیں؟　　مستفتی: وزیر زادہ قلاری چارسدہ

﴿جواب﴾ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، سود کے لکھنے والے

اور سود پر گواہ بننے والے تمام پر لعنت بھیجی ہے اور فرمایا ہے کہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں، لہٰذا آپ کو چاہئے کہ توبہ واستغفار کریں اور آئندہ کیلئے انکی مروت سے اجتناب کریں جو شریعت کے خلاف ہو۔

لما فی الصحیح لمسلم:(۲/۲۷ طبع قدیمی)

عن جابرؓ قال لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربوا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء

ولما فی سنن ابی داود:(۲/۱۱۸ طبع رحمانیہ)

عن عبداللہ بن مسعودؓ قال لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربوا وموکلہ وشاھدہ وکاتبہ وکذا فی جامع الترمذی:(۱/۱۲۵ طبع فاروقی ملتان)

ولما فی مرقاۃ المفاتیح:(۶/۳ طبع رشیدیہ)

(وکاتبہ وشاھدیہ) قال النووی فیہ تصریح بتحریم کتابۃ المترابیین والشہادۃ علیھما بتحریم الاعانۃ علی الباطل (وقال) ای النبی ﷺ (ھم سواء) ای فی اصل الاثم وان کانوا مختلفین فی قدرہ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: [illegible] غفر اللہ
۶ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ	فتویٰ نمبر: ۱۰۶۳

﴿سودی معاملہ میں وکیل بننا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ میرا بھائی بیرون ملک سے رقم میرے نام بھیج کر سودی بینک کے سودی کھاتہ میں رکھوانے کو کہتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا ایسی صورت میں رقم اس کے نام سودی بینک میں رکھوانے سے میں بھی اس گناہ میں شریک ہوں گا یا نہیں؟ جبکہ انکار کی صورت میں وہ ناراض ہو جاتا ہے۔

﴿جواب﴾ نصوص قرآنی کے ساتھ ساتھ بیشتر احادیث مبارکہ ایسی موجود ہیں جن میں سودی کاروبار کو نہ صرف حرام بلکہ اس پر سخت وعیدیں بھی آئی ہیں اور سود لینے، دینے، سودی تحریر یا حساب لکھنے اور سودی شہادت دینے والوں پر بھی لعنت کی گئی ہے اور فرمایا کہ وہ سب لوگ "گناہ" میں برابر کے شریک ہیں۔

مذکورہ صورت میں چونکہ آپ نائب "وکیل" کی حیثیت سے سودی کھاتہ کھولنے والے قرار پاتے ہیں کیونکہ ہر وہ عقد "معاملہ" جس میں وکیل اپنی طرف اضافت کرتا ہے، اس عقد کے حقوق وکیل کے ساتھ متعلق ہوتے ہیں اور شریعت مطہرہ نے ہر قسم کے سودی معاملے کو حرام قرار دیا ہے،

اس لئے آپ کا اس جیسا تصرف کرنا ناجائز وحرام ہوگا، اس سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے، حرام کاموں میں رشتہ داروں کی ناراضگی کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا، اس لئے آپ کو چاہیے کہ بھائی سے خیرخواہانہ انداز سے معذرت کرلیں۔

لمافی قوله تعالیٰ:((سورة البقرة،آیت ۲۷۵)احل الله البیع وحرم الربوا۔۔۔الأیة.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا۔

ولمافی الصحیح لمسلم:(۲۷/۲،طبع قدیمی)

عن جابرؓ قال:لعن رسول الله ﷺ آکل الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال هم سواء.

ولمافی تکملة فتح الملهم:(۶۱۹/۱،طبع دارالعلوم کراچی)

قوله ﷺ "وموکله"یعنی الذی یؤدی الربا الی غیره فاثم عقدالربا والتعامل به سواء فی کل من الآخذ والمعطی......وقوله ﷺ "وکاتبه"لأن کتابة الربا اعانة علیه۔فذالک حرام لوجهین الخ.

ولمافی الهدایة:(۱۸۷/۳،طبع رحمانیه)

والعقد الذی یعقده الوکلاء علی ضربین کل عقد یضیفه الوکیل الی نفسه کالبیع والاجارة فحقوقه تتعلق بالوکیل دون الموکل.

ولمافی قوله تعالیٰ:(سورة الانعام،آیت ۱۵۲)واذاقلتم فاعدلوا ولوکان ذاقربی۔۔۔الأیة.

ترجمہ: اور جب کہنے لگو تو حق بات کہو اگر چہ وہ تمہارے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

ولمافی روح المعانی:(۲۱۵/۸،طبع رشیدیه)

"واذاقلتم"قولا فی حکومة اوشهادة اونحوهما "فاعدلوا"فیه وقولوا الحق "ولوکان المقول له اوعلیه"ذاقربی"ای صاحب قرابة منکم.

ولمافی مرقاة المفاتیح:(۲۲۶/۷،طبع رشیدیه)

وعن علیؓ قال:قال رسول الله ﷺ لاطاعة فی معصیة انما الطاعة فی المعروف "لاطاعة"ای لأحد کمافی روایة الجامع الصغیر ای من الامام وغیره کالوالد والشیخ "فی معصیة"وفی روایة الجامع فی معصیة الله "انما الطاعة فی المعروف"ای مالاینکره الشرع(متفق علیه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۲۹ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۲۶۸

﴿سود لینا زیادہ گناہ ہے یا دینا؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ سودی معاملہ میں سود لینے

والا زیادہ گنہگار ہوتا ہے یا دینے والا؟

﴿جواب﴾ سود لینا اور دینا دونوں ناجائز وحرام ہیں، نصوص قرآنی اور احادیث مبارکہ میں انتہائی سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ اور احادیث میں سود لینے دینے اور سودی معاملہ لکھنے، گواہ بننے والے پر لعنت کی گئی ہے۔

رہا یہ سوال کہ سود لینا زیادہ سنگین جرم ہے یا دینا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حالات کے اختلاف سے اس کی حرمت کی شدت میں فرق آ سکتا ہے، کبھی تو لینے والے کا عمل زیادہ شنیع ہوتا ہے جبکہ بعض اوقات دینے والے کا جرم سنگین ہوتا ہے، بہر حال مسلمان کیلئے تو لینے، دینے دونوں کی سخت ممانعت ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة مایت ۲۷۸)

(﴿یاایها الذین اٰمنوا اتقوا الله وذروا مابقی من الربوا ان کنتم مومنین ○ فان لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله...... الأیة.﴾

ولما فی الصحیح لمسلم:(۲۷/۲ طبع قدیمی)

لعن رسول الله ﷺ اکل الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال هم سواء.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۱۰ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۲۷

﴿ہنڈی بھیجنے پر فیس لینا سود نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہنڈی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز ہنڈی کا کاروبار کرنے والا ہنڈی بھیجنے کے عوض دو تین سو روپے لیتا ہے، آیا یہ سود تو نہیں ہے؟

﴿جواب﴾ ہنڈی کا کاروبار کرنے والا اگر ایک ہی ملک کی کرنسی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتا ہے تو یہ صورت شرعاً قرض ہے اور اس صورت میں ہنڈی کا کاروبار کرنے والا جو دو تین سو روپے لیتا ہے اگر وہ رقم پہنچانے اور دفتری اخراجات پر معاوضہ لیتا ہے تو اس محنت پر فیس لینا جائز ہے، البتہ اگر مذکورہ کاروبار کی حکومت کیطرف سے اجازت نہ ہو تو قانون کی خلاف ورزی کا گناہ ہوگا اور اگر ہنڈی کا کاروبار کرنے والا آدمی مختلف ملکوں کی کرنسی کا آپس میں تبادلہ کرتا ہے یعنی ایک ملک میں ایک کرنسی وصول کرتا ہے اور دوسرے ملک میں دوسری کرنسی دیتا ہے تو یہ

معاملہ تین شرائط کے ساتھ جائز ہے: (۱) مجلس عقد میں دونوں عوضوں میں سے ایک عوض پر قبضہ ضروری ہے۔ (۲) کرنسی کی جو قیمت عقد کے دن بازار میں رائج ہو اسی پر سودا کیا جائے اس سے زائد پر سودا نہ کیا جائے (۳) اس کاروبار کی حکومت کی طرف سے قانوناً اجازت ہو۔

پہلی دو شرطوں کی مخالفت کی صورت میں مذکورہ معاملہ ناجائز ہو جائے گا اور تیسری شرط کی مخالفت کی صورت میں حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کا گناہ ہوگا اگرچہ نفس معاملہ درست ہوگا۔

لما فی حاشیۃ شرح الوقایۃ:(۲/۱۱۹ طبع امدادیہ ملتان)

ویجب ان یعلم أن التی فی زماننا المسماۃ فی لساننا (ہنڈی منی آرڈر) لیس من ھذا ولاله حکم السفاتیج لان السفاتیج کانت لسقوط خطر الطریق ونقله وصول — ونحن فاعلم أن الهندی الذی حصل لنا علمها الی الآن علی خمسۃ أقسام الاولی (منی آرڈر) وھو ان یدفع الدراھم الی الحکومۃ ویکتب أن یرفعه فی البلد الفلانی الی الفلانی فاعوانها یأخذون الدراھم ھھنا وشیئا زائداً أجرتها ثم یدفعون الی المرسل الیه وان لم یاخذوا ولم یعرف مکانه یردون الی المرسل — فلا بأس بکلها الا ضریحة بکراھته لکن الاحتیاط فی مثل تلک المعاملات من الربو واجب.

ولما فی المبسوط:(ج۱۴ ص۲۲ طبع دار الکتب العلمیۃ)

واذا اشتری الرجل فلوسا بدراھم ونقد الثمن ولم تکن الفلوس عند البائع فالبیع جائز لأن الفلوس الرائجۃ ثمن کالنقود وقد بینا أن حکم العقد فی الثمن وجوبها ووجودها معا ولا یشترط قیامها فی ملک بائعها لصحۃ العقد..... وانما یجب التقابض فی الصرف بمقتضی اسم العقد وبیع الفلوس بالدراھم لیس بصرف وکذلک لو افترقا بعد قبض الفلوس قبل قبض الدراھم

ولما فی تکملۃ فتح الملهم:(۲/۲۲۳ طبع دار العلوم کراچی)

ان المسلم یجب علیه ان یطیع امیره فی الامور المباحۃ فان امر الامیر بفعل مباح وجبت مباشرته وان نهی عن امر مباح حرم ارتکابه لان الله سبحانه وتعالی قال اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم — فلما افردهم الله سبحانه وتعالی بالذکر ظهر ان المراد اطاعتهم فی الامور المباحۃ.

ولما فی البحوث فی قضایا معاصرۃ:(۱/۱۶۶-۱۶۷ طبع دار العلوم کراچی)

فیجوز اذن أن یباع الریال السعودی مثلا بعدد اکثر من الروبیات الباکستانیۃ — وھل یجوز ھذا البیع نسیئۃ — فاما عند الحنفیۃ فیجوز ھذا البیع لان الأثمان لا یشترط فیها کونها مملوکۃ للعاقد عند البیع عندھم فیصح فیها التأجیل عند اختلاف الجنس.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد حسن عفا اللہ عنہ

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر: ۱۵۲۸

﴿اپنے بھائی کا سودی قرضہ ادا کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے بینک سے سودی قرضہ لیا، بعد میں وہ ادا نہ کرسکا تاخیر کی وجہ سے قرضہ مزید بڑھ رہا ہے اور بینک شرح سود میں مزید اضافہ کررہا ہے، اب اس کے پاس قرضہ ادا کرنے کا ظاہری کوئی سبب نہیں ہے، پوچھنا یہ ہے کہ ایسی صورت حال میں اگر اس کے بھائی یا رشتہ دار اس کا قرضہ اپنی طرف سے ادا کردیں تو کیا ایسا کرنا جائز ہوگا یا نہیں ؟ اگر نا جائز ہے تو پھر بطور قرض وہ اس کو اتنے پیسے دیدیں تا کہ اس پر مزید سودی قرضہ کا بوجھ نہ پڑے اور بعد میں اس سے اپنا قرضہ وصول کرلیں تو کیا شرعا ان کے لئے ایسا کرنا جائز ہوگا یا نہیں ؟

مستفتی: محمد محمود صاحب اختر کالونی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس کے بھائی یا رشتہ دار اگر سود سے خلاصی کی نیت کر کے اس کا قرضہ اتار دیں یا رقم بطور قرض اسے دیدیں تو دونوں صورتوں کی گنجائش ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ اسے رقم بطور قرض دیدیں تا کہ وہ بھی مزید سودی قرضہ سے بچ جائے اور سودی معاملے میں بھائیوں کا تعاون بھی نہ پایا جائے۔

لما فی قوله تعالی: المائدة، آیت ۲ ﴿وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾

واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۱۲۸۶

۲۶ رجب ۱۴۲۹ھ

﴿حبس مبیع اور قرض پر اضافی رقم لینے کا حکم اور اسکی متبادل صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ (1) زید (سنی) نے خالد (بوہری) سے 44 لاکھ روپے کی ایک دکان خریدی ہے، زید اس معینہ رقم سے 15 لاکھ روپے ادا کرچکا ہے اور 29 لاکھ روپے بقایا ہیں جنہیں ایک سال میں ادا کرنے ہیں اور خالد (بائع) سے مزید مہلت ملنے کی بھی امید ہے لیکن اس عقد کو طے ہوئے تین مہینے سے زیادہ عرصہ بیت گیا اس کے باوجود خالد (بائع) نے زید (مشتری) کو دکان کا قبضہ نہیں دیا بلکہ اس کے ذریعہ کمارہا ہے، کیا اس کے لئے ایسا کرنا شرعا جائز ہے؟

(2) چونکہ زید کے پاس دکان خریدتے وقت 29 لاکھ روپے نہیں تھے تو اس نے عمیر سے

قرض مانگا، عمیر چند شرائط کی بنیاد پر قرض دینے کے لئے راضی ہوگیا جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ایک سال میں قسط وار 29 لاکھ روپے کے بدلے 40 لاکھ روپے واپس کرنے ہونگے۔

(۲) مالک دکان کو پیسے ادا کرنے کے بعد وہ دکان میرے نام پہ کرنی ہوگی اور جس وقت تم 40 لاکھ روپے مجھے ادا کرو گے تو پھر میں یہ دکان تمہارے نام کرونگا، کیا یہ معاملہ سود میں داخل ہے؟ اگر سود ہے تو اس معاملہ کو شرعی طریقے پر کیسے لایا جائے، نیز زید یہ شرائط پوری کرنے کا پابند ہے؟

﴿جواب﴾ (1) زید اور خالد نے اگر یہ سودا شروع میں ایسا ہی کیا تھا کہ پوری رقم خالد کو ملے گی تب دکان کا قبضہ زید کو دیا جائے گا پھر تو خالد قبضہ روک سکتا ہے لیکن اگر شروع میں اس قسم کی شرط نہیں لگائی تھی اور زید نے 15 لاکھ روپے ادا کردیئے ہیں اور باقی قسط وار ادا کرنا طے ہوا ہے تو ایسی صورت میں دکان کا قبضہ خالد کے لئے روکنا جائز نہیں ہے، یہ ظلم ہے۔

البتہ مقررہ تاریخ تک زید کوئی ایک قسط بھی ادا نہ کرے تو خالد کو حق حاصل ہوگا کہ دکان پر قبضہ کرے یا زید سے کوئی چیز لے کر گروی رکھے۔

لمافی البحر الرائق: (۵/۲۷۹، طبع سعید)

واذا رضی البائع بالتاجیل فقد أسقط حقه فی حبس المبیع فلو حل الأجل قبل قبضه فللمشتری قبضه قبل نقد الثمن کذا فی المحیط.

ولمافی جامع الترمذی: (۱/۱۴۷، طبع فاروقی ملتان)

عن أبی هریرةؓ قال نهی رسول ﷺ عن بیعتین فی بیعة وقد فسر بعض أهل العلم قالوا بیعتین فی بیعة أن یقول أبیعک هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسیئة بعشرین ولا یفارقه علی أحد البیعتین فاذا فارقه علی أحدهما فلا بأس اذا کانت العقدة علی واحد منهما.

ولمافی التنویر مع الدر: (۶/۴۸۵، طبع سعید)

(ولا) یکلف (من قضی بعض دینه) أو أبرأ بعضه (تسلیم رهنه حتی یقبض البقیة من الدین)

(2) اضافی رقم لینے والی شرط تو بلاشبہ سودی معاملہ ہے جسکی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، البتہ اس کی متبادل صورت یہ ہوسکتی ہے کہ عمیر زید کو قرض رقم نہ دے بلکہ زید سے کوئی چیز (موٹر، موٹر سائیکل وغیرہ) 29 لاکھ روپے میں نقد خرید کر اس پر قبضہ کرے، بعد ازاں وہی چیز زید کو 40 لاکھ روپے میں ادھار بیچ دے، اس طرح معاملہ کرنے سے سود بھی لازم نہیں آئے گا اور زید کو بھی ضرورت کے مطابق 29 لاکھ روپے مل جائیں گے جبکہ عمیر کو بھی معین مدت میں 40 لاکھ روپے

مل جائیں گے، بلاشبہ یہ ایک حیلہ ہے اور شرعی مفاسد سے خالی نہیں ہے لیکن سود جیسے گناہ نہیں ہے۔

لما فی البحر الرائق:(۱۲۶/۶ طبع سعید)

وفی الخلاصة معزیا الی النوازل رجل له علی اخر عشرة دراهم فاراد أن یؤجلها الی السنة ویأخذ منه ثلاثة عشر فالحیلة أن یشتری منه بتلک العشرة متاعا ویقبض المتاع منه وقیمة المتاع عشرة ثم یبیع المتاع منه بثلاثة عشرة الی سنة.

رہی دوسری شرط تو عمیر اپنے رقم کے وصول یابی تک اس دکان کو گروی کے طور پر اپنے نام کرا سکتا ہے پھر جونہی رقم مل جائے تو زید کے نام منتقل کرانا لازم ہے لیکن اس دوران گروی سے فائدہ اٹھانا عمیر کے لئے جائز نہیں ہے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حفیظ اللہ بیگ

۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۹۶

﴿سودی رقم اپنے مقروض پر صدقہ کرنا اور قرض وصول کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے بینک سے کچھ سودی پیسہ ملا ہے، تو کیا میں ان پیسوں کو اپنے مقروض کو جو کہ غریب ہے بغیر نیت ثواب کے دیکر اس سے اپنے قرض میں وصول کر سکتا ہوں یا نہیں؟ مستفتی محمد ساجد

﴿جواب﴾ آپ کا مقروض واقعی اگر غریب اور محتاج ہے، اور آپ نے بغیر نیت ثواب کے اسکو ان پیسوں کا مالک بنایا، تو وہ آپکو قرضے میں دے سکتا ہے، اور آپ کے لئے ان پیسوں کا لینا اور اپنے استعمال میں لانا جائز ہے، کیونکہ ان پیسوں کی حرمت آپ کیلئے تھی، نہ کہ غریب کیلئے، اور جب وہ غریب اپنے کھانے پینے میں لا سکتا ہے، تو اپنے قرض کے ادا کرنے میں بھی لا سکتا ہے۔

ولما فی بذل المجهود:(۳۷/۱، باب فرض الوضوء)طبع مكتبة الشيخ

واما اذا كان عند رجل مال خبيث فاما ان ملكه بعقد فاسد او حصل له بغير عقد ولا يمكنه ان يرده الى مالكه ويريد ان يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة الا ان يدفعه الى الفقراء.

ولما فی معارف السنن:(۳۴/۱، باب ما جاء لا تقبل صلاة بغير طهور)طبع سعيد

قال شيخنا: ويستفاد من كتب فقهائنا "كالهداية" وغيرها أن من ملك بملك خبيث ولم يمكنه الرد الى المالك فسبيله التصدق على الفقراء ـــــ ومن قال بحرمة رجاء الثواب بل كفر من يرجو الثواب فاراد: رجاء الأجر بنفس هذا المال الخبيث.

ولما فی الاختیار لتعلیل المختار:۳/۶۱ طبع قدیمی کتب خانه۔

والملک الخبیث سبیله التصدق به،ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز،ثم ان کان غنیا تصدق بمثله،وان کان فقیرا لا یتصدق.

ولما فی العالمگیریة:(۶/۳۲۲ کتاب الحیل الفصل الأول) طبع قدیمی کتب خانه

"وکل حیلة یحتال بها الرجل لیتخلص بها عن حرام أو لیتوصل بها الی حلال فہی حسنة".

ولما فی الهدایة:(۳/۳۲۹ کتاب المکاتب)طبع رحمانیه

وما أدی المکاتب من الصدقات الی مولاہ ثم عجز فهو طیب للمولی لتبدل الملک، فان العبد یتملکه صدقة والمولی عوضاً عن العتق،والیه وقعت الاشارة النبویة فی حدیث بریرة هی لها صدقة ولنا هدیه."وفی حاشیته(قوله وما أدی المکاتب الخ)ای أخذ المکاتب الزکاة لکونه من المصارف ثم أدی الی المولی عن بدل الکتابة ثم عجز فظهر أن المولی أخذالزکوة وهو غنی ومع ذالک یطیب له"شرح الوقایه.

ولما فی الفتح القدیر:۹/۲۱۷ طبع رشیدیة

(وما أدی المکاتب من الصدقات الی مولاہ ثم عجز فهو طیب للمولی لتبدل الملک) وتبدل الملک بمنزلة تبدل العین فی الشریعة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۸ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۷۰۳

﴿سودی رقم غریبوں میں تقسیم کرنے کی غرض سے سودی معاملہ ہرگز جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں سیمنٹ کا کام کرتا ہوں،اور پیسے"کرنٹ اکاؤنٹ" میں جمع کرتا ہوں،اب کسی نے مشورہ دیا ہے کہ اپنے پیسے"سیونگ اکاؤنٹ" میں جمع کرادو اس سے جو منافع آئے گا اس کو غریبوں میں تقسیم کرو،کیونکہ بینک والے تو ویسے بھی آپ کے پیسے سودی معاملات میں استعمال کرتے ہیں،کیا شرعاً میرے لئے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟　　　　مستفتی:ایک سائل بتوسط مولانا زکریا بھکر

﴿جواب﴾ کرنٹ اکاؤنٹ میں ضرورت کی وجہ سے پیسے رکھنے کی گنجائش ہے اگر چہ بینک والے اس پیسے کو سودی معاملات میں لگاتے ہیں لیکن یہ کام وہ از خود کرتے ہیں پیسے رکھنے والا تو حفاظت کی خاطر پیسہ بینک میں رکھتا ہے اس لئے وہ گنہگار نہیں ہوتا لیکن سیونگ اکاؤنٹ میں پیسے رکھنے کے لئے باقاعدہ اپنے اختیار سے سودی معاملہ طے کرنا ہوتا ہے،جس کی کوئی گنجائش نہیں ہے،حرام ہے،غریبوں کی مدد بھی اللہ ہی کرتا ہے ہم اور آپ کی کیا حیثیت ہے اور

مدد کریں تو کتنی کر سکتے ہیں؟ پھر یہ کون سی سمجھداری ہے کہ غریب کی دنیا بنانے کے لئے ہم اور آپ اپنی آخرت برباد کریں، لھذا یہ غلط سوچ ہے شیطانی نظریہ ہے اس کے دھوکہ میں نہ آئیں۔

لما فی قوله تعالیٰ سورة البقرة ، آیت : ۲۷۵﴿أحلّ الله البيع و حرّم الرّبوا— الآية﴾

و لما فی المشکوۃ (ص ۲۴۴ طبع : سعید)

عن جابر رضی الله عنه قال لعن رسول الله ﷺ آکل الربوا و مؤکله و کاتبه و شاہدیه و قال هم سواء

ولما فیه ایضاً (ص۲۴۲، باب الکسب وطلب الحلال) طبع :سعید

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه عن رسول الله ﷺ قال لا یکسب عبد مال حرام فیتصدق منه فیتقبل منه ، ولا ینفق منه فیبارك له فیه ، و لا یترکه خلف ظهره الا کان زاده الی النار ، ان الله لا یمحو السیئ بالسیئ و لکن یمحو السیئ بالحسن .ان الخبیث لا یمحو الخبیث . رواه احمد

وفی حاشیته تحت هذا الحدیث —

قوله ان الله لا یمحو السیئ بالسیئ یعنی ان التصدق و الانفاق من الحرام سیئ لا یمحو الاثم الذی حصل له من کسب الحرام و فیه دفع لتوهم کون التصدق حسناً و کون الانفاق مبارکاً مطلقا بل قال بعض علمائنا من تصدق بمال حرام و رجا الثواب کفر و لو عرف الفقیر و دعا له کفر.

و لما فی الأشباه والنظائر (ص: ۸۷ طبع قدیمی)(الضرورات تبیح المحظورات.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۲۸ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۴۶

﴿انعامی قرعہ اندازی جوا اور سود ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے شہر مردان میں لکی تھری سٹار سپر پاور موٹر سائیکل والوں نے ایک اسکیم نکالی ہے جو قرعہ اندازی پر موٹر سائیکل دیتے ہیں لیکن ان کے کچھ شرائط وضوابط ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) قرعہ اندازی کی مدت ۲۵ ماہ ہوگی ہر ممبر کو ۵ تاریخ تک ۲ ہزار روپے جمع کروانے ہونگے قرعہ اندازی ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کو سرڈھیری بازار میں کی جائے گی۔

(۲) جس ممبر کا نام قرعہ اندازی میں نکل آئے گا اس کو سپر پاور موٹر سائیکل 70 دیا جائیگا اور باقی اقساط معاف ہونگی۔

(۳) سپر پاور موٹر سائیکل ایڈوانس لینے پر ۹ ہزار روپے ناقابل واپسی ایڈوانس دینے ہونگے۔

(۴)۵ تاریخ تک قسط جمع نہ کروانے پر قرعہ اندازی میں نام شامل نہ ہوگا متواتر دو اقساط شارٹ کرنے پر ممبر شپ کینسل کردی جائے گی۔

(۵) شارٹ قسطیں جمع کرنے کی صورت میں ممبر شپ بحال کردی جائے گی اور ۲۵ ماہ کے دوران کسی ممبر کا نام قرعہ اندازی میں نہیں آئے گا تو کمیٹی ختم ہونے کے دس دن کے اندر باقی سب ممبران کو 70c.c دیئے جائیں گے، نیز ۲ ہزار روپے اضافی جمع کروانے پر کسی اور کمپنی والا موٹر سائیکل یونیک، زیمکو، حبیب بھی دی جاسکتی ہے۔

(۶) دوکاندار حضرات ۵۰۰ روپے ہفتہ دے کر اس پیکج میں شامل ہو سکتے ہیں، روزانہ ۷۰ روپے جمع کرنے والا بھی اس پیکج میں شامل ہوسکتا ہے۔

وضاحت! ہر قرعہ اندازی میں جس کے نام نمبر نکل آئے اسکو اختیار ہے کہ موٹر سائیکل لے لے یا چالیس ہزار روپے۔ اور آخری قرعہ اندازی پر ایک لاکھ روپے نقد انعام بھی دیا جائے گا۔

غرض مسئلہ یہ ہے کہ ان شرائط کیساتھ مذکورہ اسکیم میں شامل ہونا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ اسکیم جوے اور سود کی ایک شکل ہے کیونکہ اسمیں سب سے اہم شرط یہ ہے کہ قرعہ اندازی میں جس ممبر کا نام نکل آیا اس سے بقیہ قسطیں نہیں لیں گیں اور نام نکلنے پر اسکو ایک موٹر سائیکل یا ۴۰ ہزار روپے دیئے جائیں گے اور دوسری جانب رقم جمع کرانے والے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ اپنے کم پیسوں کے ذریعے زیادہ پیسے حاصل کریں، اس وجہ سے اسمیں سود اور جوا دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں جو کہ حرام اور ناجائز ہیں۔

نیز تیسری شرط انھوں نے یہ لگائی ہے کہ ”موٹر سائیکل ایڈوانس لینے پر ۹ ہزار روپے ناقابل واپسی ایڈوانس دینے ہونگے“ جسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی ممبر اسکیم جاری نہ رکھ سکے تو یہ ۹ ہزار روپے اسکو واپس نہیں ملیں گے یہ بھی ناجائز ہے،

اور آخر میں جو وضاحت کی ہے کہ قرعہ اندازی میں جس ممبر کا نام نکل آئے اسکو اختیار ہے کہ موٹر سائیکل لے لے، یا ۴۰ ہزار روپے، یہ اس وجہ سے ناجائز ہے کہ اگر نام نکلنے والا موٹر سائیکل کے بجائے ۴۰ ہزار روپے لے لے تو یہ پیسوں کا تبادلہ پیسوں کیساتھ ہوا اور اسکے لئے ضروری ہے کہ متعاقدین میں سے ہر ایک اسی مجلس میں پیسوں پر قبضہ کریں اور دونوں جانب سے پیسے

بھی برابر ہو، اسمیں کمی زیادتی کرنا سود ہے جو کہ حرام ہے، ان وجوہات کی بنا پر اس اسکیم میں شامل ہونا شریعت کی رو سے جائز نہیں ہے۔

لما في قوله تعالىٰ سورة البقرة، آية [۲۷۵ پارہ ۳]

﴿احَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا — الآية﴾

ولما في قوله تعالىٰ ايضاً سورة المائدة، آية [۹۰ پارہ ۷]

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

ولما في تنوير الابصار: (۱۶۸/۵، طبع: ایچ ایم سعید کراچی)

هو فضلٌ خالٍ عن عوضٍ بمعيار شرعي مشروطٌ لاحد المتعاقدين في المعاوضة.

ولما في الشامي: (۲۱/۴، طبع: سعید کراچی)

لا يجوز لاحد من المسلمين اخذ مال احدٍ بغير سبب شرعي.

ولما في الجوهرة: (۲۸۳/۱، طبع: میر محمد کتب خانہ)

لما اختص باسم الصرف اختص بشرائط ثلاثة، احدها وجود التقابض من كلا الجانبين قبل التفرق بالابدان والثاني ان يكون باتاً لا خيار فيه ...و الثالث ان لا يكون بدل الصرف مؤجلاً.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفر لہ ولوالدیہ

۳ جمادی الاولی ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۳۰

﴿تعبیر بدل کر سودی معاملہ کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے مضاربت کے طور پر ۲ لاکھ روپے دیئے تجارت کے بعد اسے ۱۰ ہزار کا نفع ہوا، مضارب نے اس شخص کو دو لاکھ دس ہزار کا چیک دیا، جو کچھ عرصہ کے بعد کیش ہوگا، اس شخص کو فی الحال پیسوں کی ضرورت پڑی اس نے کسی تیسرے شخص سے کہا کہ میں نے دو لاکھ روپے کی تجارت کی ہے جس میں دس ہزار کا نفع ہوا ہے لیکن پیسے مجھے کچھ عرصہ کے بعد ملیں گے چیک میرے پاس موجود ہے، لہٰذا آپ مجھے ایک لاکھ روپے ابھی دیدیں اور میرے ساتھ اس کاروبار میں شریک ہو جائیں جب مجھے پیسے مل جائیں گے تو آدھا نفع یعنی ۵ ہزار روپے آپ کو دوں گا۔ مستفتی: امجد صاحب

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس شخص کا یہ معاملہ سودی ہے، اس لئے کہ جو رقم لے کر وہ دوسرے شخص کو اپنے نفع میں شریک کر رہا ہے وہ حقیقت میں قرض ہے، کاروبار تو ہوا ہے اور دس

ہزار منافع بھی ہو چکا ہے، مزید اس پیسے سے یہ شخص مشترکہ کاروبار تو نہیں کر رہا بلکہ یہ تو ذات کے لئے استعمال کر رہا ہے، اس لئے یہ محض قرض ہے اور قرض پر زیادتی سود ہے جو شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح تعبیر بدلنے سے کوئی بھی ناجائز معاملہ جائز نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔

لما فی قوله تعالیٰ:آل عمران،آیت ۱۳۰)﴿یاایها الذین آمنوا لاتاکلوا الربا اضعاف امضعفا﴾

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب:عبدالحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

۶ شعبان ۱۴۲۹ھ　　فتویٰ نمبر:۱۷۴۹

﴿سود کی ایک خاص صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید یہاں سے اونٹ لے جا کر ایران میں فروخت کرتا ہے، اس کیلئے اسے پیسوں کی ضرورت ہے عمرو نے اسے کہا میں تمہیں دو لاکھ روپے دیتا ہوں اس شرط پر کہ تم میرے پیسوں سے جتنے بھی اونٹ خرید و گے فی اونٹ کے حساب سے دو ہزار روپے مجھے دو گے، اب اونٹ چاہے ہلاک ہوں یا کچھ بھی ہو میں اسکا ذمہ دار نہیں ہوں تو کیا اس طریقہ سے مطلوبہ رقم لینا عمرو کیلئے سود ہو گا یا نہیں؟　　مستفتی:محمد عظیم عبدل خیل

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں صرف اونٹوں کا نام لینے سے یہ معاملہ مضاربت قرار نہیں پاتا، مضاربت کی شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، لہٰذا عمرو نے زید کو جو رقم دی ہے حقیقت میں یہ قرض ہی ہے اور قرض پر کسی قسم کا نفع لینا سود ہے جس سے بچنا ضروری ہے، البتہ نفع ونقصان کی بنیاد پر شریک ہوں تو جائز صورت بن سکتی ہے۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة آل عمران،آیت ۱۳۰)

﴿یاأیها الذین آمنوا لاتاکلوا الربوٰا أضعافا مضاعفة ـــ الأیه.﴾

ولما فی تکملة فتح الملهم:(۱/۵۶۸،طبع دار العلوم کراچی)

وان تبتم فلکم روؤس اموالکم لاتظلمون ولا تظلمون.ـــ الآیة.(سورة البقرة،آیت ۲۷۹)

فانه صریح فی الدائن لاحق له الا فی رأس المال وکل مازاد علیه فهو ربا حرام.

ذکر البخاری فی کتاب الاستقراض،باب اذا اقرضه الی اجل مسمی،قول ابن عمرؓ تعلیقا(قال ابن عمرؓ:فی القرض الی اجل لاباس،وان اعطی افضل من دراهمه مالم یشترط)ودل ذلک علی ان اشتراط الافضل من الدراهم ربا عند ابن عمرؓ،فظهر أن

الصحابة كانوا يعتبرون كل زيادة على القرض ربا ويحرمونها..... وأخرج البيهقي في سننه:٥:٣٥٠ عن فضالة ابن عبيدؓ موقوفا (كل قرض جر نفعا فهو وجه من وجوه الربوا)

ولمافي الشامي:(١٦٦/٥ طبع سعيد)

(قوله كل قرض جر نفعا حرام) أي اذا كان مشروطا كما علم مما نقله عن البحر، وعن الخلاصة وفي الذخيرة، وان لم يكن النفع مشروطا في القرض فعلى قول الكرخي لا بأس به ويأتي تمامه.

ولمافي فتح القدير:(٢/٧ طبع رشيديه)

ومنه احل الله البيع وحرّم الربا، أي حرّم أن يزاد في القرض والسلف على القدر المدفوع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفا اللہ عنہ

۶ صفر الخیر ۱۴۲۹ھ　　　فتوی نمبر: ۱۱۴۷

﴿دار الحرب میں سود لینے کا حکم اور ترکہ میں اگر سود کا مال ہو﴾

﴿سوال﴾ میرے والد صاحب برطانیہ میں ملازم تھے اور اپنی آمدنی وہاں ایک بینک میں رکھواتے تھے، انکا انتقال ہو گیا اور وہ مال ہمیں میراث میں ملا ہے، اس سے متعلق یہ پوچھنا ہے کہ ہمارے لئے وہ کل مال جائز ہے یا صرف اصل مال؟ جبکہ نہ ہم نے یہ معاملہ کیا ہے اور نہ ہم کو اصل مال کی مقدار معلوم ہے اور یہ معاملہ دار الحرب کا ہے اور دار الحرب میں کفار سے سودی معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟　　　مستفتی: ڈاکٹر حازم صاحب ڈیفنس فیز ۲

﴿جواب﴾ دار الحرب میں مسلمان مستامن (جو امن طلب کر کے وہاں جاتا ہے) کا کفار سے سود لینا امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے جبکہ جمہور فقہاء امام مالک امام شافعی امام احمد رحمہم اللہ اور احناف میں سے قاضی ابو یوسفؒ کے نزدیک کفار سے بھی سود لینا جائز نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل:

لمافي الهداية:(٩٠/٣ طبع رحمانيه)

لقوله عليه السلام لا ربوبين المسلم والحربي في دار الحرب، قال في الهداية: لان مالهم مباح في دارهم فبأي طريق اخذه المسلم اخذ مالا مباحا اذا لم يكن فيه غدر بخلاف المستامن لان ماله صار مباحا محظورا بعقد الامان.

مانعین کی سب سے بڑی دلیل قرآن و حدیث کی وہ تاکیدات ہیں جو مطلق سود کو حرام قرار دیدیتی ہیں جس طرح شراب نوشی، زنا وغیرہ بلا تفریق دار الاسلام و دار الحرب دونوں میں حرام ہیں

اسطرح سود بھی بلا کسی تفریق کے حرام ہونا چاہیے۔

لہٰذا آج کل بناء بر احتیاط محققین علماء کرام نے دار الحرب میں بھی سود لینے کو منع کر دیا ہے اگر چہ دلائل کے اعتبار سے امام ابو حنیفہؒ کا مذہب راجح ہے لیکن اگر امام صاحب کے قول پر فتوی دیا جائے (سود لینے کی اجازت دی جائے) تو قوی احتمال ہے کہ حدود شرعیہ کی حرمت وشناعت کا جو تصور مسلمانوں میں ہے یا ہونا چاہیے بتدریج وہ ختم ہو جائے گا اور سود کا دروازہ کھل جائیگا اور یہ اتنا بڑا مفسدہ ہے کہ تنہا اسکی حرمت کیلئے کافی ہے۔

رہا آپکا مسئلہ تو اسکی نوعیت کچھ اور ہے کیونکہ آپ نے خود یہ سودی معاملہ نہیں کیا ہے بلکہ آپکو یہ رقم میراث میں ملی ہے، لہٰذا اسو د جیسا حرام کہنا مشکل ہے تاہم اگر زیادہ ورع اور تقوی پر عمل کرنا چاہے تو سود کے بقدر بلا نیت ثواب صدقہ کرلیں۔

لمافی الدرمع الرد:(۵/۹۸-۹۹،طبع سعید)

وفی حظر الاشباه الحرمة تتعدد مع العلم بها الا فی حق الوارث، وقیده فی الظهیرة بأن لا یعلم أرباب الاموال. وفی الشامیة:(قوله الا فی حق الوارث الخ)ای فانه اذا علم ان کسب مورثه حرام یحل له، لکن اذا علم المالک بعینه فلا شک فی حرمته ووجوب رده علیه...... وفی منیة المفتی:مات رجل ویعلم الوارث ان اباه یکسب من حیث لا یحل ولکن لا یعلم الطالب بعینه لیرد علیه حل له الارث والافضل ان یتورع ویتصدق بنیة خصماء ابیه اھ.

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفر ہ اللہ

۱۲ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۹۷۳

﴿باب الوکالۃ﴾

﴿وکالت بالمعصیۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے ایک صاحب نے کچھ پیسے دیئے ہیں کہ فلاں مزار پر رکھ دوں۔ اب سوال یہ ہے کہ میں ان پیسوں کو مزار پر رکھ دوں یا خود ہی کسی فقیر کو دوں یا ان پیسوں کو ان کے مالک کے حوالے کر دوں؟

﴿جواب﴾ مزاروں پر پیسے رکھنا بدعت ہے آپ اس شخص کی طرف سے اگر پیسے مزار پر رکھیں گے تو تعاون علی المعصیہ شمار ہوگا، اور اگر اپنی صوابدید پر کسی فقیر کو دے دیئے تو اصل مالک کو

بتانا ضروری ہوگا، پھر اگر اس کو منظور ہوا تو ثواب ملے گا، اور اگر وہ راضی نہیں تھا تو پیسے واپس مالک کو لوٹانا آپ کے ذمہ ہوگا اور صدقہ کا ثواب صرف آپ کو ملے گا۔

لما فی الشامی :(۲/۴۳۹،طبع:ایچ ایم سعید)

واعلم ان النذر الذی یقع للاموات من اکثر العوام وما یؤخذ من الدراہم والشمع والزیت ونحوھا الیٰ ضرائح الاولیاء الکرام تقرباً الیہم فھو باالاجماع باطل وحرام ما لم یقصدوا صرفھا للفقراء الانام وقد ابتلی الناس بذلک.

ولما فی الفقہ الاسلامی وادلتہ :(۴۰۷۱/۵)کتاب الوکالۃ

ولا یجوز التوکیل فی المعصیۃ اولمحرم کالظھار ،فلا یوکل من یظاھر عنہ زوجتہ،لانہ منکر ومعصیۃ

ولما فی المحیط البرھانی:(۴۳/۱۵)طبع ادارۃ القرآن

ولو قال تصدق بھا علی مساکین اھل خراسان فتصدق بھا علی النبط فھو ضامن،لانہ سمی لہ جنس مخالف.

ولما فی الھدایہ:(۳/۳۰۶)طبع رحمانیہ

ولا یجوز الاستیجار علی الغناء والنوح وکذاسائر الملاھی لانہ استیجار علی المعصیۃ والمعصیۃ لا تستحق باالعقد.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد جاوید غفرلہ ولوالدیہ

۶ صفرالخیر ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر:

﴿مباح امور میں وکالت جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو مثلاً تیس ہزار روپے خرچے کیلئے دیئے اور اس سے کہا کہ فلاں پہاڑ پر جاؤ اور باز شکار کر کے لے آؤ، باز دونوں کا مشترک ہوگا کیا از روئے شرع شکاری کو باز میں شریک کرنا جائز ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔ مستفتی ایک مولوی صاحب ضلع ٹانک

﴿جواب﴾ شرکت چونکہ وکالت کو متضمن ہوتی ہے اور وکالت مباح امور میں صحیح نہیں ہے شکار بھی مباح امور میں سے ہے جو بھی باز شکار کرے اسی کا ہو جاتا ہے لہٰذا یہ شرکت فاسد ہے اور شکار کے سلسلہ میں خرچہ کیلئے پیسے دینا تعاون بالعاوضہ کے درجے میں تھا لہٰذا تیس ہزار روپے لینے والے نے اگر شکار کے ذریعہ کچھ حاصل کیا ہے تو وہ اسکا اپنا حق ہے رقم دینے والے کا کوئی

حق نہیں بنتا، البتہ جس غرض سے اس نے رقم دی تھی شریعت چونکہ اس کو منع کرتی ہے اس لئے اپنی رقم کا حق رکھتا ہے پوری رقم اس کو واپس لوٹا دینا ضروری ہے۔

لما فی التنویر مع الدر (۶/۵۰۱،۵۰۲،طبع امدادیہ)

(لاتصح شرکة فی احتطاب واحتشاش واصطیاد واستقاء وسائر مباحات) کاجتناء ثمار من جبال وطلب معدن من کنز وطبخ آجر من طین مباح لتضمنها الوکالہ، والتوکیل فی اخذ المباح لایصح (وما حصله احدهما باعانة صاحبه فله ولصاحبه اجر مثله بالغا مابلغ عند محمدؒ وعند ابی یوسفؒ لایجاوز به نصف ثمن ذلک)

ولما فی الشامی (۶/۵۰۲،امدادیہ)

(باعانة صاحبه) سوآء کانت الاعانة بعمل کما اذا اعانه فی الجمع والقلع اوالربط اوالحمل اوغیره اوبآلة کما لودفع له بغلا اوراویة یستقی علیها اوشبکة یصید بها.

ولما فی البحر (۵/۵۰۲،طبع ایچ ایم سعید)

ولاتصح شرکة فی احتطاب واصطیاد واستقاء لان الشرکة متضمنة معنی الوکالة والتوکیل فی اخذ المباح باطل لان امر الموکل به غیر صحیح والوکیل یملکه بدون امره فلایصح نائبا عنه (وعلی الصفحة المتصله) (قوله) والکسب للعامل وعلیه اجر مثل مالآخر لوجود السبب منه وهو الاخذ والاحراز.

ولما فی الهدایه (۲/۶۱۳،طبع رحمانیه)

ولا یجوز الشرکة فی الاحتطاب والاصطیاد وما اصطاده کل واحد منهما او احتطبه فهو له دون صاحبه وعلیٰ هذا الاشتراك فی اخذ کل شئی مباح لان الشرکة متضمنة معنیٰ الوکاله والتوکیل فی اخذ المال المباح باطل لان امر الموکل به غیر صحیح والوکیل یملکه بدون امره فلا یصح نائبا عنه وانما یثبت الملک لهما بالاخذ واحراز المباح فان اخذاه معا فهو بینهما نصفان لاستوائهما فی سبب الاستحقاق وان اخذه احدهما ولم یعمل الآخر شیأ فهو للعامل وان عمل احدهما واعانه الآخر فی عمله بان قلعه احدهما وجمعه الآخر وقلعه وجمعه وحمله الآخر فللمعین اجر المثل.

ولما فی البدائع (۷/۱۵ع علمیه بیروت)

ماتجوز فیه الوکالة تجوز فیه الشرکة ومالاتجوز فیه الوکالة لاتجوز فیه الشرکة وعلیٰ هذا تخرج الشرکة بالاعمال فی المباحات من الصید والحطب والحشیش فی البراری (وعلیٰ هذه الصفحة) فان عمل احدهما واعانه الآخر فی عمله بالجمع والربط فذلک کله للعامل ولا شئی للمعین لوجود السبب من العامل دون المعین وللمعین اجر مثله.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن صاحب عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد دیروی

۲۴ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۸۲

﴿ویزا دلوانے پر کمیشن لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ابوظہبی میں ملازمت کرتا ہے. تو وہاں کی ایک کمپنی کو پانچ مزدوروں کی ضرورت پیش آئی. کمپنی والوں نے اس شخص سے کہا کہ آپ پانچ آدمیوں کا بندوبست کرو ویزے ہم فراہم کرتے ہیں۔ اس شخص نے پاکستان کہ ایک آدمی سے کہا کہ آپ پانچ آدمی بھیج دو میرے پاس پانچ ویزے ہیں اور ہر ایک ویزا پر اتنی رقم لے لوں گا اس پاکستانی آدمی نے یہاں کے لوگوں سے کہا کہ میرے پاس پانچ ویزے ہیں اور فی ویزا اتنے کا ہے جس کو ضرورت ہو لے لو۔

اب عرض مسئلہ یہ ہے کہ ابوظہبی میں کمپنی کی جانب سے فراہم کردہ ویزوں پر یہ دونوں آدمی الگ الگ کمیشن وصول کرتے ہیں تو کیا ان دونوں کیلئے یہ کمیشن وصول کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ ویزا پہنچانے اور مناسب آدمیوں کا انتظام کرنے میں ظاہر بات ہے. کہ دونوں کو کچھ محنت یا تگ ودو کرنی پڑتی ہے اسلئے کمیشن لینا دونوں کیلئے جائز ہے بشرطیکہ پہلے سے طے شدہ ہو غلط بیانی اور دھوکہ دہی نہ ہو۔

لما فی الشامی:(٦٣/٦'مطلب فی أجرة الدلال طبع سعید)

[تتمہ] قال فی التاتر خانیة:وفی الدلال والسمسار یجب أجر المثل" وما تواضعوا علیه أن فی کل عشرة دنانیر کذا فذاك حرام علیهم وفی الحاوی: سئل محمد بن سلمه عن أجرة السمسار فقال:أرجوأنه لا بأس به وان کان فی الأصل فاسدا لکثرة التعامل وکثیر من هذاغیر جائزفجوزوه لحاجة الناس الیه کدخول الحمام و عنه قال:رأیت ابن شجاع یقاطع نساجا ینسج له ثیابا فی کل سنة

ولما فی الدرمختار:(١٥/٦،طبع سعید)

وکذا کل من لعمله أثرومالاأثرله کحمال له ا الأجر لما فرغ وان لم یسلم بحر

ولما فی الدر مع الرد:(٥٦/٣'طبع سعید)

وان سعی بینهما وباع المالک بنفسه یعتبر العرف وتمامه فی شرح الوهبانیة.(قوله یعتبر العرف) فتجب الدلالة علی البائع أو المشتری أو علیهما بحسب العرف جامع الفصولین.

ولما فی المحیط البرهانی:(٢٥١/١١'طبع ادارة القرآن)

و"فی فتاوی أبی اللیث رحمه الله" اذا قال لدلال:اعرض ضیعتی وبعها علی أنک اذا بعتها فلک من الأجرکذافلم یقدر الدلال علی اتمام ا لأمر'فباعها دلال أخرقال الفقیه أبو القاسم رحمه الله: ان کان الأول قد عرضها وذهب له فی ذلک روزگار یعتد به فأجر

فلمثل له راجب بقدر عناه وعمله وكذا في فتاوى العالمكيرى (٤/٥٩١ الباب السادس عشر)

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۹۱۹

﴿وکیل کے پاس موکل کا مال امانت ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کو کسی نے کچھ رقم دے کر کام پر بھیجا۔ کہ فلاں جگہ جاؤ اور یہ کام کرو۔ زید نے اس کام میں پوری رقم خرچ نہیں کی، بلکہ کچھ پیسے ان کے پاس بچ گئے۔ اور زید نے اسے اپنے استعمال میں لائے یعنی اپنے جیب میں ڈال دئے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ زید کے لئے یہ رقم استعمال میں لانا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زید کو اس شخص نے کسی خاص کام کو انجام دینے کیلئے یہ رقم دی تھی تو زید اس شخص کا شرعاً وکیل شمار ہوتا ہے۔ اور رقم اس کے پاس امانت ہے، لہٰذا کام کے سلسلے میں جو رقم خرچ ہوئی وہ تو اس شخص کی اجازت سے خرچ ہوئی، اس کے علاوہ جتنی رقم باقی ہے، پوری واپس کرنا ضروری ہے۔ اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے۔ اگر خرچ کی ہے تو اتنی رقم اپنی طرف سے ادا کرنا اس کے ذمہ ہے۔

لما في شرح المجلة: (٢/٢٠٢/طبع رشيدية)

اعلم ان الوكالة من العقود الجائزة الغير اللازمة ـــ والوكيل امين فيما في يده كالمودع فيضمن بما يضمن به المودع ويبراء به.

ولما في الفقه الاسلامي وادلته: (٥/٤١١٩/طبع رشيدية)

اتفق الفقهاء على ان المقبوض في يد الوكيل يعتبر امانة بمنزلة الوديعة ونحوها. لان يده نيابة عن الموكل بمنزلة يد الوديع فيضمن بما يضمن في الودائع ويبرء بما يبرء فيها.

ولما في تفسير المظهري: (٢/١٤٨/رشيدية)

تحت قوله تعالى "ان الله يامركم ان تؤدوا الامانات الى اهلها" ان الاية بعموم لفظها يفيد وجوب اداء كل امانة الى اهلها. عن انس قال قلما خطبنا رسول الله ﷺ الا قال لا ايمان لمن لا امانة له ولا دين لمن لا عهد له. وفي صحيحين عن ابي هريرة وعبدالله بن عمرو مرفوعا انه ﷺ ذكر من علامات النفاق اذا اؤتمن خان.

(فائده): ليس اداء الامانة منحصرا في ما ل الوديعة ونحو ذلك بل كان كل حق لاحد على احد امانة يجب اداؤه لاهله كما يدل عليه سبب نزول هذه الاية

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: ختظم خان غفرلہ ولوالدیہ

۴ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ

﴿وکیل مؤکل کی خلاف ورزی پر مال کا ضامن ہوگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں نے اپنے ایک بااعتماد دوست جناب بلال سوریا صاحب سے کاروبار کے متعلق مشورہ کیا انہوں نے بیپر کے کاروبار کا مشورہ دیا، میں نے کہا کہ میرا اس میں بالکل تجربہ نہیں ہے اس پر انہوں نے مال خریدنے اور بیچنے کی ذمہ داری خود لے لی، ہم نے کاروبار شروع کیا، جب انہوں نے بیپر بھیج دیا تو وہ پرائم کوالٹی (Prime Quality) کے بجائے کباڑ کا مال تھا اور اسمیں ایک کنٹینر بھی تبدیل ہوگیا تھا، کباڑ کا مال ہونے کی وجہ سے اس پر کسٹم کے اخراجات بھی زیادہ آئے اس پر میں نے کہا کہ بلال صاحب یہ مال تو پرائم کوالٹی نہیں ہے کباڑ مال ہے، اور اس پر باقاعدہ (Stock Lot) کباڑ مال کی مہر بھی لگی ہوئی تھی، وہ بھی حیران ہو گئے اور کہا آپ فکر نہ کریں مال اپنے گودام میں رکھیں میں خود اس کو نکالنے کا بندوبست کرتا ہوں اور آپ بھی گاہک تلاش کریں، چونکہ مال واپس بھیجنا تو ممکن نہیں ہوتا اس لئے میں نے مال پورٹ سے نکلوایا جس پر بڑا خرچہ آیا اور اصل رقم میں نے پہلے ادا کردی تھی، چنانچہ وہ مال 83 روپے فی کلو پڑا، بلال سوریا صاحب نے مال 50 روپے فی کلو فروخت کرنا شروع کیا اب بھی کچھ مال باقی ہے۔

غرض مسئلہ یہ ہے کہ یہ نقصان جو ہوا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ میرے ذمہ ہے یا بلال سوریا صاحب کے ذمہ ہے؟

مستفتی: چوھدری منور حسین

﴿جواب﴾ بلال سوریا صاحب کے ساتھ آپ کا معاملہ توکیل کا ہوا ہے یعنی آپ نے بلال سوریا کو پرائم کوالٹی مال خریدنے کا وکیل بنایا تھا، وکیل پر اسی صفت ونوعیت کا مال لینا لازم ہوتا ہے جس طرح مؤکل کو مطلوب ہوتا ہے، ورنہ مال کی پوری ذمہ داری وکیل کی خود کی ہوجاتی ہے۔

آپ کو پرائم کوالٹی کا مال مطلوب تھا اور بلال سوریا نے آپ کو مال روانہ کرتے ہوئے باور کرایا تھا کہ مال پرائم کوالٹی کا ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ظاہر ہوئی، پھر آپ نے بروقت اس کی شکایت بھی کی، تو اس صورت میں یہ پورا مال شرعاً بلال سوریا صاحب کا شمار ہوتا ہے۔

لہذا آپ نے اس مال کے سلسلہ میں جو رقم بلال سوریا صاحب کو دی تھی اسی طرح پورٹ سے نکالنے پر جو خرچہ آیا تمام بلال سوریا صاحب کے ذمہ ہے، اور بلال صاحب نے 50 روپے

میں فی کلو جو فروخت کیا یا آپ نے اس کی اجازت سے اس کا مال فروخت کیا یہ رقم بلال صاحب کی ہے، بلال صاحب کے مال کی رقم اگر آپ نے وصول کی ہے تو یہ آپ اپنی رقم کے بدلے وصول سمجھیں اور اپنی زائد باقی رقم کا آپ بلال سوریا صاحب سے مطالبہ کریں۔ شرعاً ان پر لازم ہے کہ آپ کی باقی ماندہ رقم وہ واپس کر دیں، اگر دنیا میں انہوں نے حساب بے باک نہیں کیا تو آخرت میں ایسے تمام معاملات کا حساب بلاشبہ ہونے والا ہے۔

لما في الهندية:(۳/۵۷۴،طبع:رشيديه كوئٹه)

التوكيل بالشراء اذاكان مقيدابراعى فيه القيداجماعاسواء كان القيدراجعا الى المشترى او الى الثمن حتى انه اذا خالف يلزمه الشراء.

ولما في الشامي:(۵/۵۲۲،طبع:سعيد كراچى)

ومنهم من يجوزبيعه كيفما كان وكذا شرائه على المعروف وهو المضارب وشريكا العنان او المفاضة والوكيل بالبيع المطلق يجوزبيع هؤلاء عند ابى حنيفة رحمةالله عليه بما عزوهان وعندهما لايجوزالا بالمعروف واما شرائهم فلايجوزالاعلى المعروف اجماعا فان اشترى بخلاف المعروف والعادةاو بغير النقودنفذشرائهم على انفسهم وضمنوامانقدوافيه من مال غيرهم اجماعا.

ولما في الهداية:(۳/۱۹۷،طبع:رحمانيه لاهور)

قال والوكيل بالشراء يجوز عقده بمثل القيمة وزيادةيتغابن الناس فى مثلها ولا يجوزبما لايتغابن الناس فى مثله لان التهمة فيه متحققة فلعله اشتراه لنفسه فاذالم يوافقه الحقه بغيره.

ولما في تبيين الحقائق:(۵/۲۵۶،طبع:سعيد كراچى)

(ولهذا لو وجد المؤكل به عيبا يرده عليه)اى وله ان يرجع بنقصان العيب اذا هلك عند المؤكل.

ولمافي شرح المجلة للأتاسي:(۴/۴۱۵،طبع:رشيديه كوئٹه)

وكذاجاز ان يكون المؤكل وكيلا عن الوكيل ورب المال عن المضارب.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷۴۲

﴿مؤکل سے اجازت لئے بغیر وکیل دوسرے کو وکیل نہیں بنا سکتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کسی کا مقروض تھا اس نے ایک اور آدمی کو وکیل بنایا کہ وہ پیسے اس تک پہنچائے۔ وکیل کسی عذر کی بناء پر خود نہ

جاسکا اس نے پیسے اپنے بھائی کے سپرد کئے کہ فلاں شخص جو کہ دائن ہے میرے موکل کا یہ پیسے اس تک پہنچا دینا اس نے پیسے لے لئے لیکن ہوا یہ کہ راستے میں کسی نے اسکی جیب کاٹ دی اور پیسے لے گیا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ مال کا ضمان کس پر آئیگا؟ برائے کرم شریعت مطہرہ کا جو بھی حکم ہو مطلع فرما کر عند اللہ ماجور ہوں

مستفتی: نورالرحمٰن پشاور

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں مقروض شخص نے دوسرے شخص کو پیسے قرض خواہ تک پہنچانے کیلئے وکیل مقرر کیا، لہٰذا یہ پیسے اس وکیل کے پاس امانت تھے، پھر اسی وکیل نے موکل کی اجازت کے بغیر اپنے بھائی کو وکیل بنا کر دیدیئے تو یہ امانت میں تعدی یعنی زیادتی کے مترادف ہے لہٰذا ضمان بھی اسی وکیل اول پر لازم ہوگا۔

ولما فی البحر: (٢٧٤/٧ طبع: سعيد)

وان حفظها بغيرهم ضمن اى ان حفظها بغير من فى عياله ضمن فا فادان المودع لا يودع فان اودع فهلكت عندالثانى ان لم يفارق الاول لاضمان على واحد منهما وان فارقه ضمن الاول عندابى حنيفه ولا يضمن الثانى ـــــ كما لو قال له احفظها فى هذه الدار فحفظها فى دار اخرى فانه يضمن الا اذا كانت الدار الاولى

ولما فى فتاوى الهنديه: (٣٣٨/٤ طبع: رشيديه)

واذ تعدى المودع فى الوديعة بان كانت دابة فركبها... اواودعها عند غيره..... وهذا اذكان الركوب والاستخدام واللبس لم ينقصها اما اذا نقصها ضمن كذا فى الجوهرة

ولما فى الشامى: (٦٦٣/٥ طبع: سعيد)

(قوله ضمن) اى بدفعها له وكذا لوتركه فى بيته الذى فيه ودائع الناس وذهب فضاعت ضمن بحر عن الخلاصة.

لما فى الدر: (٦٦٣/٥ طبع: سعيد)

(و) جاز (لمن فى عياله الدفع لمن فى عياله لونهاه عن الدفع الى بعض من فى عياله فرفع ان وجد بدا منه (ضمن والا) وان حفظها بغيرهم ضمن)

لما فى الفتح: (٥١٨/٨ طبع: رشيديه)

(ومن اودع رجلا وديعة فاودعها اخر فهلكت فله ان يضمن الاول وليس له ان يضمن الثانى وهذا عند ابى حنيفة

لما فى البدائع (٢٥٧/٨ طبع: قديمى)

منها ترك الحفظ لانه بالقصد التزام حفظ الوديعة على وجه لوترك حفظها حتى هلكت يضمن بدلها.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ

١٧ ذیقعدہ ١٤٣٣ھ — فتوی نمبر: ٣٨٩٠

﴿فروخت کنندہ کا وکیل کو کچھ رقم چھوڑنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک محلہ میں بچوں کو پڑھاتا ہے، شریف حسین نے اس کو کہا کہ قاری صاحب آپ میرے لئے ایک سائیکل خرید لیں آپ زیادہ جانتے ہیں، قاری صاحب نے جس شخص سے سائیکل خرید لی تو اس شخص نے قاری صاحب کے لئے تعلق کی وجہ سے پانچ سو روپے چھوڑ دیئے یعنی اڑھائی ہزار میں سائیکل دے دی جبکہ مارکیٹ میں وہی سائیکل تین ہزار روپے سے کم میں نہیں ملتی، براہ کرم قاری صاحب کو شرعاً حق حاصل ہے کہ وہ شریف حسین سے تین ہزار روپے وصول کریں؟ اس لئے کہ یہ رعایت خاص تعلق کی بنیاد پر قاری صاحب کے ساتھ ہوئی ہے۔　　　مستفتی فیض محمد ابوبکر مسجد

﴿جواب﴾ سائیکل کی قیمت میں کمی اگر چہ خاص تعلق کی بنیاد پر ہوئی ہے لیکن یہ بیع میں رعایت ہے قاری صاحب وکیل تھے خریداری شریف کے لئے کی ہے، اس لئے جتنے کی سائیکل لی ہے اتنی رقم یعنی اڑھائی ہزار روپے ہی وصول کرنے کا اس کو حق حاصل ہے، تین ہزار روپے کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے۔

لما فی شرح المجلة (۲۷۸/۴، طبع: رشیدیة)

وذكر في الدر وحواشيه ان البائع لو وهب كل الثمن للوكيل رجع الوكيل بكله على المؤكل ولو وهبه بعضه رجع بالباقي فلو كان الثمن الفا فوهب له النصف ثم وهب له النصف الآخر لا يرجع الوكيل على الأمر الا بخمس مائة الاخرى، لان الاولى حط والثاني هبة وهذه المسئلة مبنية على ما تقدم في البيوع ان هبة بعض الثمن حط لا هبة كله لان الحط يلتحق باصل البيع وفي حط البعض يبقى البيع بالباقي فيرجع به على مؤكله ولو جعل هبة الكل حطا لصار بيعا بلا ثمن فيفسد به البيع فلذلك جعل هبة مبتدأة للوكيل فيرجع على المؤكل بالثمن المعقود عليه فلو وهبه اياه بدفعتين او اكثر كان ما قبل الاخير حطا وكانت الهبة الاخيرة مبتدأة فيرجع على المؤكل بقدرها اه.

ولما فی البحر الرائق: (۱۵۵/۷ طبع سعید)

ولو امر رجلا ان يشتري له جارية بألف فاشتراها ثم ان البائع وهب الالف من الوكيل فللوكيل ان يرجع على الامر ولو وهب منه خمس مائة لم يكن له ان يرجع على الأمر الا بخمس مائة ولو وهب منه خمس مائة لم يكن له ان يرجع على الأمر الا بخمسة مائة ولو وهب منه خمسمائة ثم وهب منه ايضا الخمسمائة الباقية لم يرجع ولو وهب منه ثم منه ايضا الخمس مائة الباقية لم يرجع الوكيل على الأمر الا بالخمس مائة الاخرى لان

الاول حط والثانی ہبۃ

ولما فی الدرالمختار :(۵/۲۱۲،طبع سعید کراچی)

ولو وهبه کل الثمن رجع بکله ولو بعضه رجع بالباقی لانه حط بحرہ۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: کتبہ: شاہد خان سواتی غفراللہ لہ

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۱۱۳

﴿وکیل کا کمیشن وصول کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام درپیش مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے عبداللہ سے فون پر کسی کتاب کی قیمت دریافت کی، جس پر عبداللہ نے مکتبہ والے سے رابطہ کر کے ان کو ۲۵۰۰ روپے بتادیئے، پھر چونکہ مکتبہ والے سے عبداللہ کے تعلقات تھے، لہٰذا اس نے وہ کتاب ۲۵۰۰ کے بجائے ۲۴۰۰ میں خرید لی اور ۱۰۰ روپے بطور کمیشن اپنی جیب میں ڈال دیئے۔کیا یہ کمیشن عبداللہ کیلئے جائز ہے؟ برائے مہربانی شریعت اسلامیہ کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں

﴿جواب﴾ "بیع وشراء" کی مذکورہ بالا صورت میں چونکہ عبداللہ زید کا وکیل بن رہا ہے اور وکیل کا اپنے لئے نفع رکھنا درست نہیں، کیونکہ اصول شرعیہ کی روشنی میں اگر وکیل معاملہ کم قیمت میں طے کرے تو بقیہ رقم مؤکل کو لوٹانا ضروری ہے، لہٰذا اس معاملہ میں عبداللہ کا اپنے لئے کمیشن رکھنا جائز نہیں ہے۔البتہ عبداللہ کا یہی کام اگر ہو یعنی لوگوں کو کمیشن پر کتابیں دلوانا اور زید کو اسکا علم بھی ہو تو ایسی صورت میں عبداللہ کی حیثیت محض وکیل کی نہیں، بلکہ ایک بروکر اور ایجنٹ کی ہوگی اور مذکورہ معاملہ اجارہ شمار ہوگا، لہٰذا اب کمیشن جائز ہوگا۔

لما فی الهندیه : (۳ / ۵۸۸ طبع رشید یه کوئٹه)

وان حط البائع عن الوکیل بعض الثمن فانه یحطه عن الموکل، ولو حط البائع جمیع الثمن لایظهر ذلک فی حق الموکل حتی کان للوکیل ان یرجع علی الموکل بجمیع الثمن .

لما فی فتح القدیر : (۷ / ۲۶۵ طبع رشید یه کوئٹه)

وقد صح ان النبی ﷺ وکل حکیم بن حزام ... واعطاه النبی ﷺ دینار أیشتری اضحیة او شاة فاشتری شاتین فباع احدا هما بدینار وأتاه بشاة ودینار فدعاله بالبرکة ...

لما فی الفقه الاسلامی وادلته : (۵ / ۰۵۸ طبع رشید یه کوئٹه)

تصح الوکالة بأجر وبغیر أجر لان النبی ﷺ کان یبعث عماله لقبض الصدقات ویجعل لهم عمولة ... فان کانت الوکالة بغیر أجر فهی معروف من الوکیل، لماذا کانت الوکالة

باجرای یجعل فحکمها حکم الاجارة ، فیستحق الوکیل الجعل بتسلیم ماوکل فیه الی المؤکل ان کان مما یمکن تسلیمه .

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۱۷/۱۱/۱۴۳۳ھ   فتویٰ نمبر: ۴۸۷۵

﴿مبیع کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو وکیل کے لیے حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے متعلق کہ ایک شخص نے مجھے کھجور خرید کر لانے کا کہا، جب میں خرید کر لایا تو وہ موجود نہیں ہے اور اندیشہ ہے کہ کھجور خراب اور ضائع ہو جائیگی تو اب میرے لیے شرعاً کیا حکم ہے، کھجوریں کھالوں یا خراب ہوتی رہیں؟

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں آپ کی حیثیت وکیل کی ہے اور شرعاً وکیل کے قبضہ میں جو چیز ہوتی ہے اس کا حکم امانت اور ودیعت کا ہے اور ودیعت کے متعلق فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر ودیعت ایسی چیز ہو کہ اس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے اور مودع (یعنی امانت رکھنے والا) غائب ہے یا اس سے رابطہ بہت مشکل ہے تو ایسی صورت میں مودع (یعنی جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے) کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ قاضی اور حاکم کو اس صورتحال سے آگاہ کرے تاکہ وہ اس چیز کو بیچ دے۔ اور اگر قاضی تک رسائی مشکل ہو تو علماء کرام یا محلہ کے چند دیندار لوگ اس چیز کی قیمت طے کریں تاکہ اس چیز کو بیچ کر پیسے اس کے لیے محفوظ رکھیں، آپ چونکہ کھجور خود خرید کر لائے ہو تو قیمت متعین کرنے کے لیے قاضی یا جرگہ کی مدد لینے کی ضرورت نہیں ہے لہذا کسی دوسرے کو فروخت کر دیں اور اگر خود استعمال کر کے اس شخص کو بعد میں پیسے دے دیں تو اس کی بھی گنجائش معلوم ہو رہی ہے، لیکن اس طرح چھوڑ کر اگر خراب ہونے دیں تو یہ مناسب نہیں ہے اگرچہ ضائع ہونے کی صورت میں آپ کے ذمہ تاوان واجب نہیں ہے۔

لما فی الدر المختار:(۶۷۵/۵ طبع: سعید)

خیف علی الودیعة الفساد رفع الامر للحاکم لیبیعه، ولو لم یرفع حتی فسد فلا ضمان

ولما فی الهندیه:(۳۴۹/۴ طبع: قدیمی کتب خانه)

وفی فتاوی ابی اللیث: اذا کانت الودیعة شیئا یخاف علیه الفساد، وصاحب الودیعة غائب فان رفع الامر الی القاضی حتی یبیعه جاز وهو الاولی، وان لم یرفع حتی فسدت لا ضمان علیه لانه حفظ الودیعة علی ما امر به کذا فی المحیط، وان لم یکن فی البلد

قاض باعها وحفظ ثمنها لصاحبها كذا في السراج الوهاج.

ولما في شرح المجلة:(۲/۲۵۵طبع: سعيد)

اذا كان صاحب الوديعة غائبا غيبة منقطعة بحيث لم يعلم موته ولا حياته يحفظها المستودع الى ان يعلم موت صاحبها أو حياته. وانما اذا كانت الوديعة مما يفسد بالمكث يبيعها المستودع باذن الحاكم ويحفظ ثمنها امانة عنده. لكن اذا لم يبعها فسدت بالمكث لا يضمن.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٹکی

۲۶ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر: ۳۲۲۵

﴿سبزی منڈی میں کمیشن پر وکالت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید سبزی منڈی میں مزدوری کرتا ہے اور وہاں پر بہت سے سبزی فروشوں کے ساتھ اس کی جان پہچان بھی ہے، جب اس کے علاقہ کا کوئی دکاندار سبزی خریدنے سبزی منڈی آتا ہے، تو اس کو کسی متعین سبزی فروش کے پاس بھیج دیتا ہے کہ فلاں سبزی فروش سے فلاں سبزی (توری) جو کہ وہ ۱۰ روپے فی کلو دیتا ہے، ۳۰ کلو میرے لئے خرید لو اور ساتھ ۳۰۰ روپے بھی دیدیتا ہے۔ جب زید سبزی فروش کے پاس سبزی خریدنے چلا جاتا ہے تو سبزی فروش اس کیلئے رعایت کر لیتا ہے اور فی کلو دو روپیہ کم کر کے آٹھ روپے کا کلو لگا لیتا ہے جس کی وجہ سے ۳۰۰ میں سے ۶۰ روپے بچ جاتے ہیں اور یہ تقریباً روزانہ کا معمول ہے تو کیا زید کے لئے یہ بقایا رقم خود لینا جائز ہے یا جس نے بھیجا تھا اس کو واپس کرنا ضروری ہے؟ جبکہ اگر وہ خود خریدتا تو فی کلو ۱۰ روپے کا ملتا، اور اگر زید سے پورے ۳۰۰ روپے لیکر بعد میں اس میں سے کچھ رقم بطور چائے وغیرہ دے تو پھر کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ زید کا معاملہ علاقہ کے دکاندار کے ساتھ وکالت کا ہے، وکیل جتنی رقم کی وہ چیز خریدتا ہے مؤکل سے اتنی ہی رقم وصول کر سکتا ہے۔ سبزی فروش کی رعایت کا زید جو کہ وکیل ہے حقدار نہیں بنتا، البتہ سبزی فروش یہ رعایت کمیشن کے طور پر زید کے ساتھ اگر کرتا ہے تو یہ دو روپے فی کلو سبزی فروش کیطرف سے کمیشن میں شمار ہو سکتا ہے گویا سبزی فروش نے پورے دس روپے کا فی کلو دیدیا ہے اور اپنی طرف سے فی کلو دو روپے کمیشن دیدیا۔

لیکن یہ تب ہو سکتا ہے کہ یا تو پہلے سبزی فروش کیساتھ زید نے طے کیا ہو یا سبزی منڈی میں

یہ ترتیب رائج ہو تو اس رعایت کو کمیشن قرار دیا جاسکے گا۔

لما فی التنویر الابصار (۵/ ۱۵۴، طبع سعید)

(والزیادۃ) والحط (یلتحقان بأصل العقد) بالاستناد.

ولما فی الشامی ۶۳/۶، طبع سعید

قال فی التاتارخانیہ: وفی الدلال والسمسار یجب أجر المثل، وماتواضعوا علیہ ان فی کل عشرۃ دنانیر کذا فذلک حرام علیھم. وفی الحاوی: سئل محمد بن سلمۃ عن أجرۃ السمسار، فقال: أرجو أنہ لابأس بہ وان کان فی الاصل فاسدالکثرۃ التعامل وکثیر من ھذا غیر جائز فجوزوہ لحاجۃ الناس الیہ کدخول الحمام.

ولما فی الدر المختار (۵/۶، طبع سعید)

وشرطھا کون الأجرۃ والمنفعۃ معلومتین لأن جھالتھما تفضی الی المنازعۃ.

ولما فی رسائل ابن عابدین (۱۱۲/۲، طبع مکتبۃ عثمانیہ)

(واعلم) ان اعتبار العادۃ والعرف رجع الیہ فی مسائل کثیرۃ حتی جعلوا ذلک اصلا فقالوا فی الأصول فی باب ما تترک بہ الحقیقۃ بدلالۃ الاستعمال والعادۃ ---- وفی شرح الاشباہ للبیری قال فی المشرع الثابت بالعرف ثابت بدلیل شرعی وفی المبسوط الثابت بالعرف کالثابت بالنص انتھی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صدیق انور

۲۵ جمادی الاولی ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۳۵۵

﴿وکالت سے معزول ہونے کا علم ہونا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حمید اللہ نامی ایک شخص نے مجھے 15000 روپے دے کر کہا کہ بازار سے فریج خرید کر لے آنا میں بازار چلا گیا تو حمید اللہ کا ارادہ کسی وجہ سے تبدیل ہو گیا اس نے میرے دوست سے کہا کہ اپنے دوست کو اطلاع دے کر کہ فریج نہ لے چونکہ میرے دوست نے مجھے بتایا نہیں، تو میں نے بحسب حکم فریج خرید کر لے آیا لیکن اب حمید اللہ لیتا نہیں وہ کہتا ہے کہ میں نے آپکے دوست کو کہا تھا کہ آپ کو اطلاع کرے کہ فریج مت خریدیں اس میں میری کوئی غلطی نہیں۔

جناب مفتی صاحب! آپ فرمائیں کہ از روئے شریعت وہ فریج کس کا بنتا ہے؟

﴿جواب﴾ فریج خریدنے سے پہلے آپ کو یہ اطلاع واقعی اگر نہیں پہنچی تھی کہ حمید اللہ نے

اب فرنیچ خریدنے سے آپ کو منع کیا ہے، تو ایسی صورت میں یہ فرنیچ حمید اللہ کا ہے، انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے، البتہ حمید اللہ اطلاع پہنچنے کا اگر دعوی کرتا ہے اور گواہوں کے ذریعہ سے ثابت کردے تو فرنیچ آپ کا ہوگا حمید اللہ کی پوری رقم واپس کرنا ضروری ہے

لما فی الشامی:(۵/۵۲۷،طبع:سعید)

فللموكل العزل متى شاء لو الوكالة دورية ما لم يتعلق به حق الغير كوكيل الخصومة بطلب الخصم بشرط علم الوكيل لو في طلاق وعتاق

ولما فی الهداية:(۲/۲۰۶،طبع:رحمانية)

للمؤكل ان يعزل الوكيل عن الوكالة لان الوكالة حقه فله ان يبطله الا اذا تعلق به حق الغير ......فان لم يبلغه العزل فهو على وكالته وتصرفه جائز حتى يعلم

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعد کوھائی

۱۵ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ فتوی نمبر: ۳۳۲۶

﴿شروع میں کوئی معاملہ صحیح کرے اور بعد میں غیر مشروع دکھانے کی کوشش کرے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے متعلق کہ میں نے ایک شخص کو وکیل بنایا (جو کہ ایک کمپنی میں بحیثیت مینیجر خریدار بھی تھا) کہ وہ ہمارے لئے مال خریدے اور ہمیں دکھائے، اس کے بعد دوسرا عقد ہم اسکے ساتھ کرتے تھے یعنی بطور مرابحہ اس کو فروخت کرتے تھے وہ خود چونکہ دوسری کمپنی میں مینیجر تھا تو اپنی کمپنی کے لئے ہم سے مال خرید لیتا اور یہ معاملہ اسی بنیاد پر تھا جیسے مرابحہ کے طور پر اسلامی بینک معاملات کرتے ہیں بعد میں اس وکیل نے خود ظاہر کر دیا کہ میں کوئی ایسا معاملہ نہیں کرتا تھا یعنی میں آپ کے لئے مال نہیں خریدتا تھا بلکہ آپ کو ذاتی مال دکھا کر کہتا تھا کہ آپ کے لئے خریدا ہے، آپ کی رقم میں اپنے ذاتی کاروبار میں استعمال کرتا تھا جبکہ ہم اپنا مال سمجھ کر واپس اس کو مرابحہ پر فروخت کرتے تھے۔

پوچھنا یہ ہے کہ اس نے جو ہمیں نفع دیا اور کچھ نفع اصل رقم کے ساتھ بقایا ہے یعنی اس کے ذمہ باقی ہے، اس نفع کا کیا حکم ہے کہیں یہ سود تو نہیں؟ مستفتی: فیصل جنید ڈیفنس فیز ۲ کراچی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص کا آپ کے ساتھ ایک عرصہ تک معاملہ کرنے کے بعد یہ کہنا معتبر نہیں کہ وہ آپ کے لئے مال نہیں خریدتا تھا بلکہ کمپنی کا مال یا ذاتی مال دکھا کر کہتا

تھا کہ آپ کے لئے خریدا ہے کیونکہ مذکورہ شخص کا ایک عرصہ تک معاملہ کرتے رہنا، اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ صحیح معاملہ کر رہا تھا، اب کافی عرصہ کے بعد معاملہ کی صحت کا انکار کرنا اپنی ہی تکذیب کرنا ہے جو کہ شرعاً معتبر نہیں، نیز مذکورہ شخص اس وجہ سے بھی متہم ہے کہ گویا وہ اس کاروبار سے آپ کو دیا ہوا نفع واپس لینا چاہتا ہے، لہٰذا آپ کے لئے حاصل شدہ منافع اپنے استعمال میں لانا درست ہے، البتہ یہ شخص چونکہ اب قابل اعتبار نہیں رہا، اس لئے آئندہ کے لئے اس کے ساتھ معاملہ کرنے سے گریز کیا جائے۔

لمافی المحیط البرھانی:(ج۱۲ص۲۰۰طبع ادارۃ القرآن کراچی)

وذکرفی آخر بیوع الزیادات: رجل اشتری من رجل عبداثم ان البائع ادعی انه کان فضولیافی هذاالبیع واراداسترداد العبد من یدالمشتری ذالک اوادعی المشتری ان البائع کان فضولیافی هذاالبیع وارادردالعبد واسترداد الثمن لایصح دعواه لان اقدامه علی هذاالعقداقرار منه بصحة هذاالعقدونفاذه ذالک بالملک له اوبالامر من المالک فالذی یدعی کونه فضولیافی البیع منکرنفاذه بعدمااقربه وانه تناقض ظاهروان اراد ان یقیم بینة علی ماادعی من کونه فضولیافی البیع لاتسمع بینته وکذالک لولم یکن له بینة وارادان یحلف صاحبه علی ماادعی من کونه فضولیافی البیع لیس له ذالک لان سماع البینة والتحلیف یترتب علی صحة الدعوی وهذه الدعوی لم تصح هاهنا لمکان التناقض.

ولمافی الهندیة:(۴/۷۱،طبع رشیدیه)

رجل اشتری من رجل عبداثم ان البائع ادعی لاتصح دعواه۔۔۔کذافی المحیط.

ولمافی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح:(ص۲۸۸طبع قدیمی)

وفی الشرح اذاامهم زماناثم قال انه کان کافراومعی نجاسة مانعة اوبلاطهارة ای متعمدا لیس علیهم اعادة لان خبره غیر مقبول فی الدیانات لفسقه باعترافه.کذافی الهندیة: (۱/۸۷،طبع رشیدیه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبدالوہاب لغمانی عفا اللہ عنہ

۱۵ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۸۴۵۶

﴿مؤکل اور وکیل کے درمیان مقدار مقبوض میں اگر اختلاف ہو جائے۔۔۔؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص (مؤکل) نے دوسرے (وکیل) کو پچاس (۵۰۰۰۰) ہزار روپے دے دیئے اور اس نے گنتی کئے بغیر لے لیے، اسکے بعد جب دیکھا تو چالیس (۴۰۰۰۰) ہیں، اب مؤکل اور وکیل کے

درمیان اختلاف ہوا مؤکل پچاس ہزار کا دعویدار ہے جبکہ وکیل چالیس ہزار لینے کا قائل ہے، اب فیصلہ کی نوعیت شرعاً کیا ہوگی؟ مستفتی: مولانا نور محمد عبدل خیل ڈیرہ اسماعیل خان

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں مؤکل اور وکیل کا پیسے دینے اور لینے میں اتفاق ہے، البتہ مقدار مقبوض (قبضہ شدہ رقم کی مقدار) میں اختلاف ہے ایسی صورت میں مدعی یعنی مؤکل اپنے دعوی کو گواہوں کے ذریعہ سے ثابت نہ کر سکے تو وکیل قسم کھانے سے بری الذمہ ہو جائیگا۔

لمافی الهداية: (۲/ ۲۷۵ طبع رحمانيه)

واذا كان مع المضارب الفان فقال دفعت الى الفاً وربحت الفاً وقال ربّ المال لابل دفعت اليك الفين فالقول قول المضارب...... لان الاختلاف فى الحقيقة فى مقدار المقبوض وفى مثله القول قول القابض ضميناً كان اوامينا لانه اعرف بمقدار المقبوض.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی عفا اللہ عنہ

۱۶ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ   فتوی نمبر ۱۲۱۷

﴿وکیل کا مؤکل کیساتھ نئے عقد پر مرابحہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میں ایک اسلامی بینک والوں کے پاس مرابحہ کے طور پر سامان لینے گیا تو انہوں نے مرابحہ کا طریقہ کار سمجھایا کہ آپ جا کر مارکیٹ سے اپنی ضرورت کا سامان بینک کیطرف سے وکیل کی حیثیت سے خریدلیں اور قبضہ کرلیں بینک کیساتھ کاغذی کاروائی مکمل کرنے کے بعد اپنے لئے خریداری کی نیت سے قبضہ کروگے جبکہ خریدا ہوا سامان میرے ہی قبضے میں ہوگا، بینک والوں نے نہ دیکھا ہوگا اور نہ بینک کے گودام میں لایا گیا ہوگا تو کیا یہ معاملہ جائز ہے؟ نیز یہ بیع قبل القبض کے حکم میں نہیں آتا؟

﴿جواب﴾ بلاشبہ ہر ایسی چیز جو قبضہ میں نہ آئی ہو بیچنا جائز نہیں، قبضہ میں آنے کے بعد ہی بیچنا جائز ہوتا ہے، البتہ مذکورہ صورت میں بینک نے جب آپ کو اپنی طرف سے خریداری کا وکیل بنایا اور آپ نے بینک کے وکیل ہونے کی حیثیت سے وہ چیز قبضہ میں لے لی تو آپ کا یہ قبضہ بینک ہی کا قبضہ شمار ہوا، اب اگر آپ بینک والوں کیساتھ بیع مرابحہ کرنا چاہتے ہیں تو نیا عقد کر کے اسی سامان پر اپنے لئے ہی قبضہ کریں تو یہ معاملہ درست ہو جائیگا۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵/۵۱۶،طبع سعید)

(هلك المبيع من يده قبل حبسه هلك من مال موكله ولم يسقط الثمن)لان يده كيده.

ولما فی فتح القدیر:(۸/۲۲،طبع رشیدیه)

(فان هلك المبيع في يده)اى في يدالوكيل(قبل حبسه)اى قبل حبس الوكيل المبيع (هلك من مال الموكل ولم يسقط الثمن)اى لم يسقط عن الموكل هذالفظ القدورى بمعنى ان هلاك المبيع في يدالوكيل قبل حبسه اياه لايسقط الرجوع على الموكل(لان يده)اى يدالوكيل(كيدالموكل فاذالم يحبسه)الوكيل(يصير الموكل قابضابيده)

ولما فی التنویر مع الدر:(۵/۲۲۰،طبع سعید)

(وصح لو)كان الكر قرضا(وامرمقرضه به)لانه اعارة لااستبدال (كما) صح (لوامر) المسلم اليه(رب السلم بقبضه منه له ثم لنفسه ففعل)كاكتاله مرتين لزوال المانع.

ولما فی فیض الباری:(۳/۲۱۹،طبع رشیدیه)

قالوا:انه لوباع فرسافي الصحراء فان كان المشترى يستطيع ان يقبضه بدون اعانة غيره تحقق القبض فكانهم نظروافيه الى المكنة فقط ورأوهاكالقبض.

وبالجملة ان التقبض في البيع والهبة والرهن يتحقق عندنابالتخلية والمكنة على القبض ولايحتاج الى القبض الحسى والنقل.

ولما فی فقه السنة:(۳/۱۲۲،طبع دارالکتب پشاور)

والقبض فيمايتمكن نقله كالطعام والثياب والحيوان ونحوذلك يكون على النحو الاتى اولاباستيفاء القدر كيلااووزناان كان مقدراثانيابنقله من مكانه ان كان جزافاً ثالثايرجع الى العرف فيماعداذلك.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۲۷ جمادی الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۰۳

﴿نوٹ﴾ اس فتویٰ کی تائید جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے بھی کرائی گئی ہے۔

﴿وکیل اپنی چیز موکل کو نہیں بیچ سکتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ میں نے ایک دوسرے آدمی کیساتھ شرکت پر موبائل خریدنے اور بیچنے کی دکان کھولی ہے کبھی مجھے ساتھی پیسے دیتے ہیں کہ ہمارے لئے فلاں کمپنی کا فلاں موبائل خریدو، تو میں وہی موبائل اپنی دکان سے لیکر دے دیتا ہوں تو کیا میرا یہ طریقہ شریعت کی نظر میں صحیح ہے؟ مستفتی: عمران

﴿جواب﴾ آپ کے ساتھیوں میں آپکا کاروبار اگر معروف ہے یعنی وہ یہ جانتے ہیں کہ آپ

موبائل کا باقاعدہ کاروبار کرتے ہیں تو انکا یہ کہنا کہ فلاں کمپنی کا موبائل ہمارے لئے خرید لو یہ وکالت کے درجہ میں نہیں ہے بلکہ آپ پر اعتماد کرتے ہوئے آپ سے ایک خاص کمپنی کا موبائل خریدنا چاہتے ہیں تو ایسی صورت میں آپ اپنی دکان سے لیکر انکو بیچ سکتے ہیں اور پسند نہ آئے تو بلا وجہ رد بھی کر سکتے ہیں۔

البتہ ساتھیوں کا مقصد باقاعدہ آپکو وکیل بنانا ہو یعنی محض آپ سے تعاون لینا چاہتے ہوں انکے ذہن میں یہ ہے کہ یہ محض ہمارے لئے ہی خرید کر اسی قیمت سے دیں گے تو ایسی صورت میں آپ وکیل ہیں اور وکیل کیلئے جائز نہیں کہ وہ اپنی ہی چیز اپنے مؤکل کو بیچے ایسی صورت میں آپ اپنے ساتھیوں کیلئے موبائل اپنے ہی دکان سے جس میں آپ کا حصہ ہے لیکر نہیں دے سکتے دوسری جگہ سے خرید کر دینا ضروری ہوگا اور انہیں لینا ضروری ہوگا پسند ہو یا نہ ہو۔

ولما فی التنویر مع الدر:(۵/۵۲۱ فصل لایعقد وکیل البیع الخ طبع سعید)

(مع من ترد شهادته له) للتهمة وجوزاه بمثل القيمة (الا من عبده ومكاتبه الا اذا اطلق له الموكل) كبع ممن شئت (فيجوز بيعه لهم بمثل القيمة) اتفاقا (كما يجوز عقده معهم باكثر من القيمة) اتفاقا اى بيعه لا شرائه باكثر منها اتفاقا ـــ وفى السراج لو صرح بهم صار اجماعا الا من نفسه وطفله وعبده غير المديون. وكذا فى الهداية: (۳/۱۲۹ طبع رحمانيه)

وفى الشامية: (قوله الا من نفسه) وفى السراج لو امره بالبيع من هولاء فانه يجوز اجماعا الا ان يبيعه من نفسه او ولده الصغير او عبده ولا دين عليه ـــ فلا يجوز قطعا وان صرح به الموكل منح الوكيل بالبيع لا يملك شرائه لنفسه لان الواحد لا يكون مشتريا وبائعا اھ منح.

ولما فى فتح القدير:(۸/۷۸ طبع رشيديه)

(والوكيل بالبيع والشراء لا يجوز له ان يعقد مع ابيه وجده ومن لا تقبل شهادته له) عند ابى حنيفه) والمراد بعدم جواز البيع والشراء مع هولاء عند ابى حنيفة عدم جواز ذلك عنده فى مطلق الوكالة اما اذا قيد الوكالة بعموم المشيئة بان قال بع ممن شئت فيجوز بيعه وشراءه مع هولاء بلا خلاف بخلاف البيع من نفسه او من ابن صغير له حيث لا يجوز وان قال ذلك كذا صرح به فى المبسوط ونقل عنه فى النهاية ومعراج الدراية وقالا يجوز بيعه منهم بمثل القيمة قال بعضهم تخصيص البيع بالذكر من قبيل الاكتفاء بذكره من الشراء والا ففيه خلاف ايضا. وايضا فيها:(۳/۱۹۲ طبع رحمانيه)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۲۸ جمادی الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۰۵

باب السلم

بیع سلم کے لئے شرائط

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ (۱) کہ زید نے خالد سے چالیس بوری چنا فی بوری (۱۰۰ کلو والی) بارہ سو روپے کے حساب سے خریدا اور آپس میں یہ طے کیا کہ فصل کے موقع پر جب چنا آئے گا تو وصول کرلے گا ابھی فصل آنے میں تین ماہ باقی ہیں، فی بوری بارہ سو روپے کے حساب سے چالیس بوریوں کی قیمت زید نے خالد کو ادا کر دی، کیا اس طرح بیع سلم جائز ہے؟ (۲) اگر جائز ہے تو کیا زید یہی چنا حامد کو فی بوری پندرہ سو روپے کے حساب سے فروخت کر سکتا ہے؟ بینوا توجروا؟　　مستفتی: نعمت اللہ

جواب: (۱) عقد سلم کے جواز کیلئے منجملہ شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ مسلم فیہ عقد کے وقت سے لیکر ادائیگی کے وقت تک بازار میں موجود رہے حتیٰ کہ اگر مسلم فیہ عقد کے وقت موجود اور ادائیگی کے وقت منقطع ہو یا اس کا برعکس ہو یا اس کے درمیان میں منقطع ہو تو بیع سلم جائز نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ صورت اگر چنا (مسلم فیہ) تین ماہ تک بازار میں دستیاب ہو تو یہ بیع (زید اور خالد کی) جائز ہے ورنہ ناجائز۔

لما فی الهداية: (۹۸/۳، طبع رحمانیه)

قال ولا یجوز السلم حتی یکون المسلم فیه موجودا من حین العقد الی حین المحل حتی لو کان منقطعا عند العقد موجودا عند المحل او علی العکس او منقطعا فیما بین ذلک لا یجوز.

ولما فی البحر الرائق: (۱۵۸/۶، طبع سعید)

قوله: (والمنقطع) ای لا یجوز السلم فی الشیئ المنقطع لفوت شرطه وهو ان یکون موجودا من حین العقد الی حین المحل (بکسر الحاء مصدر میمی من الحلول) حتی لو کان منقطعا عند العقد موجودا عند المحل او بالعکس او منقطعا فیما بین ذلک لم یجز لانه غیر مقدور التسلیم لتوهم موت المسلم الیه فیحل الاجل وهو منقطع فیتضرر رب السلم. وحد الانقطاع ان لا یوجد فی الاسواق التی تباع فیها وان کان فی البیوت ولو انقطع عن ایدی الناس بعد المحل قبل ان یوفی المسلم فیه فرب السلم بالخیار ان شاء فسخ العقد واخذ رأس ماله وان شاء انتظر وجوده الخ. وکذا فی البدائع: (۲۲۶/۴، سعید) ومثله فی الدر: (۴۵۸/۷، طبع سعید)

عقد سلم میں قبضہ سے پہلے راس المال یا مسلم فیہ میں کوئی تصرف جائز نہیں، لہٰذا زید کا آگے

حامد کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے، ہاں قبضہ کر کے آگے فروخت کر سکتا ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵/۲۱۸،طبع سعید)

(ولا یجوز التصرف)للمسلم الیہ(فی رأس المال و)لالرب السلم فی(المسلم فیہ قبل قبضہ بنحو بیع وشرکۃ)

ولما فی البحر الرائق:(۶/۲۶۳،طبع سعید)

(ولا یصح التصرف فی رأس المال والمسلم فیہ قبل القبض بشرکۃ اوتولیۃ)لان المسلم فیہ مبیع والتصرف فی المبیع المنقول قبل القبض لایجوز ورأس المال مستحق القبض فی المجلس والتصرف فیہ مفوت لہ فلم یجزففی التولیۃ تملیکہ بعوض،وفی الشرکۃ تملیک بعضہ بعوض فلم یجز الخ(ومثلہ فی الھدایۃ:(۳/۱۰۲، طبع رحمانیہ)وکذافی بدائع الصنائع:(۴/۲۵۱،طبع سعید)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۳۹۱

﴿بیع سلم میں مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے تصرف جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے دوسومن گندم خریدی اور پیسے بھی ادا کر دیے لیکن گندم کی فصل پکنے میں ابھی دو۲ ماہ باقی ہے تو کیا قبضہ کرنے سے پہلے میں یہ گندم نفع کے ساتھ فروخت کر سکتا ہوں یا نہیں؟ مستفتی:برکت علی پشاور

﴿جواب﴾ بیع سلم میں جب تک مبیعہ پر قبضہ نہ ہوا ہو اس وقت تک اس میں کسی قسم کا تصرف کرنا جائز نہیں ہے لہٰذا مذکورہ صورت میں جب آپ نے گندم پر قبضہ نہیں کیا ہے تو اس کو آگے فروخت کرنا آپ کے لیے جائز نہیں ہے۔

لما فی تنویر الابصار مع الدر:(۵/۲۱۸،باب السلم طبع سعید)

ولا یجوز التصرف للمسلم الیہ فی رأس المال ولا لرب السلم فی المسلم فیہ قبل قبضہ بنحو بیع وشرکۃ ومرابحۃ وتولیۃ.

ولما فی البحر الرائق:(۶/۱۶۴،طبع سعید)

ولا یصح التصرف فی رأس المال والمسلم فیہ قبل القبض بشرکۃ او تولیۃ لان المسلم فیہ مبیع والتصرف فی المبیع المنقولی قبل القبض لایجوز.

ولما فی الھدایۃ:(۳/۱۰۲،باب السلم طبع رحمانیہ)

ولا یجوز التصرف فی رأس مال السلم والمسلم فیہ قبل القبض اما الاول فلما فیہ

من تفويت القبض المستحق بالعقد واما الثانى فلان المسلم فيه مبيع والتصرف فى المبيع قبل القبض لايجوز.

واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر پشاوری

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر:۳۸۰۱

۱۹ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ

﴿مسلم فیہ کی جگہ کسی اور چیز کے دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ بندہ نے اپنے ایک رشتہ دار کیساتھ بیع سلم کا معاملہ کیا تھا جس میں فی من گندم کے عوض اس سے آٹھ سو"800" روپے لیے تھے لیکن سیلاب کی وجہ سے میری ساری فصل تباہ ہوگئی جس کی وجہ سے نہ تو میرے پاس اپنی گندم ہے اور نہ ہی مہنگائی کی وجہ سے کسی دوسرے شخص سے خرید سکتا ہوں، اب وہ وقت مقرر کے آنے پر مطالبہ کر رہا ہے کہ یا تو گندم کی بجائے آٹا دو یا آج کل کے ریٹ کی حساب سے فی من گندم کے بدلے بارہ سو "1200" روپے دو، پوچھنا یہ ہے کہ شریعت کے روشنی میں اس کا یہ مطالبہ جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ آپ کے رشتہ دار کا حق تو بنتا ہے، اس لئے مطالبہ کرنا بے جا نہیں ہے لیکن سیلاب ایک آسمانی آفت ہے جسکی وجہ سے آپکے حالات اگر ایسے نہیں ہیں کہ اپنے اس وعدہ کو پورا کر سکے تو رشتہ داری کے علاوہ ایمان و اخلاق کا بھی تقاضا ہے کہ وہ آپکو مزید کچھ مہلت دیدے، تاکہ حالات کچھ اچھے ہو اور با آسانی آپ ان کا یہ حق لوٹا سکے، احادیث میں اسکی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے، البتہ یہ یاد رہے کہ رقم لوٹانے کی صورت میں صرف اصلی رقم ہی دے سکتے ہیں گندم کی آج کل کے ریٹ کے حساب سے لوٹانے کا مطالبہ یا اس کے بدلے آٹا دینے کا مطالبہ ہرگز جائز نہیں۔

لمافی سنن أبی داؤد:(۱۳۵/۲،باب السلف لایحول،طبع رحمانیه)

عن ابی سعيدالخدرى قال:قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم من اسلف فى شئى فلا يصرفه الى غيره.

ولمافى الهندية:(۱۸۶/۳،طبع رشيديه)

ولايجوزأن ياخذعوض رأس المال شيأمن غيرجنسه ولايجوزالاستبدال بالمسلم فيه.

ولمافى التنويرمع الدر:(۲۱۲/۵،طبع سعيد)

(ومنقطع)......ولوانقطع فى اقليم دون آخرلم يجزفى المنقطع ولوانقطع بعدالاستحقاق

خیررب السلم بین انتظار وجودہ والفسخ واخذرأس مالہ.

ولمافی التنویرمع الدر:(۲۱۹/۵-۲۱۸،طبع سعید)

(ولایجوزالتصرف)للمسلم الیہ.... لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام "لاتاخذالاسلمک اورأس مالک" أی الاسلمک حال قیام العقدورأس مالک حال انفساخہ فامتنع الاستبدال.

ولمافی البحر:(۱۵۸/٦،طبع سعید)

(قولہ والمنقطع)ولوانقطع عن ایدی الناس بعدالمحل قبل ان یوفی المسلم فیہ فرب السلم بالخیاران شاء فسخ العقدوان شاء انتظروجودہ کذافی الھدایۃمع فتح القدیر:(۹۵/۷،طبع رشیدیہ)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:محمد طیب عفااللہ عنہ

۱۰ربیع الاول ۱۴۳۲ھ   فتویٰ نمبر:۲۹۳۰

﴿بیع سلم میں مسلم فیہ کے عوض کوئی دوسری چیز لیناجائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے جناب ڈاکٹرگل حمید صاحب سے گندم کی بیس بوریوں میں عقد سلم کیاتھا، جب گندم کے سپرد کرنے کاوقت آیاتومیرے پاس گندم تو تھی نہیں میں نے ان کوکہاکہ گندم کی جگہ چنوں کی پندرہ بوریاں لے لو۔انہوں نے اس بات کوتسلیم کرلیا۔کیااس طرح کامعاملہ کرناشریعت کی رو سے جائز ہے یانہیں؟ واضح رہے کہ چنوں کی پندرہ بوریوں کی قیمت گندم کی بیس بوریوں کے برابر ہے۔جواب عنایت فرماکرعنداللہ ماجورہوں۔   مستفتی:مقبول احمد بلوچ مٹھ کھوہ

﴿جواب﴾ بیع سلم میں مسلم الیہ(بائع)مسلم فیہ(مبیع)کواداکرنے سے اگرعاجزآجائے تواس صورت میں رب السلم(مشتری)کواختیارہے چاہے تووہ مسلم فیہ(مبیع)کی وصول یابی تک صبرکرلے یااپنے پیسے واپس لے لے۔شرعامشتری کودوسری چیزاسکے بدلے میں لینے کی اجازت نہیں ہے،لھذاگندم کی جگہ چنالینادیناأگرچہ قیمت کی برابری کابھی خیال رکھاگیاہوجائز نہیں ہے۔البتہ بیع سلم ختم کرکے پیسہ واپس لینے کے بعدچاہیں تواسی رقم سے چناخریدلیں۔

لمافی سنن ابی داود:(۱۳۵/۲،طبع رحمانیہ)

عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ ﷺ: من اسلف فی شئی فلایصرفہ الی غیرہ.

ولمافی الھندیۃ:(۱۸٦/۳،طبع رشیدیہ)

ولایجوزان یأخذعوض رأس المال شیأمن غیرجنسہ فان أعطاہ من جنس اجود منہ أوارداًفی الصفقۃ فرضی المسلم الیہ بالأرد جاز.

ولما في الدر المختار:(۲/۱۲۹، طبع سعيد)

(ولا) يجوز لرب السلم (شراء شيء من المسلم اليه برأس المال بعد الاقالة) في عقد السلم الصحيح فلو كان فاسدا جاز الاستبدال كسائر الديون (قبل قبضه) بحكم الاقالة لقوله عليه الصلاة والسلام: لا تأخذ الا سلمك او رأس مالك اي الا سلمك حال قيام العقد او رأس مالك حال انفساخه فامتنع الاستبدال.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد امیر ملک غفر اللہ لہ ولوالدیہ

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　فتوی نمبر: ۳۰۷۸

﴿مختلف کرنسی کا عقد سلم جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی ڈالر خریدنے کیلئے صراف کے پاس گیا تو اس نے کہا کہ فی الوقت تو ڈالر موجود نہیں کچھ دنوں میں دیدوں گا آپ قیمت ابھی ادا کردو، کیا اس طرح کا معاملہ کرنا جائز ہے؟　مستفتی: مہرالدین از تاجکستان

﴿جواب﴾ کرنسی نوٹ چونکہ خلقی طور پر ثمن نہیں ہے بلکہ عرف اور رواج کی طور پر ثمن کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، اور موجودہ دور میں مختلف ممالک کی کرنسی مختلف الاجناس اشیاء میں داخل ہیں، اس لئے ان کی خرید وفروخت میں بحیثیت عددمتقارب عقد سلم کے جواز کی گنجائش ہے، بشرطیکہ عقد سلم کی شرائط پائی جاتی ہوں۔

ولما في بدائع الصنائع:(۵/۲۰۸، باب السلم، طبع سعيد)

واما السلم في الفلوس عندنا فجائز عند ابي حنيفة وابي يوسف وعند محمد لا يجوز بناء على ان الفلوس اثمان عنده فلا يجوز السلم فيها كما لا يجوز السلم في الدراهم والدنانير وعندهما ثمنيتها ليست بلازمة بل تحتمل الزوال لانها ثبتت بالاصطلاح فتزول بالاصطلاح.

ولما في البحر الرائق:(۶/۱۵۲، باب السلم، طبع سعيد)

قوله ويصح في المعدود المتقارب كالبيض والجوز والفلس لأنه عددي يمكن ضبطه فيصح السلم فيه وقيل لا يصح عند محمد لأنه ثمن عنده وظاهر الرواية عن الكل الجواز.

ولما في الرد:(۵/۲۱۰، باب السلم، طبع سعيد)

(قوله وفلس) الأولى وفلوس لأنه مفرد لا اسم جنس قهستاني وفيه خلاف محمد لمنعه بيع الفلس بالفلسين الا ان ظاهر الرواية عنه كقولهما.

ولما في مختصر القدوري:(ص۸۱، باب الربوا، طبع قديمي)

واذا عدم الوصفان الجنس والمعنى المضموم اليه حل التفاضل والنساء، ولنا وهذا

حرم التفاضل و النساء واذا وجد احدهما و عدم الاخر حل التفاضل و حرم النساء.

ولما في بحوث في قضايا فقهية معاصرة:(ص١٦٩-١٧٠ طبع معروفية)

وهل يجوز هذا البيع نسيئة، كما هو معمول به اليوم عند كثير من التجار و عامة الناس؟ أنهم يعطون عملة بلدهم، بشرط أن يودى الآخذ بدلهم في شكل عملة بلد آخر بعد مدة، مثل ان يعطى زيد عمروا ألف ريال سعودى في المملكة العربية السعودية، بشرط أن يودى عمرو بدلها اربعة آلاف ربية باكستانية في باكستان، فأما عند الحنفية، فيجوز هذا البيع، لأن الأثمان لايشترط فيها كونها مملوكة للعاقد عند البيع عند هم، فيصح فيها التأجيل عند اختلاف الجنس—

ثم يمكن تخريجه على قاعدة السلم ايضا، لأن السلم في الفلوس جائز عند اكثر الفقهاء — وحينئذ يجب أن تراعي في هذا العقد شرائط السلم.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن حفظہ اللہ تعالیٰ — واللہ اعلم بالصواب: جلال الدین خرسند تاجکی

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۴۴

﴿اخبار ورسائل جاری کرانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل بعض اخبار ورسائل کے مالکان قارئین (خریدار) سے سالانہ رقم پہلے وصول کرتے ہیں مثلاً ۳۰۰ تین سو روپے، جبکہ اخبار ورسائل ان کو بعد میں ملتے ہیں، کیا شرعاً اس طرح عقد کرنا درست ہے؟

﴿جواب﴾ اخبار ورسائل کے مالکان جو رقم سالانہ پہلے سے وصول کرتے ہیں اس معاملہ کو بیع سلم کہا جاتا ہے جو کہ شرعاً جائز ہے اس لئے کہ بیع سلم کی تمام شرائط اس میں پائی جاتی ہیں.

البتہ اکثر وبیشتر رسائل واخبارات میں فحش قسم کی تصاویر ہوتی ہیں جو کہ ایک مستقل گناہ ہے اس لئے ایسے رسائل جاری کرنا بے حیائی کو فروغ دینے میں مدد کرنے کے مترادف ہے اس لئے منع ہے۔

لما في الدر المختار مع الرد:(۵/ ۲۰۹ تا ۲۱۲ طبع سعید)

(هو)لبيع آجل)وهو السلم فيه(بعاجل)وهو رأس المال (وركنه ركن البيع)حتى ينعقد بلفظ بيع في الا صح ---وشرطه اى شروط صحته التي تذكر في العقد سبعة بيان جنس --- ونوع --- وصفة--- وقدر--- وأجل واقله في السلم (شهر)وبيان قدر رأس المال --- والسابع بيان مكان الايفاء

ولما في فتاوى قاضي خان:(۲/۲ طبع قديمى)

ومن شرائط السلم أن يكون موجودا من وقت العقد الى وقت محل الا جل بلا انقطاع

فی الثمن ،والانقطاع أن لا یوجد فی السوق الذی یباع فیه فی ذلک المصر

ولمافی الفقه الاسلامی:(۳۶۲۷/۵،طبع:رشیدیه)

مقتضی السلم :أنه یثبت الملک فیه لرب السلم مؤجلا بمقابلة ثبوت الملک فی رأس المال المعین او الموصوف فی الذمة للمسلم الیه وقد أجیز حکمه بطریق الرخصة دفعا لحاجة الناس ولکن بالشرائط المخصوصة التی ذکرت والتی هی غیر مشروطة وعقد البیع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عزیز اللہ آغا عفی عنہ

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ   فتویٰ نمبر ۳۲۰۲

﴿بیع سلم کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جوس بنانے والی کمپنیوں کا اپنی مصنوعات فروخت کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کمپنی اپنے کسی ڈیلر کو عام ریٹ پر مثلاً ۵۰ فیصد رعایت فی کریٹ دیتی ہے، لیکن اگر ڈیلر کمپنی کو یہ رقم سیزن سے کچھ مدت پہلے ادا کردے تو کمپنی اُسے ۶۰ فیصد رعایت فی کریٹ دیدیتی ہے، اس طرح سے ڈیلر کو دس ۱۰ روپے فی کریٹ بچت ہوجاتی ہے، جبکہ اس کیساتھ وقت کا تعین بھی کرتے ہیں مثلاً چھ مہینے، کیا شرعاً اس طرح عقد کرنا درست ہے؟   مستفتی: ظریف خان ڈیفنس فیز ۲

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ فقہی اصطلاح میں بیع سلم کہلاتا ہے، کمپنی کے ڈیلروں کو جن سے یہ معاملہ ہوتا ہے جوس کی نوعیت، مقدار، مال وصولیابی کی تاریخ اور جگہ وغیرہ پہلے سے اگر متعین اور معلوم ہیں تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہے ورنہ نہیں۔

لمافی الهدایه: (۱۰۰/۳،طبع رحمانیه)

ولا یصح السلم عندابی حنیفة الا بسبع شرائط جنس معلوم کقولنا حنطة او شعیر ونوع معلوم کقولنا سقیة او بخسیة وصفة معلوم کقولنا جید اوردی ،ومقدار معلوم کقولنا کذاکیلا بمکیال معروف اوکذاورنا واجل معلوم ...... ومعرفة مقدار رأس المال اذاکان یتعلق العقد علی مقداره کالمکیل والموزون والمعدود وتسمیة المکان الذی یوفیه فیه اذاکان له حمل ومؤنة.

لمافی الدرالمختار:(۲۱۴/۵،طبع: سعید)

وشرطه ...... بیان جنس...... وبیان نوع...... وصفة...... وقدر...... وأجل واقله فی السلم شهر...... وبیان قدر رأس المال ...... وبیان مکان الا یفاء

لما فی فتاوی قاضی خان: (۲/۳،طبع :قدیمی)

ومن شرائط السلم أن یکون موجوداًمن وقت العقد الی وقت محل الاجل بلا انقطاع فی البین والا نقطاع أن لا یوجد فی السوق الذی یباع فیه فی ذلک المصر

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :عزیزاللہ آغاعفی عنہ

۳۰ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر:۳۲۰۲

﴿کتاب الدعوی﴾

﴿بھتیجے کا چچا سے زمین کا مطالبہ کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ یاسین نے حمیداللہ سے ۱۲ سال پہلے زمین خریدی جو کہ حمیداللہ نے عزیزاللہ سے خریدی تھی .اب جب یاسین نے اس زمین پر عمارت کھڑی کی .اورزمین کی قیمت بھی بڑھ گئی تو عزیزاللہ جو بائع اول تھا کے بھتیجے حفیظ اللہ نے اب یاسین پر براہ راست دعوی کیا کہ یہ زمین میری ہے جب میرے چچا نے بیچی تھی اس وقت میں چھوٹا تھا لیکن اب دعوی کرر ہا ہوں ،لہذا زمین مجھے دیدو اب پوچھنا یہ ہے کہ حفیظ اللہ کا براہ راست یاسین سے زمین کا مطالبہ درست ہے یا نہیں ؟اگر درست ہے تو یاسین کس قیمت کولیکر زمین حوالہ کرے قیمت خرید پر یا جواب زمین کی قیمت ہے اور جو عمارت بنائی ہے اس کا کیا ہوگا وضاحت کریں؟ مستفتی :غازی خان

تنقیح :زمین کا اصل مالک کیا حفیظ اللہ ہے؟اگر حفیظ اللہ اصل مالک ہے تو اس کے چچا نے کیوں زمین بیچی کیا ایسا تو نہیں ہے کہ حفیظ اللہ یتیم تھا اور اس کا ولی صرف چچا تھا لھذا اس نے حفیظ اللہ کی ضرورت کے لئے بیچی ہوا گر ایسا تھا تو کیا عزیز اللہ نے حکومت سے یا محلہ کے لوگوں سے پنچائیت کی صورت میں اجازت لی تھی ؟

جواب تنقیح :زمین کا اصل مالک عزیزاللہ ہے اس نے یہ زمین خریدی ہے حفیظ اللہ زمین کا مالک نہیں ہے بلکہ ویسے ہی کبھی مطلق ملک کا دعوی کرتا ہے اور کبھی میراث کے ذریعے ملنے کا مدعی ہے۔

﴿جواب﴾ اس زمین کا اصل مالک اگر عزیزاللہ تھا اس نے خود خریدی تھی پھر اپنی حیات میں خود اس نے حمیداللہ پر فروخت کی تھی اور حمیداللہ نے یاسین کو بیچ دی تو حفیظ اللہ اگر چہ عزیزاللہ کا

بھتیجا ہے اس کا زمین سے کوئی تعلق نہیں، حفیظ اللہ کا صرف اس بنیاد پر دعوی کرنا کہ عزیز اللہ (اصل مالک) چونکہ میرا چچا تھا لہذا زمین میری ہے بالکل غلط ہے، میراث کے طور پر زمین کا دعوی کرنا تب صحیح ہوتا اگر عزیز اللہ زمین اپنی حیات میں نہ بیچتے، جب بیچ دیا تو زمین عزیز اللہ کی ملکیت سے نکل گئی اب ورثاء کا کوئی حق متعلق نہیں ہوا لھذا یہ بات سمجھ سے دور ہے کہ حفیظ اللہ صرف اس بنیاد پر زمین کا دعوی کرے کہ عزیز اللہ چونکہ اس کا چچا تھا اور حفیظ اللہ سودا کے وقت چھوٹا تھا اب بڑا ہو گیا ہے تو عزیز اللہ نے اپنی زندگی میں اپنی ملکیت میں اگر تصرف کیا ہے اس کو کالعدم شمار کیا جائے، ہاں کوئی اور بات ہو اور سوال میں واضح نہ کی ہو تو الگ بات ہے اس لئے کہ مفتی غیب نہیں جانتا.

لما فی قولہ تعالی (النساء پ۵/۲۹) ﴿یاایھا الذین اٰمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل﴾

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٰکی

۹ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۶۷۲

﴿باپ اگر زمین کی تقسیم پر راضی ہو تو بیٹوں کا اعتراض مسموع نہیں ہوگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید، خالد، عمرو، عمران اور شریف آپس میں بھائی ہیں انہوں نے ۱۹۷۵ء میں باہمی رضامندی سے زمین تقسیم کی تھی۔ پھر اپنے اپنے حصوں پر قبضہ کر کے تصرفات بھی کر رہے ہیں یہاں تک کہ خالد اور شریف نے اپنی اپنی زمین کے کچھ حصے بھی بیچ دیے اس کے علاوہ پانچوں بھائیوں نے اپنی زمینوں میں ٹیوب ویل بھی لگائے ہیں اور ان میں سے تین بھائیوں خالد، عمران، شریف نے اپنی زمینوں میں گھر بھی بنائے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صورتحال اس طرح ہو گئی کہ خالد، عمران اور شریف کے حصے میں جو زمین آ گئی تھی وہ مین روڈ اور گاؤں کے قریب تھی تو ان کے حصوں کی قیمت بڑھ گئی اب ۲۰۱۱ء میں زید اور عمرو کے بیٹوں نے مطالبہ کیا کہ تمام زمینوں کی نئی تقسیم ہو گی اور پرانی تقسیم جو ہو گئی ہے وہ ہمیں منظور نہیں ہے البتہ زید اور عمرو جب حیات تھے تو وہ اس تقسیم پر راضی تھے عمرو کا انتقال ۱۹۹۰ء میں ہو گیا ہے جبکہ زید کا انتقال ۲۰۰۱ء میں ہو گیا اب پوچھنا یہ ہے کہ زید اور عمرو کے بیٹوں کا نئی تقسیم کا مطالبہ کرنا اور ان کے اس مطالبہ پر پرانی تقسیم کا باطل کرنا کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں زید اور عمرو کے بیٹوں کا نئی تقسیم کا مطالبہ کرنا صحیح نہیں ہے

اور ان کے اس دعویٰ کو نہیں سنا جائیگا اور نہ اس مطالبہ پر پرانی تقسیم باطل ہوگی اس لیے کہ ۳۵ سال تک ان کا اس زمین پر قبضہ کرنا اور اس سے استفادہ کرنا ان کی رضامندی کی دلیل ہے مزید یہ کہ خالد اور شریف کا اپنی زمینوں کا کچھ حصہ بیچتے وقت ان کا دعویٰ نہ کرنا پرانی تقسیم پر رضامندی کی دلیل ہے لھذا اب جو زید اور عمرو کے بیٹے نئی تقسیم کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کے اس مطالبہ کو نہیں سنا جائیگا۔

لما فی رد المحتار: (۲۲۲/۵، طبع:سعید)

اذا ترك الدعوى ثلاثاوثلاثين سنة ولم يكن مانع من الدعوى ثم ادعى لا تسمع دعواه لان ترك الدعوى مع التمكن يدل على عدم الحق ظاهراً ه وفي جامع الفتاوى عن فتاوى العتابي قال المتاخرون من اهل الفتوى لا تسمع الدعوى بعد ست وثلاثين سنة الا ان يكون المدعي غائباً او صبياً او مجنوناً وليس لهما ولي او المدعى عليه اميرا جائراً ونقل ط عن الخلاصة لا تسمع بعد ثلاثين سنة ثم لا يخفى ان هذا ليس مبنياً على المنع السلطاني بل هو منع من الفقهاء فلا تسمع الدعوى بعده وان امر السلطان بسماعها

ولما في ردالمحتار:(۲۲۲/۵،طبع:سعید)

الثامن سماع الدعوى قبل مضي المدة المحدودة مقيد بما اذا لم يمنع منه مانع آخر يدل على عدم الحق ظاهرا لما سياتي في مسائل شتى آخر الكتاب من انه لو باع عقارا اوغيره وامرأته اواحد اقاربه حاضر يعلم به ثم ادعى ابنه مثلا ملكه لا تسمع دعواه وجعل سكوته كالافصاح قطعا للتزوير والحيل.

ولما فی فتاوی قاضی خان: (۱۲۳/۲،طبع:قدیمی)

ومنها ان يكون المتنازعتين بينهما بعد ما اشهد كل واحد منهما على القبض واستيفاء الحق بصلة التمام ثم يقول احدهما حقي الذي في يدك وحقك الذي في يدي أو يقول قد قسمنا ذلك ولكن أخذت أنا بعض حقي دون بعض ،لا يسمع دعواه ولا الخصومة منه بعدما أشهد على القبض والاستيفاء

ولما فی الھندیۃ (۲۲۶/۵،طبع:رشیدیہ)

ادعى أحد المتقاسمين الغلط في القسمة من حيث القيمة بأن ادعى غبنا في القسمة فان كان يسيرا يدخل تحت تقويم المقومين لاتسمع دعواه ولا بينته وان كان فاحشا بحيث لا يدخل تحت تقويم المقومين فأن كانت القسمة بالقضاء لا بالتراضي تسمع بينته بالاتفاق وان كانت بتراضي الخصمين لا بقضاء القاضي لم يذكر في الكتاب وحكى عن الفقيه أبي جعفر أنه كان يقول ان قيل تسمع فله وجه وان قيل :لا تسمع فله وجه كذا في الفتاوى الصغرى وهو الصحيح وعليه الفتوى ..... وذكر الاسبيجابي في شرحه هذا كله اذا اقر الخصم

بالاستیفاء، اما اذا أقر بالاستیفاء فانه لا یصح دعواه للغلط والغبن الا اذا ادعی بالغصب.

واللہ أعلم بالصواب: برکت اللہ

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ

فتویٰ نمبر: ۳۲۸۱

﴿مدعی اور مدعیٰ علیہ میں سے کسی ایک کی غیر موجودگی میں قاضی کے فیصلہ کا حکم؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱) اسلامی نقطہ نظر سے قاضی مدعی اور مدعیٰ علیہ میں سے کسی ایک کے خلاف اس کا موقف سنے بغیر اسکی غیر موجودگی میں فیصلہ دے سکتا ہے یا نہیں؟ (۲) فریقین کو اطلاع دینا کیا عدالت کی ذمہ داری ہے؟ اگر فریقین میں سے کسی کو اطلاع نہ ملے جس کی وجہ سے فیصلہ اس کے خلاف ہو جائے تو ایسی صورت میں کیا یہ فیصلہ ہمیشہ کیلئے نافذ العمل ہو جائیگا یا بعد میں حاضر ہونے کی صورت میں اسکو اپنا موقف واضح کرنے کا موقع دیا جائیگا؟

مستفتی: ایک نمازی ابوبکر صدیق مسجد

﴿جواب﴾ (۱) شریعت مطہرہ میں قاضی مدعی اور مدعیٰ علیہ میں سے کسی ایک کے خلاف اس کا موقف سنے بغیر اسی طرح اس کی غیر موجودگی میں فیصلہ نہیں دے سکتے البتہ صرف چند صورتوں میں کسی خاص مصلحت کے تحت قاضی اس طرح کا فیصلہ دیدیں تو وہ اس کے مجاز ہیں اور یہ ایسی صورت میں جب قاضی کو یقین ہو کہ اگر فریق کی حاضری تک فیصلہ کو مؤخر کرلیا، تو ایک جانب یقینی طور پر بڑا نقصان ہوگا لیکن پھر بھی کچھ شرائط ہیں، جنکا لحاظ کرنا قاضی کیلئے ضروری ہے، مثلاً کوئی شادی شدہ عورت گواہوں سے ثابت کردے، کہ اس کے شوہر نے نکاح میں رہنے یا نہ رہنے میں اسکو اختیار دیدیا تھا، اور نفقہ کا انتظام کئے بغیر وہ لاپتہ ہیں تو ایسی صورت میں قاضی تمام وسائل بروئے کار لاتے ہوئے فریق ثانی کو اطلاع پہنچانے کی کوشش کریں گے، پھر بھی وہ حاضر نہ ہو تو اس کی جانب سے باقاعدہ ایک وکیل مقرر کریں گے، جو کہ فریق ثانی کے حقوق کی حفاظت کریگا، اب قاضی ضرورت اگر محسوس کرے تو اس کے خلاف فیصلہ دے سکتا ہے۔

(۲) فریقین کو اطلاع دینا چونکہ عدالت کی ذمہ داری ہے اس لئے اگر قاضی فریقین میں سے کسی کو اطلاع نہ دیں یا اطلاع دیں لیکن اس کو اطلاع نہ ملے اور فیصلہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے خلاف ہو جائے، تو حاضر ہونے کی صورت میں وہ دوبارہ استدعاء کرسکتا ہے۔

لما فی روح المعانی (پارہ ۲۳ سورۃ ص آیت ۲۴)

(قال لقد ظلمک ...... نعاجه) .... لانه معلوم من الشرائع انه لا یحکم الحاکم الا بعد اجابة المدعی علیه وجاء فی روایة انه علیه السلام لما سمع کلام الشاکی قال للأخر ما تقول فاقر فقال له لترجعن الی الحق أولاکسرن الذی فیه عیناک

ترجمہ: (علامہ آلوسی بغدادیؒ مذکورہ ایت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں) کہ یہ بات تمام شرائع سے معلوم ہے کہ حاکم مدعی علیہ کے جواب دینے کے بعد ہی فیصلہ کریگا اور ایک روایت میں آتا ہے کہ داؤدؑ نے جب شکایت کرنے والے کے کلام کو سنا تو دوسرے سے کہا تم کیا کہتے ہو تو اس نے اقرار کیا (پھر) داؤدؑ نے اس کو کہا کہ تم ضرور بضرور حق کی طرف لوٹو گے یا میں تیرا سر پھوڑ دوں گا۔

ولما فی بذل المجہود (۲/۰۷ مکتبة الشیخ)

عن علی قال بعثنی رسول الله ﷺ الی الیمن قاضیا فقلت یا رسول الله ﷺ ترسلنی وانا حدیث السن ولا علم لی بالقضاء فقال ان الله سیهدی قلبک ویثبت لسانک فاذا جلس بین یدیک الخصمان فلا تقضین حتیٰ تسمع من الأخر کما سمعت من الاول فانه احری ان یتبین لک القضاء......

قال الشیخ الامام المحدث الکبیر مولانا خلیل احمد السهارنفوریؒ تحت الحدیث المذکور قال الخطابی فیه دلیل علی ان الحاکم لا یقضی علی غائب وذلک اذا منعه ان یقضی لاحد الخصمین وهما حاضران حتی یسمع کلام الأخر فدل ذلک علی انه فی الغائب الذی لم یحضره ولم یسمع قوله اولی بالمنع .... وکان ابو عبیدیری للقضاء علی الغائب اذا تیقن الحاکم ان فراره واستخفاءه انما هو فرار من الحق ومعاندة للخصم

ترجمہ: حضرت علیؓ سے مروی ہے آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے (قاضی بنا کر) بھیج رہے ہو حالانکہ میں کم عمر ہوں اور قضاء سے متعلق مجھے علم نہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ آپ کے دل کی رہنمائی فرمائیں گے اور آپ کی زبان کو حق پر ثابت رکھیں گے، (البتہ چند باتوں کا خیال رکھئے چنانچہ) جب مدعی اور مدعی علیہ (فیصلہ کیلئے) آپ کے سامنے بیٹھ جائیں تو پہلے کیطرح دوسرے کا موقف سن کر فیصلہ کرنا، کیونکہ حق تک رسائی کیلئے یہ صورت اختیار کرنا زیادہ مفید و لائق ہے۔

علامہ خلیل احمد سہارنپوریؒ مذکورہ حدیث کے ذیل میں علامہ خطابیؒ کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ حاکم غائب کے خلاف (اس کی غیر موجودگی میں) فیصلہ نہیں سنائے گا، اور یہ اس لئے کہ جب آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو دونوں

کرنے سے منع فرمایا (یعنی مدعی اور مدعی علیہ) کے موجود ہوتے ہوئے کسی ایک کیلئے فیصلہ کرنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ دوسرے کے کلام کو وہ سنے تو یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ غائب جو سرے سے مجلس قضاء (عدالت) میں حاضر ہی نہ ہو اور نہ ہی (قاضی) نے اس کے موقف کو سنا ہو تو اس صورت میں (فیصلہ دینا) بطریق اولیٰ ممنوع ہونا چاہیے..............اور ابو عبیدؒ ایک صورت میں قضاء علی الغائب (یعنی کسی خصم کی غیر موجودگی میں فیصلہ دینے) کو جائز سمجھتے ہیں وہ یہ کہ جب قاضی کو یہ یقین ہو، کہ غائب کا روپوش ہونا اور بھاگ جانا تعنت اور حق سے فرار ہونے پر مبنی ہے۔

یہاں تک تو قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ ﷺ سے دلائل پیش کئے ذیل میں فقہاء کرام کے معتبر فتاویٰ سے حوالے ملاحظہ ہوں.

ولما فی التنویر مع الدر(۵/۴۰۹ سعید)

(ولا یقضی علی غائب ولا له)لا یصح بل ولا ینفذ علی المفتی به بحر (الا بحضور نائبه)الی من یقوم مقام الغائب (حقیقة کوکیله..........)

قال الشامی تحت قوله(ولا یقضی علی غائب)ای بالبینة سواء کان غائبا وقت الشهادة او بعدها و بعد التزکیة وسواء کان غائبا عن المجلس او عن البلد ....قوله (لا یصح)لما فی الفتح من ان حضرة الخصم لیتحقق انکاره شرط لصحة الحکم بحر (قوله بل ولا ینفذ)هذه العبارة غیر محررة لان نفی الصحة یستلزم عدم النفاذ ایضا فالحکم صحیح وانما الخلاف فی نفاذه بدون تنفیذ قاض آخر کما افاده ح ولذا فسر فی البحر کلام الکنز لعدم الصحة ثم قال :والاولی ان یفسر لعدم النفاذ لقولهم اذا نفذه قاض آخر یراه فانه ینفذ.........

ولما فی التنویر مع الدر والرد(۵/۴۱۲،۴۱۵ سعید)

(ولو قضی علی غائب بلا نائب ینفذ)فی اظهر الروایتین عن أصحابنا ذکره ملا خسرو فی باب خیار العیب (وقیل لا ینفذ)ورجحه غیر واحد وفی المنیة والبزازیة ومجمع الفتاوی ورجحه فی الفتح توقفه علی امضاء قاض آخر وفی البحر :والمعتمد أن القضاء علی المسخر لا یجوز الا لضرورة وهی فی خمس مسائل :اشتری بالخیار فتواری اختفی المکفول له ،حلف لیوفینّه الیوم فتغیّب الدائن ،جعل أمرها بیدها ان لم تصل نفقتها فتغیّب ،الخامسة اذا تواری الخصم فالمتأخرون أن القاضی ینصب وکیلاً فی الکل وهو قول الثانی خانیة .

قلت و نقل شراح الوهبانیة عن شرح ادب القاضی انه قول الکل و انّ القاضی یختم ببیته مدة یراها ثم ینصب الوکیل

وقال الشامیؒ تحت قوله (ولو قضی علی غائب الخ)أی قضی من یری جوازه

كشافعي لاجماع الحنفية على أنه لا يقضى على غائب كما ذكره الصدر الشهيدفي شرح ادب القضاء كذا حققه في البحر والحاصل انه لا خلاف عندنا في عدم جواز القضاء على الغائب وانما الخلاف في انه لو قضى به من يرى جوازه ـــــ ولا يقضى على غائب بيان لحكم المذهب

وقال في جامع الفصولين :قد اضطربت آرائهم وبيانهم في مسائل الحكم للغائب وعليه ولم يصف ولم ينقل عنهم اصل قوى ظاهر يبنى عليه الفروع بلا اضطراب ولا اشكال فالظاهر عندى ان يتأمل في الوقائع ويحتاط ويلاحظ الحرج والضرورات فيفتى بحسابها جوازا أوفسادامثلالوطلق امرأته عند العدل فغاب عن البلد ولايعرف مكانه ،أويعرف ولكن يعجزعن احضاره أوعن أن تسافر اليه هي أووكيلهالبعده أولمانع آخر وكذاالمديون لوغاب وله نقد في البلد أونحوذلك ،ففي مثل هذا لوبرهن على الغائب وغلب على ظن القاضي أنه حق لاتزوير ولاحيلة فيه ،فينبغي أن يحكم عليه وله ،وكذاللمفتى أن يفتى بجوازه دفعا للحرج والضرورات وصيانة للحقوق عن الضياع مع أنه مجتهد فيه ....قلتُ :ويؤيده مايأتي قريبافي المسخر وكذا ما في الفتح من باب المفقود لا يجوز القضاء على الغائب الا اذا رأى القاضي مصلحة في الحكم له وعليه فحكم فانه ينفذ لانه مجتهد فيه قلت وظاهره ولو كان القاضي حنفياولو في زماننا ولا ينافي ما مر لان تجويز هذا للمصلحة والضرورة

ولما في الردالمحتار (٥/٤١٥ سعيد)

(قوله الخامسة الخ)ذكر في شرح ادب القاضي لو قال رجل للقاضي لي على فلان حق وقد توارى عني في منزله فالقاضي يكتب الى الوالي في احضاره فان لم يظفر به وسأل الطالب الختم على بابه فان اتى بشاهدين انه في منزله وقالا رأيناه منذ ثلاثةايام او اقل ختم عليه لا ان زادعلى ثلاث والصحيح انه مفوض الى رأي الحاكم فاذاختم وطلب المدعي ان ينصب له وكيلا بعث القاضي الى داره رسولا مع شاهدين ينادي بحضورهما ثلاثةايام في كل يوم ثلاث مرات يا فلان بن فلان ان القاضي يقول احضر مع خصمك فلان مجلس القاضي والا نصبت لك وكيلا وقبلت بينته فان لم يخرج نصب له وكيلا وسمع شهود المدعي وحكم عليه بحضروكيله ملخصا

ولما في درر الحكام (٢/٦٤٤،٦٨١ مكتبه ماجديه كوئٹه)

(اذا امتنع المدعى عليه من الحضورمن ارسال وكيل الى المحكمةولم يمكن جلبه واحضاره يدعى الى المحاكمة بطلب المدعي بان يرسل اليه ثلاث مرات ورقةالدعوى المخصوصةبالمحكمة في ايام مختلفةفان لم يحضر ايضا يفهمه القاضي بانه سينصب وكيلا ويسمع دعوى المدعي وبينته فاذالم يحضر المدعى عليه بعد ذلك الى المحاكمةولم يرسل وكيلا نصب له القاضي وكيلايحافظ على حقوقه وسمع الدعوى والبينةفي مواجهة الوكيل المذكوروتفهاقاذاتحقق انها مقارنةللصحةحكم بالدعوى بهذاالثبوت

حکومت کی طرف سے متعین ہوتے ہیں اور عوام کے مسائل حل کرتے ہیں لیکن اس فیصلہ پر عمل نہ ہوسکا، ایک تو اس وجہ سے کہ ساجد نے علاقے کے سرکاری لوگوں سے دوستی بنائی تھی اور ان کو پیسے دیے تھے یعنی پولیس والوں کو اور انہوں نے کاغذات میں مدعی علیہ کے نام زمین لکھی تھی جس کیوجہ سے وہ قبضہ نہ کرسکے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مدعی سادہ آدمی تھا ان کو سرکاری معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا جس کیوجہ سے اپنی زمین پر قبضہ کرنا اسکے لئے مشکل رہا اور نوابوں نے جو فیصلہ کیا تھا اس فیصلے کے کاغذات ساجد کے ہاتھ آئے ہیں، اس کے پاس ہیں، ساجد خود بھی علاقے کا بڑا آدمی تھا، اس کے پاس طاقت تھی جب اس کو پتہ چلا کہ فیصلہ زید کے حق میں ہوا تو اس نے کاغذات پر قبضہ کیا جو ابھی تک اس کے پاس ہیں۔ مستفتی: محمد نصیر کورنگی

﴿جواب﴾ (۱) زید چونکہ شروع سے دعویٰ کرتا رہا اور خصوصاً جب نوابوں نے بھی اس کے حق میں فیصلہ کیا تھا، لہذا اب اسکی اولاد کو دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے اگرچہ زمانہ لمبا گزرا ہے، یعنی قاضی کے پاس اس کی شکایت کرسکتی ہے، قاضی تحقیق کرکے زندہ اولاد کے حق میں فیصلہ دیدے تو ان کے لئے لینا جائز ہوگا ورنہ نہیں اگر زید دعویٰ نہ کرتا تو اسکی اولاد کا دعویٰ معتبر نہ ہوتا۔

لمافی درر الحکام: (۲/۲۱۰-۲۱۱، المادۃ ۱۶۶۶ مطبع ماجدیہ)

اذا ادعی أحد علی آخر خصوصاً فی حضور القاضی فی کل بضعة سنوات مرة ولم تتصل دعواہ ومر علی ھذا الوجہ خمس عشرۃ سنة فلا یکون مانعاً من استماع الدعوی۔

(۲) اور زمین چونکہ ساجد کے قبضے میں ہے، لہذا دعویٰ ساجد کی اولاد پر کرینگے، بکر پر دعویٰ نہیں کرینگے۔

لمافی الھدایۃ: (۳/۲۰۹ مطبع رحمانیہ)

وذکر أنہ فی ید المدعی علیہ لابدمنہ لانہ انما ینتصب خصماً اذا کان فی یدہ۔

(۳) دعویٰ کے لئے دو مردوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے علاقے میں شہرت دعویٰ کے لئے کافی نہیں ہے، البتہ اگر اصلی گواہوں میں سے ایک مرگیا ہے تو پھر قاضی مدعی علیہ سے قسم بھی لے سکتا ہے۔

لمافی الھدایۃ: (۳/۱۶۱ مطبع رحمانیہ)

وماسوی ذلک من الحقوق یقبل فیہا شہادۃ رجلین اورجل وامرأتین سواء کان الحق مالاً أو غیر مال۔ وفیہا (ص ۲۱۰) وان عجز عن ذلک وطلب یمین خصمہ استحلفہ۔

(۴) اگر قاضی مدعی کے حق میں فیصلہ کر لے تو مدعی کو مدعی علیہ سے زمین کی قیمت لینا جائز نہیں، البتہ اگر کسی خاص مقدار پر صلح ہو جائے تو صلح کی صورت میں مدعی پیسے بھی لے سکتا ہے وہ پیسے آپس میں جتنی مقدار میں بھی متعین کریں۔

لمافی التنویر مع الدر والرد:(۱۱۳/۵،طبع سعید)

(وحکمہ قبول الاجازۃ)اذاکان البائع والمشتری والمبیع قائما.(قولہ من المالک)

افادأنہ لاتجوزاجازۃ وارثہ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:ذیشان احمد ملازئی

۴ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۹۵۷

﴿اپنے حق کے وصولیابی کیلئے حق سے زیادہ کا دعویٰ کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ موجودہ دور میں اپنا حق وصول کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے اور مذہبی رجحان رکھنے والوں کیلئے زیادہ مشکلات کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ بذریعہ عدالت اپنا حق اس وقت تک وصول نہیں ہوتا جب تک کہ جھوٹ نہ بولا جائے یا جھوٹی گواہی نہ لی جائے۔

مثلاً کسی آدمی نے دوسرے سے اپنا حق جو کہ پچاس ہزار ہے وصول کرنا ہو اور وہ دعویٰ کردے تو عدالت نصف رقم کی ادائیگی کا فیصلہ سنا دیتی ہے جو کہ حقدار کیلئے قابل قبول نہیں ہوتا لیکن اگر وہ اپنے حق سے کچھ زیادہ مثلاً ایک لاکھ کا دعویٰ کرے تو اسکو اپنا حق پورا وصول ہونے کی توقع ہوتی ہے تو کیا اس صورت میں اپنے حق سے زیادہ کا دعویٰ کرنا جائز ہے؟ جبکہ آدمی کی نیت یہ ہے کہ اپنے حق سے زیادہ رقم ملنے کی صورت میں زائد رقم مالک کو واپس کر دیگا، واضح رہے کہ عدالتوں میں سچ بولنے پر حلف لیا جاتا ہے کہ میں نے جو دعویٰ کیا ہے سچ ہے جھوٹ نہیں۔

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ شریعت میں صریح جھوٹ بولنا حرام اور موجب ہلاکت ہے جبکہ سچ بولنا باعث نجات ہے، اس لئے صاف جھوٹ بولنا تو ہرگز جائز نہیں ہے، البتہ اپنے حق کے وصولیابی کیلئے تعریض اور توریہ کی اجازت ہے یعنی ایسی بات کہ بظاہر جھوٹ ہو لیکن حقیقت میں وہ جھوٹ نہ ہو اسکی گنجائش ہے، سوال میں ذکر کردہ صورت میں تعریض وتوریہ کی صورت اختیار کرنا بڑا مشکل ہے، اس لئے کہ واضح روپے اور خاص تعداد کا دعویٰ ہے، البتہ روپوں کا ذکر کئے

(۴) اگر قاضی مدعی کے حق میں فیصلہ کرلے تو مدعی کو مدعی علیہ سے زمین کی قیمت لینا جائز نہیں، البتہ اگر کسی خاص مقدار پر صلح ہو جائے تو صلح کی صورت میں مدعی پیسے بھی لے سکتا ہے وہ پیسے آپس میں جتنی مقدار میں بھی متعین کریں۔

لما فی التنویر مع الدر والرد:(۱۱۲/۵،طبع سعید)

(وحکمہ قبول الاجازۃ)اذا کان البائع والمشتری والمبیع قائما.(قولہ من المالک)

افادأنہ لاتجوز اجازۃ وارثہ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب:ذیشان احمد ملازئی

۴ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　فتویٰ نمبر:۲۹۵۷

﴿اپنے حق کے وصولیابی کیلئے حق سے زیادہ کا دعویٰ کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ موجودہ دور میں اپنا حق وصول کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے اور مذہبی رجحان رکھنے والوں کیلئے زیادہ مشکلات کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ بذریعہ عدالت اپنا حق اس وقت تک وصول نہیں ہوتا جب تک کہ جھوٹ نہ بولا جائے یا جھوٹی گواہی نہ لی جائے۔

مثلاً کسی آدمی نے دوسرے سے اپنا حق جو کہ پچاس ہزار ہے وصول کرنا ہو اور وہ دعویٰ کردے تو عدالت نصف رقم کی ادائیگی کا فیصلہ سنا دیتی ہے جو کہ حقدار کیلئے قابل قبول نہیں ہوتا لیکن اگر وہ اپنے حق سے کچھ زیادہ مثلاً ایک لاکھ کا دعویٰ کرے تو اسکو اپنا حق پورا وصول ہونے کی توقع ہوتی ہے تو کیا اس صورت میں اپنے حق سے زیادہ کا دعویٰ کرنا جائز ہے؟ جبکہ آدمی کی نیت یہ ہے کہ اپنے حق سے زیادہ رقم ملنے کی صورت میں زائد رقم مالک کو واپس کردیگا، واضح رہے کہ عدالتوں میں سچ بولنے پر حلف لیا جاتا ہے کہ میں نے جو دعویٰ کیا ہے سچ ہے جھوٹ نہیں۔

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ شریعت میں صریح جھوٹ بولنا حرام اور موجب ہلاکت ہے جبکہ سچ بولنا باعث نجات ہے، اس لئے صاف جھوٹ بولنا تو ہرگز جائز نہیں ہے، البتہ اپنے حق کے وصولیابی کیلئے تعریض اور توریہ کی اجازت ہے یعنی ایسی بات کہ بظاہر جھوٹ ہو لیکن حقیقت میں وہ جھوٹ نہ ہو اسکی گنجائش ہے، سوال میں ذکر کردہ صورت میں تعریض وتوریہ کی صورت اختیار کرنا بڑا مشکل ہے، اس لئے کہ واضح روپے اور خاص تعداد کا دعویٰ ہے، البتہ روپوں کا ذکر کئے

بغیر عدد اور پیسوں کا دعوی کرے اور بظاہر یہ معلوم ہو کہ اتنے روپوں کا دعوی ہے تو اسکی گنجائش ہے، اس لئے کہ پیسوں کی تعداد تو لاکھ سے بھی زیادہ بنتی ہے، جو کہ سچ ہے، جھوٹ نہیں ہے۔

لما فی الدر مع الرد: (۶/۴۲۷، طبع سعید)

الکذب مباح لاحیاء حقه ودفع الظلم عن نفسه والمراد التعریض لان عین الکذب حرام۔۔۔ وفی الشامیة: (قوله قال) ای صاحب المجتبی قال علیه الصلاة والسلام "کل کذب حرام الا ثلاثة الرجل مع امرأته او ولده والرجل یصلح بین اثنین والحرب قال الطحاوی وغیره: هو محمول علی المعاریض، لان عین الکذب حرام قلت: وهو الحق قال تعالی - قتل الخراصون - وقال علیه الصلوة والسلام: "الکذب مع الفجور وهما فی النار" ولم یتعین عین الکذب للنجاة وتحصیل المرام اه.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد یروی

۸ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ　　　　فتوی نمبر: ۲۴۹۲

﴿کتوں کی نشاندہی کرنے سے کسی کو چور قرار نہیں دیا جا سکتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں جب کسی کی چوری ہو جائے تو چور کو پکڑنے کا طریقہ یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ تربیت یافتہ کتے منگوائے جاتے ہیں جو چوری والے گھر سے قدموں کے نشانات وغیرہ سونگھ کر اس جگہ کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں چور موجود ہو، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا اسطرح سے کتے جس جگہ یا گھر کی نشاندہی کریں تو اس گھر کے مکینوں پر چوری کا الزام لگایا جا سکتا ہے جبکہ اس گھر والے انکار کرتے ہوں اور قسم کھانے کو بھی تیار ہوں؟　　　　مستفتی: ممتاز خان

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ شریعت نے دوسرے آدمی پر کسی چیز کو ثابت کرنے کیلئے دو صورتیں بیان فرمائی ہے ایک یہ کہ مدعی علیہ خود اقرار کرے دوسری یہ کہ مدعی قاضی کے سامنے گواہوں کے ذریعے دعوی ثابت کرے تو مدعی علیہ پر وہ چیز لازم ہو جاتی ہے۔

مذکورہ صورت میں چونکہ مدعی کے پاس نہ گواہی ہے اور نہ مدعی علیہ کیطرف سے اقرار ہے بلکہ انکار کر رہا ہے اور قسم دینے کیلئے بھی تیار ہے، لہذا اس شخص پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا، کتوں کی نشاندہی کو زیادہ سے زیادہ قرینہ کی حیثیت دے سکتے ہیں، گواہی کی حیثیت نہیں دے سکتے بلکہ کتوں سے چور کی نشاندہی کرانا جیسا کہ رائج ہے سخت گناہ ہے، اس لئے کہ اس سے بدگمانی پھیلتی

ہے اور بسا اوقات ایک پاکدامن آدمی پر غلط الزام لگ سکتا ہے اور کتوں سے چور کا پتہ لگانے کا یہ عمل تمام لوگوں کے سامنے ہوتا ہے جبکہ کسی مسلمان پر غلط الزام لگانے کی قرآن وحدیث میں بڑی شناعت بیان ہوئی ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۷/۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱،طبع سعید)

(ویسأل القاضی المدعی علیه)عن الدعوی فیقول انه ادعی علیک کذافماذاتقول (بعدصحتهاوالا)تصدرصحیحة(لا)یسأل لعدم وجوب جوابه(فان اقر)فبهاالان دعوی الفعل کماتصح علی ذی الیدتصح علی غیره(اوانکرفبرهن المدعی قضی علیه) بلاطلب المدعی(والا)یبرهن(حلفه)الحاکم (بعدطلبه)اذلابدمن طلبه الیمین فی جمیع الدعاوی الاعندالثانی فی أربع علی مافی البزازیة.

ولما فی الهدایة:(۲/۲۱۱،طبع رحمانیه)

واذانکل المدعی علیه عن الیمین قضی علیه بالنکول والزمه ماادعی علیه.

ولما فی المظهری:(۵/۴۳۹،طبع رشیدیه)

(ولاتقف مالیس لک به علم)ای مالم یتعلق به علمک بالحس أوالخبرالصادق اوالبرهان......قال مجاهدرحمه الله:معناه لاترم احدابمالیس لک به علم.

ولما فی روح المعانی:(۵/۹۴،طبع رشیدیه)

(ولاتقف مالیس لک به علم)ای لاتتبع مالاعلم لک به من قول اوفعل وحاصله یرجع الی نهی عن الحکم بمالایکون معلوماوبندرج فی ذلک......وحدیث معاذبن انس:من قفامؤمنابمالیس فیه یریدشینه به حبسه الله تعالی علی جسرجهنم حتی یخرج مماقال۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:سلمان احمد

۲۳ربیع الاول ۱۴۳۰ھ   فتویٰ نمبر:۲۰۶۸

﴿کسی دوسرے پر کسی چیز کو لازم کرنے کیلئے گواہوں کی گواہی یا مدعیٰ علیہ کا اقرار ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص کی چوری ہوگئی،اس نے دوسرے شخص پر دعویٰ کیا لیکن دوسرا شخص نہیں مان رہا ہے اور مدعی کے پاس گواہ بھی نہیں ہے،البتہ ایک مولانا صاحب کوزے پر کچھ عمل پڑھتے ہیں اور پرچیوں پر مشتبہ افراد کے نام لکھتے ہیں جس پرچی پر کوزہ گھوم جاتا ہے تو اسی نام کے آدمی کو چور شمار کیا جاتا ہے کیا صرف اسی وجہ سے اس شخص کو چور قرار دیا جاسکتا ہے اور چوری کیا ہوا مال اس پر لازم کیا جاسکتا ہے؟   مستفتی:حضرت علی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ شریعت نے دوسرے شخص پر کسی چیز کو ثابت کرنے کیلئے دو

صورتیں بیان فرمائی ہے ایک یہ کہ مدعیٰ علیہ خود اقرار کرے دوسری یہ کہ مدعی قاضی کے سامنے گواہوں کے ذریعے دعویٰ ثابت کرے تو مدعیٰ علیہ پر وہ چیز لازمی ہو جاتی ہے۔

مذکورہ صورت میں چونکہ مدعی کے پاس نہ گواہی ہے اور نہ مدعیٰ علیہ کی طرف سے اقرار ہے، لہٰذا اس دوسرے آدمی پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا، البتہ قاضی اس سے قسم دلوائے گا اگر قسم کھالے تو بری ہو جائیگا ورنہ قید کیا جائے یہاں تک کہ اقرار کرلے یا قسم کھالے مولانا صاحب کے اسطرح کے عمل کو ایسی حیثیت دینا جسکی وجہ سے اس شخص کو یقینی طور پر چور تصور کیا جاتا ہے ہرگز جائز نہیں ہے بلکہ اسطرح کا عمل کرنا بھی جائز نہیں ہے اس سے بدگمانی کو تقویت ملتی ہے، بلا شبہ ہمارے بزرگوں نے ایسے اعمال بتادیئے ہیں لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بتادیا ہے کہ اس کو یقین کا درجہ نہیں دینا، لہٰذا تنہائی میں لوگوں میں ظاہر کئے بغیر اپنے لئے کوئی ایسا عمل کرے اور صرف قرینہ کا درجہ اس کے نتیجہ کو دے تو اسکی گنجائش ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۷/۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱ طبع سعید)

(ويسأل القاضي المدعى عليه)عن الدعوى فيقول انه ادعى عليك كذا فماذا تقول (بعد صحتها(والا)تصدر صحيحة(لا)يسأل لعدم وجوب جوابه(فان اقر)فبها لان دعوى المقر كماتصح على ذى اليد تصح على غيره(لوانكر فبرهن المدعى قضى عليه) بلا طلب(والا)يبرهن(حلفه)الحاكم(بعد طلبه)اذلابدمن طلبه اليمين فى جميع الدعاوى الاعندالثانى فى أربع على مافى البزازية.

ولمافی الهداية:(۲/۲۱۱ طبع رحمانیه)

واذانكل المدعى عليه عن اليمين قضى عليه بالنكول والزمه ماادعى عليه.

ولمافی البحر:(۷/۲۰۲ طبع سعید)

(فاذاصحت الدعوى سأل المدعى عليه عنها)لينكشف وجه الحكم ومفهومه انهااذا لم تصح لايسأله القاضي عنهالعدم وجوب الجواب والفتوى على قول أبى يوسف فيمايتعلق بالقضاء كمافى القنية والبزازية فلذاأفتيت بأن يحبس الى أن يجيب.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۴ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ | فتویٰ نمبر: ۱۹۷۷

﴿دوسرے کی ملکیت میں کسی کو دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ (۱) عبدالمتین نے اپنی ذاتی رقم سے کراچی

میں پلاٹ خریدا ہے تو کیا محمد علی عبدالمتین کا بھائی جو گاؤں میں رہتا ہے والد صاحب کی فوتگی کے بعد عبدالمتین کی ذاتی رقم سے خریدے گئے پلاٹ میں حصے کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

(۲) عبدالمتین نے چچا کا حصہ اپنی ذاتی رقم سے خریدا ہے اس میں محمد علی کا حق ہے یا نہیں؟

(۳) ٹھیکے کی زمین سے چچا کے حصے کو عبدالمتین اور بڑے بھائی مولانا محمد شفیع مرحوم نے ذاتی رقم سے خریدا ہے اس میں بھائی محمد علی کا حق بنتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: عبدالمتین صاحب

﴿جواب﴾ (۱) عبدالمتین کی ذاتی کمائی سے خریدے گئے پلاٹ یا مکان میں محمد علی کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے۔ (۲) عبدالمتین نے چچا کا جو حصہ اپنی ذاتی رقم سے خریدا ہے اس میں بھی محمد علی کو شرعاً مطالبے کا کوئی حق نہیں ہے۔ (۳) عبدالمتین اور مولانا محمد شفیع مرحوم دونوں نے مل کر ٹھیکے کی زمین سے جو چچا کا حصہ خریدا ہے اس میں بھی محمد علی کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے۔

لما في المرقاة شرح المشكوة: (۱۳۵/۶ طبع رشيديه)

(لايحل مال امرئ) اى مسلم أو ذمى (الا بطيب نفس منه) اى بامر أو رضا.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد

۲/۱/۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۸۱۹

﴿مصارف مقدمہ جھوٹے مدعی کے ذمہ ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے دوسرے آدمی پر غلط دعویٰ کیا اور عدالت میں اس پر مقدمہ دائر کر دیا، اب مدعیٰ علیہ نے اس سے جان چھڑانے کے لئے وکیل کا خرچہ کیا اور عدالت کے چکر لگائے، عدالت نے بھی مدعی کا دعویٰ غلط قرار دے دیا اور مدعیٰ علیہ کو بری کر دیا، آپ حضرات سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا مدعیٰ علیہ اب مدعی سے وکیل اور دیگر امور کا خرچہ لے سکتا ہے؟ مستفتی: عبدالکریم کوہاٹ

﴿جواب﴾ مذکورہ بالا صورت میں مدعیٰ علیہ مدعی سے وکیل کا خرچہ اور دیگر امور جن کا براہ راست مقدمہ سے تعلق ہے کا خرچہ وصول کر سکتا ہے لیکن جو کام مدعیٰ علیہ نے اپنی سہولت کے لئے انجام دیے ہوں اور اس سلسلہ میں مال خرچ کیا ہو تو اس طرح کے خرچے مدعی سے وصول نہیں کیے جا سکتے۔

اور یہ ایسا ہے جس طرح کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا مال دبانے یا اس کو نقصان پہنچانے

کے لئے ظالم بادشاہ، چوہدری یا سردار کے پاس اس کی ناحق شکایت لگائے اور وہ ظالم اس کے مال وغیرہ پر قبضہ کرلے تو شرعاً یہ شکایت کرنے والا اس کے نقصان کا ذمہ دار قرار پائے گا اور اس سے نقصان وصول کیا جائے گا۔

لما فی تنقیح الحامدیۃ:(۱۳۰/۲،طبع موقع الاسلام بیروت)

افتی المتأخرون ان للمشکی ان یرجع بما غرم علی الشاکی،وسئل عن شخص تسبب فی غرامۃ شخص عند بعض الظلمۃ واغرامہ علیہ حتی غرم مالا للظلمۃ ھل یلزم المتسبب أم لا؟(الجواب)اذا تعاون شخص ورفعہ الی الظالم وعادۃ الظالم ان من رفع الیہ و تعوون علیہ عندہ ان یاخذ منہ مالا مصادرۃ.یضمن الشاکی فی ھذہ الصورۃ ما اخذہ الظالم.ھذا ھو المفتی بہ.افتی بہ المتأخرون من علمائنا.

ولما فی مجمع الضمانات:(ص۲۸۰،طبع دار الکتب العلمیۃ)

لو وقع فی قلبہ انہ یجھنی الی امرء تہ او امتہ فرفع الی السلطان فغرمہ وظھر کذبہ لم یضمن الساعی عند الشیخین وضمن عند محمد.وبہ یفتی لغلبۃ السعایۃ فی زماننا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ لکی مروت

۱۸ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۷۷۹

﴿کتاب الحوالة﴾

﴿حوالہ کرنے کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں حدایت اللہ غیاث الدین کا دس ''۱۰۰۰۰'' ہزار روپے کا مقروض ہوں، ایک دن غیاث الدین نے مجھ سے اپنا قرض لینے کا مطالبہ کیا، تو میں نے غیاث الدین سے کہا حسین نے مجھ سے زبردستی دس ''۱۰۰۰۰'' ہزار روپے لئے ہیں وہ آپ کو دے دیگا، غیاث الدین نے جب حسین سے رابطہ کیا تو حسین نے کہا کہ ٹھیک ہے میں آپ کو دے دونگا، چند دن کے بعد جب غیاث الدین حسین کے پاس گیا تو حسین نے کہا کہ بھائی وہ رقم مجھ سے ضائع ہوگئی، اب میں آپ کو نہیں دے سکتا ہوں، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا غیاث الدین اب مجھ سے مطالبہ کرنے کا حق رکھتا ہے، یا غیاث الدین حسین ہی سے مطالبہ کرے؟

﴿جواب﴾ غیاث الدین یعنی آپ کے قرض خواہ نے جب آپ کی اس پیش کش کو قبول کرلیا کہ وہ اپنا قرضہ حسین سے وصول کریگا اور حسین نے بھی غیاث الدین کو قرضہ اداء کرنے کا

وعدہ کرلیا تو حسین شرعاً غیاث الدین کا مقروض ہوگیا، اس پر لازم ہے کہ غیاث الدین کو مذکورہ رقم دیدے، حسین کے پاس اگر چہ وہ رقم اب ضائع ہوگئی ہے اس سے وہ بری الذمہ قرار نہیں پاتے، وہ بدستور اصالۃً آپ کا مقروض ہے اور اب حوالہ قبول کرنے کیوجہ سے غیاث الدین کا مقروض قرار پائے گئے ہیں،

البتہ حسین اگرادا نہیں کررہا ہے اور شرعی حکم معلوم ہونے کے باوجود اداء کرنے سے انکاری ہے تو غیاث الدین کو آپ سے مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے.

لمافی الهداية :(۱۲۶/۳، طبع: رحمانيه)

قال وتصح الحوالة برضا المحيل ،والمحتال ،والمحتال عليه

ولما في الهداية:(ج۳/ص۱۲۷، طبع: رحمانيه)

ولا يرجع المحتال على المحيل الا ان يتوى حقه وقال الشافعیؒ لايرجع وان توى لان البراءة قد حصلت مطلقة فلا يعود الا بسبب جديد ولنا انها مقيدة ب سلامة حقه له اذهو المقصود او تنفسخ الحوالة لفواته لانه قابل للفسخ فصار كوصف السلامة في المبيع.

قال والتوى عند ابی حنيفةؒ احد الا مرين اما ان يجحد الحوالة ويحلف ولا بينة له عليه أو يموت مفلسا لأن العجز عن الوصول يتحقق بكل واحد منها وهو التوى في الحقيقة.

ولما في مجمع الانهر:(۲۰۶/۳ طبع: منار)

ولايرجع عليه الا اذاتوى حقه وهو بموت المحتال عليه مفلسا او انكاره الحوالة وحلفه ولا بينة عليها وعند هما بتفليس القاضى اياه

ولمافي الدر المختار:(۳۴۲/۵ تا ۳۴۵، طبع: سعيد)

(ولا يرجع المحتال على المحيل الا بالتوى) بالقصر وبمد هلاك المال لأن براء ته مقيدة بسلامة حقه وقيده في البحر بأن لا يكون المحيل هو المحتال عليه ثانيا (وهو) باحد أمرين (ان يجحد) المحال عليه (الحوالة ويحلف ولا بينة له) اى لمحتال ومحيل (أويموت) المحال عليه (مفلسا) بغير عين ودين وكفيل

ولمافي الهندية:(۲۸۶/۳ طبع: قديمی)

ولم يرجع المحتال على المحيل الا أن يتوى عند ابی حنيفةؒ احد الا مرين اما أن يجحد المحتال عليه الحوالة ويحلف ولا بينة للمحيل ولا للمحتال له ،او يموت مفلسا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　　واللہ اعلم بالصواب: عزیز اللہ آغا عفی عنہ

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ　　　　　　　　　　فتویٰ نمبر: ۳۳۰۴

حوالہ میں دین کا معلوم ہونا ضروری ہے

سوال: جناب مفتی صاحب زید میرا دوست ہے کچھ دن پہلے ایسا ہوا کہ ہم دونوں ایک جگہ موجود تھے تو اچانک عمرو آکر زید سے اپنے دین کا مطالبہ کرنے لگا چونکہ زید کے پاس پیسے نہیں تھے اور وہ بار بار مطالبہ کر رہا تھا تو میں نے کہا کہ اس کو چھوڑ دو میں دے دونگا اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ دین کتنا ہے اور میں نے پوچھا بھی نہیں کچھ دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ دین ایک لاکھ روپیہ ہے جو میرے لیئے ادا کرنا کافی مشکل ہے اور میں اس پر راضی نہیں ہوں تو کیا میرے ذمہ دین ادا کرنا لازم ہے؟

مستفتی: محمد زاہد باجوڑی باندہ کوہاٹ

جواب: آپ نے زید کا قرضہ اپنے ذمہ لیا شرعی اصطلاح میں اسکو "حوالہ" کہتے ہیں حوالہ صحیح ہونے کیلئے ضروری ہے کہ قرضہ معلوم ہو آپکو چونکہ معلوم نہیں تھا اب معلوم ہوا اس لیئے ذمہ داری قبول کرنے سے آپ چاہیں تو انکار کر سکتے ہیں۔

لما فی الشامی: (۵/۳۴۲، طبع: سعید)

(وتصح فی دین) معلوم (ولا فی العین)(قوله المعلوم) فلو احتال بمال مجہول علی نفسه بان قال احتلت بما یذوب لک علی فلان لا تصح الحوالة مع جہالة المال ولا تصح الحوالة أیضا بہذا اللفظ۔

ولما فی بحر الرائق: (۶/۲۴۸، طبع: سعید)

ولم یقید المصنف بان یکون الدین محال به معلوما ولا بد منه لصحتہا لما فی البزازیه احتال بمال مجہول علی نفسه بان قال احتلت بمایذوب لک علی فلان لا تصح الحوالة مع جہالة المال

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوہاٹی

۱۵ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ

فتویٰ نمبر: ۳۳۲۱

امانت ضائع ہونے کی صورت میں حوالہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید میرا مقروض ہے میں نے اس سے اپنا قرض وصول کرنے کا مطالبہ کیا تو زید نے کہا کہ میری کچھ رقم شریف کے پاس بطور امانت پڑی ہے وہ آپکو دے گا شریف سے رابطہ کیا تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ جب دو دن بعد شریف کے پاس میں گیا تا کہ قرض وصول کروں تو وہ کہنے لگا کہ وہ امانت مجھ سے بغیر

کسی تعدی کے ضائع ہوگئی۔اب پوچھنا یہ ہے کہ میں اپنا قرض وصول کرنے کا مطالبہ شریف سے کروں یا زید سے؟ مستفتی: محمد مدیر آفریدی باڑہ

﴿جواب﴾ آپکے مقروض یعنی زید نے آپکی اجازت سے وہ قرض شریف سے وصول کرنے کو کہا اور شریف نے قبول کرلیا۔فقہی اصطلاح میں اسکو "حوالہ" کہتے ہیں جس کا حکم یہ ہے کہ اب آپ کو صرف شریف سے اپنا قرض وصول کرنے کا حق حاصل ہے لیکن شریف نے زید کی امانت کی بنیاد پر یہ ذمہ داری قبول کی تھی اور اب وہ امانت ضائع ہوگئی ہے اس لئے شریف کی کوئی ذمہ داری باقی نہ رہی شریف سے خود زید اب مطالبہ نہیں کرسکتا اس لئے آپ بھی اس سے مطالبہ نہیں کرسکتے۔البتہ آپ اب اپنے اصل مقروض یعنی زید سے وصول کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

لما فی تنویر الابصار:(۵/۳۴۷،طبع: سعید)

(أحاله بما له عند زيد) حال كونه (وديعة) بأن أودع رجلا الفا ثم أحال بها غريمه (صحت فان هلكت) الوديعة (برئ) المودع وعاد الدين على المحيل لان الحوالة متيدة بها بخلاف متيدة بالمغصوب فانه لا يبرء

ولما فی الهنديه:(۳/۲۹۹،طبع برشيديه)

واذا كانت الحوالة متيدة بالوديعة فقال المودع ضاعت الوديعة بطلت الحوالة ولو كانت متيدة بالغصب لا تبطل الحوالة كذا في الخلاصة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوھاٹی

۲۸ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۲۳

﴿حوالہ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ زید خالد کا مدیون ہے زید نے قرض کی ذمہ داری بکر پر ڈال دی کہ میرا قرض بکر ادا کرے گا،کافی عرصہ گزرنے تک جب بکر نے قرض ادا نہیں کیا اور ٹال مٹول کرتا رہا تو خالد نے دوبارہ زید سے مطالبہ شروع کردیا تو کیا خالد کے لئے زید سے مطالبہ کرنا درست ہے جبکہ ایک مرتبہ تینوں اس پر راضی ہوگئے کہ اب زید کی طرف سے بکر قرض ادا کرے گا؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد جمیل

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں جب دین کی ادائیگی کی ذمہ داری زید نے خالد کی رضامندی سے بکر کے ذمہ لگادی اور بکر نے یہ ذمہ داری قبول بھی کرلی کہ ہاں میں زید کی طرف سے خالد کو دین

ادا کروں گا تو اب خالد زید مدیون سے دین کے مطالبہ کا حق نہیں رکھتا بلکہ بکر محتال علیہ سے دین کا مطالبہ کرے گا اور زید مدیون بری الذمہ متصور ہوگا، قاضی (جج) کی مدد سے حق وصولی کی کوشش کرے، وہاں سے بھی وصولی نہ ہو سکے تو خالد کو زید سے دوبارہ مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔

لمافی الهداية:(۲/۱۲۷،طبع رحمانیه)

قال وانتمت الحوالة برئ المحيل من الدين بالقبول ولا يرجع المحتال على المحيل الا ان يتوى حقه.

ولمافی الدرالمختار:(۵/۳۴۲،طبع سعید)

وبرئ المحيل من الدين والمطالبة جميعا(بالقبول)من المحتال للحوالة(ولا يرجع المحتال على المحيل الا بالتوى)

ولمافی البحرالرائق:(۶/۲۵۰،طبع سعید)

(قوله وبرئ المحيل بالقبول من الدين)قوله ولم يرجع المحتال المحيل الا بالتوى لان برأته مقيدة بسلامة حقه اذهو المقصود اولفسخ الحوالة لفواته وانها تحتمل الفسخ فصار كوصف السلامة فى المبيع وهذااذالم يشترط الخيار للمحال امااذاجعل للمحال الخيار اواحاله على ان له ان يرجع على ايهماشاء صح كذافى البزازية:ومراده اذاكانت الحوالة باقية امااذافسخت الحوالة فان للمحتال الرجوع بدينه على المحيل ولذاقال فى البدائع ان حكمها ينتهى بفسخها وبالتوى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　فتوی نمبر: ۳۶۸

﴿باب الاحتکار﴾

﴿ذخیرہ اندوزی کا بیان﴾

﴿چینی کی ذخیرہ اندوزی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میں چینی اسٹور کرنا چاہتا ہوں اس غرض سے کہ بعد میں قیمت بڑھ جانے سے زیادہ نفع حاصل کرونگا کیا ازروئے شریعت میرے لئے یہ جائز ہے؟ جبکہ لوگوں کو اس میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔　مستفتی: عبدالقدوس شاہ حسن خیل ڈی آئی خان

﴿جواب﴾ ذخیرہ اندوزی حرام ہے شریعت میں سختی سے منع ہے لیکن عام چیزوں کو زیادہ نفع حاصل کرنے کی غرض سے روکے رکھنا ذخیرہ اندوزی نہیں کہلاتا یہ تو تجارت کا حصہ ہے، البتہ خاص غذائی اشیاء مثلاً گندم، چاول کہ ان اشیاء کو عام لوگ غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں، ایسی

چیزوں کی ذخیرہ اندوزی حرام ہے اور وہ بھی اتنی مقدار میں اگر کوئی جمع کرتا ہے جس سے عام مارکیٹ متاثر ہو تب حرام ہے اگر مارکیٹ میں عام ملے تو ان اشیاء کو روکنا بھی جائز ہے، تاہم خوراک کی اشیاء کو مہنگا ہونے کی غرض سے روکنا مناسب نہیں ہے، ناپسندیدہ ہے اور چینی بھی خوراک کی اشیاء میں سے ہے۔

لمافی مشکوۃ المصابیح:(ص ۲۵۰،طبع سعید)

من احتکر فھو خاطئی.وعلی ھامش المشکوۃ:قولہ ﷺ:(من احتکر)الاحتکار المحرم ھو فی الاقوات خاصۃ بان یشتری الطعام فی وقت الغلاء...واما غیر الاقوات فلا یحرم الاحتکار فیہ بکل حال.

ولمافی تکملۃ فتح الملھم:(۱/۲۵۶-۲۵۷-۲۵۸،طبع دارالعلوم کراچی)

قولہ ﷺ:"من احتکر"... ثم ذھب اکثر الفقھاء الی ان حرمۃ الاحتکار مختصۃ بالاقوات فلا یحرم الاحتکار فی غیرھا... وقال ابن قدامۃ"الاحتکار المحرم ما اجتمع فیہ ثلاثۃ شروط:أحدھا أن یشتری......والثانی:أن یکون المشتری قوتا،فأما الادام والحلواء والعسل والزیت وأعلاف البھائم فلیس فیھا احتکار محرم......الثالث:أن یضیق علی الناس بشرائہ......الخ الذی یبدو لھذا العبد الضعیف عفا اللہ عنہ أن حرمۃ احتکار الطعام ثابتۃ بالحدیث من غیر شک،فکان أمراتشریعیا معمولا بہ الی الابد،لان حاجۃ الناس الی الطعام أکثر منھا الی غیرہ،وأما احتکار الأشیاء الأخری فیفوض الی الحاکم.

ولمافی الشامی:(۶/۳۹۸،طبع ایچ ایم سعید)

(قولہ:وکرہ احتکار قوت البشر)...والتقیید بقوت البشر قول أبی حنیفۃ ومحمد وعلیہ الفتوی کذافی الکافی.

ولمافی خلاصۃ الفتاوی:(۲/۳۵۳-۳۵۴،طبع رشیدیہ)

ثم الاحتکار المکروہ لا یتحقق عند أبی حنیفۃ الا من قوت الناس کالحنطۃ والارز والدخن والذرۃ اذا کان فی مواضع یتخذون الخبز من الارز......ھکذا قال محمدؒ وعلیہ الفتوی.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:محمد احمد عفا اللہ عنہ

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ   فتویٰ نمبر:۱۵۹۹

﴿ذخیرہ اندوزی سے متعلق سوال وجواب﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جن کا حکومتی سطح سے مصنوعی بحران پیدا کیا جاتا ہے مثلاً موجودہ وقت میں چینی، ایسی صورت میں اگر عام دکاندار چینی کو ذخیرہ کر کے رکھ لے تاکہ قیمت زیادہ ہونے پر فروخت کرے کیا دکاندار کا یہ عمل ذخیرہ

اندوزی میں شامل ہے یا نہیں؟ حالانکہ اس سے عوام کو ضرر پہنچتا ہے۔ مستفتی: عمر فاروق ٹنڈو آلہ یار

﴿جواب﴾ خوردنی اشیاء کو روکے رکھنا تاکہ مہنگے داموں فروخت کی جائیں ''احتکار'' کہلاتا ہے، دین اسلام میں احتکار سختی سے منع ہے، احادیث میں احتکار کرنے والے پر لعنت ہوئی ہے اور آپ ﷺ نے ایسے شخص کو جزام اور افلاس کی بددعاء دی ہے لیکن اس قدر سختی سے یہ ممانعت اس صورت میں ہے کہ اتنے مال کا احتکار کوئی کرے جس سے عام مارکیٹ متاثر ہو خصوصاً ایسے حالات میں ان اشیاء کو روکے رکھنا جب یہ چیزیں عام دستیاب نہ ہوں اور لوگوں کو دشواری ہو اگر عام دستیاب ہوں تو ایسی ممانعت نہیں ہے لیکن بہتر اور احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ خوردنی اشیاء کو عام حالات میں بھی اس غرض سے روکنا نہیں چاہیے، کمائی کے لئے اور بھی بہت سارے ذرائع ہیں۔

لما فی مشکوۃ المصابیح: (ص ۲۵۰ مطبع سعید)

عن معمر قال قال رسول الله ﷺ من احتکر فھو خاطی مو فیه ایضا: عن عمر بن الخطاب ؓ قال سمعت رسول الله ﷺ یقول من احتکر علی المسلمین طعامھم ضربه الله بالجزام والافلاس.

ولما فی التنویر مع الدر: (۳۹۸/۶ مطبع سعید)

(و) کره (احتکار قوت البشر) کتبن وعنب ولوز (والبھائم) کتبن وقت (فی بلد یضر باھله) لحدیث "الجالب مرزوق والمحتکر ملعون".

ولما فی الھدایة: (۴۳/۴ مطبع رحمانیه)

ویکره الاحتکار فی اقوات الآدمیین والبھائم اذا کان ذلک فی بلد یضر الاحتکار باھله وکذلک التلقی فاما اذا کان لا یضر فلا باس به والاصل فیه قوله علیه السلام الجالب مرزوق والمحتکر ملعون ولانه تعلق به حق العامة وفی الامتناع عن البیع ابطال حقھم وتضییق الامر علیھم فیکره اذا کان یضربھم ذلک.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ فتویٰ نمبر: ۲۵۱۷

﴿سگریٹ کی ذخیرہ اندوزی کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سگریٹ کی ذخیرہ اندوزی کرنا کیسا ہے؟ ہمارے علاقے میں کچھ عرصہ کے بعد سگریٹ کی قیمتیں بڑھ جائیں گی اس بات کے پیش نظر اسٹاک کرنا کیسا ہے؟ مستفتی: مولوی ندیم صاحب، بھکر

﴿جواب﴾ سگریٹ کا اسٹاک کرنا جائز ہے یہ کوئی ذخیرہ اندوزی نہیں ہے۔ ذخیرہ

اندوزی صرف خوراک کی اشیاء اور روزمرہ کی اشیائے ضرورت میں جائز نہیں ہے۔ سگریٹ ایسی کوئی ضرورت کی چیز نہیں ہے۔

لما فی العالمگیریہ (۴/۲۱۴) طبع رشیدیہ

والاحتکار فی کل ما یضر بالعامة فی قول ابی یوسف رحمه الله تعالی وقال محمد رحمه الله تعالی الاحتکار بما یتقوت به الناس والبهائم کذا فی الحاوی۔

ولما فی ردالمحتار (۶/۳۹۸) طبع سعید

وعن ابی یوسف کل ما اضر بالعامة حبسه ،فهو احتکار وعن محمد الاحتکار فی الثیاب ابن کمال (قوله کتبن وعنب ولوز) ای مما یقوم به بدنهم من الرزق ولو دخنا لا عسلا وسمنا در منتقی۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   والله اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین بھکر

۶ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ   فتویٰ نمبر:

کتاب الشهادة و القضاء

گواہی کی شرائط

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے بکر پر کسی جرم کا الزام لگایا پھر جب اسے عدالت میں جج کے سامنے پیش کیا گیا یعنی بحیثیت گواہ کے تو اس نے کہا کہ لوگ ایسا کہتے ہیں "میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں اس کو جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے" عرض ہے کہ کیا زید جبکہ باشرع آدمی ہے اور بکر کے بارے میں یہ الزام لگا رہا ہے کیا اس طرح گواہی کافی سمجھی جائے گی؟ مستفتی: غلام رسول

جواب زید کی بکر کے خلاف مذکورہ گواہی شرعاً قبول نہیں کی جائے گی، اس لئے کہ گواہی میں (چند مخصوص صورتوں کے علاوہ) مشاہدۃ المشہود بہ شرط ہے جو مسئولہ صورت میں نہیں پائی گئی۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵/۴۶۱-۴۶۲ طبع سعید)

(ھی) لغة خبر قاطع وشرعا:(اخبار صدق لاثبات حق) فتح..... (شرطها العقل الكامل) وقت التحمل ، والبصر ، ومعاينة المشهود به الا فيما يثبت بالتسامع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم: محمد شریف حسین

۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ   فتویٰ نمبر: ۳۹۷

وڈیو وغیرہ کے ذریعے اثبات جرم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کی قتل یا زنا کرتے ہوئے وڈیو یا تصویر بنالی جائے اور عدالت میں قاضی کے سامنے پیش کی جائے، کیا یہ اثبات جرم کیلئے کافی ہے یا عینی گواہ اور نصاب شہادت ہونا ضروری ہے؟ مستفتی: سفیان احمد

جواب شریعت نے حدود و قصاص کے اثبات کیلئے کڑی شرائط اور مقررہ گواہان کا ہونا ضروری قرار دیا ہے، اس لئے محض وڈیو اور دیگر جدید آلات کے ذریعے سے کسی پر قتل یا زنا وغیرہ ثابت نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً جبکہ ان آلات میں جعل سازی اور ردوبدل نہ صرف ممکن ہے بلکہ اب تو ان آلات میں واقعات کو تبدیل کر کے کچھ کا کچھ بنا دینا اور ایک کا الزام دوسرے پر لگانا مشاہد اور واقع بھی ہو چکا ہے۔

اور بڑی مہارت سے واقعے کو ایسا پیش کیا جاتا ہے کہ کسی کو شک بھی نہیں گزرتا کہ اس میں دھوکہ سے کام لیا گیا ہے، ظاہر ہے ایسی صورت حال میں شرعاً تو کجا عقلاً بھی اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا، الحمد للہ دین اسلام نے ہمیں ہر شعبے میں سادہ اور واضح ہدایات دینے ہیں، نا قابل بھروسہ غیر یقینی سائنسی ایجادات کا محتاج نہیں رکھا۔

لما في قوله تعالى :(سورة النور آيت ۱۳)

﴿لولا جآء وا عليه باربعة شهدآء فاذلم ياتوا بالشهدآء فاولئك عند الله هم الكذبون﴾

ولما في التنوير مع الدر:(۴/۷،طبع سعيد)

(ويثبت بشهادة اربعة) رجال (في مجلس واحد) فلو جآء وا متفرقين حدوا.

وفي الشامية:(قوله فلو جاء وا متفرقين حدوا) اى حد القذف.

ولما في البدائع:(۶/۲۶۶-۲۶۷،طبع سعيد)

اما ركن الشهادة فقول الشاهد اشهد بكذا وكذا......واما شرائط اداء الشهادة فمنها العقل و البلوغ ومنها بصر الشاهد ومنها النطق ومنها العدالة.

ولما في البحر:(۷/۵۵،طبع سعيد)

جرى على السنة الامة سلفها وخلفها في اداء الشهادة اشهد مقتصرين دون غيره من الالفاظ الدالة على تحقيق الشئ نحو اعلم اتيقن وهو موافق للكتاب والسنة فكان كالاجماع على تعين هذه اللفظة دون غيره ولا يخلو عن معنى التعبد اذلم ينقل غيره و الشهادة (هي اخبار عن مشاهدة وعيان لا عن تخمين وحسبان)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: مغیرہ شہاب غفرلہ ولوالدیہ

ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　فتویٰ نمبر: ۳۰۵۱

﴿تنہا عورت کی گواہی معتبر نہیں﴾

﴿سوال﴾ والد محترم کے انتقال کے تقریباً ۲۰ یا ۲۵ دن بعد والدہ محترمہ نے فرمایا کہ والد محترم نے انتقال سے ۴۰ دن پہلے یہ وصیت کی تھی کہ میرے کل مال میں سے ایک تہائی کی حد تک سے نماز، روزہ کا فدیہ دینے کے بعد بقایا مال میرے بڑے پوتے اقرار احمد کو دے دیا جائے لیکن ورثاء کو اس پر اعتراض ہے کہ انتقال سے پہلے والدہ محترمہ نے یہ بات اپنے بیٹوں کو کیوں نہیں بتائی، دوسرا اعتراض یہ ہے کہ وفات والے دن گھر میں ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں اہل خانہ شریک تھے لیکن اس وقت بھی والدہ صاحبہ نے یہ بات نہیں بتائی تو کیا ایسی صورتحال میں اس

وصیت کے بارے میں ایک خاتون (والدہ محترمہ) کے قول کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں چونکہ وصیت کی گواہی دینے والی صرف ایک عورت ہے اور شریعت کی رو سے ایک عورت کی گواہی معتبر نہیں، لہٰذا والدہ محترمہ کی گواہی سے اس بات کو وصیت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، اس لئے اس پر عمل کرنا کوئی ضروری نہیں، البتہ ورثاء عاقل و بالغ ہوں اور بخوشی اس بات کو وصیت کا درجہ دیتے ہوں تو شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے، بلکہ باعث اجر وثواب ہے۔

لما في قوله تعالى:(سورة البقرة،آيت ۲۸۲)

﴿واستشهدوا شهيدين من رجالكم فان لم يكونا رجلين فرجل وامرأتن ممن ترضون من الشهداء﴾

ولما في التنوير مع الدر:(۲۶۵/۵ طبع سعيد)

(و)نصابها(لغيرها من الحقوق سواء كان)الحق(مالاأو غيره،كنكاح وطلاق ووكالة ووصية واستهلال صبي)ولو(للارث رجلان أورجل وامرأتان)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ خیر الوارثین: عبدالباری

۱۸ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۹۹

﴿ماں کی گواہی بیٹوں کے حق میں قابل قبول نہیں﴾

﴿سوال﴾ صرف ماں کی گواہی بیٹوں کے لئے قبول ہوگی یا نہیں؟ مستفتی: محمد عمر کراچی

﴿جواب﴾ شرعاً اصول وفروع کی گواہی ایک دوسرے کے لئے قابل قبول نہیں ہے، لہٰذا ماں کی گواہی بھی بیٹوں کے حق میں حجت نہیں ہے۔

لما في البحر:(۸۰/۷ طبع سعيد)

(قوله والولد لأبويه وجديه وعكسه) اى لم تقبل شهادة الفرع لاصله والاصل لفرعه للحديث ولان المنافع بين الاولاد والآباء متصلة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی عفی عنہ

۱۴ رجب ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۷۴

﴿راستے میں پان، سگریٹ کھانے پینے سے مردود الشہادۃ نہیں ہوتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ بعض لوگ راہ چلتے سگریٹ پان وغیرہ کھاتے پیتے

رہتے ہیں، شریعت کی رو سے اس طرح کھانے پینے سے آدمی مردود الشہادۃ تو نہیں ہوتا؟

﴿جواب﴾ ایسی چیزیں جن کو راہ چلتے کھانے اور پینے کو عرف میں اگر معیوب نہ سمجھا جاتا ہو تو اس طرح کے کھانے پینے سے آدمی مردود الشہادۃ نہیں ہوتا۔

پان اور سگریٹ بھی ان چیزوں میں سے ہیں جن کا عام استعمال راہ چلتے کیا جاتا ہے اور عرف میں اس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا، لہٰذا ان کے اس طرح استعمال سے آدمی مردود الشہادۃ نہیں ہوگا۔

لما في الشامي:(۸/۲۰۲،كتاب الشهادات،طبع امداديه)

قال في النهاية: أما اذا شرب الماء أو اكل الفواكه على الطريق لا يقدح في عدالته لان الناس لا تستقبح ذلك.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز فیض بادی

۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۷

﴿کیا غیر عالم بااثر شخص کو شرعاً ثالث مقرر کرنا جائز ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ بعض لوگ آپس کے تنازعات کو ختم کرنے کے لئے ایسے شخص کو ثالث مقرر کرتے ہیں جو ایک عالمِ دین کی طرح دینی امور سے واقف نہیں ہوتا اگرچہ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہوتا ہے لیکن بااثر شخصیت ہونے کی بناء پر اُس کو ثالث مقرر کیا جاتا ہے، کیا شرعاً ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مذکورہ شخص کو ثالث مقرر کرنا شرعاً جائز ہے لیکن ثالث کو چاہیے کہ وہ اپنی رائے پر فیصلہ کرنے کے بجائے شرعی قوانین کو مدنظر رکھتے ہوئے علماء کرام سے مشورہ لیکر فیصلہ کرے۔

لما في الهداية:(۳/۱۵۱،طبع رحمانيه)

وأذا حكّم رجلان رجلا فحكم بينهما ورضيا بحكمه جاز لأن لهما ولاية على انفسهما فصح تحكيمهما وينفذ حكمه عليهما...... والفاسق اذا حكم يجب أن يجوز عندنا كما مر في المولى.

وفي حاشية الهداية قوله كما مرّ في اول ادب القاضي من ان الفاسق لا ينبغي أن يقلد القضاء ولو قلد جاز.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۱۱

﴿کتاب الاجارات﴾

﴿ملازمت کرنے اور کرایہ پر لینے، دینے کا بیان﴾

﴿امامت پر اجرت لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے امام کے ساتھ مقتدیوں کو کتنا تعاون کرنا ضروری ہے۔ اور ایسا امام جسکی تمام ضروریات مقتدیوں سے پوری ہوں اس کی امامت کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: ولی محمد کوئٹہ

﴿جواب﴾ نماز پڑھانا بڑی عبادت ہے اس پر اجرت لینا متقدمین فقہاء کرام کے نزدیک جائز نہیں تھا۔ لیکن متاخرین فقہاء کرام نے اس شعبے کے ضائع ہونے کے اندیشے کی وجہ سے اجرت لینے دینے کو جائز قرار دیا ہے۔

دراصل فقہاء متقدمین کے زمانہ میں ائمہ مساجد کے لئے اسلامی حکومتوں کی طرف سے باقاعدہ ان کی ضرورت کے تناسب سے وظائف مقرر ہوتے تھے۔ لیکن بعد میں اسلامی حکومتیں نہیں رہیں یا دین کے معاملے میں سستی ولاپرواہی بڑھ گئی تو اس شعبہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ حلانکہ یہ دین اسلام کا بڑا شعبہ ہے، اور روزانہ پانچ مرتبہ خاص مقررہ وقت پر اسکی خدمات انجام دینے کے لیئے عالم دین کو حاضر رہنے کی ضرورت ہے، ادھر ہر انسان کیساتھ ذاتی اور بیوی بچوں کی ضروریات بھی وابستہ ہیں، ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اگر حکومتی سطح پر کوئی انتظام نہیں ہے تو اہل محلہ کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ اس کا بندوبست کریں۔ اس لئے اہل محلہ پر واجب ہے کہ امام کی ضروریات پورا کرنے کے لئے مناسب مشاہرہ مقرر کرلیں تاکہ یکسوئی اور باعزت طریقے سے امام صاحب اس اہم ذمہ داری کو پورا کرسکے اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔

ضروریات ہر شخص کی اور ہر علاقے میں مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس کا فیصلہ محلے کے معتبر دیانتدار اور تجربہ کار لوگ کرسکتے ہیں کوئی مفتی اسکی تعیین نہیں کرسکتا۔ لہذا امام کی ذاتی اور بیوی بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مقتدیوں سے ماہانہ اجرت لینا اس کا حق ہے اس سے امامت پر کوئی برا اثر نہیں پڑھتا بلا کراہت اس کی امامت جائز ہے۔

لما فی الدر مع الرد المختار:(۶/۵۵،طبع:سعید کراچی)

لاالأجل الطاعات مثل(الأذان والحج والامامة وتعليم القرآن والفقه)ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والامامة والأذان.

(قوله ويفتى اليوم الخ)قال في الهداية:وبعض مشايخنا رحمهم الله تعالى استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليو م لظهور التوانى فى الامور الدينية،ففى الامتناع تضييع حفظ القرآن وعليه الفتوى ،وقد اقتصر على استثناء تعليم القرآن ايضاً فى متن الكنز ومتن مواهب الرحمن وكثير من الكتب ،وزاد فى مختصرالوقاية ومتن الاصلاح تعليم الفقه،وزاد فى متن المجمع الأمامة،ومثله فى الملتقى ودررالبحار.

ولما فى البحر الرائق:(۸/۲۰،طبع سعيد كراچى)

وفى الروضة وفى زماننا يجوز للامام والمؤذن والمعلم أخذالاجرة ومثله فى الذخيرة.

ولما فى الدر مع الرد:(۴/۲۱۹،طبع: سعيد كراچى)

ويعطى بقدر الحاجة والفقه والفضل فان قصر كان الله عليه حسيباً

(قوله ويعطى بقدر الحاجةالخ)الذى فى الزيلعى هكذا ، ويجب على الامام أن يتقى الله تعالى ويصرف الى كل مستحق قدر الحاجة من غير زيا دة فان قصر فى ذالک کا ن الله تعالى عليه حسيبا ،وفى البحر عن القنية :كان ابوبكر رضى لله تعالى عنه يستوى فى العطاء من البيت المال،وكان عمر رضى الله تعالى عنه يعطيهم على قدر الحاجةوالفقه والفضل،والاخذ بهذه فى زماننا أحسن فتعبر الامور الثلاثة.

ولما فى تبيين الحقائق :(۶/۱۱۸،طبع:سعيد كراچى)

كان شيخنا ابو محمد عبد الله الخزلخزى يقول:فى زماننا يجوز للامام والمؤذن والمعلم أخذالاجر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: تنویرالرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۱۸صفرالخیر۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر:۳۵۳۲

﴿امام مسجد کی بیماری کے دنوں کی تنخواہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ کیا امام مسجد بیماری کے دنوں کی تنخواہ لے سکتا ہے؟اور ناغہ کرنے پر کمیٹی والے امام کی تنخواہ کاٹنے کا حق رکھتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ تنخواہ دار شخص کی چھٹیوں کا دارومدار عرف پر ہے اور عام مساجد کا عرف یہی ہے کہ امام کو بیماری کے دنوں کی تنخواہ دیتے ہیں،لہٰذا امام مسجد کے لئے بیماری کے دنوں کی تنخواہ لینا بالکل جائز ہے اور کمیٹی والے مسجد کے فنڈ میں سے امام کو تنخواہ دے سکتے ہیں،البتہ امام کے تقرر کے وقت یا عرف عام میں یہ بات طے ہوجائے کہ امام کو بیماری کے دنوں کی تنخواہ یا ناغہ

کرنے پر تنخواہ نہیں دی جائے گی تو ایسی صورت میں امام مسجد بیماری کے دنوں کی تنخواہ یا ناغہ کرنے والے دن کی تنخواہ کا حق نہیں رکھتا۔

لما فی الشامی:(۲/۴۷۲ مطلب فی استحقاق القاضی والمدرس الوظیفة فی یوم البطالة سعید)

(قوله وينبغي الحاقه ببطالة القاضي الخ) قال في الاشباه وقد اختلفوا في أخذ القاضي ما رتب له في بيت المال في يوم بطالته فقال في المحيط انه يأخذ لانه يستريح لليوم الثاني وقيل لا اه وفي القنية القاضي يستحق الكفاية من بيت المال في يوم البطالة في الأصح وفي الوهبانية أنه اظهر فينبغي أن يكون كذلك في المدرس، لان يوم البطالة للاستراحة، وفي الحقيقة تكون للمطالعة والتحرير عند ذوي الهمة ولكن تعارف الفقهاء في زماننا بطالة طويلة أدت الى أن صار الغالب البطالة وأيام التدريس قليلة اه ورده البيري بما في المنبع ان كان الواقف قدر للدرس لكل يوم مبلغا فلم يدرس يوم الجمعة أو الثلثاء لا يحل له أن يأخذ ويصرف اجر هذين اليومين الى مصارف المدرسة من المرمة وغيرها بخلاف ما اذا لم يقدر لكل يوم مبلغا فانه يحل له الاخذ وان لم يدرس فيهما للعرف بخلاف غيرهما من أيام الاسبوع حيث لا يحل له أخذ الاجر عن يوم لم يدرس فيه مطلقا سواء قدر له اجر كل يوم أو لا اه ط قلت هذا ظاهر فيما اذا قدر لكل يوم درس فيه مبلغا أما لو قال يعطى المدرس كل يوم كذا فينبغي أن يعطى ليوم البطالة المتعارفة بقرينة ما ذكره في مقابله من البناء على العرف فحيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلثاء والجمعة وفي رمضان والعيدين يحل الأخذ وكذا لو بطل في يوم غير معتاد لتحرير درس الا اذا نص الواقف على تقييد الدفع باليوم الذي يدرس فيه كما قلنا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۸ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ	فتویٰ نمبر: ۷۵

﴿طاعات پر اُجرت لینے کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کسی مسجد میں امام بن رہا ہو یا کسی مدرسہ میں مدرس بن رہا ہو تو کیا مسجد و مدرسہ کی انتظامیہ کے ساتھ تنخواہ کی تعیین ضروری ہے یا بغیر تعیین کے بھی زید یہ سمجھ کر کام شروع کر سکتا ہے کہ انتظامیہ جو تنخواہ دیگی انشاء اللہ اسی پر باہمی رضامندی ہو جائے گی؟	مستفتی: سلمان احمد ٹانکوی

﴿جواب﴾ امامت اور دینی مدارس میں تدریسی خدمات انجام دینا طاعات میں سے ہیں اور طاعات پر اُجرت لینے کو متقدمین فقہاء کرام ناجائز قرار دیتے تھے اور یہی اصل حکم ہے لیکن متاخرین فقہاء کرام نے ان کاموں کی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر جواز کا فتویٰ دیا ہے اس لئے

کہ اُجرت لینے کو اگر منع کیا جائے اور حکومت کی طرف سے بھی اسطرح کی خدمات انجام دینے والوں کی ضروریات کا بندوبست نہ ہو جسطرح آج کل ہو رہا ہے تو امامت، تدریس اور خطابت جیسے اہم شعبے ناکارہ ہو جائیں گے۔ ہر کوئی بیوی بچوں اور ذاتی ضروریات کیلئے دنیاوی مشاغل میں لگا رہیگا، اس لئے جمہور علماء امامت، خطابت اور دینی علوم پر اُجرت لینے کی گنجائش بتاتے ہیں.

لہذا ازروئے فتویٰ امامت وغیرہ پر اُجرت لینا جائز ہے اور اگر کوئی اُجرت کے بغیر یہ خدمات انجام دیتا رہے تو بلاشبہ زیادہ اُجر وثواب کا باعث ہے اور تقویٰ کے لائق ہے، اس لئے بعض مدارس میں مدرس کیلئے کوئی اُجرت طے نہیں کی جاتی۔ انتظامی امور کے ذمہ دار حضرات خدمات انجام دینے والوں کی ضروریات کو دیکھ کر اپنی صوابدید پر کسی کو کم کسی کو زیادہ دیتے ہیں اور جس کے بارے میں اطمینان ہو کہ اسکی ضروریات دیگر وسائل سے پوری ہو رہی ہیں تو اسکو بالکل نہیں دیتے اور کسی کو بھی گراں نہیں گزرتا اسلئے کہ شروع سے دونوں جانب صرف دینی خدمت انجام دینا ہی مقصود ہوتا ہے اور ثواب ہی کی غرض سے وہ خدمات انجام دیتے ہیں۔ بعض ائمہ مساجد بھی اس ترتیب سے خدمات دیتے ہیں.

اور بعض مدرسین اور ائمہ مساجد گو یہ توقع رکھتے ہیں کہ انتظامیہ کی طرف سے بقدر ضرورت ملتا رہیگا لیکن باقاعدہ کچھ طے نہیں کراتے بلکہ واضح بھی کر دیتے ہیں کہ میں خدمات انجام دونگا میری طرف سے معاوضہ کا مطالبہ نہیں ہوگا البتہ آپ لوگ دینگے تو رد بھی نہیں کرونگا تو یہ بھی کوئی معاملہ اُجرت نہیں ہے۔ خدمات انجام دینے والے کے حق میں محض عبادت ہے اور دینے والوں کی طرف سے مالی مدد محض احسان وثواب ہے بشرطیکہ انتظامیہ کی طرف سے کبھی مدد نہ ملے تو اس کو ناگوار نہ گزرتا ہو، ناگوار اگر گزرتا ہو یا اس کا قوی اندیشہ بھی اگر ہو تو باقاعدہ اُجرت طے کرنا ضروری ہے، ایسی صورت میں بجائے ثواب کے گناہ کا اندیشہ ہوتا ہے.

اور ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ خدمات انجام دینے والا باقاعدہ اپنا حق سمجھتا ہو اور انتظامیہ والوں کو بھی اس کے جذبات وخیالات کا علم ہے کہ یہ شخص مفت میں کام کرنے والا نہیں ہے اسکے باوجود معاملہ خاموشی میں رکھتے ہیں باقاعدہ کچھ طے نہیں کرتے اور علاقہ میں اسطرح کی خدمات انجام دینے پر اُجرت لینا دینا رائج بھی ہو تو یہ اجارہ فاسدہ کی صورت ہے۔ فریقین پر شرعاً واجب ہے کہ باقاعدہ اُجرت وخدمت طے کریں ورنہ دونوں گنہگار ہونگے۔ اور ایسی

صورت میں اگر نزاع پیدا ہو جائے یعنی خدمت گزار کو جب معاوضہ ملے اور وہ اس کو کم سمجھے اور ناراضگی کا اظہار کرے تو اُجرت مثل دینا ضروری ہوگا۔

لمافی اعلاء السنن(۱۶/۲۰۲، ۲۰۴ ادارۃ المعارف)

قال: فان اعطى المعلم شيئا من غير شرط فظاهر كلام أحمد جوازه (وهو قولنا معشر الحنفية) وكرهه طائفة من اهل العلم، لما تقدم من حديث القوس والخميصة ـــ، ووجه الاول قول النبي صلى الله عليه وسلم: "ما أتاك من غير اشراف نفس ولا مسألة فخذه وتموله، فانه رزق ساقه الله اليك."

"وقد أرخص النبي صلى الله عليه وسلم لأبي في أكل طعام الذي كان يعلمه اذا كان من طعامه وطعام أهله." ـــ ولأنه اذا كان بغير شرط كان هبة مجردة، فجاز، كما لو لم يعلمه شيئا. فأما حديث القوس والخميصة فقضيتان في عين، فيحتمل أن النبي صلى الله عليه وسلم علم انهما فعلا ذلك لله خالصا فكره أخذ العوض من غير الله تعالى، ويحتمل غير ذلك اهـ..... فهؤلاء جماعة الصحابة والتابعين انما كرهوا تعليم القرآن بأجر مشروط، وأما اذا أعطى شيئا من غير شرط فقد صح عن عمر أنه كان يرزق المعلمين من بيت المال.

ولما في رسائل ابن عابدين(۱/۱۶۸، ۱۶۹ مكتبة عثمانية)

والحاصل ان اخذ الاجرة على العبادات حرام وما يأخذه الفقهاء ونحوهم لما صلة لهم او كفاية لهم عن الاشتغال بالكسب ولما اجرة على اتعاب النفس فيما دون العبادات انتهى ملخصا.

ولما في خلاصة الفتاوى(۱/۲۸ طبع رشيدية)

ولا يحل للمؤذن ولا للامام ان يأخذ على الاذان والامامة اجرا فان لم يشارطهم على شيء لكنهم عرفوا حاجته فجمعوا له في كل وقت شيئا كان حسنا يطيب له ولا يكون اجرا.

ولما في التنوير مع الدر(۶/۵۵ طبع سعيد)

(ولا تصح الاجارة لعسب التيس) ـــ (و) لا لأجل الطاعات مثل (الأذان والحج والامامة وتعليم القرآن والفقه) ويفتى اليوم بصحتها لتعليم القرآن والفقه والامامة والأذان.

ولما في الدر المختار(۶/۵ طبع سعيد)

وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين لأن جهالتهما تفضي الى المنازعة.

ولما في الهندية(۵/۴۴۹ مكتبة رشيدية)

قال الفقيه اذا أراد المعلم أن ينال الثواب ويكون عمله عمل الأنبياء فعليه أن يحفظ خمسة أشياء أولها أن لا يشارط الأجر ولا يستقصي فيه فكل من أعطاه شيأ أخذه ومن لم يعطه شيأ تركه وان شارط على تعليم الهجاء وحفظ الصبيان جاز الخ.

ولما في معارف السنن(۲/۲۲۲ طبع سعيد)

انما كره المتقدمون الاستيجار على تعليم القرآن وكرهوا أخذ الأجر على ذلك لأنه كان

للمعلمين عطيات في بيت المال في ذلك الزمان وكان لهم زيادة رغبة في أمر الدين وإقامة الحسبة وفي زماننا انقطعت عطياتهم وانتقصت رغائب الناس في أمر الآخرة. فلو اشتغلوا بالتعليم مع الحاجة الى مصالح المعاش لاختل معاشهم فللذا بصحة الاجارة ووجوب الأجرة للمعلم.

ولما في التنوير مع الدر والرد(۶/۲۵طبع سعید)

باب الاجارة الفاسدة:(الفاسد)من العقود(ما كان مشروعا بأصله دون وصفه،والباطل ماليس مشروعا أصلا)لا بأصله ولا بوصفه(وحكم الأول)وهو الفاسد(وجوب أجر المثل بالاستعمال).

وفي الشامي:(قوله دون وصفه)وهو ما عرض عليه من الجهالة أو اشتراط شرط لا يقتضيه العقد حتى لو خلا عنه كان صحيحا ط.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفی عنہ — واللہ اعلم بالصواب :صدیق انور

۲۳ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ — فتوی نمبر :۳۳۴۸

﴿غیر حاضری کے دنوں کی تنخواہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مدارس کے اساتذہ اور مساجد کے ائمہ حضرات جن دنوں میں غیر حاضر ہوتے ہیں کیا ان دنوں کی اجرت کے بھی مستحق ہوتے ہیں یا نہیں؟ نیز کتنے دنوں کی غیر حاضری کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

﴿جواب﴾ اس مسئلہ میں مدارس اور مساجد وغیرہ کے عرف پر عمل ہوگا کہ عرف میں جتنی غیر حاضریاں معاف سمجھی جاتی ہیں ان کی اجرت کا تو مستحق ہوگا زیادہ کا نہیں۔

لما في الشامي:(۲/۴۱۹،طبع ایچ ایم سعید)

وفي القنية من باب الامامة امام يترك الامامة لزيارة أقربائه في الرساتيق أسبوعا أو نحوه أو لمصيبة أو لاستراحة لا بأس به ومثله عفو في العادة والشرع اه وهذا مبني على القول بأن خروجه أقل من خمسة عشر يوما بلا عذر شرعي، لا يسقط معلومه، وقد ذكر في الأشباه في قاعدة العادة محكمة عبارة القنية هذه وحملها على أنه يسامح اسبوعا في كل شهر،واعترضه بعض محشيه بان قوله في كل شهر ملبس في عبارة القنية ما يدل عليه قلت: والأظهر ما في اخر شرح منية المصلي للحلبي أن الظاهر أن المراد في كل سنة.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم :شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۷ جمادی الاولی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر :۳۳۷

﴿درزی اگر لمبائی و چوڑائی میں کمی بیشی کر دے تو کیا حکم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ میں نے درزی کو کپڑا دیا اور اپنا

ناپ بھی بتلایا کہ مثلاً قمیص کی لمبائی، چوڑائی اتنی ہونی چاہیے لیکن درزی نے متعینہ لمبائی وچوڑائی سے بہت کم قمیص کردی تو کیا اس صورت میں میں درزی سے ضمان لے سکتا ہوں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر ایک انگلی کی مقدار تک قمیص وشلوار کی لمبائی یا چوڑائی میں کمی آگئی ہے تو اس کا اعتبار نہیں ہے اور نہ اس کا ضمان لازم آئیگا، البتہ ایک انگلی سے زیادہ کی اور نقص آگیا تو اس صورت میں درزی سے ضمان لینا جائز ہے۔

(لما فی الدر المختار مع الرد المحتار:(۶/۲۷طبع سعید)

قال للخیاط:اقطع طوله وعرضه وكمه كذا فجاء ناقصاً ان قدر اصبع ونحوه عفو وان كثر ضمنه ــــ قال الشامیؒ:(قوله عفو)ای وله الاجر لقلة التفاوت ،ولعسر الاحتراز (قوله ضمنه)لانه مما يخل بالمقصود فيعد اتلافاً.

(ولما فی الهندیة ۲/۵۱۵قدیمی کتب خانه)

اذا دفع الی خیاط ثوباً وقال يقطعه حتى يصيب القدم وكمه خمسة اشبار وعرضه كذا فجاء بها ناقصاً قال ان كان قدر اصبع ونحوه فليس بشیء وان كان اكثر منه يضمنه كما فی الخلاصة.

(ولما فی الخلاصة الفتاوی ۲/۱۲۷ طبع رشیدیة)

ولو قدر للخياط طول الثوب وعرضه فجاء بها ناقصاً ان كان قدر اصبع ونحوها فليس بشیء، وان كان اكثر يضمنه.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفی اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اکی

۳۰ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:

﴿ملازم کے لیے وقت سے پہلے گھر آنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میں P.I.A میں اپرنٹس ہوں اور مجھے سات ہزار ماہانہ وظیفہ کے عنوان سے رقم ملتی ہے۔ کسی اپرنٹس کا ادارے میں کام یہ ہوتا ہے کہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ کام کو سیکھے چنانچہ اسی غرض سے ہم ادارہ کے مختلف شعبوں میں پھرتے ہیں بسا اوقات کام نہیں ہوتا تو ہم گھر چلے جاتے ہیں اور قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ادارے نے ہمیں کسی خاص نظام الاوقات کا پابند نہیں بنایا ہے کیونکہ ادارے نے اپنے مستقل ملازمین کو ایک پنچ سسٹم کا پابند کیا ہے یعنی بوقت دخول وخروج مشین کے اندر ہاتھ کا اندراج ہوتا ہے۔ اب مستفتی اپنے دل کی تسلی کے لیے پوچھنا چاہتا ہے کہ ہمارے لیے جلدی گھر جانا جائز ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ ہمیں ایک کاغذ دیا گیا ہے کہ ہم وقت کے تعین کے ساتھ حاضریوں کا

اندراج کریں اور جب مہینے کے آخر میں جمع کرائیں گے تو وظیفہ ملے گا اور ادارہ کبھی کبھی ایک غیر حاضری کی صورت میں ۲۰۰ پیسے کاٹ لیتا ہے لیکن وقت میں کمی کی صورت میں کوئی کٹوتی نہیں ہوتی۔ اور میں مذکورہ کاغذ میں صحیح وقت کے تعین کے ساتھ حاضریوں کا اندراج کرتا ہوں۔

﴿جواب﴾ شرعاً ملازم کے لیے ان پابندیوں کا پورا کرنا ضروری ہے جو ادارہ عقد ملازمت کے ضمن میں ملازم پر لازم کرے۔ آپ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ادارے نے آپ کو وقت کا پابند نہیں کیا البتہ کام آپ کے سپرد ہوا ہے لھذا آپ کی تنخواہ بھی کام کے ساتھ مشروط ہوگی۔ اور وقت سے پہلے جانا اگر آپ کے ذمہ دار آفیسر کے علم میں ہو اور پھر بھی وہ منع نہ کریں تو یہ دلالۃ اجازت سمجھی جائیگی لھذا کام نہ ہونے کی صورت میں آپ وقت سے پہلے جلدی گھر جاسکتے ہیں لیکن اگر کام تھا مگر نہیں کیا، یا کیا تو ہے مگر ناقص کیا تو ادارے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تنخواہ میں سے کچھ وضع کردیں لیکن اگر ادارہ بخوشی پوری تنخواہ دے دے تو آپ کے لیے لینا جائز ہے۔

لما فی قوله تعالیٰ پارہ ۱۵ سورہ بنی اسرائیل ﴿وأوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا﴾

ولما فی مشكوة المصابيح ۲۵۵/۱ طبع سعید)

عن ابی حرة عن عمه قال قال رسول الله ﷺ ألا لا تظلموا ألا لا يحل مال امرىء الا بطيب نفس منه رواه البيهقي فی شعب الايمان .

ولما فی تنوير الابصار والدر المختار ٦/ ٦٤ طبع سعید)

(الاجراء على ضربين مشترك وخاص فالاول من يعمل لا لواحد)كالخياط ونحوه (أو يعمل له عملا غير موقت)كان استاجره للخياطة فی بيته غير مقيدة بمدة كان أجيرا مشتركا وان لم يعمل لغيره (أو موقتا بلا تخصيص)كان استاجره ليرعى غنمه شهرا بدرهم كان مشتركا الا ان يقول ولا ترعى غنم غيرى وسيتضح .وبعد اسطر (ولا يستحق المشترك الأجر حتى يعمل كالقصار ونحوه)

ولما فی الرد المختار ٦/ ٦٤ طبع سعید)

(قوله حتى يعمل)لان الاجارة عقد معاوضة فتقتضی المساواة بينهما فما لم يسلم المعقود عليه للمستاجر لا يسلم له العوض والمعقود عليه هو العمل أو أثره على ما بينا فلا بد من العمل زيلعى والمراد لا يستحق الأجر مع قطع النظر عن امور خارجية كما اذا عجل له الأجر أو شرط تعجيله كما فی السعدية .

ولما فی الهنديه ۵۰۹/۴ طبع رشیدیه)

اختلفت عبارة المشايخ فی الحد الفاصل بينهما بعضهم قالوا :الأجير المشترك من يستحق الأجر بالعمل لا بتسليم نفسه للعمل .والأجير الخاص من يستحق الأجر

بتسليم نفسه وبمضي المدة ولا يشترط العمل في حقه لاستحقاق الأجر وبعد اسطر والأوجه ان يقال الأجير المشترك من يكون عقده واردا على عمل معلوم ببيان عمله.

ولما في البحر الرائق ۲۶/۸ طبع سعيد)

وبيان ذلك ان معنى الأجير المشترك من لا يجب عليه ان يختص بواحد عمل لغيره أو لم يعمل ولا يشترط ان يكون عاملا لغير واحد بل اذا عمل لواحد فهو مشترك اذا كان بحيث لا يمتنع ولا يبعد عليه ان يعمل لغير واحد قال الشارح والأولى ان يقال الأجير المشترك من يكون عقده واردا علىٰ عمل معلوم ببيان محله ليسلم من النقض (ولا يستحق الأجرة حتى يعمل كالقصار والصباغ والخياط والنساج)لان الأجارة عقد معاوضة فيقتضي المساواة بينهما كما تقدم.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اکمی

۷ صفرالخیر ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر: ۳۶۴۲

﴿غیر مسلم کے لئے اجرت پر کام کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کارپینٹر کا کام کرتا ہوں میرے پاس ایک ہندو آیا کہ میرے گھر کے لئے ایک الماری کتابوں کی بنادو جس میں وہ اپنی مذہبی کتابیں رکھے گا، تو کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں اس کے لئے الماری بنادوں؟ اور اس سے حاصل ہونے والی مزدوری کا استعمال میرے لئے جائز ہوگا؟ مستفتی: نصرت اللہ

﴿جواب﴾ آپ کارپینٹر ہیں یہی آپ کا روزگار ہے ہندو آدمی کے لئے آپ الماری بنا سکتے ہیں وہ اس میں مذہبی کتابیں رکھے یا دوسرے کسی کام میں لائے یہ اسکی مرضی ہے، آپ اپنے کام کی اجرت لے سکتے ہیں البتہ ہندو اور دیگر غیر مسلموں کی ایسی ملازمت یا خدمت وغیرہ انجام دینا جس میں مسلمان کی ذلت ورسوائی ہو مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

لما في فتاوى قاضي خان: (۲۲۶،۲۲۵/۲، كتاب الاجارات، طبع قديمي)

مسلم آجر نفسه من نصراني، ان استاجره لعمل غير الخدمة جاز، وان جر نفسه للخدمة، قال الشيخ الامام ابو بكر محمد بن الفضل: لايجوز. وذكر القدوري رحمه الله تعالى: انه يجوز، ويكره له خدمة الكافر.

ويقول الشيخ بعد سطور: ولو آجر المسلم نفسه من المجوس ليوقد لهم النار لاباس عندهم، لان التصرف في النار و الانتفاع بها مباح بخلاف الانتفاع بالخمر و حمل الخمر عندهم...... وكذا لو بنى بالاجر بيعة او كنيسة لليهود و النصارى، طاب له الاجر.

لما فی بدائع الصنائع:(۴/۱۸۹،کتاب الاجارۃ،مطلب فما یرجع الی المعقود علیه،طبع سعید)
ولو استاجر ذمی مسلما لیخدمه ذکر فی الاصل انه یجوز و اکره للمسلم خدمة الذمی اما الکراهة فلان الاستخدام استذلال فکان اجارة المسلم نفسه منه اذلالا لنفسه ولیس للمسلم ان یذل نفسه خصوصا بخدمة الکافر و اما الجواز فلانه عقد معارضة فیجوز کالبیع.
لما فی خلاصة الفتاوی:(۴/۱۲۹،کتاب الاجارات،طبع رشیدیة)
المسلم اذا آجر نفسه من الکافر لیخدمه جاز ویکره قال الفضلیؒ: لا یجوز فی الخدمة وما فیه اضلال، بخلاف الزراعة و السقی ، مسلم آجر نفسه من مجوسی لیوقد له النار لا باس به.
وبعد سطور: الیهود اذا استاجروا مسلما لیبنی لهم بیعة او کنیسة للنصاری فان الاجر یطیب له.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن حفظہ اللہ تعالیٰ　　　　واللہ اعلم بالصواب: جلال الدین خرسند

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۱-۴۷۳

﴿کفار کے ہاں ملازمت کی ایک خاص صورت کا بیان﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ مجھے بگرام ایئربیس (جو کہ امریکی فوج کے قبضہ میں ہے) میں ملازمت ملی ہے اور میرا کام یہ ہے کہ میں امریکی فوج کے زیر استعمال فریج وغیرہ خراب ہونے کی صورت میں مرمت اور ٹھیک کروں، کیا شرعا میرے لیے یہ ملازمت اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔　　　　مستفتی: محمد عرفان کراچی

﴿جواب﴾ امریکی فوج چونکہ افغانستان میں مسلمانوں کے خلاف لڑ رہی ہے اور ایسی فوج کے ہاتھ وہ چیزیں بیچنا حرام اور ناجائز ہے کہ جن کے ذریعے ان کو مسلمان مجاہدین کے خلاف قوت اور مدد ملے البتہ فقہاء کرام نے تاجروں کے لیے ان چیزوں کی اگرچہ اجازت دی ہے کہ جن سے کفار کو مسلمانوں کے خلاف قوت اور مدد نہیں ملتی لیکن ساتھ ہی صراحت بھی فرمائی ہے کہ تاجروں کے لیے ایسی چیزوں کی تجارت سے گریز کرنا بہتر وافضل ہے کیونکہ کفار مسلمانوں کو ہلکا اور ذلیل سمجھتے ہیں اور مسلمان انکی ظاہری شوکت سے متاثر ہونگے لہذا اپنے دین وایمان اور عزت نفس کی خاطر اس ملازمت سے دور رہنا بہتر ہے۔

لما فی الرد المحتار:(۴/۱۳۴طبع:سعید)
(قوله ولم نبع)اراد به التملیک بوجه کالهبة قهستانی بل الظاهر ان الایجار والاعارة کذلک لان العلة منع ما فیه تقویة علی قتالنا (یحرم)ای یکره کراهة تحریم (قوله کحدید)(کسلاح مما استعمل للحرب ولو صغیراً کالابرة وکذا ما فی حکمه من الحریر والدیباج فان تملیکه مکروه لانه یصنع منه الرایة .....(قوله ولا نحمله الیهم)ای لبیع

ونحوه فلا بأس للتاجرنا ان يدخل دارهم بامان ومعه سلاح لا يريد بيعه منهم اذا علم انهم لا يتعرضون له والا فيمنع عنه

ولما في البدائع الصنائع:(۱۰۲/۷طبع:سعید)

وأما بيان ما يكره حمله الى دار الحرب وما لا يكره فنقول ليس للتاجر ان يحمل الى دار الحرب ما يستعين به اهل الحرب على الحرب من الاسلحة والخيل والرقيق من اهل الذمة وكل ما يستعان به في الحرب لان فيه امدادهم واعانتهم على حرب المسلمين قال الله تبارك وتعالى ولا تعاونوا على الاثم والعدوان فلا يمكن من الحمل ......ولا بأس بحمل الثياب والمتاع والطعام ونحو ذلك اليهم لانعدام معنى الامداد والاعانة وعلى ذلك جرت العادة من تجار الاعصار انهم يدخلون دار الحرب للتجارة من غير ظهور الرد والانكار اليهم الا ان الترك افضل لانهم يستخفون بالمسلمين ويدعونهم الى ما هم عليه فكان الكف والامساك عن الدخول من باب صيانة النفس عن الهوان والدين عن الزوال فكان اولى۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٹکی

۲۷ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۶۳

﴿ گائے چرانے کی اُجرت اسکے دودھ اور نسل میں سے مقرر کرنا ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے عمرو کو اپنی گائے دی اور کہا کہ یہ گائے پانچ سال آپ اپنے پاس رکھیں، اس کا چارہ وغیرہ آپ کے ذمے ہے، اور اس کا دودھ وغیرہ بھی آپ استعمال کریں، البتہ اس عرصے میں گائے کی نسل میں جو اضافہ ہوگا وہ ہم دونوں کے درمیان آدھا آدھا ہوگا، ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ شریعت ہر ایسے معاملے کو منع کرتی ہے جس میں معاملہ کرنے والوں کا آپس میں ناراضگی یا اختلاف کا اندیشہ رہتا ہو، مذکورہ معاملہ چونکہ اسی نوعیت کا ہے اس لئے ناجائز ہے اس کو فوراً ختم کرنا ضروری ہے، اس کی جائز صورت ایک یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ زید گائے کا آدھا حصہ عمرو کو چند روپوں کے عوض فروخت کردے، گائے مشترک ہو جائے گی، پھر چارہ کا خرچہ بھی مشترک ہوگا ،اور حاصل ہونے والا دودھ بھی ،اور بچے بھی مشترک ہونگے ،آگے زید دودھ کا اپنا حصہ بطور احسان چھوڑتا ہے اور عمرو چارہ کا خرچہ وغیرہ چھوڑتا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے.

(لما في سنن الدار قطني ۲/ ۶۲۲ طبع: دار المعرفة)

عن ابي سعيد الخدري ؓ قال نهى عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان "

وفي التنوير مع الدر (۶/۵۱ طبع سعيد)

ولو دفع غزلا لآخر لينسجه له بنصفه)اى بنصف الغزل(او استأجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه اوثورا ليطحن بره ببعض دقيقه)فسدت في الكل لانه استأجره بجزء من عمله والاصل في ذلك نهيه ﷺ عن قفيز الطحان ـــ والحيلة أن يفرز الأجر اولا او يسمي قفيزا بلا تعيين ثم يعطيه قفيزا منه فيجوز.

(وفي المحيط البرهاني (۱۲/۱۶،۱۷ طبع:ادارة القرآن)

اذا دفع الى آخر بقرة بالعلف ليكون الحادث بينهما نصفان ،فالحادث كله لصاحب البقرة وعليه اجر مثل عمل المدفوع اليه وثمن العلف وهذا لان المدفوع اليه غير متبرع فيما صنع ،لانه انما فعل ذلك رجاء ان يسلم له نصف الحادث ولا يسلم له نصف الحادث فهنا لفساد العقد لكون البدل مجهولا .

والحيلة في جنس هذه المسائل ان يبيع صاحب البيضة نصف البيضة ،وصاحب الدجاجة والبقرة نصف الدجاجة والبقرة من المدفوع اليه ويبرءه عن ثمن ما اشترى، فيكون بينهما .

(وفي فتاوى قاضي خان ۲/۳۲۲،طبع:قديمي)

رجل اخذ من رجل بقرة على ان ماحصل من لبنها من المصل والسمن والرائب يكون بينهما لايجوز.........والحيلة في تجويز هذا التصرف ،ان يبيع نصف هذه البقرة من المدفوع اليه بثمن معلوم ،ويسلم البقرة اليه ثم يأمره بان يتخذ من لبنها المصل والسمن وغير ذلك، فيكون ذلك بينهما .

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: صدیق انور

۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۲۷۶

﴿ گائے پالنے کی اجرت اس کی قیمت میں سے متعین کرنا ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں رواج ہے کہ گائے کے بچے کو اس شرط پر کسی دوسرے شخص کو دے دیا جاتا ہے کہ جب یہ بچہ بڑا ہوگا تو اس کو بیچ کر اسکی قیمت مالک اور پالنے والے دونوں میں آدھی آدھی تقسیم ہوگی یا جب یہ بچہ بڑا ہو کر بچہ جنے گا تو اصل جانور مالک کو واپس کر دیا جائے گا اور اسکا جنا ہوا بچہ پالنے والے کا ہو جائے گا، شرعاً اس عقد کا کیا حکم ہے؟ اگر صحیح نہیں تو شرعاً اسکی صحیح متبادل صورت کیا ہوگی؟

﴿جواب﴾ یاد رہے کہ مذکورہ عقد اجارۂ فاسدہ کی ایک صورت ہے، یوں کہ اسمیں اجرت اور مدت کے مجہول ہونے کیساتھ ساتھ قفیز الطحان کی صورت بھی پائی جاتی ہے جو کہ ممنوع ہے، لہذا اس طرح کے عقد سے بچنا چاہیے، البتہ اس کی متبادل صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جانور پالنے

والے کیساتھ مخصوص مدت تک جانور پالنے کی اجرت مقرر کی جائے اور جب مدت مقررہ پوری ہوجائے اور جانور نے بچہ جنا ہوتو پالنے والے کو وہی بچہ بطور اجرت دیا جاسکتا ہے اگر بچہ نہ جنا ہو تو بھی پالنے والے کو متعین اجرت دیجائیگی، جانور کا مالک جانور فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت سے بھی مقررہ اجرت دے سکتا ہے۔

لمافی البحر:(۱۲/۸،باب الاجارۃ الفاسدۃ،طبع:سعید)

(یفسد الاجارۃ الشرط)قال فی المحیط کل جھالۃ تفسد البیع تفسد الاجارۃ لان الجھالۃ للتمکنۃ فی البدل او المبدل تفضی الی المنازعۃ.

ولمافی الهدایۃ:(۲۰۸/۳،رحمانیہ)اذا استاجر حمارا یحمل علیہ طعاما بقفیز منہ فالاجارۃ فاسدۃ.

ولمافی التنویر مع الدر:(۵۶/۶-۵۷،باب الاجارۃ الفاسدۃ،طبع سعید)

(أواستاجر بغلا لیحمل طعامہ ببعضہ اوثوراً لیطحن برہ ببعض دقیقہ)فسدت فی الکل ویجب اجر المثل لایجاوز بہ المسمی زیلعی.

ولمافی العنایۃ علی هامش الفتح:(۱۰۹/۹،طبع رشیدیہ)

وھذا اصل کبیر یعرف بہ فساد کثیر من الاجارات فان قیل اذا کان عرف دیارنا علی ذلک،فھل یترک القیاس؟قلنا:لا.

ولمافی الدر المختار:(۵۷/۶،طبع سعید)

والحیلۃ ان یفرز الاجر أولاً أویسمی قفیزا بلاتعیین ثم یعطیہ قفیزا منہ فیجوز.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:ذیشان احمد طارق

۸صفرالخیر۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۸۴۳

﴿شراب کی فیکٹری میں کام کرنا منع ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شراب مسلمانوں کے لئے حرام ہے:اگر کوئی مسلمان غیر مسلموں کے پاس شراب خانہ یا شراب فیکٹری میں کام کرتا ہے مزدوری لیکر تو کیا یہ شخص شریعت کی روشنی میں کام کرسکتا ہے؟

﴿جواب﴾ شراب تیار کرنا، یا تیار کرانے میں معاونت کرنا دونوں منع ہیں، اگرچہ یہ کام غیر مسلموں کے پاس کوئی مسلمان کرے، اس لئے کہ احادیث میں شراب بنانے کی باقاعدہ وضاحت کیساتھ ممانعت آئی ہے۔

لمافی قولہ تعالی:(سورۃ المائدہ ۲)﴿ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان.﴾

ولما فی سنن ابن ماجه: (ص:۲۲۲،طبع: فاروقی)

باب لعنة الخمر علی عشرة اوجه :عن ابن عمر یقول قال قال رسول اللهﷺ لعنة الخمر علی عشرة اوجه بعینها وعاصرها ومعتصرها وبائعها ومبتاعها وحاملها والمحمولة الیه وآکل ثمنها وشاربها وساقیها.

ولما فی الشامی:(۳۹۱/۶،طبع: سعید)

اقول:وهو خلاف اطلاق المتون وتعلیل الشروح بما مر وقال ط:وفیه انه لایظهر الا علی قول من قال ان الکفار غیر مخاطبین بفروع الشریعة والاصح خطابهم ،وعلیه فیکون اعانة علی المعصیة،فلا فرق بین المسلم والکافر فی العصیر منهما فتدبر.

ولما فی فتاوی الولوالجیة:(۳۸٦/۲،طبع: فاروقی)

رجلا اجر نفسه من مجوسی یوقد له نارا لاباس به ولو اجر نفسه لیحمل الخمر یکره ذلک ،لان التصرف فی النار مباح وفی الخمر لا.

وایضا:(۳۲۱/۲،طبع: فاروقی)

فقیر اجر نفسه من کافر لیعصر العنب لیتخذامنه الخمر یکره له ذلک ،لان النبی ﷺ قال:"لعن الله عاصرها"الحدیث

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بندہ شاہ جہان غفرلہ ولوالدیہ

۲۲صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:۳۱۲٦

﴿بقدرِ مسافت ٹیکسی کے کرایہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ماڑی پور سے کورنگی تک ایک ٹیکسی اپنے سامان کی منتقلی کیلئے کرائے پر لی اور باہمی رضامندی سے کرایہ پانچ سو (۵۰۰) روپے مقرر کیا، اب راستہ کے درمیان میں ٹیکسی خراب ہوگئی، تو اس صورت میں ٹیکسی والا کرایہ کا مستحق ہے کہ نہیں؟ اگر ہے تو کتنے کرایہ کا مستحق ہے حالانکہ مسافر شخص اگر دوبارہ ٹیکسی کرایہ پر لے گا تب بھی اسکو پانچ سو (۵۰۰) روپے میں ٹیکسی ملے گی تو کیا شریعت میں ایسے شخص کیلئے بھی کوئی رعایت ہے کہ نہیں؟

مستفتی: محمد زبیر کورنگی

﴿جواب﴾ ٹیکسی اگر واقعی خراب ہوئی ہے تو یہ حقیقی عذر ہے جسکی وجہ سے یہ اجارہ فسخ ہوجائے گا اور ٹیکسی والے نے جتنی مسافت طے کی ہے اسی کی بقدر وہ کرایہ کا مستحق ہوگا، لہٰذا اگر آدھے راستہ تک مسافت طے کی ہے تو آدھے کرایہ کا مستحق ہوگا۔

اور رہا یہ کہ آدھے راستہ کی مسافت کیلئے بھی ٹیکسی پانچ سو (۵۰۰) روپے میں ملے گی یہ سمجھ

سے دور ہے بلکہ ممکن ہے کوئی دوسو (۲۰۰) روپے میں بھی تیار ہو، بہرحال دوسری ٹیکسی والے کیساتھ اب دوبارہ باہمی رضامندی سے معاملہ طے کریگا، کم ہو خواہ زیادہ، اس معاملہ کا تعلق پہلے والے کیساتھ نہیں ہے۔

لما فی الهداية:(۲/۲۱۸،طبع رحمانيه)

ومن استأجر دابة ليسافر عليها ثم بدا له من السفر فهو عذر لأنه لو مضى على موجب العقد يلزمه ضرر زائد لأنه ربما يذهب للحج فذهب وقته أو لطلب غريمه فحضر أو للتجارة فافتقر وان بدا للمكارى فليس ذلك بعذر لأنه يمكنه أن يقعد ويبعث الدواب على يد تلميذه أو أجيره. وقال العلامة عبدالحئى اللكهنوىؒ تحت قوله بدا له معناه ان بدا له صلاح خلاف ماقصد من السفر أى ظهر له فيه رأى منعه من ذلك السفر.

ولما فى المبسوط:(ج۱۵ص۱۷۸ طبع دار المعرفة بيروت)

وان نفقت الدابة فى الطريق فعليه من الكراء بقدر ما ساروا. وكذا فى الشامى:(۶/۷۷،طبع سعيد)

ولما فى الخانية على هامش الهندية:(۲/۳۵۴،طبع رشيديه)

رجل استأجر رجلاً ليذهب بحمولته الى موضع كذا فلما سار بعض الطريق بدا له أن لا يذهب ويترك الاجارة وطلب من الأجير نصف الأجر قالوا ان كان النصف الباقى من الطريق مثل الأول فى السهولة والصعوبة كان له ذلك والا يسترد بقدره. وكذا فى الشامى:(۶/۶۹،طبع سعيد) وكذا فى القدورى:(ص۱۱۴ طبع قديمى)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: علی خان

۱۵ رجب المرجب ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۵۳

﴿اجارہ پر طویل المیعاد زمین لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ لیز (اجارہ) پر ۹۰ سال تک زمین خریدنا اور پھر ہر سال ایک مخصوص رقم مثلاً چار سو روپے ہر ماہ ادا کرنا ضروری ہوگا اور سالانہ اضافہ بھی ہوتا رہے گا جبکہ یہ بات دورانِ عقد واضح ہو چکی ہو تو یہ معاملہ شرعاً کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: ڈاکٹر عبدالرحمٰن

﴿جواب﴾ نوے (۹۰) سال کے لئے زمین لیز (اجارہ) پر لینا دینا جائز ہے، اور سالانہ ایک مخصوص رقم لینا بھی جائز ہے بشرطیکہ معاملہ کرتے وقت یہ تمام باتیں واضح طور پر معلوم ہوں، البتہ یہ کہ سالانہ اضافہ بھی ہوتا رہے گا، اس شق کی وجہ سے پورا معاملہ فاسد ہوا، اس لئے کہ اضافہ اجرت کا حصہ ہوگا اور اجرت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اجارہ فاسد ہو جاتا ہے۔

لہذا شروع میں اگر اس کا تعین نہیں ہوا ہے تو یہ معاملہ واجب الفسخ ہے یعنی معاملہ ختم کرنا ضروری ہے۔

لما فی الفتاوی الشامی:(۶/۱،طبع سعید)

قال فی المنح:بعد نقل ما فی الخلاصة ومفاده أن الأجرة اذا كانت معلومة فی الاجارة الطويلة تنعقد فی التعاطی،لأنه جعل العلة فی عدم انعقادها كون الأجرة فيها غير معلومة والله تعالى اعلم.وكذا فی الفتاوی الشامی:(۲۹۱/۲-۲۹۲-۲۹۳،طبع سعید) وكذا فی الفقه الاسلامی مع أدلته:(۳۲۵۳/۲،طبع رشيديه)وكذا فی الهداية:(۲۹۲/۳،طبع رحمانيه)وكذا فی الهندية:(۴۱۱/۲،طبع رشيديه)وكذا فی البحر:(۶/۸،طبع سعيد)

ولما فی البحر:(۳۱۲/۷،طبع سعيد)

فقال:اذا كان ما وقع عليه عقد الاجارة مجهولا فی نفسه أو فی أجرة أو فی مدة الاجارة أو فی العمل المستأجر عليه فالاجارة فاسدة وكل جهالة تدخل فی البيع فتفسده من جهة الجهالة فكذلك هی فی الاجارة وفيه:(۱۶/۸-۱۷)يفسد الاجارة الشرط،قال فی المحيط:كل جهالة تفسد البيع تفسد الاجارة المتمكنة فی البدل أو المبدل منه تفضی الی المنازعة وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين يفضی الی المنازعة فيفسد الاجارة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۳ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ   فتویٰ نمبر:۲۸۰۶

﴿متعین کردہ شخص کے علاوہ ٹیکسی چلانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں، مالکِ ٹیکسی نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ صرف آپ ہی چلاؤ گے، آپ پر میرا اعتماد ہے، لیکن کبھی کبھار گھر میں بیماری وغیرہ کی وجہ سے میرا بیٹا چلا لیتا ہے تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ میرا اس ٹیکسی کے علاوہ کوئی اور سہارہ نہیں ہے۔   مستفتی:عزیز اللہ بلال چورنگی کراچی

﴿جواب﴾ ٹیکسی کے مالک نے آپ کو واضح کر کے اگر خود چلانے کا پابند کیا ہے تو اس عہد کی پاسداری ضروری ہے، بیٹے کو چلانے کے لئے دینا جائز نہیں۔

لما فی التنوير مع الرد:(۲۵/۶،كتاب الاجارات،طبع سعيد)

(وان قيد براكب أو لابس فخالف ضمن اذا عطبت ولا أجر عليه وان سلم)

وفی الشامية:(قوله ضمن)لأنه صار متعدياً،لأن الركوب واللبس مما يتفاوت فيه الناس،فرب خفيف جاهل أضر علی الدابة من ثقيل عالم (قوله وان سلم)لأنه يكون

غاصبا أو منافع المغصب غير مضمونة الا فيما استثنى.

ولما في البحر:(۷/۲۰۸،كتاب الاجارات،طبع سعيد)

(قوله وان قيد براكب أو لابس فخالف ضمن) يعني اذا عطيت لأن الناس يتفاوتون في العلم بالركوب واللبس ولا أجر عليه،لأنه مع الضمان ممتنع وكذا لا أجر عليه ان سلم لأنه لما سلم تبين أنه لم يخالف.

ولما في البدائع:(۴/۱۸۳،كتاب الاجارات،طبع سعيد)

ولا بد فيهما من بيان ما يستأجر له في الحمل والركوب ،لأنهما منفعتان مختلفتان وبعد بيان ذلك لا بد من بيان ما يحمل عليها ومن يركبها،لأن الحمل يتفات بتفاوت المحمول والناس يتفاوتون في الركوب ،فترك البيان يفضي الى المنازعة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۱صفر الخیر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۹۰۴

﴿متعین کردہ پکوان کا مزدوروں سے کھانا پکوانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا پکوان سینٹر ہے، لوگ مجھ سے آرڈر پر کھانا پکواتے ہیں بعض اوقات لوگ اس بات پر مصر ہوتے ہیں کہ آپ خود پکائیں،آپ کے ہاتھوں کا کھانا لذیذ ہوتا ہے لیکن کبھی آرڈر زیادہ ہونے کی وجہ سے میں مزدوروں سے بنواتا ہوں، پوچھنا یہ ہے کہ آرڈر لیکر مزدوروں سے پکوانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے ملنے والی رقم میرے لئے جائز ہوگی یا نہیں؟ مستفتی:ہدایت اللہ بنارس کراچی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ جو حضرات آپ کو آرڈر دیکر وضاحت کے ساتھ یہ کہیں کہ آپ ہی پکاؤ گے مزدور سے نہیں پکانا تو اس صورت میں آپ کے لئے جائز نہیں کہ آپ مزدور سے پکوائیں،البتہ جو حضرات بغیر کسی تخصیص کے آرڈر دیں تو اس صورت میں جائز ہے کہ آپ کے بجائے آپ کے مزدور پکائیں اور اس سے ملنے والی اجرت بہر دو صورت جائز اور حلال ہے۔

لما في الهندية:(۴/۴۹۹،كتاب الاجارات،طبع رشيديه)

واذا شرط على الصناع أن يعمل بنفسه فليس له أن يستعمل غيره في محل بعينه فيستحق عينه كالمنفعة في محل بعينه وان أطلق له العمل فله أن يستأجره من يعمله لأن المستحق عمل في ذمته ويمكن ايفاء ه بنفسه وبالاستعانة بغيره بمنزلة ايفاء الدين.

ولما في البحر:(۷/۳۰۳،كتاب الاجارات،طبع سعيد)

(قوله ولا يستعمل غيره ان شرط عمله بنفسه)لأن المعقود عليه العمل في محل بعينه

کالمستعاللی محل بعینه......والمرادمن اشتراط العمل بنفسه أن یقول له اعمل بنفسک أوبیدک ولاتعمل بید غیرک کمافی الخلاصة،أمااذاقال أن تعمل فهومن قبیل مااذاأطلق کذافی المستصفیٰ وغایةالبیان(قوله وان أطلق کان له أن یستأجر غیره) لأن المستحق عمل فی ذمته ویمکن استیفاء ه بنفسه وبالاستعانة بمنزلة ایفاء الدین.

ولمافی البحر:(۱۹/۸،طبع سعید)

ومهرالبغی.....وان استأجرهاالیزنی بهائم أعطاهامهرهاأوماشرطهالاباس بأخذه،لأنه فی اجارةفاسدةفیطیب له وان کان السبب حراماً.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۱۹صفرالخیر۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۹۰۳

﴿ایڈوانس رقم پیشگی کرایہ کی تاویل سے لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم نے نئی دوکانیں بنائی ہیں جسکے پلستر وغیرہ ابھی تک نہیں ہوئے پڑوسی جلدی میں ایک دوکان چاہتا ہے جبکہ ہمارے پاس ضرورت سے زائد رقم اتنی نہیں جس سے ہم دوکان کے پلستر وغیرہ کرسکیں،ہم نے پڑوسی سے بات کی کہ آپ ہمیں ابھی اتنی رقم دیدیں جس سے ہم پلستر وغیرہ کریں،ایڈوانس میں لینے والی رقم ہم کرایہ میں شمار کرلینگے، کیا ہمارے لئے شرعاً ایسا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟بینوا توجروا۔　　مستفتی:بھائی ریاض محمد سواتی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں''ایڈوانس رقم''پیشگی کرایہ کی تأویل سے لینا جائز ہے، کیونکہ پیشگی کرایہ کی شرط شریعت کے رو سے جائز ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱۰/۶،کتاب الاجارات،طبع سعید)

(و)اعلم أن (الأجر لایلزم بالعقدفلایجب تسلیمه)به(بل بتعجیله أوشرطه فی الاجارة)المنجزة.

وفی الشامیة:(قوله لایلزم بالعقد)ای لایملک به کماعبرفی الکنز،لأن العقدوقع علی المنفعةوهی تحدث شیئاًفشیئاًوشان البدل أن یکون مقابلاًللمبدل وحیث لا یمکن استیفاء هاحالاًلایلزم بدلهاحالاًالااذاشرطه ولوحکمابان عجله،لأنه صارملتزماًله بنفسه حینئذوأبطل المساواةالتی اقتضاهاالعقدفصح.

وکذافی البحر:(۲/۸،کتاب الاجارات،طبع سعید)

ولمافی البدائع:(۱۹۵/۴،کتاب الاجارات،طبع سعید)

ولواجربشرط تعجیل الأجرةأوشرط علی المستأجرأن یعطیه بالأجرة رهناًأوکفیلا جاز،اذاکان الرهن معلوماًوالکفیل حاضراًلأن هذاشرط یلائم العقدوان کان

لا یقتضیہ کما ذکرنا فی البیوع، فیجوز کما فی بیع العین.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۱۸ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۹۰۱

﴿کسی کے لئے قرضہ وصول کرانے پر اجرت لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کا کسی دوسرے پر قرضہ ہے اور وہ شخص اپنا قرضہ اس سے وصول نہیں کرسکتا، ابھی ایک تیسرا آدمی کہتا ہے کہ میں تیرا قرضہ وصول کرتا ہوں لیکن مجھے کمیشن دو گے، تو کیا یہ مطالبہ اس کا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ کسی بھی جائز محنت کا معاوضہ لینا اجرت کے زمرے میں آتا ہے، یہ تیسرا شخص قرض خواہ کا حق وصول کرنے کیلئے ظاہر بات ہے اپنا وقت، اثر ورسوخ، آنے جانے کیلئے کرایہ وغیرہ خرچ کریگا، اس لیے اس پر اجرت لینا جائز ہے، البتہ پہلے سے طے ہو کہ اتنی رقم لوں گا، کمیشن فی صد کے اعتبار سے اگر طے ہو تو اس سے بھی اجرت متعین ہو جاتی ہے، اس لئے مذکورہ صورت جائز ہے۔ (امداد الفتاوی، ۳/۳۹۱ مکتبہ دار العلوم کراچی)

لما فی الدر المختار: (۶/۵ طبع سعید)

کون الاجرۃ والمنفعۃ معلومتین لان جهالتهما تفضی الی المنازعة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۱۲ رجب ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۸۲۴

﴿رشتہ کرانے پر اجرت لینا کیسا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل رشتہ طے کرانے کے لئے لوگوں نے دفاتر کھولے ہوتے ہیں اور لڑکا لڑکی والوں کی آپس میں سلام دعا کرا کر اس پر اجرت لیتے ہیں، ایسی اجرت لینا شرعاً کیسا ہے؟　　　مستفتی: محمد بشارت نخوہ

﴿جواب﴾ جسطرح خرید وفروخت میں دلال بڑا کردار ادا کرسکتا ہے اور معاملات میں اس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے، موجودہ دور میں رشتہ تلاش کرنے میں بھی اس کی ضرورت پیش آنے سے انکار نہیں کیا جاسکتا چونکہ ضرورت ہی کی خاطر دلال کی اجرت خرید وفروخت میں خلاف قیاس جائز قرار دی گئی ہے، اس لئے رشتہ کے معاملہ میں بھی دلال کی اجرت کا وہی حکم ہے یعنی جائز ہے۔

لسان قاضی خان(٢/٣٣٠ طبع قدیمی)

اختلف المشائخ في الدلالة في النكاح هل يكون لها اجر؟ قال الامام ابو بكر محمد بن الفضل: لا اجر لها لانه لا تستحق الزوج من كلامها بغير عقد انما هو الزوج في العقد والمتمم اقام بها وقال غيره من المشائخ لها اجر مثلها لان معظم الامر في النكاح يقوم بالدلالة فان النكاح لا يكون الا بمقدمات تكون من الدلالة فكان لها اجر المثل بمنزلة الدلال في البيع فانه يستحق الاجر وان كان البيع يكون من صاحب السلعة. كذا في الولوالجية (٣/٣٣٣ قبيل الفصل الثاني فيما يضمن المستاجر طبع مكتبہ رشیدیہ پشاور)
وكذا في البزازية (١/٣٣٣ نوع متفرقات اجارة على المعاصي طبع قدیمی)

الجواب صحیح عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شعیب عفی عنہ

۹ ربیع الاول ۱۴۲۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۹۱۳

﴿یتیم بچوں کی مدد کے لئے ان کے کاروبار کو سنبھالنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ایک دوست قضائے الٰہی سے شہید ہو گئے ہیں پسماندگان میں انکا ایک بالغ لڑکا ہے، ایک نابالغ، دو بیٹیاں اور ایک انکی اہلیہ بیوہ ہے۔ بچے زیر تعلیم ہیں اور خاندان میں کاروبار سنبھالنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے۔ پسماندگان کی خواہش ہے کہ مرحوم کے کاروبار کو میں سنبھال لوں اور وہ لوگ فرماتے ہیں کہ آپ جیسے مناسب سمجھیں یہ معاملہ خود طے کر لیں لیکن معاملہ دنیا و آخرت کے اعتبار سے نازک اور احتیاط طلب ہے اس لئے از خود کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ براہ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا حل بتادیں؟

مستفتی: محمد شاہد حنیف

﴿جواب﴾ یتیم بچوں کے کاروبار کو سنبھالنا بلاشبہ بڑا نازک اور احتیاط طلب امر ہے، لیکن کوئی متقی قابل بھروسہ آدمی اچھی نیت اور خیر خواہی کا جذبہ رکھتے ہوئے اگر سنبھال لے تاکہ یتیم بچوں کی مدد ہو یعنی یکسوئی سے وہ دینی تعلیم حاصل کریں اور اس کاروبار سے انکی ضروریات پوری ہوں تو بہت بڑے اجر وثواب کا بھی باعث ہے۔ کوئی بھی معاملہ متعاقدین کے باہمی رضامندی سے طے ہوتا ہے از خود ایک جانب سے کوئی طے نہیں کر سکتا، آپ مندرجہ ذیل تجاویز میں سے جو مناسب سمجھیں مرحوم کے بالغ لڑکے کے سامنے پیش کریں چونکہ دیگر یتیم بھائی اور بہنوں کا بھی وہی اب شرعاً ولی (ذمہ دار) ہے، اس لئے اسی کا فیصلہ معتبر ہوگا، لیکن اتنا بڑا بوجھ دوا کیلئے اور راز

خود نہ لے بلکہ اپنی والدہ اور خاندان کے دیگر بزرگوں کیساتھ بھی مشورہ کرے، تجربہ کار لوگوں سے رہنمائی حاصل کرے اس کے بعد آپکی تجویز کردہ صورت کو کاروبار اور اپنے یتیم بھائی بہن وغیرہ کے حق میں اگر مفید سمجھے تو خاندان کے چند بزرگوں کی موجودگی میں معاملہ کو تحریری صورت دیکر باضابطہ معاہدہ کریں۔

یتیم بچوں کے کاروبار کو سنبھالنے کے لئے ایک تجویز تو یہ ہے کہ آپ بطور ملازمت یہ کام سنبھال لیں، کام کی نوعیت، اپنی ضروریات اور یتیم بچوں کی ضروریات کے علاوہ کاروبار کا فائدہ بھی ملحوظ رکھتے ہوئے ایک خاص مقدار کا مشاہرہ انکو بتادیں اور اپنی ڈیوٹی کے اوقات بھی ان پر واضح کریں۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ بطور شراکت آپ یہ کاروبار سنبھال لیں۔شراکت کی صورت اس طرح ہوسکتی ہے کہ آپ باقاعدہ اس کاروبار میں حصہ دار بنیں مثلاً کاروبار اگر ہارڈ ویئر کی دوکان ہی ہے اور ہارڈ ویئر سامان ہے، تو موجود سامان کا تجربہ کار لوگ صحیح اندازہ لگائیں کہ کتنی مالیت کا کل سامان ہے، بالفرض نو لاکھ کا سامان ہے، آپ نے تین لاکھ کا حصہ خرید لیا تو چھ حصوں کے مالک مرحوم کے بچے وغیرہ ہیں، اور تین حصوں کے آپ مالک ہوجائیں گے، پھر باہمی رضامندی سے منافع کی شرح بھی مقرر کریں، چونکہ آپ اپنے حصوں کے تو مالک ہیں اور انکے چھ حصوں کی محنت پوری آپ کی ہوگی، تو منافع کی شرح پچاس فی صد بھی طے کرسکتے ہیں یا مرحوم کے بچوں کیلئے ساٹھ فی صد اور اپنے لئے چالیس فیصد بھی طے کرسکتے ہیں یعنی محنت کیوجہ سے اپنے سرمایہ کی نسبت سے زیادہ منافع کا آپ مطالبہ کرسکتے ہیں، پھر اگر وہ منظور کرلیں تو یہ جائز صورت ہوگی۔

اور ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ خدانخواستہ کبھی نقصان ہوا تو پہلے منافع سے وہ نقصان پورا کیا جائیگا، اور ہر ایک فریق اپنے نفع کی شرح کی نسبت نفع واپس کریگا تاکہ اس نقصان کا ازالہ ہوسکے۔لیکن اس سے بھی خدانخواستہ نقصان اگر زیادہ ہوا یعنی تمام منافع واپس کرنے کے بعد بھی اصل سرمایہ میں کمی رہی تو مزید نقصان ہر ایک کو سرمایہ کی نسبت سے ہوگا۔اور دوکان کی بلڈنگ، فرنیچر وغیرہ مرحوم کی بچوں کی اگر ملکیت ہے کرایہ کی نہیں ہے تو اس کیلئے بھی مناسب کرایہ مقرر

کریں اور اپنے حصوں کا کرایہ الگ سے آپ ادا کرتے رہیں اور کرایہ کا نفع ونقصان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

لما في التنوير مع الدر :(۶/۶۹ طبع سعيد)

(والثاني)هو الاجير (الخاص)يسمى اجير وحد(وهو من يعمل لواحد عملا مؤقتا بتخصيص ويستحق الاجر بتسليم نفسه في المدة وان لم يعمل كمن استؤجر شهرا للخدمة).

ولما في التنوير مع الرد:(۴/۳۱۲ طبع سعيد)

(قوله:ومع التفاضل في المال دون الربح)أي بان يكون لاحدهما الف وللآخر الفان مثلا لز اشترطا التساوي في الربح ،وقوله:وعكسه اى بان يتساوى المالان ويتفاضلا في الربح لكن هذا مقيد بان يشترطا الأكثر للعامل منهما أو لأكثرهما عملا اما لو شرطاه للقاعد او لاقلهما عملا فلا يجوز.

ولما في الهندية:(۲/۳۲۰طبع رشيديه)

لو كان المال منهما في شركة العنان والعمل على احدهما ان شرطا الربح على قدر رؤس اموالهما جاز ويكون ربحه له ووضيعته عليه وان شرطا الربح للعامل أكثر من راس ماله جاز على الشرط ويكون مال الدافع عند العامل مضاربة.

ولما في الشامية:(۶/۲۷۵طبع امدادية)

ثم يقول:فما كان من ربح فهو بينهما على قدررؤوس اموالهما ،وما كان من وضيعة او تبعة فكذلك، ولاخلاف أن اشتراط الوضيعة بخلاف قدر رأس المال باطل ،واشتراط الربح متفاوتاً عندنا صحيح.

ولما في البحر الرائق :(۵/۱۶۲،طبع ،سعيد)

وقوله ولاتصح مفاوضة عنا ن بغير النقدين والتبر والفلوس.

ولما في الشامي :(۶/۱۳۳طبع :امداديه)

قلت: ذكروا مثل هذا في وصي اليتيم ،وانه لو تصرف في ماله احد من اهل السكة من بيع او شراء جاز في زماننا للضرورة .وفي الخانية :انه استحسان ،وبه يفتى.

واللہ اعلم بالصواب: نصرت اللہ غفرلہ ولوالدیہ　　　الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۳۶۷۶　　　۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

﴿گھنٹوں کے اعتبار سے اجرت طے کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ مفتی صاحب السلام علیکم (ورحمۃ اللہ وبرکاتہ) اللہ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائیں، کہ آپ نے شفقت فرمائی، اور میرے مسئلے کے سلسلے میں حل ارشاد فرمائی، ایک توجہ طلب گزارش

ہے، کہ ماشاء اللہ دونوں حل اپنی نوعیت کے اعتبار سے لاجواب ہیں، لیکن میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے کچھ مشکل کا سامنا ہوگا، فرض کیا اگر ملازمت کی صورت ہے تو وقت کی پابندی بہت اہم چیز ہوگی، جس میں مجھ سے کوتاہی ہوسکتی ہے، کیونکہ اللہ کی توفیق سے دعوت کی محنت میں ہی کچھ ٹوٹی پھوٹی شرکت رہتی ہے، اس لئے آنے اور جانے کے اوقات کی پابندی نہ ہوسکے گی۔ دوسرا شراکت کے ساتھ تو بہت سے مسائل وابستہ رہتے ہیں۔

ایک تجویز یہ ہے کہ اگر میں وقت یعنی گھنٹوں کے اعتبار سے طے کرلوں تو جتنے ماہانہ گھنٹے ہوں گے اسکو اپنی کم سے کم ضرورت کے مطابق ان کے سامنے پیش کردوں، پھر جتنا وقت دے سکا اسکا مطالبہ کروں۔ جواب عنایت فرمائیں۔

مستفتی: بھائی شاھد

﴿جواب﴾ مرحوم کے کاروبار کو چلانے کیلئے آپ نے جو تجویز پیش کی ہے تو شرعا اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، مرحوم کے بچے اور بچیوں کے سرپرست ذمہ دار حضرات کو یہ تجویز اگر منظور ہے کہ آپکی اجرت گھنٹوں کے حساب سے آپس میں طے کرلیتے ہیں تو شرعا یہ جائز ہے، البتہ آپ سمیت یتیم بچوں کے سرپرست حضرات کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ کاروبار کی نوعیت کو ضرور ملحوظ رکھے اور کام کو وقت دینے کی ایسی ترتیب وضع کریں جس سے کام کا نقصان نہ ہو۔

لما فی التنویر مع الدر ۶/۶۹ طبع سعید.

والثانی وهو الأجير الخاص ويسمى أجير وحده وهو من يعمل لواحد عملا مؤقتا بالتخصيص ويستحق الاجر بتسليم نفسه فی المدة وان لم يعمل كمن استوجر شهرا للخدمة او شهرا لرعی الغنم المسمى باجر مسمى.

ولما فی الشامی ۴/۴۱۹، طبع سعید.

اما لو شرط شرطا تبع كحضور الدرس اياما معلومة فی كل جمعة فلا يستحق المعلوم الا من باشر خصوصا اذا قال من غاب عن الدرس قطع معلومه فيجب اتباعه وتمامه فی البحر.

ولما فی الشامی ۴/۴۱۹، طبع سعید

امام يترك الامامة لزيارة اقربائه فی الرساتيق اسبوعا او نحوه او لمصيبة او لاستراحة لا باس به ومثله عفو فی العادة والشرع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

فتوی نمبر: ۳۶۷۹

﴿ٹرین نہ رکنے کی وجہ سے جو سفر ہوا اسکا کرایہ لازم نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ زید نے کسی شخص کو پیسے دیے کہ میرے لئے حیدرآباد تک کا ٹکٹ خرید لاؤ اس شخص نے نوری آباد (حیدرآباد سے پہلے ایک جگہ ہے) کا ٹکٹ خریدا، زید نے ٹکٹ دیکھے بغیر سفر کیا لیکن حیدرآباد ٹرین نہ رکنے کی وجہ سے زید کو مجبوراً اگلے اسٹیشن (نواب شاہ) اترنا پڑا، اب زید نے جتنا سفر بغیر ٹکٹ کے کیا اسکی تلافی کیسے کرے؟

﴿جواب﴾ زید کو چاہیے کہ نوری آباد سے حیدرآباد تک کا ٹکٹ خرید کر ضائع کر دے تو جو سفر بغیر ٹکٹ کے ہوا اسکی تلافی ہو جائے گی لیکن جو سفر حیدرآباد سے آگے (نواب شاہ) تک ٹرین نہ رکنے کی بناء پر ہوا اسکا کرایہ زید پر شرعاً لازم نہیں، البتہ ٹرین کا روٹ یہی ہو کہ نواب شاہ سے پہلے وہ نہیں رکتی تو یہ کرایہ بھی زید پر لازم ہے، اس لئے کہ ٹرین کے انتخاب میں زید کی اپنی غلطی تھی۔ واللہ اعلم۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱۲/٦، کتاب الاجارۃ، طبع سعید)

(وللموجر طلب الاجر للدار والارض) کل یوم (وللدابۃ کل مرحلۃ)

ولمافی الھدایۃ:(۲۹۷/۳، الاجر متی یستحق، طبع رحمانیہ)

ومن استاجر بعیرا الی مکۃ فللجمال ان یطالبہ باجرۃ کل مرحلۃ لان سیر کل مرحلۃ مقصود.

ولمافی البزازیۃ:(۲۲۹/۱، اجارۃ الدواب، طبع قدیمی)

حمل رجلا کرھا الی البلاد فعلی الحامل کراہ حتی یرجع الی موضع حملہ وکذافی کل مالہ حمل ومؤنۃ.

ولمافی المحیط البرھانی:(۱۲۱/۱۲، طبع ادارۃ القرآن المجلس العلمی)

رجل حمل رجلا کرھا الی بعض البلدان فعلی الحامل کراہ حتی یردہ الی الذی حملہ منہ وکذالی کل مالہ حمل ومؤنۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: ناجد محمود کھوٹ
۲٦ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ | فتوی نمبر: ۲۹۱۷

﴿اجارہ فاسدہ کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ ایک مالدار آدمی جانور خریدتا ہے پھر کسی غریب آدمی کو دیتا ہے کہ اسکی پرورش کرو اور

جب اسکو فروخت کریں گے تو پورے ثمن سے متعین رقم میں لوں گا (اسکو ہمارے عرف میں سر کہتے ہیں) اور باقی رقم آپس میں تقسیم کریں گے۔

دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ مالدار آدمی جانور کا چھوٹا بچہ خریدتا ہے اور کسی شخص کو پرورش پر دے دیتا ہے اور آپس میں طے کر دیتے ہے کہ جب فروخت کریں گے تو قیمت آپس میں تقسیم کر لیں گے، پوچھنا یہ ہے کہ از روئے شرع اس طرح کا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اسکی صحیح اور جائز صورت کیا ہو سکتی ہے؟

مستفتی: عالمگیر چارسدہ

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ صحت اجارہ کیلئے ضروری ہے کہ اجرت اور مدت دونوں معلوم ہوں جبکہ مذکورہ صورت میں اجرت اور مدت دونوں مجہول ہے اور اس میں قفیز الطحان کی صورت بھی پائی جاتی ہے، اس لیے معاملہ فاسد ہے، البتہ معاملہ کو صحیح قرار دینے کیلئے یہ حیلہ بتلایا گیا ہے کہ جانور کا نصف پرورش کرنے والے کے ہاتھ فروخت کر دے اور پھر آدمی قیمت سے اسکو بری کر دے اسطرح یہ دونوں اس جانور میں شریک ہو جائینگے اور اسکے منافع میں دونوں شریک ہوں گے۔

ولما في الهندية: (۵۰۴/۴، طبع قديمي)

دفع بقرة الى رجل على أن يعلفها وما يكون من اللبن والسمن بينهما أنصافا فالاجارة فاسدة وعلى صاحب البقرة للرجل أجر قيامه وقيمة علفه ان علفها من علف، وكذا في التنوير مع الدر: (۴۱/۱-۴۷، طبع سعيد)

ولما في خلاصة الفتاوى: (۱۱۴/۳، طبع رشيديه)

في فتاوى النسفي: رجل دفع بقرة الى رجل بالعلف مناصفة وهي التي يسمى بالفارسية "كاوبنم سود" بان دفع على أن مايحصل من اللبن والسمن بينهما نصفان فهذا فاسد والحادث كله لصاحب البقرة والاجارة فاسدة.

ولما في التنوير مع الدر: (۵۶/۸-۵۷، طبع سعيد)

(أو استأجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه أو ثورا ليطحن بره ببعض دقيقه) فسدت في الكل لانه استاجره بجزء من عمله، والاصل في ذلك نهيه ﷺ عن قفيز الطحان.... والحيلة: أن يفرزه الأجر أولاً أو يسمى قفيزا بلا تعيين ثم يعطيه قفيزا منه فيجوز.

ولما في الهندية: (۵۰۴/۴، طبع قديمي)

والحيلة: في جوازه أن يبيع نصف البقرة منه بثمن ويبرئه عنه ثم يأمر باتخاذ اللبن والمصل فيكون بينهما.

ولما في فتح القدير: (۱۰۹/۹، طبع رشيديه)

وكذلك استأجر حمارا يحمل طعاما له بقفيز منه لانه في معنى قفيز الطحان في جعل

الاجر ببعض مایخرج من عمله وهذا أصل كبير يعرف به فساد كثير من الاجارات فإن قيل: اذا كان عرف ديارنا على ذلك فهل يترك به القياس؟ قلنا لا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: محمد عمران

۱۳ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۸۶۴

﴿اجارہ فاسدہ میں تعدی کی صورت میں تاوان لازم ہوگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی گائے پالنے کیلئے دوسرے شخص کو اس شرط پر دی کہ اس کی بڑھوتری میں سے تیسرا حصہ آپ کا ہوگا اور باقی دو حصے میرے ہوں گے، جبکہ اس دوسرے شخص نے مالک کی اجازت کے بغیر وہ گائے کسی تیسرے کی دیکھ بھال میں دیدی، جس سے اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ شرعاً مالک اس شخص یعنی تعدی کرنے والے سے تاوان وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔

مستفتی: مولانا عبدالصمد صاحب، وڈھ بلوچستان

﴿جواب﴾ جانور کو پالنے کیلئے اس شرط پر کسی کو دینا کہ وہ چارہ کھلاتا رہے اور اس کی بڑھوتی میں اس کا حصہ ہوگا یہ اجارہ فاسدہ کی صورت ہے جائز نہیں ہے، مالک کو چاہئے تھا کہ جانور کا ایک حصہ پالنے والے کو فروخت کرتا یا ہبہ کر کے اس کا مالک بناتا تو وہ اپنے جانور کو کھلاتا پلاتا کوئی اجارہ کی صورت نہ ہوتی۔ بہرحال اس شخص نے ایک تیسرے کو مالک کی اجازت کے بغیر دیکھ بھال کیلئے دیا اور اس کے ہاں جانور کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو اس علاقہ میں تیسرے شخص کو دیکھ بھال کے طور پر دینا اگر رائج ہو تو پالنے والے شخص کے ذمہ کوئی تاوان نہیں ہے اور اگر رائج نہیں ہے تو یہ زیادتی ہے پالنے والے شخص کے ذمہ تاوان اداء کرنا لازم ہے۔

لما فی الهندیه: (۴/۵۰۴، مطبع قدیمی)

دفع بقرة الى رجل على ان يعلفها ومايكون من اللبن والسمن بينهما انصافا فالاجارة فاسدة وعلى صاحب البقرة للرجل أجر قيامه وقيمة علفه ان علفها من علف هو ملكه لا ماسرحها فى المرعى ويرد كل اللبن ان كان قائما وان تلف فالمثل الى صاحبها لأن اللبن مثلى ـ والحيلة فى جوازه أن يبيع نصف البقرة منه ويبرئه عنه ثم يامر باتخاذ اللبن والمصل فيكون بينهما ـ فلو ان المدفوع اليه دفع البقرة أو الدجاجة الى رجل أخر بالنصف فهلك فى يده فالمدفوع اليه الاول ضامن فلو ان المدفوع اليه بعث البقرة الى السراح فلا ضمان لمكان العرف.

لمافی البزازیۃ علی ھامش الھندیہ:(۵/۳۲،طبع رشیدیہ)

اعطاہ بقرۃ "بنیم سود" الدمر صورتہ فاعطاھا الآخذ الیٰ غیرہ "بنیم سود" فعطب عند الثانی ضمن الاول لانہ مودع لامستعیر لان المنافع فی العاریۃ یختص بھا المستعیر.

لمافی محیط البرھانی :(۱۲/۹۶،طبع ادارۃ القرآن)

اذادفع الیٰ آخر بقرۃ بالعلف ،لیکون الحادث بینھما نصفان فالحادث کلہ لصاحب البقرۃ ،وعلیہ اجر مثل المدفوع الیہ ۔ فلو ان المدفوع الیہ دفع البقرۃ أو الدجاجۃ الیٰ رجل آخر بالنصف ،فھلک فی یدہ فالمدفوع الیہ الاول ضامن لأن العین امانۃ فی یدہ ،ولیس للأمین أن یدفع الامانۃ الیٰ غیرہ من غیر ضرورۃ، فلو ان المدفوع الیہ بعث البقرۃ الی السراح فلاضمان لمکان العرف.

لمافی شرح المجلہ:(۳/۳۷۹،طبع رشیدیہ)

اماما لا یقبلھا بان کان لا ینتفع بہ بعد القسمۃ انتفاعا من جنس الانتفاع الذی کان قبل القسمۃ ،کبیت صغیر او حمام،فتصح ھبتہ وتتم بقبضہ شائعا بان یقبض الکل ،لان قبض کل شئی بحسبہ ،وھذا لا یکون قبضہ الا کذالک فاکتفی بذالک وتمت بہ الھبۃ.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خنداری غفر لہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر: ۲۰۵۱

﴿علماء کا گھروں میں جا کر پڑھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں بعض لوگ علماء کرام کو قرآن مجید اور دیگر دینی تعلیم کیلئے گھروں میں بلاتے ہیں اور ان کے بچوں کو پڑھاتے ہیں اور اس تدریس کی تنخواہ دیتے ہیں اور کبھی کبھار کھانا بھی کھلاتے ہیں، اب صورت حال یہ ہے کہ اگر علماء حق نہ جائیں تو دوسرے بدعقیدہ لوگ پہنچ جاتے ہیں۔

اب مطلوب یہ ہے کہ ان گھروں میں قرآن مجید پڑھانے کیلئے جانا کیسا ہے؟ اور اس پر اجرت لینا اور اسی طرح وہ جو کھانا کھلاتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: محمد سلمان ڈیفنس کراچی

﴿جواب﴾ قرآن مجید اور دیگر دینی علوم کی تدریس پر اجرت لینا جائز ہے اسی طرح اگر وہ معلم کو کچھ کھلائے تو اس میں بھی حرج نہیں ہے، چنانچہ جن گھروں میں علماء کی عزت کی جاتی ہو اور نامحرم وغیرہ سے پردے کا خوب انتظام ہو تو وہاں جانے کی گنجائش ہے لیکن جہاں کہیں نامحرم سے اختلاط ہو یا علماء کو دیگر ملازمین کی طرح ایک نوکر سمجھتے ہوں تو وہاں پر قطعاً نہیں جانا چاہیے۔

لمافی الصحیح لمسلم:(۱/۱۱،طبع قدیمی)

عن محمد بن سیرین قال ان ھذاالعلم دین فانظرواعمّن تاخذون دینکم.

ولمافی کنزالعمال:(۲/۲۵۹،کتاب الاذکار،طبع رحمانیہ)

وقال النبی ﷺ:اکرمواحملۃالقرآن فمن اکرمھم فقداکرمنی وفی روایۃاخری حامل القرآن حامل رأیۃالاسلام من أکرمہ فقداکرم اللہ ومن أھانہ فعلیہ لعنۃاللہ.

ولمافی التنویرمع الدر:(۶/۵۵،طبع سعید)

(ولاتصح الاجارۃلعسب التیس)......لاجل الطاعات مثل(الأذان والحج والامامۃ وتعلیم القرآن والفقہ) ویفتی الیوم بصحتھالتعلیم القران والفقہ والامامۃوالاذان.

ولمافی المرقاۃ:(۱/۶۶،طبع رشیدیہ)

قال مالک قال لی ھارون الرشید:یااباعبداللہ ینبغی ان تختلف الیناحتی یسمع صبیاننامنک الموطایعنی الامین والمامون فقلت اعز اللہ امیرالمؤمنین ان ھذاالعلم منکم خرج فان انتم اعززتموہ عزوان انتم اذللتموہ ذل وفی روایۃمہ یاامیرالمومنین لاتضع عزشئی رفعہ اللہ والعلم یؤتی ولایاتی.

ولمافی الفتاوی الھندیۃ:(۴/۴۴۸،طبع رشیدیہ)

ومشائخ بلخ جوزواالاستیجار علی تعلیم القران اذضرب لذلک مدۃوأفتوابوجوب المسمی وعندعدم الاستیجاراصلااوعندالاستئجاربدون المدۃافتوابوجوب اجر المثل کذافی المحیط وقداستحسنواجبروالدالصبی علی المبرہ المرسومۃوکذاجواز الاستئجارعلی تعلیم الفقہ ولواستاجرالمعلم علی حفظ الصبیان اوتعلیم الخط أو الھجاء جاز.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:محمد فاروق چارسدوی

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر:۲۹۹۵

﴿کارپارکنگ کاٹھیکہ لینا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماءکرام اورمفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں گذشتہ کئی سالوں سے پشاور ہائی کورٹ کی گاڑی پارکنگ کاٹھیکہ لیتاہوں،اس کاطریقہ کارکچھ یوں ہوتاہے کہ حکومت ہرسال ہم سے چھ،سات لاکھ روپے وصول کرتی ہےاورایک مخصوص جگہ متعین کرتی ہے کہ ہائی کورٹ میں جولوگ آئیں گے وہ یہاں اپنی گاڑیاں پارک کرینگےاورہم لوگ ان گاڑیوں کی حفاظت کرینگےاورواپس جاتے ہوئے کاروالے سے ۲۰روپے اورموٹر سائیکل والے سے ۱۰روپے وصول کرینگے بعض لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ چونکہ ایک ظالمانہ ٹیکس

ہے اس لئے یہ کام ناجائز ہے، اب مطلوب یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے یا ناجائز ہے اور کیا اس سے کمائی جانے والی رقم حرام ہے؟ مستفتی: انور احمد چارسدہ

﴿جواب﴾ ایک سال کی مدت کیلئے خاص رقم کے عوض آپ یہ جگہ لیتے ہیں اور حکومت کی ہدایات کے مطابق کار والے سے بیس اور موٹر سائیکل والے سے دس روپے حفاظت کی اجرت بحیثیت جگہ کا کرایہ لیتے ہیں تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، اسکو ناجائز نہیں سمجھا جاتا ہے۔

ولما في الفتاوى الهندية (٤/٥١٣ طبع رشيدية)

وإذا اتخذ الرجل مشرعة على شاطئ الفرات ليستقي منه السقاؤن ويأخذ منهم الأجر فإن بنى على ملكه وإن أجرها منهم للاستقاء لم يجز وإن أجرها ليأخذه، لأن الأجرة وقعت على استهلاك العين مقصودا، وإن أجرها للقوم ليقعد السقاؤن ويضعون القرب فيها ويربطون الدواب فيها جاز، وكذا في الدر المختار (٦/٢٠ طبع سعيد)

ولما في التنوير مع الدر (٥/٦٧٩ طبع سعيد) وأما المستأجر فلا يؤجر ولا يودع ولا يعير ولا يرهن.

ولما في تنوير الابصار (٦/٢٩٩-٢٠٠ طبع سعيد)

(ولا يضمن ما هلك في يده إلا إذا تعدى الأرباب عن الاحتياط فإنه لا يضمن عند أهل الرأي)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد فاروق چارسدوی

۱۲ صفر المظفر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر ۱۸۲۶

﴿اجیر عام سے کوئی چیز بغیر تعدی کے ہلاک ہو جائے تو ضمان نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ٹیلرنگ کی دکان ہے، ایک دفعہ اس طرح کا واقعہ پیش آیا کہ ایک رات میری دکان سے چوری ہوئی اور چور پوری دکان کا صفایا کر گیا جبکہ مارکیٹ کے لئے چوکیدار بھی مقرر ہے وہ رات کو ڈیوٹی دیا کرتا ہے، اب لوگ آکے مجھ سے اپنے کپڑوں کا مطالبہ کر رہے ہیں حالانکہ میری اپنی ساری کمائی بھی لٹ چکی ہے تو کیا میرے ذمہ ان لوگوں کو کچھ دینا لازم ہے کہ نہیں؟ مستفتی: عنایت الرحمٰن صوابی

﴿جواب﴾ مسؤلہ صورت میں اگر آپ نے ان کپڑوں کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں برتی یعنی جاتے ہوئے دکان بند کر کے چلے گئے تھے اور چوکیدار بھی مقرر تھا تو ایسی صورت میں آپ پر ان کپڑوں کا کوئی ضمان واجب نہیں۔

لما في مجمع الضمانات (ص ٤٠، الباب الخامس مسائل الاجارة طبع دار الكتب العلمية)

نساج ترك ذوبا في بيت الطراز فسرق ليلا إن كان البيت حصينا تمسك الثياب في

مثله لايضمن..... ليس على النساج أن يبيت في بيت الطراز لكن لو أغلق الباب في الليل وذهب لايضمن..... نساج ترك الثوب في الدكان وذهب الى بيته وأغلق الباب وذلك في وقت غلبه السراق فسرق الثوب لو كان يترك مثله في مثله في هذا الزمان لايضمن والاضمن .من الفصولين وفي صفحة(٥٠)فالاجير المشترك..... والمتاع أمانة في يده ان هلك بغير عمله لم يضمن ولا أجرله عند أبي حنيفة رحمه الله.

ولما في الهندية:(٢/٥٤٢،طبع قديمي)

نساج ترك الكرباس في بيت الطراز فسرق الكرباس ان كان بيت الطراز حصينا يمسك في مثل هذا المتاع لايضمن.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: عباداللہ غفرلہ

۵ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۹۶۸

﴿دھوبی سے کپڑے گم ہونے پر ضمان کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے اسلام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کسی دھوبی سے کپڑے دھلواتا رہتا ہے، اسی اثناء میں ایک مرتبہ دھوبی سے اس کی قمیص گم ہوگئی جس پر اس نے دو مہینے تک دھوبی کو وہ قمیص ڈھونڈ کر لانے کا کہا اور دھوبی اس کو ٹالتا رہا، بالآخر اس نے ڈرا دھمکا کر اس مکمل سوٹ کے بدلہ میں دھوبی سے ایک کپڑا وصول کرلیا، اس آدمی کا کہنا ہے کہ یہ کپڑا میرے سوٹ کے آدھی قیمت کے برابر ہے، نیز مارکیٹ میں بھی دھوبیوں کا یہی اصول ہے کہ نیا کپڑا گم ہونے کی صورت میں سلائی کاٹ کر نصف قیمت ادا کی جائیگی۔اب پوچھنا یہ ہے کہ شریعت کی روشنی میں اس کا یہ عمل کس حد تک درست ہے؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ دھوبی سے کپڑا گم ہونا اسکی غفلت اور لاپرواہی کی علامت ہے، ایسی صورت میں اس سے تاوان لینا جائز ہے، لہٰذا جو کپڑا آپنے بطور تاوان وصول کرلیا ہے اس کی قیمت آپ کی قمیص کی قیمت سے کم ہے تو یہ کپڑا آپ کیلئے جائز ہے۔

لما في الشامي: ٦/٦٥(طبع ایچ ،ایم سعید)

(ولا يستحق المشترك الاجر حتى يعمل كالقصار ونحوه)(ولا يضمن ماهلك في يده وان شرط عليه الضمان)وفي البدائع : لايضمن عنده ماهلك بغير صنعه قبل العمل أو بعده لأنه أمانة في يده وهو القياس . وقالا يضمن الامن خرق غالب أو لصوص مكابرين وهو الاستحسان . وقال بعضهم : قول ابي حنيفة قول عطاء وطاؤس وهمامن كبار التابعين ، وقولهما قول عمرؓ وعليؓ وبه يفتى احتشاما لعمرؓ وعليؓ وصيانة لاموال

الناس ،والله اعلم .وفي التبيين :وبقولهمايفتي لتغير أحوال الناس ، وبه يحصل صيانة أموالهم .(قوله وأفتى المتاخرون بالصلح)أى عملا بالقولين ومعناه عمل في كل نصف بقول حيث حط النصف وأو جب النصف بزازيه : قال شرح الملتقى : قال الزاهدی : على هذا ادركت مشايخنا بخوارزم أقره القهستانی .

لما في لجوهرة النيرة:۳۲۱/۱(ميرمحمد كتب خانه)

(الاجير المشترك كل من لا يستحق الاجرة حتى يعمل كالقصار والصباغ)قوله والمتاع امانة في يده ان هلك لم يضمن شيئا عند ابی حنيفةؒ وزفرؒ وقال ابويوسفؒ ومحمد هو مضمون)۔واختار المتاخرون عندالفتوى في الاجير المشترك الصلح على النصف.

لمافي الفقه الاسلامی وادلتہ:۲۸۵۰/۵(رشيديه كوئٹه)

وان لم يكن الأجير متعديافي الافساد بأن افسد الثوب بعمله من غير قصده فان الاجير الخاص يضمن بالاتفاق ، وان كان مشتركاكالقصار اذادق الثوب فتخرق ، أو ألقاه في المواد الكيماوية فاحترق ، أو كالملاح اذاغرقت السفينة من عمله۔أ و الراعي المشترك اذا ساق الدواب، فضرب بعضها بعضافي حال سوقه حتى هلك بعضها ،فعلى كل هذه الحالات يكون المالك مضمونا عندابی حنيفة و صاحبيه ،لان العمل الماذون فيه هو العمل المصلح لا المفسد ، لان العاقل لايرضى بإفساد ماله ولايلتزم الأجرة بمقابلة الفاسد فيتقيد الأمر بما يصلح دلالة.

الجواب صحيح :مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب :عزیزاحمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۴صفرالخیر۱۴۳۵ھ   فتویٰ نمبر:۳۹۳۹

﴿دھوبی کی غفلت سے کپڑا جل جائے تو تاوان وصول کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دھوبی سے کپڑے جل جائیں تو کیا اس پر ضمان ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ کپڑے جلنے کی دوصورتیں ہیں (۱) دوران استری کبھی کپڑوں کو نقصان پہنچتا ہے (۲) کبھی کپڑوں کے گودام میں آگ لگنے سے سارے کپڑے جل جاتے ہیں۔ برائے مہربانی دونوں صورتوں کے حکم کی مکمل وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ دھوبی کی دوکان میں آگ لگنے سے اسی طرح دوسری کسی آفت سے کپڑوں کو نقصان پہنچے ،جس میں دھوبی کی غفلت ،لاپرواہی وغیرہ کا دخل نہ ہو تو ایسی صورت میں دھوبی نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ البتہ استری کرتے ہوئے کپڑے جل جائیں یا دھوتے ہوئے کیمیکل کیوجہ سے کپڑے خراب ہو جائیں تو ایسی صورت میں دھوبی کی غفلت ولاپرواہی کا چونکہ دخل ہے اس لئے وہ ذمہ دار ہوگا اور اس سے تاوان وصول کرنا جائز ہوگا۔

لما فی الهدایه: ۳۱۰/۱ (طبع رحمانیه)

الاجراء على ضربين اجير مشترك واجير خاص فالمشترك من لا يستحق الاجرة حتىٰ يعمل كالصباغ والقصار . والمتاع امانة فى يده فان هلك لم يضمن شياً عند ابى حنيفةؒ وهو قول زفر . ويضمنه عندهما الا من شئى غالب كالحريق الغالب والمكابر فاذا هلك بسبب يمكن الاحتراز عنه كالغصب والسرقة كان التقصير من جهته فيضمنه كالوديعة اذا كانت باجر بخلاف مالا يمكن الاحتراز عنه كالموت حتف انفه والحريق الغالب وغيره.

لما فی البدائع: ۵٦/٦ (طبع دار الكتب العلميه بيروت)

ومنها : الاتلاف والافساد اذا كان الاجير متعديا فيه بأن تعمد ذلك أو عنف فى الدق سواء كان مشتركا أو خاصا ، وان لم يكن متعديا فى الافساد بأن افسد الثوب خطأ بعمله من غير قصده ، فان كان الاجير خاصا لم يضمن بالاجماع ، وان كان مشتركا كالقصار اذا دق الثوب فتحرق أو القاه فى التنور فاحترق ، أو الملاح غرقت السفينة من عمله ونحو ذالك فانه يضمن فى قول اصحابنا الثلاثه.

لما فی مجمع الضمانات: ۸۱ (دار الكتب العلميه بيروت)

اذا أدخل القصار سراجا فى حانوت فاحترق الثوب بغير فعله يضمن ، لان هذا مما يمكن الاحتراز عنه فى الجملة فلهذا لا يضمن فى الحرق الغالب الذى لا يمكن التحرز منه ولا يتمكن من اطفائه وهذا هو قولهما ، أما على قول أبى حنيفة لا يضمن لأنها هلكت بغير صنعه.

لما فی الشامی: ٦۵/٦ (طبع ایچ ایم سعید)

(ولا يستحق المشترك الاجر حتىٰ يعمل كالقصار ونحوه) (ولا يضمن ما هلك فى يده وان شرط عليه الضمان) وفى البدائع : لا يضمن عنده ما هلك بغير صنعه قبل العمل أو بعده لأنه أمانة فى يده وهو القياس . وقالا يضمن الا من حرق غالب أو لصوص مكابرين وهو الاستحسان . وقال بعضهم : قول ابى حنيفةؒ قول عطاء وطاوس وهما من كبار التابعين ، وقولهما قول عمرؓ وعلىؓ وبه يفتى احتشاما لعمرؓ وعلىؓ وصيانة لاموال الناس والله اعلم . وفى التبيين : وبقولهما يفتى لتغير أحوال الناس ، وبه يحصل صيانة أموالهم . (قوله وأفتى المتاخرون بالصلح) أى عملا بالقولين ومعناه عمل فى كل نصف بقول حيث حط النصف وأوجب النصف بزازيه : قال شرح الملتقى : قال الزاهدى : على هذا ادركت مشايخنا بخوارزم أقره القهستانى.

لما فی الجوهرة النيرة: ۳۴۱/۱ (مير محمد كتب خانه)

(الاجير المشترك كل من لا يستحق الاجرة حتىٰ يعمل كالقصار والصباغ) قوله والمتاع امانة فى يده ان هلك لم يضمن شيئا عند ابى حنيفةؒ وزفرؒ وقال ابو يوسفؒ ومحمدؒ هو مضمون) واختار المتاخرون عند الفتوى فى الاجير المشترك الصلح على النصف.

لما فی الفقه الاسلامی وادلته:٥/٣٨٥٠،(رشیدیه کوئٹه)

وان لم یکن الأجیر متعدیا فی الافساد بأن افسد الثوب بعمله من غیر قصده فان الاجیر الخاص یضمن بالاتفاق، وان کان مشترکا کالقصار اذا دق الثوب فتخرق، أو ألقاه فی المواد الکیماویة فاحترق، أو کالملاح اذا غرقت السفینة من عمله۔أو الراعی المشترک اذا ساق الدواب، فضرب بعضها بعضا فی حال سوقه حتیٰ هلک بعضها ففی کل هذه الحالات یکون المالک مضمونا عند ابی حنیفة وصاحبیه ،لان العمل المأذون فیه هو العمل المصلح لا المفسد، لان العاقل لا یرضی بافساد ماله ولا یلتزم الأجرة بمقابلة الفاسد فیتقید الأمر بما یصلح دلالة.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد غفرلہ ولوالدیہ

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۹۸

﴿اجیر خاص سے کوئی چیز اتفاقاً ضائع ہو جائے تو ضمان نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ گھر کی خادمہ سے صفائی کے دوران کوئی قیمتی چیز ضائع ہو جائے تو اس پر اسکی پوری یا آدھی قیمت دینا لازم ہے یا نہیں شرعاً کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ گھر کی خادمہ کو شریعت کی اصطلاح میں اجیر خاص کہا جاتا ہے اور اسکے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر بغیر قصد وارادہ کے کوئی چیز اس سے اتفاقاً ضائع ہو جائے تو اس پر تاوان نہیں آتا ،لہٰذا اس صورت میں گھر کی خادمہ پر اس ضائع ہونے والی چیز کی کوئی قیمت دینا لازم نہیں۔

لما فی مجمع الضمانات:(ص٥٢،الباب الخامس مسائل الإجارة،طبع بیروت)

ولا ضمان علی الاجیر الخاص ولا فیما تلف من عمله اتفاقا الا اذا تعمد الفساد ذکره فی الاصلاح نقلا عن الخانیة قال فی الفصولین نقلا عن التجرید الاجیر الخاص لا یضمن الا بالتعدی.

ولما فی التنویر مع الدر:(٦/٧٠-٧١،طبع ایچ ایم سعید)

(ولا یضمن ما هلک فی یده أو بعمله)کتخریق الثوب من دقه الا اذا تعمد الفساد فیضمن کالمودع ثم فرع علی هذا الاصل بقوله(فلا ضمان علی ظئر فی صبی ضاع فی یدها أو سرق ما علیه)من الحلی لکونها أجیر وحد،وکذا لا ضمان علی حارس السوق وحافظ الخان.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عباد اللہ غفرلہ

۱۵ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۰۱۵

﴿گاڑی کرایہ پر دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ گاڑی جو کرایہ پر دی جاتی ہے کیا یہ عقد اجارہ ہے

جبکہ اسمیں پٹرول خرچ ہوتا ہے جو عین ہے حالانکہ اجارہ میں تو منافع خرچ ہوتے ہیں؟

﴿جواب﴾ گاڑی سے مقصود سواری ہوتی ہے جو ایک منفعت ہے پٹرول مقصود نہیں ہوتا، پٹرول تو اس منفعت حاصل کرنے کا آلہ اور ذریعہ ہوتا ہے، لہذا گاڑی کرایہ پر لینا عقد علی المنافع ہی ہوا۔

لمافی فتح القدیر:(۲۸۴/۶،طبع رشیدیه)

(أما الاجارة فلأنها)لوصحت ملك بها الأعيان وحكمها ليس الا ملك المنافع نعم اذا كانت الأعيان آلة لاقامة العمل المستحق كالصبغ واللبن في استئجار الظئر فيملك بعد اقامة العمل تبعاً أما ابتداءً فلا.

ولمافی العنایة مع فتح القدیر:(۲۸۵/۶،طبع رشیدیه)

بأن استأجر بقرة ليشرب لبنها لايصح... وذلك لأن المستحق بعقد الاجارة على الأجر المنافع لا الأعيان الا اذا كانت الأعيان آلة لاقامة العمل المستحق بالاجارة كالصبغ في استئجار الصباغ واللبن في استئجار الظئر لكونه آلة للغضانة والظئورة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن کوہاٹی

۱۳ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۰۵۸

﴿گاڑی کو کرایہ پر دینا صحیح ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ گاڑی خرید کر کسی کو کرایہ پر دے دیتے ہیں اور یہ طے کرتے ہیں کہ تم روزانہ مجھے سو یا ڈیڑھ سو روپے دیا کرو، کیا شرعاً ایسا کرنا صحیح ہے، نیز بعض اوقات گاڑی کے مالک کو جب ضرورت پڑتی ہے تو وہ خود گاڑی کو استعمال کرتے ہیں تو کیا اس صورت میں بھی اجیر پر روزانہ کے اعتبار سے اجرت دینا لازمی ہوگا جب مالک پورا دن گاڑی کو چلائے اور اگر دو، تین گھنٹوں کیلئے لے لیں تو کیا حکم ہے؟　　　　مستفتی: زر میت خان کوہاٹی لاچی سوڈل

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں گاڑی اجرت پر دیکر یومیہ خاص اجرت طے کر کے وصول کرنا صحیح ہے اور جس روز مالک کو ضرورت ہو تو پورا دن اپنے پاس گاڑی رکھنے کی صورت میں پورے دن کا کرایہ ساقط ہوگا، اس سے کم وقت کے لئے گاڑی اپنے استعمال میں لائے تو اس حساب سے کرایہ کم وصول کریگا بشرطیکہ ڈرائیور بخوشی اس کو قبول کرے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۶،طبع سعید) وشرعاً(تمليك نفع)مقصود من العين(بعوض)

ولما فی البحر الرائق :(۲۹۷/۷،طبع سعید)

وشرطها ان تکون الاجرة والمنفعة معلومتین لان جهالتهما تفضی الی المنازعة وحکمها وقوع الملک فی البدلین ساعة فساعة.

ولما فی الدر المختار:(۱۳/۶،طبع سعید)

والمراد من تمکنه من الاستیفاء تسلیم المحل الی المستأجر بحیث لا مانع من الانتفاع.

ولما فی الهندیة:(۴۹۵/۴،طبع قدیمی)

فان عرض فی بعض المدة ما یمنع الانتفاع کما اذا لو غصبت الدار من المستأجر او غرقت الارض المستأجرة او انقطع عنها الشرب او مرض العبد او ابق سقطت الاجرة بقدر ذلک کذا فی المحیط السرخسی.

ولما فی قاضیخان علی هامش الهندیة:(۱۱/۵،طبع رشیدیه)

والاجرة تجب بالتمکین من استیفاء المنفعة حتی ان من استأجر دارا مدة معلومة وعطلها مع التمکن من الانتفاع یجب الاجر وان لم یتمکن بان منعه المالک او الاجنبی لا یجب.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی

ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۲۱۳۶

﴿ گاڑی کو متعین اجرت پر دینا جائز ہے ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید گاڑی کا مالک ہے،اس نے ایک ڈرائیور کو گاڑی کرایہ پر دی ہے جس سے وہ روزانہ متعین کرایہ لیتا ہے، یہ معاملہ شرعی نقطہ نظر سے درست ہے؟

﴿جواب﴾ زید نے جو گاڑی کرایہ پر دی ہے،اس کا کرایہ اور مدت اجارہ اگر معلوم ہے، نیز اس معاملے میں دیگر مفاسد بھی نہیں ہیں تو اس معاملے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما فی تنویر الابصار:(۲/۶،طبع سعید)(هی تملیک نفع بعوض)

ولما فی التنویر مع الدر(۳۲/۶طبع سعید)(و)تصح(اجارة الدابة للرکوب والحمل)

ولما فی المجلة الاحکام العدلیة:(۱۲۲/۲،المادة ۵۴۹،طبع رشیدیه)

کما یصح استکراء دابة علی ان یرکبها فلان کذلک یصح استکراء دابة علی ان یرکبها المستأجر من شاء علی التعمیم.

ولما فی الهدایة:(۳۰۱/۳طبع رحمانیه)

ویجوز استیجار الدوآب للرکوب والحمل)لأنه منفعة معلومة معهودة.وفیها ایضا: (۲۹۲/۳،طبع رحمانیه)ولا یصح حتی تکون المنافع معلومة والأجرة معلومة.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۷صفر ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۱۹۱۶

﴿رقوم کی منتقلی پر بینک کا پیسے کاٹنا اجرت ہے سود نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک بنک کے ذریعہ سے پیسے بھیجتے ہیں اور بنک والے کچھ پیسے بھی کاٹتے ہیں آیا اس صورت میں سود لازم آتا ہے یا نہیں؟

مستفتی: جمال الدین تاجکی

﴿جواب﴾ ایک ملک سے دوسرے ملک پیسے بھیجنا کاروباری مجبوری ہے اس کے بغیر اب بڑا کوئی کاروبار ممکن نہیں رہا اسلئے بینک کے ذریعہ رقم بھیجنا اندرون ملک ہو یا بیرون جائز ہے اور بنک والے اس پر کچھ پیسے کاٹتے ہیں یہ اجرت ہے سود نہیں کہلائیگا۔

وفی امداد الفتاوی:(۱۴۶/۳،کتاب الربوا)

قال العلامۃ اشرف علی تھانوی (رح): منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے، ایک قرض جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرا اجارہ جو فارم کے لکھنے اور روانہ کرنے پر بنام فیس کے دیجاتی ہے اور دونوں معاملے جائز ہیں، پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے، اور چونکہ اس میں ابتلائے عام ہے اس لیے یہ تاویل کر کے جواز کا فتوی مناسب ہے۔

لما فی الفقہ الاسلامی و ادلتہ:(۴۷۴۳/۵، طبع رشیدیۃ)

ویتم التعبیر عن ھذا القرض بتسلم المقترض وصلا (وثیقۃ) یثبت حقہ فی بدل القرض، ویکون المقترض و ھو الصرف أو البنک ضامنا لبدل القرض، ولکنہ یأخذ أجرا أو عمولۃ علی تسلیم المبلغ فی بلد آخر مقابل مصاریف الشیک أو أجرۃ البرید أو البرقیۃ أو التلکس فقط، لتکلیف وکیل الصراف بالوفاء أو السداد.

وھذان العقدان: الصرف و التحویل القائم علی القرض ھما الطریقان لتصحیح ھذا التعامل فیما یبدو لی واللہ أعلم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن حفظہ اللہ تعالی　　　　واللہ تعالی اعلم بالصواب: جلال الدین خرسند تاجکی

۵ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ　　　　فتوی نمبر: ۳۶۷۱

﴿گھریلو اخراجات کیلئے بذریعہ کمپنی رقم بھیجنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ ہم لوگ کراچی میں کاروبار کرتے ہیں، اس دوران اگر ہمیں گھریلو اخراجات کیلئے کچھ رقم بھیجنی ہوتی ہے تو یہاں ایک کمپنی ہے جو لوگوں کی رقم ان کے گھروں تک پہنچاتی ہے، اس پر وہ اجرت لیتی ہے، کیا یہ کاروبار جائز ہے سود تو نہیں؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں دو چیزیں ہیں، ایک ہے رقم اصلی جسکو گھریلو اخراجات

کیلئے روانہ کیا جاتا ہے تو یہ مذکورہ کمپنی والوں کے پاس قرض ہوتی ہے اور دوسری اس اصل رقم کے روانہ کرنے کی اجرت یا فیس یہ دونوں معاملے جائز ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے امداد الفتاوی: (۱۳۶/۳، طبع دار العلوم کراچی) پر منی آرڈر کے جواز کا فتوی دیا ہے جو اس سے ملتی جلتی صورت ہے، فقہاے کرام نے ایک صورت کو مکروہ قرار دیا ہے، جو ہمارے زیر بحث صورت سے مختلف ہے، وہ یہ کہ ایک آدمی راستے کے خطرات سے اپنے مال کو بچانے کیلئے کسی کو اس شرط پر قرض دیتا ہے کہ یہ رقم مجھے فلان ملک میں ادا کروگے، اس صورت میں راستے کے خطرات سے حفاظت ایک منفعت ہے جسکا لینا قرض دینے والے کیلئے جائز نہیں، البتہ ہماری زیر بحث صورت اس سے بالکل مختلف ہے۔

لمافی التنویر مع الدر: (۵/۵۰، طبع سعید) (وکرهت السفتجة)......وهی اقراض لسقوط خطر الطریق.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبید اللہ دیروی غفرلہ ولوالدیہ

فتوی نمبر: ۱۸۱۴ — ۱۴۲۹ھ

﴿کرایہ پر لی ہوئی زمین دوسرے کو کرایہ پر دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میں نے ایک آدمی سے زمین کرایہ پر لی ہے، اب میں چاہتا ہوں کہ بجائے خود دوسرے کو کرایہ پر دوں تو کیا کرایہ پر لی ہوئی زمین دوسرے کو کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی میر اسلم صاحب لکی مروت

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ نے جس اجرت پر زمین لی ہے، اس سے کم یا اسکے برابر اجرت پر دینا مطلقا جائز ہے، البتہ آپ نے دی ہوئی اجرت سے زیادہ کرایہ وصول کرلیا تو زیادتی آپ کیلئے اس صورت میں صحیح ہوگی جب آپ نے زمین میں کچھ اصلاحات کی ہوں یا خلاف الجنس کرایہ پر دی ہو۔ (مثلاً آپ نے کرایہ میں روپے دیے ہیں اور دوسرے سے کرایہ گندم طے کی ہے) ورنہ زیادتی کو صدقہ کرنا چاہیے۔

لمافی الهندیة: (۴/۴۲۶، طبع قدیمی)

واذا استاجر دارا وقبضها ثم آجرها فانه یجوز ان آجرها بمثل ما استاجرها او اقل وان آجرها باکثر مما استاجرها فهی جائزة ایضا الا انه ان کانت الاجرة الثانیة من جنس الاجرة الاولی فان الزیادة لا تطیب له ویتصدق بها وان کانت من خلاف جنسها طابت له الزیادة.

ولما فی الشامی:(۶/۱۱،طبع سعید)

(قوله للمستأجران یؤجرالمؤجرالخ)ای ماستأجره بمثل الاجرۃ الاولیٰ أوبانقص.فلو باکثرتصدق بالفضل الافی مسالتین کمامر.

ولما فی الدرالمختار:(۶/۲۹،طبع سعید)

ولوآجرباکثرتصدق بالفضل الا فی مسألتین اذاآجرهابخلاف الجنس أواصلح فیهاشیئا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:حبیب الرحمٰن ندیم سواتی

۱۷جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۳۶۸

﴿رہن رکھی ہوئی زمین کرایہ پر دینا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ میں نے ایک آدمی کو پچاس ہزار روپے قرض دیا ہے،اس نے قرض کی ادائیگی تک مجھے اپنی زمین بطور رہن رکھوائی ہے تو کیا میں اس زمین کو کرایہ پر دے سکتا ہوں یا نہیں؟　　　　مستفتی:میر اسلم لکی مروت

﴿جواب﴾ رہن دراصل قرضہ وصول کرنے کیلئے ایک ضمانت ہے،لہذا قرضہ وصول یابی تک فقط اپنے قبضہ میں رکھنے کا حق حاصل ہے مرہونہ چیز سے منافع حاصل کرنا جائز نہیں ہے بلکہ یہ سود کی ایک صورت ہے،لہذا یہ زمین کرایہ پر خواہ مالک کی اجازت سے ہو دینا جائز نہیں ہے کسی نے اب تک ایسا کیا ہے تو حاصل کردہ کرایہ مالک زمین کو دینا ضروری ہے یا کم از کم صدقہ کرنا ضروری ہے۔

لما فی الشامی:(۶/۵۱۱،طبع سعید)

واماالاجارۃفالمستأجران کان هوالراهن فهی باطلۃوکانت بمنزلۃمااذاعارمنه او لودعه،وان کان هوالمرتهن وجددالقبض للأجارۃ أواجنبیابمباشرۃاحدهماالعقدباذن الأخربطل الرهن والأجرۃللراهن وولایۃالقبض للعاقدولایعودرهناالابالاستئناف.

ولمافی الدرمع الرد:(۶/۵۲۲،طبع سعید)

وفیهااباح للمرتهن نفعه هل للمرتهن ان یؤجره؟قال لاقیل فلوآجره ومضت المدۃ فالاجرۃله ام للراهن؟قال له ان آجره بلااذن،وان باذن فللمالک وبطل الرهن۔۔۔وفی الشامیۃ:(قوله قال له الخ)فی التاتارخانیۃ:آجرالمرتهن الرهن من اجنبی بلا اذن فالغلۃله ویتصدق بهاعندأبی حنیفۃومحمد،وله ان یعیده فی الرهن.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:حبیب الرحمٰن

۱۵رجب المرجب ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۳۷۰

﴿ایام علالت کے مشاہرہ لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ ایک قاری صاحب ایک ادارے میں مدرس ہیں، ان کی طبیعت خراب ہوئی جسکی وجہ سے وہ ادارے میں نہیں جاسکتے، سوال یہ ہے کہ اس قاری صاحب کو مشاہرہ دیا جائیگا یا نہیں؟

سائل: عالم زیب ناظم آباد کراچی

﴿جواب﴾ تقرری کے وقت ایسے دنوں کی تنخواہ لینے نہ لینے کی وضاحت اگر نہیں ہوئی ہے اور ادارہ کے ضوابط میں بھی اسکی وضاحت نہیں ہے تو علاقے میں دیگر مدارس کے طریقہ کار کے مطابق عمل کریں، ایسے دنوں کی تنخواہ لینے کا جہاں عرف ہوگا تو جائز ہوگا ورنہ نہیں، البتہ تقویٰ اور اخلاص کا تقاضا تو یہ ہے کہ قاری صاحب تنخواہ نہ لیں اور مہتمم صاحب کو چاہیے کہ قاری صاحب کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی دوسری مد سے اسکا تعاون کرلیں۔

لما فی الفتاوی الخیریۃ:(۲۰۷/۱،طبع حقانیہ)

وان مقتضیٰ کلام صاحب القنیۃ وهو امام یترك الامامة لزیارة اقربانه فی الرساتیق أسبوعا أو نحوه أو لمصیبة أو لاستراحة لا بأس به ومثله عفو فی العادة والشرع انه یستحق اذا کان کذالک للعرف.

ولما فی الشامی:(۳۷۲/۴،طبع سعید)

قلت هذا ظاهر فیما اذا قدر لکل یوم درس فیه مبلغا اما لو قال یعطی المدرس کل یوم کذا فینبغی ان یعطی لیوم البطالة المتعارفة بقرینة ما ذکره فی مقابله من البناء علی العرف، فحیث کانت البطالة معروفة فی یوم الثلاثاء والجمعة وفی رمضان والعیدین یحل الأخذ وکذا لو بطل فی یوم غیر معتاد لتحریر درس الا اذا نص الواقف علی تقیید الدفع بالیوم الذی یدرس فیه کما قلنا.

ولما فی التاتارخانیة:(۵۵۳/۵،طبع قدیمی)

قال الفقیه ابو اللیث ومن یاخذ الاجر من طلبة العلم فی یوم لا درس فیه ارجو ان یکون جائزا اذا کان مشتغلا بالکتابة والتدریس.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: عبید اللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۰۸۶

﴿گاڑی برآمد کرنے پر متعین انعام طے کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ میری ایک گاڑی چوری ہوگئی تھی

جس کے برآمد کرنے پر میں نے اپنے ایک دوست سے متعین انعام طے کیا تھا، اب چونکہ اس نے گاڑی برآمد کی ہے لیکن اپنے پاس روک دی ہے کہ جب تک مجھے معاوضہ نہیں ملتا، گاڑی میری پاس رہیگی، معاوضہ تو میں اس کو دونگا لیکن جن ایام میں اس نے گاڑی کو روکے رکھا، ان ایام کا تاوان میں اس سے لے سکتا ہوں یا نہیں؟

سائل: انور علی کراچی

﴿جواب﴾ آپ نے اپنے دوست کے ساتھ گاڑی برآمد کرنے کا باقاعدہ معاوضہ طے کیا تھا، اب اس نے گاڑی برآمد کی، تو معاوضہ اس کا حق بنتا ہے، آپ اگر طے شدہ معاوضہ نہیں دینگے تو گاڑی وہ اپنے پاس روک سکتا ہے اور ان ایام کا کوئی تاوان آپ اس سے وصول نہیں کر سکتے۔

لمافی الهداية: (۲/۲۹۸، طبع رحمانيه)

وكل صانع ليس لعمله اثر في العين فليس له ان يحبس العين للاجر كالحمال والملاح...... وهذا بخلاف الآبق حيث يكون للراد حق حبسه لاستيفاء الجعل ولا اثر لعمله لانه كان على شرف الهلاك وقد احياه فكانه باعه منه فله حق الحبس

ولمافی الرد: (۲/۱۲۷، طبع سعيد)

(قوله وكره الجُعل) الجعل بضم الجيم وهو مايجعل للانسان في مقابلة شيئ يفعله.

ولمافی المظهری: (۵/۱۸۲، طبع رشيديه)

قوله تعالىٰ (ولمن جاء به حمل بعير) من الطعام جُعلاله وفيه دليل على جواز الجُعالة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد

۲۵ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۹۲۹

﴿اجیر کو اجرت پیسوں کے علاوہ بھی دی جا سکتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم نے ایک مزدور سے بات کی کہ اگر وہ ہماری زمین جو چار (۴) کنال ہے کی گندم کاٹے گا تو اسکو ہم ایک بوری گندم دینگے، پوچھنا یہ ہے کہ ہمارا یہ عقد صحیح ہے یا نہیں؟ یا ان کو گندم کی بجائے پیسے دینے ضروری ہے؟　　مستفتی: حافظ خالد محمود

﴿جواب﴾ مزدور کو صرف پیسوں کی صورت میں مزدوری دینا ضروری نہیں گندم ہو یا اسطرح کی کوئی دوسری چیز بھی مزدوری میں طے ہو جائے تو دینا لینا جائز ہے بشرطیکہ اسکا وزن وغیرہ معلوم ہو، البتہ اسی فصل سے حاصل ہونے والا غلہ طے نہ کریں۔

لمافی التنوير مع الدر: (۶/۴، طبع سعيد) (وكل ماصلح ثمنا) اى بدلا فى البيع (صلح اجرة)

وفی الشامیۃ:(قولہ ای بدلا فی البیع)فتدخل فیہ الاعیان فانہا تصلح بدلا فی المقایضۃ فتصلح اجرۃ.

ولما فی الھدایۃ:(۲۹۶/۳ طبع رحمانیہ)

وما جاز ان یکون ثمنا فی البیع جاز ان یکون اجرۃ فی الاجارۃ لأن الاجرۃ ثمن المنفعۃ فیعتبر بثمن المبیع.

ولما فی الفقہ الاسلامی وادلتہ:(۳۸۲۲/۴-۳۸۲۳ طبع رشیدیہ)

ان تکون الاجرۃ مالا متقوما معلوما والاصل فی اشتراط العلم بالاجرۃ قول النبی ﷺ "من استأجر اجیرا فلیعلمہ أجرہ" والعلم بالأجرۃ لایصح الا بالاشارۃ او التعیین او بالبیان.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: اسلام بادشاہ

۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۲۳۴۱

﴿تمام سرکاری ملازمین اجیر خاص کے حکم میں ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں درجہ سابعہ کا طالبعلم ہوں اور اپنے گاؤں کے سکول میں حکومت کیطرف سے چوکیدار ہوں لیکن پڑھائی کو جاری رکھنے کی وجہ سے ڈیوٹی سرانجام نہیں دے سکتا، لہذا میں نے اپنی جگہ پر دوسرے آدمی کو آدھی تنخواہ پر رکھا ہے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ میرے لئے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے تو میں نے جو پہلے دو سال تنخواہ لی ہے وہ حلال ہے یا حرام؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ ملازمت عقد اجارہ ہے، ملازم جن شرائط کیساتھ کسی محکمہ میں ملازمت اختیار کرتا ہے، انکا پورا کرنا واجب ہے، تمام سرکاری ملازمین شرعاً اجیر خاص کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو صرف کام کی تنخواہ نہیں ملتی بلکہ کام اور طے شدہ وقت میں حاضری دونوں کی اجرت ملتی ہے، لہذا جتنا وقت محکمہ کی طرف سے مقرر ہو ڈیوٹی دینا ضروری ہوگا۔

ملازمین کا دوسرے کو اپنی جگہ ڈیوٹی بھیجنا درست نہیں ہے البتہ محکمہ سے باقاعدہ اجازت لیکر کسی باصلاحیت شخص کو اپنی جگہ مقرر کرلیا ہو اور وہ شخص کم تنخواہ لیکر اسکی جگہ ڈیوٹی دینے پر راضی ہو تو ملازم کیلئے ایسا کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ اس محکمہ میں ایسا قانون موجود ہو یا کم از کم محکمہ کو صحیح صورتحال کا علم ہو۔

لما فی التنویر مع الدر:(۶۹/۶ طبع سعید)

(والثانی)ھو الاجیر(الخاص)......(وھو من یعمل لواحد عملا موقتا بالتخصیص

ويستحق الاجر بتسليم نفسه فى المدة وان لم يعمل كمن استؤجر شهرا للخدمة اه)

ولما فى الكفاية مع فتح القدير:(۳۲/۹،طبع رشيديه)

(قوله والاجير الخاص الذى يستحق الاجر بتسليم نفسه فى المدة وان لم يعمل) اى سلم نفسه ولم يعمل مع التمكن اما اذا امتنع من العمل ومضت المدة اولم يتمكن من العمل ومضت المدة لم يستحق الاجر لانه لم يوجد تسليم النفس.

ولما فى البحر الرائق:(۲۹/۸،طبع سعيد)

الاجير الخاص يستحق الاجر بتسليم نفسه فى المدة عمل اولم يعمل وكذا فى الولوالجية:(۲۳۱/۳،طبع فاروقيه پشاور)

ولما فى الفقه الاسلامى:(۷۶۷/۴،طبع رشيديه)

(الاجير الخاص الذى يستحق الاجر بتسليم نفسه فى المدة وان لم يعمل) كالخادم فى المنزل والاجير فى المحل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۲۶ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۸۷۰

﴿اجارہ فاسدہ کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اپنے ہسپتال میں کینٹین کھولنے والے کیساتھ اس طرح شراکت کرلوں کہ جگہ اور فرنیچر میری طرف سے ہو اور اس کینٹین میں فروخت ہونے والی اشیاء مثلاً کیک چائے بسکٹ وغیرہ خرید کردہ لایا کرے اور ان اشیاء سے حاصل ہونے والا نفع ہم برابر تقسیم کریں تو کیا یہ جائز ہوگا یا ناجائز؟ بالفرض اگر ناجائز ہے تو اسکی جائز صورت بھی بتادیں؟ مستفتی: ڈاکٹر عبدالرحمٰن آرتھوپیڈک

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ معاملہ شراکت کا نہیں بلکہ اجارہ فاسدہ کی ایک صورت ہے اس لئے جائز نہیں ہے، اجارہ صحیح ہونے کیلئے اجرت کی تعین ضروری ہے چائے وغیرہ سے حاصل ہونے والے منافع معلوم نہیں ہیں۔

اسکی جائز صورت ایک یہ بھی ہوسکتی ہے کہ باہمی رضامندی سے جگہ اور فرنیچر کا کرایہ متعین کرلیں، آپ کرایہ وصول کرتے رہیں اور باقاعدہ شراکت چاہتے ہیں تو جگہ اور فرنیچر کا کرایہ متعین کرلیں اور ہوٹل میں فروخت ہونے والی اشیاء میں آپ بھی اپنی طرف سے خاص مقدار کی رقم شامل کریں مثلاً آدھی رقم آپ شامل کریں اور منافع کی تقسیم کی شرح رأس المال کے

اعتبار سے متعین کرلیں مثلاً پچاس فیصد آپکا اور پچاس فیصد کینٹین چلانے والے کیلئے اور کرایہ بھی حاصل ہونے والے منافع سے وصول کیا جائیگا اور باقی منافع کی تقسیم کم ازکم پچاس فیصد کینٹین چلانے والے کا حق بنتا ہے، آپ چاہیں تو اس سے زیادہ شرح بھی محنت کرنے والے کیلئے مقرر کرسکتے ہیں مثلاً ساٹھ/۶۰ فیصد اسکے لئے اور چالیس/۴۰ فیصد آپ کے لئے مقرر ہو۔

لمافی الهداية:(۲۹۵/۳ طبع رحمانيه)

الاجارة عقد يرد على المنافع بعوض...... ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة والاجرة معلومة ولان الجهالة في المعقود عليه وبدله تفضي الى المنازعة كجهالة الثمن والمثمن في البيع.

ولمافي الشامي:(۴/۳۱۲ طبع سعيد)

قلت والظاهر ان هذا محمول على ما اذا كان العمل مشروطاً على احدهما وفي النهر اعلم انهما اذا شرطا العمل عليهما ان تساويا مالا وتفاوتا ربحا جاز عند علمائنا الثلثة خلافا لزفر والربح بينهما على ما شرطا وان عمل احدهما فقط وان شرطاه على احدهما فان شرطا الربح بينهما بقدر رأس مالهما جاز ويكون مال الذي لا عمل له بضاعة عند العامل له ربحه وعليه وضيعته وان شرطا الربح للعامل اكثر من رأس ماله جاز ايضا على الشرط ويكون مال الدافع عند العامل مضاربة ولو شرطا الربح للدافع اكثر من رأس ماله لا يصح الشرط ويكون مال الدافع عند العامل بضاعة لكل واحد منهما ربح ماله والوضيعة بينهما على قدر رأس مالهما ابدا هذا حاصل ما في العناية اه ما في النهر.

ولمافي الهداية:(۳/۲۶۲ طبع رحمانيه) الا ترى ان الربح لو شرط كله لرب المال كان بضاعة.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۷۳

﴿یہ عقد مضاربت نہیں بلکہ اجارہ فاسدہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے بکر کو کپاس دیا کہ یہ کپاس مثلاً (۵۰) کلو ہے خرچوں سمیت دس ہزار کا پڑا ہے آپ مناسب منافع کیساتھ آگے بیچو، منافع برابر برابر ہوگا اور اس کام کو نام مضاربت کا دے رہے ہیں شریعت کی رو سے اسکا کیا حکم ہے۔

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ کو زید اور بکر اگرچہ مضاربت کا نام دے رہے ہیں لیکن یہ عقد مضاربت نہیں ہے، کیونکہ مضاربت میں رب المال کیطرف سے نقد مال مثلاً سونا چاندی، روپے ڈالر وغیرہ مضارب کو دینا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ مضارب تجارت کے ذریعہ اس کو استعمال میں لائے جس میں نفع ونقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے یہاں خاص مقدار میں روئی دیکر زید نے بکر کو

نفع کیساتھ بیچنے کا پابند کیا ہے، اور فروخت ہونے کی صورت میں مختانہ کے طور پر آدھے منافع دینا اسکے ساتھ طے ہوا ہے تو یہ اجارہ فاسدہ کی صورت ہے اس لئے شرعی حکم یہ ہے کہ معاملہ کو بلا تاخیر ختم کیا جائے اور ابتک جتنا کام ہوا ہے کام کرنے والا اجرت مثلی کا حقدار بنتا ہے۔

(لمافی الدالمختار: ج۵/۶۴۵ سعید)

وشرعا (عقد شركة في الربح بمال من جانب) رب المال (وعمل من جانب) المضارب

وايضافيه (ج۵/۶۴۷) وشرطها أمور سبعة (كون رأس من الاثمان) كمامر في الشركة وهو معلوم للعاقدين

(لمافی التنویر مع رد: ۶/۴۶ سعید)

فكل ماافسدالبيع ممامريفسد ها كجهالة مأجور واجرة اومدة اوعمل وكشرط طعام عبد وعلف دابة ومرمة الدار الخ

(لمافی الهندية: ج ۴/۴۹۲ الفصل الاول فيما يفسد العقد فيه ،طبع قديمى)

الفساد قديكون لجهالة قدر العمل بأن لايبين محل العمل وقد يكون بشرط فاسد لمخالف المقتضىٰ فالفاسد يجب فيه اجر المثل ولايزادعلى المسمى ان سمى في العقد مالامعلوماوان لم يسم يجب بالغا مابلغ ــ الخ

(لمافی هداية: ج۳/۲۹۶ رحمانيه)

ولايصح حتى تكون المنافع معلومة والاجرة معلومة لما روينا ولان الجهالة في المعقود عليه وفي بدله تفضى لمنازعة كجهالة الثمن ولمثمن في البيع ــ الخ

وايضافيها (ج۳/۳۰۱) ويجوز استيجار الدواب للركوب والحمل لانه منفعه معلومة معهودة ــ الخ

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ غفرلہ ولوالدیہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۴۱

﴿ڈاکٹر کیساتھ کمیشن کے معاہدہ میں زائد شرط لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لیبارٹری والا ایک ڈاکٹر کیساتھ یہ معاہدہ کرنا چاہتا ہے کہ آپ ہمارے ہاں ٹیسٹ کیلئے مریض بھیجا کریں ہم نفع کا مثلاً دس فیصد آپ کو دیں گے، البتہ آپ لیبارٹری کی بجلی کا بل اگر تیس/۳۰ ہزار سے کم تک آئے تو آپ بھریں گے تو کیا یہ معاملہ شریعت کی رو سے صحیح ہے؟ مستفتی: ڈاکٹر عبدالرحمٰن آرتھوپیڈک

﴿جواب﴾ ڈاکٹر صاحب مریضوں کیلئے ٹیسٹ لکھ کر آپکی لیبارٹری سے ٹیسٹ کرانے کی سفارش اگر کرتا ہے اور آپ ہر ٹیسٹ پر مخصوص مقدار میں کمیشن ان کو دیتے ہیں تو اس حد تک یہ

معاملہ درست ہے بشرطیکہ کمیشن کی لالچ میں آکر وہ بلاضرورت مریضوں کو ٹیسٹ کرانے کا نہ کہیں اور آپ بھی ڈاکٹر صاحب کی سفارش سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے عام مارکیٹ کی نسبت سے زیادہ فیس وصول نہ کریں لیکن اس معاملے میں ڈاکٹر صاحب کو بجلی کا بل ادا کرنے کا پابند کرنا شرط فاسد ہے جسکی وجہ سے پورا معاملہ خلاف شریعت ہے۔

لیبارٹری آپکی ہے اس کے اخراجات بھی آپ خود ہی برداشت کرتے رہیں چاہیں تو ڈاکٹر صاحب کو کمیشن کم دیا کریں بجلی کا بل ادا کرنے کی شرط لگانا خلاف عقد ہے اور مقدار بھی معلوم نہیں ہے، لہذا ایسا معاملہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

لمافی الشامی:(۶/۶۳ طبع سعید)

[تتمۃ] قال فی التاترخانیۃ: وفی الدلال والسمسار یجب اجر المثل، وما تواضعوا علیہ ان فی کل عشرۃ دنانیر کذا فذاك حرام علیھم. وفی الحاوی: سئل محمد بن سلمہ عن اجرۃ السمسار، فقال: أرجوانہ لا بأس بہ وان کان فی الاصل فاسدا لکثرۃ التعامل وکثیر من ھذا غیر جائز، فجوزوہ لحاجۃ الناس الیہ کدخول الحمام.

ولمافی التنویر مع الدر:(۶/۴۶-۴۷ طبع سعید)

(تفسد الاجارۃ بالشروط المخالفۃ لمقتضی العقد فکل ما افسد البیع) مما مر (یفسدھا) کجھالۃ ماجور او اجرۃ او مدۃ او عمل، وکشرط طعام عبد وعلف دابۃ الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۹ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۶۷

﴿کرائے پر گاڑیاں اور رکشے چلانے والے اجیر مشترک کے حکم میں ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میں نے رکشہ والے کیساتھ بات کی تھی کہ ماہانہ آپ کو پندرہ سو روپے دونگا آپ میرے بھائیوں کو روزانہ ٹیوشن کیلئے لے جایا کروگے، مہینے کے آخری دنوں میں شہر کے حالات خراب ہوگئے، تین دن تک کرفیو نافذ رہا، تین دن کے بعد حالات معمول پر آگئے، رکشہ والا ان تین دنوں کے علاوہ اور چار دن بھی بھائیوں کو لینے نہیں آیا، اب جب حساب کتاب کا وقت آیا تو وہ ان چھٹی کیے ہوئے سات/۷ دن کے کرایہ کا بھی مطالبہ کررہا ہے تو کیا میرے اوپر ان سات دنوں کا کرایہ دینا لازم ہے؟ مستفتی: داؤد شاہ ڈی آئی خان

﴿جواب﴾ تمام گاڑیوں اور رکشوں والے شریعت کی اصطلاح میں اجیر مشترک کہلاتے

ہیں اور وہ تب اجرت کے مستحق ہوتے ہیں جب وہ کام سرانجام دیں، مذکورہ صورت میں جتنے دن رکشہ والا غیر حاضر رہا ہے آپ کے بھائیوں کو لیکر نہیں گیا اتنے دنوں کے حساب سے آپ کرایہ کاٹ سکتے ہیں ان دنوں کا کرایہ انکو دینا آپ پر لازم نہیں ہے بشرطیکہ آپ نے پہلے اسکے ساتھ یہ طے نہ کیا ہو کہ اگر حالات کے خراب ہونے کی وجہ سے آپ نہ آسکے تب بھی آپ کو کرایہ دونگا۔

لما فی التنویر مع الدر:(۶/۶۴ طبع سعید)

(ولا یستحق المشترک الأجر حتی یعمل کالقصار ونحوه) کقتال وحمال ودلال وملاح، وله خیار الرؤیة فی کل عمل یختلف باختلاف المحل مجتبی.

ولما فی الکفایۃ مع فتح القدیر:(۹/۱۲۲ طبع رشیدیه)

(فالمشترک من لا یستحق حتی یعمل کالصباغ والقصار) لان المعقود علیه اذا کان هو العمل او اثره کان له ان یعمل للعامة لان منافعه لم تصر مستحقة لواحد فمن هذا الوجه یسمی مشترکاً.

ولما فی الفقه الحنفی:(۲/۸۶ طبع دار الکلم الطیب)

الاجیر المشترک من لا یستحق الاجر حتی یعمل وهو الذی یعمل لا لواحد من غیر توقیت کالطبیب وشرکة المقاولات وشرکات النقل البریة والجویة والبحریة.

ولما ایضاً فیها:(۲/۸۹ طبع دار الکلم الطیب)

تستحق الاجرة باستیفاء المعقود علیه او باشتراط التعجیل او بالتعجیل من غیر شرط لان الاجرة لا تجب بنفس العقد لقوله علیه السلام اعط الاجیر اجره قبل ان یجف عرقه ولو وجبت بالعقد لما جاز تأخیره الی ما بعد الفراغ لان العرق انما یوجد بالعمل

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ | فتویٰ نمبر: ۲۱۴۲

﴿مسجد میں اجرت لیکر بچوں کو قرآن کی تعلیم دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں اجرت لیکر بچوں کو دینی تعلیم یعنی قرآن مجید وغیرہ پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: مرتضیٰ صاحب

﴿جواب﴾ بچوں کو مسجد میں پڑھانا جائز ہے خواہ استاد کو اسکی تنخواہ ملتی ہو، البتہ جن بچوں سے مسجد میں پیشاب وغیرہ کا اندیشہ ہو تو انکو مسجد میں لانا منع ہے۔

لما فی الشامی:(۶/۴۲۸ طبع سعید)

قلت بل فی التاتارخانیة عن العیون جلس معلم أو وراق فی مسجد فان کان یعلم

أو يكتب بأجر يكره الا لضرورة وفي الخلاصة تعليم الصبيان في المسجد لا بأس به اھ.
ولما في الهندية:(۵/۳۲۱،طبع رشيديه)
لو جلس المعلم في المسجد والورّاق يكتب فان كان المعلم يعلم للحسبة والورّاق يكتب لنفسه فلا بأس به لانه قربة وان كان بالاجرة يكره الا أن يقع لهما الضرورة.
وكذا في المبسوط:(ج۲۷ص۲۵،طبع بيروت)
ولما في خلاصة الفتاوى:(۱/۲۲۹،طبع رشيديه)
وكذا الكاتب اذا كان يكتب باجرة يكره وبغير أجر لا يكره وأما المعلم الذي يعلم الصبيان بأجر اذا جلس يعلم الصبيان لضرورة الحر أو غيره لا يكره وفي نسخة القاضي الامامؒ في اقرار العيون جعل مسئلة المعلم كمسئلة الكاتب والخياط فان كان يعلم حسبة لا بأس به وان كان بأجر يكره الا اذا وقع ضرورة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ
۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی
فتویٰ نمبر: ۲۰۱۶

﴿جانوروں کی جفتی کرانے پر اجرت لینا درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں بعض لوگ گائے جفتی کرانے کیلئے بیل پالتے ہیں اور اس پر متعین اجرت لیتے ہیں تو کیا یہ اجرت لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: محمد عابد

﴿جواب﴾ اجرت لینے کیلئے یہ ضروری ہے کہ جس چیز سے نفع اُٹھایا جائے وہ اس شخص کی ملکیت میں ہو، صورت مسئولہ میں گائے کا حمل ٹھہرانا کسی کے بس کی بات نہیں اس لئے اس پر اجرت لینا شرعاً جائز نہیں اور اس کے علاوہ احادیث مبارکہ میں بھی اس سے منع فرمایا ہے، البتہ اجرت طے کئے بغیر بعد میں جانور کیلئے چارہ وغیرہ کے طور پر کچھ دینا چاہئے تاکہ لوگوں کی ضرورت پوری ہو اور حدیث مبارک میں مذکورہ ممانعت کے خلاف بھی نہ ہو۔

لما في الشامي:(۶/۷۵،طبع امداديه)
قوله:(لا تصح الاجارة لعسب التيس)لأنه عمل لا يقدر عليه وهو الاحبال.
ولما في البحر الرائق:(۸/۱۹،طبع سعيد)
(لا أجرة عسب التيس)بمعنى لا يجوز أخذ أجرة عسب التيس لقوله عليه الصلاة والسلام ان من السحت عسب التيس ومهر البغي لانه عمل لا يقدر عليه وهو الاحبال فلا يجوز أخذ الاجرة عليه ولا أخذ المال بمقابلة الماء وهو نجس لا قيمة له فلا يجوز

والمراد هنا استئجار التيس لينزو على الغنم ويحبلها باجر.

ولما في الهداية:(۳۰۵/۳،طبع رحمانيه)

(ولا يجوز اخذ أجرة عسب التيس) وهوان يواجر فحلا لينزو على اناث لقوله عليه السلام ان من السحت عسب التيس والمراد اخذ الاجرة عليه.

ولما في خلاصة الفتاوى:(۱۱۳/۳،طبع رشيديه)

رجل استاجر فحلا لينزنه على انثى لا يجوز بخلاف ما اذا استاجر ظئرا لترضع ولده حيث يجوز والفرق حاجة الناس والقياس فيهما سواء.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی

۴ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　فتویٰ نمبر: ۱۹۹۱

﴿جانور کو نصف دودھ کے عوض پالنے کیلئے دینا درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص نے بھینس خرید کر کسی دوسرے شخص کو اس شرط پر پالنے کیلئے دی کہ آدھا دودھ تمہارا اور آدھا میرا ہوگا تو اس قسم کی شرط لگانا اور ایسا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ شرعاً ایسا معاملہ جائز نہیں ہے، یہ اجارہ فاسدہ کی صورت ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ چارہ کی قیمت اور رکھوائی کی اجرت آپس میں طے کرلیں، دودھ بھینس کے مالک کا ہوگا، البتہ چارے کی قیمت اور رکھوائی کی اجرت کے بدلے میں دودھ کی خاص مقدار مثلاً کلو، من وغیرہ مقرر کرنا چاہیں تو اس طرح کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اور دودھ بھی خاص انہی جانوروں کا مقرر نہ کریں بلکہ مطلق دودھ خواہ دوسرے جانوروں سے ہو، بعد میں بیشک انہی جانوروں کا دودھ بدلے میں دیا کریں لیکن معاملہ میں مطلق دودھ طے کرلیں یہ شرعاً صحیح طریقہ ہے اور اب تک جو معاملہ ہوا ہے یہ اجارہ فاسدہ ہے دونوں اگر راضی ہیں تو آئندہ کیلئے یہ معاملہ درست کرلیں اور اگر اختلاف کی صورت پیدا ہوئی ہے تو بھینس کے مالک کے ذمہ اس شخص کی رکھوائی کی مزدوری واجب ہے اور چارہ کی قیمت بھی اور مزدور کے ذمہ دودھ واپس کرنا ہے یعنی جتنا اس نے استعمال کیا ہے۔

لما في الهندية:(۴۴۵/۴،طبع رشيديه)

دفع بقرة الى رجل على ان يعلفها وما يكون من اللبن والسمن بينهما انصافا فالاجارة فاسدة وعلى صاحب البقرة للرجل اجر قيامه وقيمة علفه ان علفها من علف هو ملكه

ویرد کل اللبن ان کان قائما وان اتلف فالمثل الی صاحبہا لان اللبن مالی وکذا فی

البزازیۃ بہامش الہندیۃ(۵/۲۷،مطبع رشیدیہ)

ولمافی خلاصۃ الفتاوی(۲/۱۱۲ مطبع رشیدیہ)

رجل دفع بقرۃ الی رجل بالعلف مناصفۃ وھی التی یسمی بالفارسیۃ کاونیم سودیان دفع علی ان یحصل من اللبن والسمن بینہما نصفان فہذا فاسد والحادث کلہ لصاحب البقرۃ والاجارۃ فاسدۃ ولو اکل اللبن مع ھذا الرمض فاثم فماکان من اللبن قائما یرد علی مالک البقرۃ وماکان اکل یرد مثلہ من اللبن....ولہ علی المالک قیمۃ علفہا واجر المثل فی قیامہ علیہا.

ولمافی فیض الباری(۲/۲۸۲،مطبع رشیدیہ)

ان من البیوع الفاسدۃ مالو اتی بہا احد جازت دیانۃ وان کانت فاسدۃ قضاء وذلک لان الفساد قد یکون لحق الشرع بان اشتمل العقد علی مالم فلا یجوز بحال، وقد یکون الفساد لمخافۃ التنازع ولا یکون فیہ شیء اخر یوجب الاثم فذلک ان لم یقع فیہ التنازع جاز اعندی دیانۃ وان بقی فاسدا قضاء لارتفاع علۃ الفساد وھی المنازعۃ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب:رضوان اللہ حقانی

۲۰ صفرالخیر ۱۴۳۰ھ　　فتویٰ نمبر:۱۹۱۲

﴿جانور کو نصف پر دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل یہ عام رواج ہے کہ مالدار آدمی غریب کے لئے جانور خرید لیتا ہے اور اس سے یہ کہتا ہے کہ تم اسکو پالو اور اسکے جو بچے ہونگے وہ دونوں کے درمیان مشترک ہونگے، شرعا اسکا کیا حکم ہے اور جواز کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

مستفتی:سعید مرتضیٰ صاحب

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں چونکہ اجرت مجہول ہے اسلئے یہ معاملہ جائز نہیں ہے، البتہ اس کے جواز کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مالدار آدمی جانور لے کر اسکی قیمت لگا کر آدھا حصہ غریب کو فروخت کردے پھر چاہے تو پیسے بھی نہ لے اب جانور دونوں کا مشترک ہوگا غریب بطور احسان جانور رکھے اب اس جانور میں اور اسکے بچوں میں بھی دونوں شریک ہونگے۔

لمافی الھندیۃ:(۲/۲۲۵،مطبع رشیدیہ)

وعلی ھذا اذا دفع البقرۃ الی انسان بالعلف لیکون الحادث بینہما نصفین فما حدث فہو لصاحب البقرۃ ولذلک الرجل مثل العلف الذی علفہا واجر مثلہ فیما قام علیہا

وعلی ھذا اذا دفع دجاجۃ الی رجل بالعلف لیکون البیض بینھما نصفین والحیلۃ فی ذلک أن یبیع نصف البقرۃ من ذلک الرجل ونصف الدجاجۃ بثمن معلوم حتیٰ تصیر البقرۃ وأجناسھا مشترکۃ بینھما فیکون الحادث منھما علی الشرکۃ.

ولما فی الدر المختار:(۳۲۶/۴،طبع سعید)

کما لو دفع دابۃ لرجل لیؤجرھا والأجر بینھما،فالشرکۃ فاسدۃ والربح للمالک وللآخر أجر مثلہ.وکذا فی المبسوط:(۲۱۹/۱۱،طبع سعید)

ولما فی الشامی:(۳۲۶/۴،طبع سعید)

[تنبیہ]لم یذکروہ ومالو کانت الدابۃ بین اثنین دفعھا أحدھما للآخر علی أن یؤجرھا ویعمل علیھا علی أن ثلثی الأجر للعامل والثلث للآخر وھی کثیرۃ الوقوع،ولا شک فی فسادھا لأن المنفعۃ کالعروض لا تصح فیھا الشرکۃ.وکذا فی منحۃ الخالق:(۱۸۲/۵،طبع سعید)

واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر:۲۰۹۵ ۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

﴿جانوروں کی جفتی کرانے پر اجرت لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے متعلق بعض دیہاتوں میں کچھ لوگ بیل پالتے ہیں، دوسرے لوگ مادہ جفتی کے واسطے ان کے پاس لے جاتے ہیں تو وہ اس پر اجرت سو روپے لیتے ہیں اگر ان سے اس بارے میں کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس کی اجرت نہیں لیتے ہیں بلکہ بیل کے لئے چارہ وغیرہ کا خرچہ لیتے ہیں، کیا ان کا یہ قول درست ہے؟ اور اس طرح کے حیلے سے یہ معاملہ درست ہوگا؟ مستفتی: ولایت خان

﴿جواب﴾ اجارے کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز سے نفع حاصل کیا جارہا ہے وہ شخص کی ملکیت ہو اور حمل ٹھہرانا کسی کے بس اور قدرت میں نہیں ہوتا ہے اس لئے یہ اجارہ درست نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اجرت لینے کو منع فرمایا ہے: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم والسلام: ان من السحت عسب التیس ومھر البغی.

لما فی التنویر مع الدر:(۵۵/۶،طبع امدادیہ)(لا تصح الاجارۃ لعسب التیس)وھو نزوہ علی الاناث.

وفی الشامیۃ:لانہ عمل لا یقدر علیہ وھو الاحبال.

ولما فی الھدایۃ:(۳۰۵/۳،طبع رحمانیہ)

ولا یجوز أخذ أجرۃ عسب التیس وھو أن یواجر فحلاً لینزو علی اناث لقولہ علیہ السلام

ان من السحت عسب التيس والمراد منه أخذ الاجرة عليه.

تاہم بغیر اجرت مقرر کئے ہوئے معاملہ کیا جائے تو درست ہے اسی طرح اگر پیسے بطور اجرت کے نہ ہوں بلکہ بیل کے لئے چارہ مہیا کرنے کے لئے کچھ دیا جائے تو گنجائش ہے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۱۱

﴿کرایہ دار کا دوسرے کو مکان کرایہ پر دینے کی شرعی حیثیت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم تقریباً دس افراد ایک مکان میں رہتے ہیں، ان دس افراد میں سے ایک نے اس مکان کو مالک سے (۲۵۰۰) پچیس سو روپے کرایہ پر لیا ہے جبکہ وہ ہم نو سے تقریباً (۴۵۰۰) ساڑھے چار ہزار روپے جمع کرتا ہے اور باقی اخراجات بھی ہم سے لیتا ہے اور اصل مالک کو بھی یہ معاملہ معلوم ہے کیا یہ زیادتی رقم اس کیلئے جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ آپکے دوست نے یہ مکان خود کیلئے کرایہ پر اگر لیا ہے اور اس میں اپنی طرف سے سہولت کا بھی کچھ انتظام کر دیا ہے مثلاً رنگ و روغن وغیرہ تو اضافی رقم وصول کرنا اس کیلئے جائز ہے اور اگر سہولت کا کوئی بھی انتظام اپنی طرف سے نہیں کیا ہے تو اضافی رقم وصول کرنا مناسب نہیں ہے چاہیے کہ تمام ساتھیوں کو اضافی کرایہ واپس کر دے یا صدقہ کر دے۔

لما في الهندية: (۴/۴۵۰، طبع رشيديه)

واذا استأجر دارا وقبضها ثم آجرها فانه يجوز ان آجرها بمثل ما استأجرها أو أقل وان آجرها بأكثر مما استأجرها فهي جائزة أيضا الا أنه ان كانت الاجرة الثانية من جنس الاجرة الاولى فان الزيادة لا يطيب له ويتصدق بها وان كانت من خلاف جنسها طابت له الزيادة.

ولما في الدر مع الرد: (۹/ ۳۸، طبع امداديه)

ولو آجر بأكثر تصدق بالفضل الا في مسألتين: اذا آجرها بخلاف الجنس أو أصلح فيها شيئا.

وفي الشامية: قوله: (أو أصلح فيها شيئا) بان جصصها أو فعل فيها مسناة وكذا كل عمل قائم، لأن الزيادة بمقابلة ما زاد من عنده حملا لأمره على الصلاح كما في المبسوط.

ولما في بدائع الصنائع: (۴/۲۰۶، طبع سعيد)

ولو أجرها المستأجر بأكثر من الاجرة الاولى فان كانت الثانية من خلاف جنس الاولى طابت له الزيادة وان كانت من جنس الاولى لا تطيب له حتى يزيد في الدار زيادة من بناء أو حفر أو تطيين أو تجصيص فان لم يزد فيه شيئا فلا خير في الفضل ويتصدق به لكن تجوز الاجارة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۱۹ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۹۱۰

﴿کرایہ کے مکان میں رہائش اختیار نہ کی ہو تب بھی کرایہ واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر کے قریب ایک آدمی نے گھر بنایا کچھ عرصہ وہ اسمیں رہا پھر وہاں سے منتقل ہوا اور گھر ہمارے حوالے کیا کہ کوئی مناسب کرایہ دینے والا مل جائے تو دیدینا، کافی عرصہ وہ خالی پڑا رہا پھر ہمارے ایک جاننے والے نے کہا میں یہاں آرہا ہوں اس سے بات ہوگئی ہم نے چابیاں اسکے حوالے کر دیں اس نے سامان وغیرہ لاکر رکھ دیا لیکن رہائش اختیار نہیں کی اس طرح ایک مہینہ گزر گیا، جب ہم نے اس سے کرایہ کا کہا تو وہ کہنے لگا کہ میں نے گھر رہائش کیلئے کرایہ پر لیا تھا جب میں نے اسمیں رہائش ہی اختیار نہیں کی تو کرایہ کس چیز کا دوں، میں سامان ابھی لے جاتا ہوں آئندہ کیلئے بھی میں نے یہاں رہائش اختیار نہیں کرنی۔

براہ کرم وضاحت فرمائیں کہ ہم اس آدمی سے ایک مہینہ کے کرایہ کے مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں یا نہیں؟ اسلئے کہ مالک مکان کو تو ہم نے یہ بتایا کہ آپکے مکان کیلئے کرایہ دار مل گیا ہے۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں جب آپنے کرایہ دار کو گھر کی چابیاں دیدی اور اسکے رہائش کیلئے فارغ کر دیا اس طور پر کہ اسکے لئے اس گھر میں رہائش اختیار کرنے سے کوئی مانع نہیں رہا اسکے بعد اس نے گھر میں رہائش اختیار کی ہو یا نہیں، دونوں صورتوں میں آپ مہینہ پورا ہونے پر اس سے مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں، اسکا یہ کہنا کہ ”گھر میں رہائش کیلئے کرایہ پر لے رہا تھا جب میں نے اسمیں رہائش اختیار نہیں کی تو کرایہ کس چیز کا“ نا قابل توجہ بات ہے۔

لما في البدائع (ج۵/۲۷ طبع دار الكتب العلمية)

ولو آجر المنزل فارغا وسلم المفتاح الى المستأجر فلم يفتح الباب حتى مضت المدة لزمه كل الاجر لوجود التسليم وهو التمكين من الانتفاع برفع الموانع في جميع المدة فحدثت المنافع في ملك المستأجر فهلكت على ملكه فلا يسقط عنه الاجر كالبائع اذا سلم المبيع الى المشتري بالتخلية فهلك في يد البائع كالهلاك على المشتري لانه هلك على ملكه .كذا هذا وان لم يسلم المفتاح اليه لكنه اذن له بفتح الباب فقال :مر وافتح الباب فان كان يقدر على فتح الباب بالمعالجة لزمه الكراء لوجود التسليم، وان لم يقدر لا يلزمه لان التسليم لم يوجد.

وكما في شرح المجلة (ج۲/۶۸۰، ۶۸۱ طبع رشيدية) المادة ۵۸۲

﴿تسليم المأجور عبارة عن اجازة الآجر ورخصته للمستأجر بان ينتفع به بلا مانع﴾

بمعنى ان الاجارة انعقدت صحيحة لكن التسليم الذي بسببه يستحق الآجر على
المستأجر هو عبارة عن تخلية الآجر بين المستأجر والمأجور على وجه يتمكن من الانتفاع المعقود
بلا حائل يمنعه منها فلو صح التسليم فان كان المعقود عليه الدار مثلا ان تسليم مفتاح نحو الدار الى
المستأجر مع التخلية بينه وبين الدار تسليم للدار حتى يجب الاجر بمضي المدة وان لم يسكن.

والله تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۲۱۶۳

۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۲ھ

﴿کمپنی کے ساتھ طے شدہ معاہدہ کی پاسداری ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ بعض نوجوان مختلف کمپنیوں کے ساتھ بیرون ملک جاتے ہیں چونکہ یہاں عام طور پر ان کی تنخواہ کم ہوتی ہے اس لئے کسی بڑی تنخواہ کی غرض سے وہاں جاکر بھاگ جاتے ہیں اور کئی سالوں تک چھپ کر رہتے ہیں۔

پوچھنا یہ ہے کہ ان لوگوں کے اس عمل اور کمائی کا شرعاً کیا حکم ہے؟ نیز کمپنی کے ساتھ جانے والوں کیلئے لائف انشورنس (Life insurance) کرانا ضروری ہے، اس کے بغیر شرکت اور جانے کی اجازت نہیں ہوتی، تو کیا یہ لوگ اس گناہ میں شریک ہونگے، اور انشورنس کرانے کی صورت میں جو پیسے ملتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

مستفتی: محمد اسلم چترالی

﴿جواب﴾ کمپنی والے جس آدمی کو باہر ملک بھیجتے ہیں تو وہ اس سے یہ عہد لے کر بھیجتے ہیں کہ وہاں جاکر کمپنی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کام کریگا، اب وہاں جاکر کمپنی کی منشاء کے خلاف کسی دوسری جگہ کام کرنا معاہدہ کی خلاف ورزی ہے جو کہ ناجائز ہے، رہا کمائی کا مسئلہ تو چونکہ وہ اپنی محنت اور وقت صرف کرکے کماتے ہیں، لہٰذا ان کی کمائی جائز ہوگی۔

لما في قوله تعالى (سورة المؤمنون، آیت ۸) والذين هم لأماناتهم وعهدهم راعون ۔۔۔ الآية.

ولما في البحر (۸/۲ طبع سعيد)

واما ركنها فهو الايجاب والقبول والارتباط بينهما، واما شرط جوازها فثلاثة اشياء: أجر معلوم وعين معلوم وبدل معلوم، ومحاسنها دفع الحاجة بقليل المنفعة، واما حكمها فوقوع الملك في البدلين ساعة فساعة.

رہا لائف انشورنس (Life insurance) کا مسئلہ تو علماء ایسی صورت میں کہ شیئر ہولڈر صرف اپنی اصل رقم کی واپسی چاہتا ہو تو اس کی گنجائش بتاتے ہیں، لہٰذا مذکورہ صورت میں اگر

مجبوری کی وجہ سے کوئی انشورنس کرائے اور پھر اس پر سود نہ لے تو جائز ہے لیکن اس پر زیادتی لینا ہرگز جائز نہیں ہے، معاہدہ کے وقت اس کی صراحت اگر کرے خواہ زبانی ہو تو بہت اچھا ہوگا۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفا اللہ عنہ

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۵۵۷

﴿درزی کے کام سے متعلق چند مسائل﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ (۱) ہماری درزی کی دکان بازار میں ہے اور ہم جوڑے کا ۱۸۰ روپے لیتے ہیں اور دوسری دوکانیں مارکیٹ میں ہیں، وہ دوکاندار جوڑے کا ۱۳۰ روپے لیتے ہیں اور ہماری دوکانوں کا کرایہ ۴۰۰۰ روپے ہے جبکہ ان کی دکانوں کا کرایہ ۱۵۰۰ روپے ہے، نیز جو میٹر بل ہم استعمال کرتے ہیں وہ میٹر بل وہ لوگ استعمال نہیں کرتے، یہ زائد اجرت لینا ہمارے لئے جائز ہوگا یا نہیں؟ (۲) جب کوئی گاہک ہمارے پاس آتا ہے تو ہم اس کو بتاتے ہیں کہ آپ کا جوڑا دس (۱۰) دن کے بعد تیار ہوگا پھر بسا اوقات بجلی کی لوڈشیڈنگ کی وجہ سے جوڑا پندرہ (۱۵) دن کے بعد بنتا ہے تو کیا اس معاملے میں ہم وعدہ خلافی کر رہے ہیں یا وعدہ خلاف ہو گئے ہیں؟

﴿جواب﴾ (۱) آپ فی جوڑے کی سلائی اجرت ۱۸۰ روپے لیتے ہیں یا زیادہ جبکہ پہلے سے گاہک سے یہ رقم طے ہوئی تھی یا کسی طرح اس کے علم میں ہے پھر تو کوئی مضائقہ نہیں ہے گاہک کو علم نہ ہو لیکن سلائی کے بعد بخوشی قبول کر لے تب بھی کوئی بات نہیں ہے اور اگر سلائی کے بعد مطلوبہ اجرت دینے سے وہ انکار کر دے اور عام مارکیٹ میں اس طرح بازار کے دیگر کاریگروں کے پاس بھی ایسی سلائی (۱۳۰) روپے کی ہے تو اس سے زیادہ لینا جائز نہیں ہوگا، اسلئے پہلے سے بتادیا کریں یا کم از کم لکھ کر دوکان میں آویزاں کریں تا کہ گاہک کو مطلوبہ اجرت معلوم ہو۔

(۲) آپ کی کوشش کے باوجود دس (۱۰) دن میں لوڈشیڈنگ کی وجہ سے جوڑا تیار نہ ہو سکا تو یہ وعدہ خلافی کے زمرے میں نہیں آتا، البتہ خود کو اندازہ ہو، کہ دس دن میں تیار نہیں کر سکیں گے لیکن گاہک بنانے کے لئے بتادیا تو یہ صورت بلاشبہ وعدہ خلافی ہے اور گناہ ہے۔

لما فی سنن ابی داود: (۳۲۰/۲، مطبع قدیمی)

اذا وعد الرجل أخاه ومن نيته أن يفي له فلم يف ولم يجئ للميعاد فلا اثم عليه

المحشر: أي لم يف بعذر وقيل الخلف في الوعد من غير مانع حرام ۔۔۔ وكان الوفاء بالوعد مأمورا به في الشرائع السابقة.

ولما في مرقاة المفاتيح: (۲۱۱/۱ طبع رشیدیه کوئٹه)

اية المنافق ثلاث" زاد مسلم وان صام أو صلى وزعم انه مسلم "اذا حدث كذب واذا وعد اخلف واذا أؤتمن خان۔ قال الملا علي القاري: اخلف، أي جعل الوعد خلافا بان لم يف بوعده ان عزم على الاخلاف حال الوعد لا ان طرء له كما هو واضح.

واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ　　　الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۱۲۲۵　　　۱۹ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ

﴿قفیز الطحان کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ ہمارے گاؤں میں ابتلاء عام ہے کہ جب پن چکی والا گندم وغیرہ پیس لیتا ہے تو اسی میں سے اپنی اجرت (ایک کلو یا دو کلو) لے لیتا ہے کبھی کلو وغیرہ کی کوئی قید نہیں لگائی جاتی بلکہ ایک مخصوص برتن ایک بار یا دو بار بھر کر لے لیتا ہے، نیز غلہ پیسنے کی مشینیں بھی ہیں، اکثر مشین والے بھی پسائی کی اجرت اس پسی ہوئی چیز (گندم، مکئی وغیرہ) ہی میں سے لیتے ہیں، البتہ بعض مشین والے نقد اجرت بھی لیتے ہیں، کیا مذکورہ معاملات شرع کی رو سے درست ہیں؟

﴿جواب﴾ گندم کی پسائی کی اجرت آٹے سے لینا درست نہیں یہ "قفیز الطحان" کے قبیل میں سے ہے یعنی جو چیز اجیر کے کسی عمل کے نتیجے میں وجود میں آئے اسی میں سے اجرت مقرر کرنا "قفیز الطحان" کہلاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، اس کے درست ہونے کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مشین والے یا پن چکی والے کی اجرت پیسنے سے پہلے الگ کر دی جائے یا بلا تعیین کے اس کی اجرت مقرر کر دی جائے یعنی چاہے مستأجر دوسری گندم سے اس کو اجرت دے یا اسی میں سے دے، ان صورتوں میں یہ معاملہ درست رہے گا اور "قفیز الطحان" کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

لما في التنوير مع الدر: (۷۹/۶ طبع امدادیه)

(أو استأجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه أو ثورا ليطحن بره ببعض دقيقه) فسدت في الكل لانه استأجره بجزء من عمله، والاصل في ذلك نهيه صلى الله عليه وسلم عن قفيز الطحان في بيع الوفاء. والحيلة: أن يفرز الأجر أولا أو يسمى قفيزا بلا تعيين ثم يعطيه قفيزا منه فيجوز، وكذا في البحر الرائق: (۲۳/۸ طبع سعید)

ولما فی الهندیة: (۴/۴۴۴، طبع رشیدیه)

صورة قفيز الطحان أن يستأجر الرجل من آخر ثوراً ليطحن به الحنطة على أن يكون لصاحبها قفيز من دقيقها ويستأجر انساناً ليطحن له الحنطة بنصف دقيقها وما أشبه ذلك فذلك فاسد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۸۶

﴿مزدور کو اس کے عمل سے حاصل ہونے والی چیز اجرت میں دینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام درپیش مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے مونگ پھلی توڑنے کیلئے کسی کو اپنی کھیت دیدی کہ حاصل ہونے والی فصل میرے اور آپ کے درمیان مشترک ہے یعنی آدھی فصل آپ کی ہوگی اور آدھی میری ہوگی۔ یہ معاملہ کرنا کیسا ہے؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔　　　　مستفتی: مولانا عنایت اللہ صاحب

﴿جواب﴾ اس معاملہ کے بارے میں اصل حکم تو عدم جواز کا ہے اس لئے کہ مزدور کو اس کی محنت سے حاصل ہونے والی چیز بطور اجرت دینا طے ہوا، اس کے علاوہ مونگ پھلی معلوم نہیں کہ کتنا نکلے گا، لیکن جہاں اس طرح کا معاملہ عام رائج ہو اور لوگوں میں ناراضگی، جھگڑے وغیرہ کی نوبت نہیں آتی ہو تو عرف کی وجہ سے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ اسی کھیت سے حاصل ہونے والی مونگ پھلی اجرت میں طے نہ کریں، بلکہ ایک خاص مقدار کی مطلق مونگ پھلی مثلاً "من"، "دس من" طے کریں بعد میں خواہ اسی کھیت کی مونگ پھلی سے اجرت دیدیں۔

لما فی تنویر مع الدر: ۵۶/۶ (طبع ایچ ایم سعید)

ولو دفع غزلا لآخر لينسجه له بنصفه أي بنصف الغزل أو استاجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه اوثوراً ليطحن بره ببعض دقيقه فسدت في الكل لانه استاجره بجزء من عمله والاصل في ذلك نهيه النبي ﷺ عن قفيز الطحان وقدمناه في بيع الوفاء. والحيلة ان يفرز الاجر اولا اويسمى قفيزا بلا تعيين ثم يعطيه قفيزا منه فيجوز.

ولما فی الهدایة: (۳/۳۰۸، طبع رحمانیه، لاهور)

ومن دفع الى حائك غزلا لينسجه بالنصف فله اجر مثله وكذا اذا استاجر حمارا ليحمل عليه طعاما بقفيز منه فالاجارة فاسد لانه جعل الاجر بعض مايخرج من عمله فيصير في معنى قفيز الطحان وقد نهى النبي ﷺ عنه وهو ان يستاجر ثوراً ليطحن له حنطة بقفيز من دقيقه وهو المعنى فيه ان المستاجر عاجز عن تسليمه الاجر وهو بعض

المنسوج او المجهول او حصوله بعمل الاجير فلا يعد قادرا بقدرة غيره.
ولما في فتح القدير: (۱۰۹/۹ طبع رشیدیہ، کوئٹہ)
ومن دفع الى حائك غزلا لينسجه بالنصف فالاجارة فاسدة وكذالك اذا استاجر حمارا ليحمل طعامه له بقفيز منه لانه في معنى قفيز الطحان في جعل الاجرة ببعض مايخرج من عمله وقد نهى النبي ﷺ عن قفيز الطحان.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۹۵

﴿ڈیوٹی کے اوقات میں اضافی کام پر اضافی تنخواہ کا مطالبہ درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک پرائیویٹ ادارے میں بحیثیت اکاؤنٹینٹ کام کرتا ہوں، میرے اور کمپنی کے درمیان معاہدہ ہوا تھا (جسکی کاپی سوال کیساتھ منسلک ہے) جسکا خلاصہ یہ ہے کہ میں ادارے میں صبح ۹:۳۰ سے شام ۶:۳۰ تک کام کروں گا اور اس وقت میں میں کمپنی کا اکاؤنٹ بناؤں گا جسکے عوض کمپنی مجھے ابتدائی تین ماہ ۱۲۵۰۰/ اور اس کے بعد ۱۴۰۰۰/ ماہانہ تنخواہ دے گی، کچھ عرصہ بعد ایک اور ادارے کا اکاؤنٹ بنانے کی ذمہ داری بھی مجھے سونپ دی گئی جس سے میرا کام دوگنا ہوگیا۔

چنانچہ جب میں نے مالک سے اس اضافی کام کے عوض مزید تنخواہ کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا کہ آپ اضافی تنخواہ کے حق دار نہیں کیونکہ آپ مقررہ وقت میں کام کرتے ہیں۔ برائے مہربانی شریعت کی رو سے بتلائیں کہ کمپنی کے مالک کی بات درست ہے یا کہ میرا مطالبہ؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ مزید تنخواہ کا مطالبہ کرنے کے شرعاً مستحق نہیں کیونکہ منسلک عہد نامہ میں شق (۱) اور (۵) کے مطابق آپ اجیر خاص کی حیثیت رکھتے ہیں اور اجیر خاص کا حکم یہ ہے کہ اسکو مالک کی طرف سے ایک مقررہ وقت تک کام کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور اس وقت یا مدت میں مالک اس کو جتنا کام کرنے کو کہے تو حسب استطاعت اس کے لئے وہ کام کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ہاں اگر مالک آپ کو (out of time) مقررہ وقت کے بعد بھی کام کرنے کو کہے تو اس اضافی وقت کے بقدر تنخواہ کا مطالبہ کرنے کے آپ شرعاً حق دار ہیں۔

لما في التنوير مع الدر:(۹/۱۲-۹۵،طبع امدادیه)

(والثاني)وهو الاجير(الخاص)ويسمى اجير واحد(وهو من يعمل لواحد عملاً مؤقتاً بالتخصيص ويستحق الاجر بتسليم نفسه في المدة وان لم يعمل كمن استؤجر شهراًللخدمة أو)شهراً(للرعي الغنم)المسمى باجر مسمى.

ولما في الشامي:(۹/۹۶،طبع امدادیه)

فرع:ارادرب الغنم ان يزيدفيها مايطيق الراعي له ذلك لوخاصاً،لانه في حق الرعي بمنزلة العبد،وله ان يكلف عبده من الرعي مايطيق.تاترخانية.

الجواب صحيح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:ابوخزیمہ محمد کفایت اللہ

۶ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ　　　فتوی نمبر:۲۲۴۰

﴿اپنی مزدوری دوسرے شخص کو بیچنا شرعاً کیسا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے ماتحت دس آدمی مزدوری کرتے ہیں،ان میں سے ایک اپنی ملازمت (مزدوری) دوسرے شخص کو بیچ دیتا ہے اور اس سے اس کے بدلے قیمت وصول کرتا ہے اور مالک کو بتاتا ہے کہ میں نے اپنا کام چھوڑ دیا ہے،میری جگہ پر یہ میرا بھائی کام کریگا حالانکہ وہ اس کا بھائی نہیں ہوتا بلکہ اس کو پہلے والے شخص نے اپنی ملازمت بیچ دی ہوئی ہوتی ہے اور اس سے پیسے وصول کر چکا ہوتا ہے،کیا شریعت کی روشنی میں ایسا معاملہ جائز ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ شریعتِ مطہرہ کی رو سے جائز ہے یعنی کسی معلوم عوض کے بدلے اپنے حق کو کسی دوسرے کے لئے فارغ کردینا درست ہے۔

لما في شرح المجلة:(۲/۱۲۰،طبع رشيديه)

وان كان ذلك الحق قدثبت لصاحب الحق اصالة لاعلى وجه رفع الضرر كالوظيفة في وقف من امامة وخطابة واذان وفراشة وبوابة فان صاحبها قدثبت له وهذاالحق بتقرير القاضي على وجه الاصالة لالأجل رفع ضرر عن صاحبه فينبغي أن يصح الاعتياض عن تلك الوظيفة بمال ياخذه الفارغ،وهو صاحب الوظيفة بمال من المفروغ له لأنه صلح عن حق الحاقاله بالاعتياض عن القصاص بمال.

أقول وعلى ماذكروه من جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة بمال ينبغي أن يجوز الاعتياض عن حق التعلي وعن حق الشرب وعن حق المسيل بمال،لأن هذه الحقوق لم تثبت لأصحابها لأجل دفع الضرر عنهم،بل تثبت لهم ابتداء بحق شرعي.

ولما فی الدر المختار:(۴/ ۵۱۸-۵۱۹،طبع سعید)

وفی الاشباہ:ولا یجوز الاعتیاض عن الحقوق المجردۃ کحق الشفعۃ وعلیٰ هذا لا یجوز الاعتیاض عن الوظائف بالأوقاف وفیها فی آخر بحث تعارض العرف مع اللغۃ المذهب عدم اعتبار العرف الخاص لکن افتی کثیر باعتبارہ و علیه فیفتی بجواز النزول عن الوظائف بمال.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم:محمد شریف حسین عفا اللہ عنہ

۲۵ رجب ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۵۷۲

﴿ریڈیو کی مرمت پر اجرت لینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ریڈیو خراب ہونے کی صورت میں اس کی مرمت کرنا اور اس پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی:مراد خان

﴿جواب﴾ اگرچہ ریڈیو میں ہر قسم کے پروگرام ہوتے ہیں جس میں جائز و ناجائز پروگرام شامل ہیں تاہم اس کو اصلاحی، معلوماتی اور تربیتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، اس لئے اس کی مرمت کرنا اور اس پر اجرت لینا جائز ہے لیکن اگر کسی کے بارے میں یہ یقین ہو کہ یہ اس کو صرف لہو لعب کے لئے استعمال کرے گا تو اس وقت اس کو بنانا اور اس پر اجرت لینا مناسب نہیں ہوگا، ایسی صورت میں معذرت کرنی چاہیے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۹/ ۷۵،طبع امدادیه)

(لا تصح الاجارۃ لعسب التیس) وهو نزوہ علی الاناث (و) لا (لاجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی ولو أخذ بلا شرط یباح.هکذا فی فتاویٰ حقانیة:(۲/ ۲۵۶،طبع حقانیه اکوڑہ خٹک) وفتاویٰ محمودیة:(۱۱/ ۳۲۳،طبع جمیعت پبلیکیشنز)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم:صلاح الدین چترالی

۲۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۴۹۵

﴿جہاں عام رائج ہو تو شریک کو اجیر بنانے کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ دو آدمیوں نے ایک گاڑی خرید لی بحیثیت شراکت کے، کہ اس کے نفع ونقصان میں ہم دونوں برابر کے شریک ہونگے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک اسی گاڑی کا ڈرائیور بھی ہے تو کیا یہ

ادا ہوگا، (جو کہ اس کاروبار میں شریک بھی ہے) اور جو منافع سے خالص ہوا وہ الگ سے ادا ہوگا تو کیا یہ معاملہ جائز ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی تحقیق فرمائیں۔ جزاکم اللہ اجمعین۔

﴿جواب﴾ مذکورہ بالا صورت میں شریک کو اجیر بنایا گیا ہے اور شریک کو شریک کاروبار میں اجیر کی حیثیت دینے کو فقہاء کرام نے "قفیز الطحان" کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے منع کیا ہے۔ لیکن جہاں یہ نام رائج ہوا اور عرف بن چکا ہو تو وہاں یہ ممانعت باقی نہیں رہتی لہٰذا اجیر اگرچہ شریک ہے اس کیلئے ذاتی محنت کا معاوضہ الگ تنخواہ کی صورت میں مقرر کرنا جائز ہے کیونکہ آج کل یہ نام رائج ہے۔ البتہ کاروبار میں خدانخواستہ اگر نقصان ہوا تو سرمایہ کے حساب سے ہر ایک شریک کو نقصان برداشت کرنا ہوگا۔

لما فی در المختار:(۶/۵۱)

ولو استاجره ليحمل له نصف هذا الطعام بنصفه الاخر لا اجر له اصلاً لصيرورته شريكاً.

ولما فی الشامی:(۶/۵۱،۵۰)

قال ابن عابدين رحمه الله :قال في التبيين ومشائخ بلخ والنسفي يجيزون حمل الطعام ببعض المحمول ونسج الثوب ببعض المنسوج لتعامل اهل بلادهم بذلك ومن لم يجوزه قاسه على قفيز الطحان والقياس يترك بالتعارف ولئن قلنا انه ليس بطريق القياس بل النص يتناوله دلالة فالنص يخص بالتعارف الا ترى ان الاستصناع ترك القياس فيه وخص من القواعد الشرعية بالتعامل ومشائخنا رحمهم الله لم يجوزوا هذا التخصيص لان ذلك تعامل اهل بلدة واحدة لا يخص الاثر بخلاف الاستصناع فان التعامل به جرى في كل البلاد، وبمثله يترك القياس ويخص الاثر.

ولما فی رسائل ابن عابدین رحمہ اللہ :(۲/۱۲۵ مکتبہ عثمانیہ)

وقال الشامي رحمه الله في رسالته" نشر العرف في بناء بعض الاحكام على العرف" (الباب الثاني) فيما اذا خالف العرف ما هو ظاهر الرواية فنقول اعلم ان المسائل الفقهية اما ان تكون ثابتة بصريح النص وهي الفصل الاول واما ان تكون ثابتة بضرب اجتهاد ورأى وكثير منها مايبنيه المجتهد على ما كان في عرف زمانه بحيث لو كان في زمان العرف الحادث لقال بخلاف ما قاله اولا ولهذا قالوا في شروط الاجتهاد انه لابد فيه من معرفة عادات الناس فكثير من الاحكام تختلف باختلاف الزمان لتغير عرف اهله ولحدوث ضرورة او فساد اهل الزمان بحيث لو بقى الحكم على ما كان عليه اولا للزم منه المشقة والضرر بالناس.

وایضاً فی رسائل ابن عابدین رحمہ اللہ:(۲/۱۲۱،۱۲۲)

(فان قلت)اذا كان على المفتي اتباع العرف وان خالف المنصوص عليه في كتب

ظاهر الرواية فهل هنا فرق بين العرف العام والعرف الخاص كما في القسم الاول وهو ماخالف فيه العرف النص الشرعي (قلت)لا فرق بينهما هنا الا من جهة ان العرف العام يثبت به الحكم العام والعرف الخاص يثبت به الحكم الخاص .

وايضاًفي رسائل ابن عابدين:(۲/۱۳۲)

(فهذه)النقول ونحوها دالةعلى اعتبار عرف الخاص وان خالف المنصوص عليه في كتب المذهب ما لم يخالف النص الشرعي (الى قوله)اقول وبماقررناه تبين لک ان ماتقدم عن الاشباه من ان المذهب عدم اعتبار العرف الخاص انما هوفيمااذا عارض النص الشرعي فلا يترك به القياس ولا يخص به الاثر ... واما العرف الخاص اذا عارض النص المذهبي المنقول عن صاحب المذهب فهو معتبر كما مشى عليه اصحاب المتون والشروح والفتاوى۔

ولمافي الفتاوى الخانية:(۲/۳۲۰)

ولو دفع غزلا الى حائک لينسج له بالثلث او بالربع ذكر في الكتاب انه لا يجوز ومشائخ بلخ رحمهم الله جوزوا ذلک لمكان التعامل وبه اخذ الفقيه ابو الليث وشمس الائمة الحلواني والقاضي الامام ابوعلي النسفي رحمهم الله.

ولما في الشامي:(۴/۳۱۲)

(والربح على ما شرطا)من كونه بقدرراس المال اولا ـــ وقيد بالربح لان الوضيعة على قدرالمال وان شرطا غيرذلک۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد جاوید افغانی غفرلہ ولوالدیہ

۲۷ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۲۸

﴿اجیر خاص کا اپنی جگہ مستاجر کو مقرر کرنا﴾

﴿سوال﴾ زید سرکاری ملازم تھا اس نے حکومت کو بتائے بغیر عمرو کو اپنی جگہ رکھ لیا ہے، اب زید کی جگہ عمرو ملازمت کر رہا ہے اور تنخواہ بھی عمرو ہی کو ملتی ہے، ایسا کرنا کیسا ہے؟ جبکہ عمرو میں اس ملازمت کی صلاحیت بنسبت زید کے زیادہ ہے اگر ایسا کرنا گناہ ہے تو عمرو نے جواب تک ایکی ملازمت کی ہے اور تنخواہ لی ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ اجیر خاص اگر اپنی جگہ اپنے سے زیادہ باصلاحیت شخص سے کام کروائے تو یہ جائز ہے لیکن حکومت کو بتائے بغیر ایسا کرنا خلاف قانون ہونے کی وجہ سے اچھا نہیں ہے، تاہم اگر عمرو میں سپرد کی گئی ذمہ داری کی صلاحیت واقعی موجود ہے تو اس کے لئے تنخواہ جائز ہے ورنہ

نہیں اور اگر کوئی نقصان وغیرہ ہو گیا تو حکومت کی طرف سے پوچھ زید سے ہوگی۔

لما فی فتح القدیر:(۹/۷۸،طبع رشیدیه)

(واذا شرط علی الصانع أن یعمل بنفسه لیس له أن یستعمل غیره)لان المعقود علیه العمل فی محل بعینه فیستحق عینه کالمنفعة فی محل بعینه.واعترض علی هذا فی العنایة حیث قال:وفیه تأمل لأنه ان خالفه الی خیر بان استعمل من هو أصنع منه فی ذلک الفن أو سلم دابة اقوی من ذلک کان ینبغی أن یجوز.

ولما فی الهدایة:(۳/۲۹۹،طبع رحمانیه)

وان اطلق له العمل فله ان یستاجر من یعمله لان المستحق عمل فی ذمته ویمکن ایفاء بنفسه وبالاستعانة بغیره بمنزلة ایفاء الدین.

ولما فی الشامی:(۹/۱۷،طبع امدادیه)فان أمره بعمل فعمل غیره ضمن ماتولدمنه تاترخانیة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم:عبدالوہاب عفا اللہ عنہ

۲۵ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۶۸

﴿گندم وغیرہ پسوانے کی اجرت﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقہ میں جب کوئی شخص گندم یا مکئی وغیرہ پسوانے کیلئے پن چکی پر لاتا ہے تو پن چکی کا مالک اس پسوانے والے سے کچھ غلہ اجرت کے طور پر پہلے ہی لے لیتا ہے یعنی اس غلہ کو پسنے سے پہلے اس سے کچھ لے لیتا ہے کیا یہ جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ جائز ہے۔

لما فی الدر المختار:(۹/۷۱،طبع امدادیه ملتان)

والحیلة أن یفرز الأجر اولاً،أو یسمی قفیزا بلاتعیین ثم یعطیه قفیزا منه فیجوز.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم:عبدالوہاب عفا اللہ عنہ

۲۶ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۷۱

﴿جعلی سند لے کر ملازمت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ اگر کوئی سرکاری سروس کے حصول کیلئے کسی مدرسے کی جعلی سند حاصل کرے اور اسی سند سے اس کو سروس بھی مل جائے، سروس ملنے کے بعد وہ اپنی ڈیوٹی بخوبی سرانجام دیتا ہو تو اس ڈیوٹی پر جو تنخواہ اسکو ملتی ہے اس کا کیا حکم ہے؟ اگر ناجائز ہے تو اب تک جتنی تنخواہیں لی ہیں اسکا کیا کرے؟

﴿جواب﴾ سند کی حیثیت دراصل اس بات کی شہادت ہے کہ حامل سند میں فلاں کام کی

صلاحیت واہلیت موجود ہے اور اس کو غلط طریقہ سے حاصل کرنا کوئی اچھا عمل نہیں ہے لیکن اگر کسی میں سپرد کی گئی ذمہ داری کی صلاحیت واہلیت واقعی بخوبی موجود ہے تو تنخواہ لینا جائز ہے۔

لما فی الصحیح لمسلم:(۳۲۵/۲ طبع قدیمی)

عن عبدالله رضی الله تعالیٰ عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الصدق یهدی الی البر وان البر یهدی الی الجنة وان الرجل لیصدق حتی یکتب عند الله صدیقا وان الکذب یهدی الی الفجور وان الفجور یهدی الی النار وان الرجل لیکذب حتی یکتب عندالله کذاباً.

ولما فی البحر الرائق:(۳/۸ طبع سعید)

وأما رکنها فهو الایجاب والقبول والارتباط بینهما أما شرط جوازها فثلاثة اشیاء أجر معلوم وعین معلوم وبدل معلوم ومحاسنها رفع الحاجة بقلیل المنفعة واما حکمها فوقوع الملک فی البدلین ساعة فساعة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبدالوہاب عفا اللہ عنہ

۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۶۲

﴿گھریلو ضرورت کیلئے عیسائی عورت کو ملازمہ رکھنا﴾

﴿سوال﴾ عیسائی ملازمہ کو گھر میں صفائی، کپڑے دھونے، استری وغیرہ کرنے کیلئے رکھنا کیسا ہے؟ نیز ہم اس سے برتن دھلوا سکتے ہیں یا چائے بنوا سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ غیر مسلموں کو خدمت کیلئے ملازم کے طور پر رکھنا اور ان سے گھر کا کام کاج لینا جائز ہے، ان سے کھانا پکوانا برتن دھلوانا بھی جائز ہے بشرطیکہ پاکی وناپاکی کا خیال رکھتے ہوں اور غریب گھرانے کی کوئی مسلمان خاتون اگر ملے تو وہ زیادہ بہتر ہے اس نیت سے کہ کسی مسلمان کو روزگار مہیا کر دینا ثواب ہے جب کہ اس سے آپ کی ضرورت بھی پوری ہوگی۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة المائدة،آیت ۵)

﴿الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لهم﴾

ولما فی اعلاء السنن:(ج ۱۶ ص ۲۲۲،طبع بیروت)

واما استئجار المشرکین والکفار فقد صح انه ﷺ عامل یهود خیبر واستاجر عند الهجرة رجلا من بنی الدیل هادیا خریتا وهو علی دین کفار قریش ... قال ابن بطال عامة الفقهاء یجیزون استئجارهم عند الضرورة وغیرها لما فی ذلک من المذلة لهم.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۲۲/۱ طبع سعید)

(فسور آدمی مطلقا) ولو جنبا او کافرا او امرأة، نعم یکره سورها للرجل کعکسه

للاستلذاذ واستعمال ربق الغير.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرہ اللہ

۱۶ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر: ۱۰۰۱

﴿غیر مسلم کیلئے کرایہ پر کام کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں ہندو بہت زیادہ ہیں جب کوئی ہندو مرتا ہے تو اپنے مذہب کے مطابق اسکو جلادیا جاتا ہے تو کیا کسی مسلمان کیلئے یہ جائز ہے کہ ان کیلئے کرایہ پر لکڑیاں لیکر آئے؟ مستفتی: نوشیروان

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں مسلمان کیلئے یہ عمل جائز تو ہے لیکن بہتر یہ ہیکہ اس سے بچا جائے اور کسی دوسرے طریقے سے اپنے معاش کا انتظام کرے۔

لما فی الهندیة:(۴/۴۵۰،طبع رشیدیه)

وسئل ابراهيم بن يوسفؒ عمن آجر نفسه من النصارى ليضرب لهم الناقوس كل يوم بخمسة ويعطى كل يوم خمسة دراهم في ذلك العمل وفي عمل آخر درهمان قال لايواجر نفسه منهم ويطلب الرزق من طريق آخر.

ولما فی خلاصة الفتاوى:(۴/۱۲۹،طبع رشیدیه)

ولو آجر نفسه ليعمل له الخمر يكره لان التصرف في الخمر حرام قال هكذا اطلق لكن هذا قولهما اما على قول ابى حنيفةؒ لايكره.

ولما فی الشامی:(۶/۳۹۱-۳۹۲،طبع سعید)

(قوله وحمل خمر ذمى)قال الزيلعى:وهذا عنده وقالا هومكروه "لانه عليه الصلوة والسلام لعن فى الخمر عشرة وعدمنها حاملها" وله ان الاجارة على الحمل وهو ليس بمعصية ولا سبب لها وانما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار وليس الشرب من ضرورات الحمل.....قال الزيلعىؒ وعلى هذا الخلاف لو آجره دابة لينقل عليها الخمر او آجره نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الاجر عنده وعندهما يكره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز

۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر: ۹۲۰

﴿اجیر عام کی لاپرواہی کی وجہ سے تاوان لینا درست ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے موچی کو موزہ سلوانے کے لئے دیا اور وہ موزہ اس سے دکان کے سامان میں خلط ملط ہو کر گم ہو گیا، عرض یہ ہے

کہ میں موچی سے اس کی قیمت لے سکتا ہوں یا نہیں؟ مستفتی: سعد صاحب

﴿جواب﴾ موچی، درزی، دھوبی وغیرہ کو فقہاء کرام کی اصطلاح میں اجیر عام کہا جاتا ہے، اجیر عام کے پاس اگر کوئی چیز اس کی لاپرواہی سے ضائع ہوتی ہے تو اس کے ذمہ تاوان ادا کرنا لازم ہے، لہذا آپ موچی سے اپنے موزے کی قیمت وصول کر سکتے ہو۔

لمافی الهندية:(۵۰۰/۴،طبع رشيديه)

وحكم الاجير المشترك أن ماهلك فى يده من غير صنعه فلاضمان عليه فى قول أبى حنيفة رحمه الله وهوقول زفروالحسن وأنه قياس سواء هلك بأمريمكن التحرز عنه كالسرقة والغصب أوبأمر لايمكن التحرز كالحرق الغالب والغارة الغالبة والمكابرة وقال أبويوسف ومحمدرحمهماالله ان هلك بأمريمكن التحرزعنه فهوضامن وان هلك بأمرلايمكن التحرزفلاضمان كذافى المحيط.....وبقولهمايفتى اليوم لتغير أحوال الناس وبه يحصل صيانة أموالهم كذافى التبيين.

ولمافى الشامى:(۶۵/۶،طبع سعيد)

(قوله ولايضمن الخ)اعلم أن الهلاك امابفعل الأجيرأولا والاول امابالتعدى أولا.والثانى اماأن يمكن الاحترازعنه أولا،ففى الاول بقسميه يضمن اتفاقا.وفى ثانى الثانى لايضمن اتفاقاوفى أوله لايضمن عندالامام مطلقاويضمن عندهمامطلقا ....

وفى التبيين:وبقولهمايفتى لتغيرأحوال الناس،وبه يحصل صيانة أموالهم اه.لانه اذاعلم أنه لايضمن ربمايدعى أنه سرق أوضاع من يده.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبداللہ عفا اللہ عنہ

۳ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۳۹

﴿غیر مسلم کو کام کیلئے رکھنے اور اسے زکوۃ دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا کسی غیر مسلم کو گھر میں کام کاج کیلئے رکھنا جائز ہے؟ نیز کیا غیر مسلم کو زکوۃ دے سکتے ہیں؟ مستفتی: اویس دہلی کالونی

﴿جواب﴾ بہتر یہ ہے کہ گھر میں کام کاج کیلئے کسی مسلمان کو رکھا جائے، البتہ غیر مسلم کو بوجہ ضرورت گھر میں کام کیلئے رکھنے کی گنجائش ہے۔

لمافی اعلاء السنن من فتح الباری:(۳۶۲/۵،طبع بیروت)(ج۱۶ص ۲۴۲،طبع بیروت)

واما استئجار المشركين والكفار فقدصح انه ﷺ عامل يهودخيبر،واستاجر عندالهجرة رجلامن بنى الديل هاديا خريتا وهوعلى دين كفار قريش......

وقال في بعض عامة الفقهاء يجوزون استئجارهم عند الضرورة وغيرها لما في ذلك من تحقيرهم وانما لا يستقيم ان يواجر المسلم نفسه من المشرك لما فيه من اذلال المسلم اه.

غیر مسلم کو زکوۃ نہیں دے سکتے البتہ خیرات وغیرہ دے سکتے ہیں۔

لما في الهداية: (۱/۲۰۲ طبع ایچ ایم سعید)

ولا يجوز ان يدفع الزكوة الى ذمي لقوله عليه السلام لمعاذ خذها من اغنيائهم وردها في فقرائهم ويدفع اليه ماسوى ذلك من الصدقة.

وفي التنوير مع الدر: (۲/۳۵۱ طبع ایچ ایم سعید)

ولا تدفع (الى ذمي) لحديث معاذ (وجاز) دفع (غيرها وغير العشر) والخراج (اليه) اى الذمي ولو واجباً كنذر وكفارة وفطرة خلافاً للثاني.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد حسین

۲ ذی القعدہ ۱۴۲۹ھ | فتوی نمبر: ۸۴۰

﴿حجام، بڑھئی، لوہار وغیرہ کیلئے غلہ میں سے سالانہ اجرت مقرر کرنا﴾

﴿سوال﴾ حضرت مفتی صاحب! ہمارے ہاں قاعدہ ہے کہ حجام، بڑھئی، لوہار موچی وغیرہ کیلئے غلہ کی ایک خاص مقدار مقرر کردیتے ہیں مثلاً دو تین من سالانہ اوراس کے عوض میں سال بھر میں جتنی دفعہ کام کی ضرورت پڑتی ہے لیتے ہیں خواہ وہ غلہ اس کے کام کی اجرت سے زیادہ ہو یا کم کیا وہ خوشی سے اس پر راضی ہے۔ مستفتی: محمد یوسف

﴿جواب﴾ اس صورت میں عمل کی تفصیل چونکہ معلوم نہیں ہوتی جس سے نزاع پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے لہذا اصل میں تو یہ اجارہ فاسدہ ہے جوکہ جائز نہیں ہے لیکن اگر کسی جگہ اس کا عرف عام ہے اوراجیر اور مستاجر معاملہ کو بوقت عقد اچھی طرح سے سمجھ لیتے ہیں اور یہ جہالت (مفضی الی النزاع) بھی نہیں ہوتی تو وہاں اس معاملہ کو جائز کہا جائے گا۔

لما في الهندية: (۴/۴۱۱ طبع رشیدیہ)

ومنها ان يكون المعقود عليه وهو المنفعة معلوما علما يمنع المنازعة فان كان مجهولا جهالة مفضية الى المنازعة يمنع صحة العقد والا فلا.

ولما في التنوير مع الدر: (۶/۴۶-۴۷ طبع سعید) (بفسدها) كجهالة ماجور أو اجرة أو مدة أو عمل.

ولما في شرح العقود (ص ۱۱/۴۹ طبع نعمانیہ) والعرف في الشرع له اعتبار لذا عليه الحكم قد يدار.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عبدالستار

۳ رجب ۱۴۲۸ھ | فتوی نمبر: ۱۰۵۳

﴿ڈیوٹی کے دوران دوسرے کام کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں ایک سکول ٹیچر ہوں، صبح کی شفٹ میں گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتا ہوں، شام کی شفٹ میں پرائیوٹ اسکول میں پڑھاتا ہوں، صبح کی شفٹ کا ٹائم ۷:۴۰ سے ۱۲:۲۰ ہے لیکن چھٹی کبھی ۱۲:۱۰ کبھی ۱۲:۵ کبھی ۱۲:۲۰ تک ہوجاتی ہیں، مجھے دوسرے سکول جانے کیلئے ۱۲:۰۰ بجے جانا پڑتا ہے، اس لئے میں نے ہیڈ ماسٹر سے بات کی، نہ تو کوئی دباؤ ڈالا اور نہ کوئی لالچ دی، اس نے مجھے ۱۵، ۲۰ منٹ پہلے جانے کی اجازت دیدی پھر ٹائم ٹیبل ایسا بنایا کہ میرے پیریڈ ۱۲ بجے تک پورے ہوجاتے ہیں یعنی پڑھانے کی ذمہ داری پوری ہوجاتی ہے لیکن ڈیوٹی کے اعتبار سے ۱۵، ۲۰ منٹ جلدی چلا جاتا ہوں، قرآن اور حدیث میں اسکی کیا حیثیت ہے؟ ۱۵، ۲۰ منٹ جلدی جانے سے کیا تنخواہ ناجائز ہوجاتی ہے یا ہیڈ ماسٹر کی اجازت سے جائز ہوجاتی ہے؟ شریعت کے مطابق بتائیں کہ ۱۵، ۲۰ منٹ پہلے اجازت سے جانا جائز ہے یا نوکری چھوڑنا بہتر ہے؟ مستفتی: علی مراد سونگی کورنگی

﴿جواب﴾ حکومت کی ملازمت میں عرفاً وقت اور کام دونوں کا معاہدہ ہوتا ہے اور حکومت جو تنخواہ آپکو دے رہی ہے وہ صرف وقت کی نہیں بلکہ طے شدہ وقت سکول میں گزارنے کا بھی معاوضہ ہے اور ہیڈ ماسٹر کو اتنا اختیار نہیں کہ وہ روزانہ کسی کو وقت سے پہلے جانے کی اجازت دیدے، لہذا آپ کیلئے روزانہ وقت مقررہ سے پہلے جانا جائز نہیں اور اگر آپ روزانہ وقت سے پہلے جائیں گے تو اسی قدر تنخواہ شرعاً متاثر ہوگی یعنی آپ کیلئے حلال وطیب نہ ہوگی، کوتاہی کے بقدر تنخواہ کی رقم محکمہ کو واپس کرنا ضروری ہوگا۔

لما فی الدر مع الرد: (۶/۷۰، طبع ایچ ایم سعید)

وليس للخاص ان يعمل لغيره، ولو عمل نقص من اجرته بقدر ما عمل فتاوى النوازل. وفى الشامية: بل ولا ان يصلى النافلة قال فى التاتارخانية: وفى فتاوى الفضلى واذا استاجر رجلا يوما يعمل كذا فعليه ان يعمل ذلك العمل الى تمام المدة ولا يشتغل بشىء آخر سوى المكتوبة وفى فتاوى سمرقند: وقد قال بعض مشائخنا له ان يؤدى السنة ايضا واتفقوا انه لا يؤدى نفلا وعليه الفتوى.

ولما فى الهداية: (۳/۲۱۲، طبع رحمانيه)

والاجير الخاص الذى يستحق الاجرة بتسليم نفسه فى المدة وان لم يعمل وانما سمى اجير وحد لانه

لا یمکنہ ان یعمل لغیرہ لان منافعہ فی المدۃ صارت مستحقۃ لہ والاجر مقابل بالمنافع

ولما فی البحر الرائق:(۸/ ۲۹-۳۰ طبع سعید)

(والخاص یستحق الاجر بتسلیم نفسہ فی المدۃ وان لم یعمل کمن استوجر شہرا للخدمۃ اولرعی الغنم) یعنی الاجیر الخاص یستحق الاجر بتسلیم نفسہ فی المدۃ عمل اولم یعمل۔۔۔وسمی الاجیر خاصا ووحدہ لانہ یختص بالواحد ولیس لہ ان یعمل لغیرہ ولان منافعہ صارت مستحقۃ للغیر والاجر مقابل بہا فیستحقہ مالم یمنع مانع من العمل کالمرض والمطر ونحو ذلک مما یمنع التمکن ---قال فی المحیط ولو اجر نفسہ من غیرہ وعمل للاول والثانی استحق الاجر کاملا علی کل واحد منہما ولا یتصدق بشیء وہاثم۔

واللہ اعلم بالصواب: سعید احمد　　　　الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۶۳۸　　　　۱۷ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ

﴿رنگساز پر ضمان کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص رنگساز کو کپڑا رنگنے کیلئے دیتا ہے جسکی قیمت پچاس روپے فی میٹر ہے، رنگ کرنے کے بعد کپڑے کی قیمت تقریبا اسی روپے فی میٹر ہوجاتی ہے لیکن مشین کی خرابی کی وجہ سے صحیح رنگ نہیں ہو پاتا بلکہ کمزور رنگ کی وجہ سے یہ کپڑا اپنی اصلی قیمت یعنی پچاس روپے فی میٹر بھی فروخت نہیں ہوسکتا، کپڑوں کا مالک کپڑا واپس لینے کیساتھ پندرہ روپے فی میٹر کے حساب سے نقصان کا مطالبہ کرتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اسکا مطالبہ کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اور رنگ ساز کے ذمہ اس رقم کا ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

مستفتی: محمد فیصل صاحب ڈیفنس کراچی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں رنگساز کی ناقص کارکردگی کیوجہ سے واقعی کپڑے کی مارکیٹ ویلیو اپنی اصلی قیمت یعنی پچاس روپے سے بھی کم ہوگئی ہو تو ایسی صورت میں کپڑے کا مالک کپڑے کی اصل قیمت یعنی پچاس روپے فی میٹر کے حساب سے رنگساز سے وصول کرے اور کپڑا رنگ ساز کو دیدے ایسی صورت میں رنگساز کو کپڑے کا مالک قرار دیا جائے گا۔

اور کپڑے کے مالک کو اگر یہ منظور نہ ہو یعنی کپڑا خود رکھنا چاہتا ہو تو رنگ ساز کو اس ناقص رنگائی کی اجرت دیدے یعنی مارکیٹ میں ایسی رنگائی کی جو اجرت ہوتی ہے وہی دینا ضروری ہے، کپڑے کی اصل قیمت کے تعین پر اتفاق نہ ہو یا اس ناقص رنگ کی اجرت کا تعین مشکل ہو تو

اس شعبہ سے تعلق رکھنے والے دو تجربہ کار، دیانتدار آدمی جو متعین کریں شرعاً وہی معتبر ہے اور آسان حل یہی ہے کہ مذکورہ صفات کے دو آدمیوں پر اتفاق کرلیں پھر وہ جو بھی فیصلہ کریں فریقین کو قبول کرلینا چاہیے۔

لمافی مجمع الضمانات:(ص۸۵،طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

دفع ثوبه ليصبغه من عنده فصبغه به الاأنه خالف فى صبغه ماأمره به بأن اشبع او قصر فى الاشباع حتى تعيب فمالكه بالخيار ان شاء ترك الثوب وضمنه قيمة ثوبه ابيض اواخذه بأجر مثله لايجاوز ماسمى من الفصولين.

ولمافی الشامی:(۸۱/۶،طبع امدادیه)

قوله:(ولايضمن الخ)اعلم أن الهلاك امابفعل الاجيراولا،والاول امابالتعدى اولا. والثانى اماأن يمكن الاحترازعنه اولا.ففى الاول بقسميه يضمن اتفاقا،وفى ثانى الثانى لايضمن اتفاقا،وفى اوله لايضمن عندالامام مطلقا،ويضمن عندهما مطلقا، و أفتى المتاخرون بالصلح على نصف القيمةمطلقا۔ فهذه اربعةاقوال كلهامصححة مفتى بها.

ولمافی البزازیة:(۶۲/۲،طبع قدیمی)

والمشترك يضمن ماجنت يده اجماعاومااتلف لابصنعه ان بامريمكن التحرزعنه يضمن عندهماالاعندالامام وبعض أخذوابقولهمالانه مذهب عمرؓ وعلیؓ وبعضهم أفتوا بالصلح عملابالقولين ومعناه عمل فى كل نصف بقول حيث حط النصف وأرجب النصف.

ولمافی الهندیة:(۴۵/۴،طبع رشیدیه)

وان صبغه ماأمره به الاأنه خالف فى الوصف بأن أمره ان يصبغه بربع قفيزعصفر فصبغه بقفيزعصفر أقربذلك رب الثوب خيررب الثوب ان شاء ترك الثوب عليه وضمنه قيمةثوبه ابيض وان شاء اخذالثوب واعطاه مازادمن العصفرمع الاجر المسمى.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری

۸محرم الحرام ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۱۸۴

﴿اسکول استاذ اپنی جگہ دوسرے آدمی کو نہیں رکھ سکتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اسکول استاذ اپنی جگہ دوسرے آدمی کو رکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر رکھ سکتا ہو تو تحریری اجازت ضروری ہے یا زبانی اجازت کافی ہے؟ بینوا توجروا

مستفتی: مولانا نصیب ولی صاحب

﴿جواب﴾ یہ سرکاری ملازم اجیر خاص ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اس کو صرف کام کی تنخواہ نہیں

ملتی بلکہ کام اور وقت میں حاضری دونوں کی تنخواہ ملتی ہے لہٰذا اس کا اپنی جگہ دوسرے آدمی کو مقرر کرنا اگر بغیر اجازت کے ہو تو غلط ہے۔

البتہ اگر وہ شخص باصلاحیت ہو اور مذکورہ کام بخوبی انجام دے سکتا ہو اور ذمہ دار افسران کی زبانی یا تحریری اجازت سے ہو تو جائز ہے۔

لمافی الکفایہ مع فتح القدیر:(۳۲/۹،طبع:رشیدیہ،کوئٹہ)

(قولہ والاجیر الخاص الذی یستحق الاجر بتسلیم نفسہ فی المدۃ وان لم یعمل) ای سلم نفسہ ولم یعمل مع التمکن اما اذا امتنع من العمل مضت المدۃ اولم یکن یتمکن من العمل مضت المدۃ لم یستحق الاجر لانہ لم یوجد تسلیم النفس۔

وایضافی فتح القدیر:(۷۸/۹،طبع:رشیدیہ،کوئٹہ)

(واذا شرط علی الصانع ان یعمل بنفسہ لیس لہ ان یستعمل غیرہ) لان المعقود علیہ العمل فی محل بعینہ حیث قال وفیہ تامل لانہ ان خالفہ الی خیر بان استعمل من ہو اصنع منہ ذلک الفن۔الخ۔۔۔۔(والثانی) ہو الاجیر (الخاص)۔۔(وہو من یعمل) واحد عملا مؤقتا بالتخصیص ویستحق الاجر بتسلیم نفسہ فی المدۃ وان لم یعمل کمن استؤجر شہر اللخدمۃ آہ۔

ولمافی الہدایہ:(۲۹۹/۳،طبع:رحمانیہ،لاہور)

واذا شرط علی الصانع ان یعمل بنفسہ فلیس لہ ان یستعمل غیرہ وان اطلق لہ العمل فلہ ان یستأجر من یعملہ لان المستحق عمل فی ذمتہ ویمکن ایفانہ بنفسہ وبالاستعانۃ بغیرہ منزلۃ ایفاء الدین۔

واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ غفرلہ ولوالدیہ

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۲۰۰۱

۱۴ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ

﴿ہیڈ ماسٹر اگر وقت مقررہ سے پہلے چھٹی دیدے تو دیگر اساتذہ بھی جاسکتے ہیں یا نہیں؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اسکول ہیڈ ماسٹر اگر بچوں کو مقررہ وقت سے پہلے چھٹی دیدے تو دیگر اساتذہ کیلئے مقررہ وقت تک ٹھہرنا ضروری ہے یا وہ بھی وقت سے پہلے جاسکتے ہیں؟ برائے مہربانی وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ ہیڈ ماسٹر اپنے اختیارات کی حد تک یعنی حکومت کی طرف سے جو اس کو حاصل ہیں اسکول بچوں کو چھٹی دے سکتا ہے اور ایسی صورت میں اساتذہ مقررہ وقت سے پہلے بھی جاسکتے ہیں، ضمناً اساتذہ کو بھی گویا ہیڈ ماسٹر نے چھٹی دیدی، کوئی خاص وجہ ہو تو ہیڈ ماسٹر کو اسکی اجازت

ہوتی ہے۔البتہ کسی خاص صوابدید کے بغیر بچوں کی چھٹی کرنے کا ہیڈ ماسٹر کو اجازت نہیں ہوتی۔ایسی صورت میں اساتذہ وقت مقررہ تک اسکول میں رہیں تاکہ ماہانہ اجرت ان کیلئے حلال ہو یا مقررہ وقت سے پہلے جانے کے ٹائم کا کم از کم اندراج کریں تاکہ ماہانہ تنخواہ سے حسب ضابطہ محکمہ کو کٹوتی کا موقع فراہم ہو ورنہ خیانت شمار ہوگی اور اس وقت کے برابر کی تنخواہ حلال نہ ہوگی۔

لمافی الدر مع الرد(٦/٦٩،طبع سعید)

(والثانی)وهوالاجير(الخاص)ويسمى اجيروحد (وهومن يعمل لواحد عملا موقتا بالتخصيص ويستحق الاجرة بتسليم نفسه فى المدة وان لم يعمل كمن استوجر شهرا للخدمة او) شهرا(لرعى الغنم)المسمى باجر مسمى(قوله بالتخصيص)خرج نحوالراعى اذاعمل لواحدعملاموقتا من غيران يشرط عليه عدم العمل لغيره (وعلى هذه الصفحة)(قوله وان لم يعمل)اى اذا تمكن من العمل ،فلوسلم نفسه ولم يتمكن منه لعذر كمطر ونحوه لااجرله.

ولمافی تبیین الحقائق(٦/١٤٣-١٤٢،طبع سعید)

قال:(والخاص يستحق الاجر بتسليم نفسه فى المدة،وان لم يعمل كمن استوجر شهرا للخدمة اولرعى الغنم)اى الاجير الخاص يستحق الاجرة بتسليم نفسه للعمل عمل اولم يعمل سمى اجيرا خاصا واجيروحد لانه يختص به الواحدوهو المستاجر وليس له ان يعمل لغيره لان منافعه فى المدة صارت مستحقة له والاجرمقابل بها فيستحقه مالم يمنعه من العمل مانع حسى كالمرض والمطر ونحوذلك مما يمنع التمكن من العمل-وكذا فى البحر(٨/٢٩-٣٠،طبع سعید)

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ

واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد دیروی
فتویٰ نمبر ۳۹۹۲

﴿سرکاری ملازم تاخیر سے آنے کی صورت میں خاص آمد کا وقت لکھے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جو کہ اسکول میں استاذ ہے اگر وہ اپنے مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے آئے یا دس منٹ تاخیر سے آئے تو وہ حاضری والی رجسٹر میں کونسا وقت درج کرے؟ جس وقت آیا ہے وہ درج کرے یا وہ جو مقررہ وقت ہے۔ برائے مہربانی جواب دیکر ممنون فرمائیں۔

مستفتی: مولانا نصیب ولی

﴿جواب﴾ مقررہ وقت مثلاً نو بجے سے پہلے آنے کی صورت میں بھی وہی نو بجے کا وقت اگر درج کر لیا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اس لئے کہ نو بجے سے پہلے کا وقت دینے پر حکومت

والے نہ کوئی انعام دیں گے اور نہ اس بارے میں آپ سے پوچھیں گے۔ البتہ تاخیر سے آنے کی صورت میں خاص آمد کا ہی وقت لکھیں ورنہ جھوٹ اور خیانت کا گناہ ہوگا۔

لمافی الدر مع الرد (۶۹/۶، طبع سعید)

(والثانی) وھو الاجیر (الخاص) ویسمی اجیر وحد (وھو من یعمل لواحد عملا مؤقتا بالتخصیص ویستحق الاجر بتسلیم نفسہ فی المدۃ وان لم یعمل کمن استوجر شھرا للخدمۃ او) شھرا (لرعی الغنم) المسمی باجر مسمی (قولہ وان لم یعمل) ای اذا تمکن من العمل، فلو سلم نفسہ ولم یتمکن منہ لعذر کمطر ونحوہ لااجر لہ کمافی المعراج عن الذخیرۃ.

ولمافی الھدایۃ (۲۱۲/۳، طبع رحمانیۃ)

قال والاجیر الخاص الذی یستحق الاجرۃ بتسلیم نفسہ فی المدۃ وان لم یعمل کمن استوجر شھرا للخدمۃ اولرعی الغنم وانما سمی اجیر وحد لانہ لایمکنہ ان یعمل لغیرہ لان منافعہ فی المدۃ صارت مستحقۃ لہ والاجر مقابل بالمنافع ولھذا یبقی الاجر مستحقا وان نقص العمل.

ولمافی شرح المجلۃ (۲۸۷/۲، طبع رشیدیۃ)

(المادۃ ۴۲۵) الاجیر الخاص یستحق الاجرۃ اذاکان فی مدۃ الاجارۃ حاضرا للعمل ولایشترط عملہ بالفعل۔ لکن لیس لہ ان یمتنع عن العمل واذاامتنع لایستحق الاجرۃ.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد دیروی

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر ۳۰۰۰

﴿سرکاری ملازم اپنی جگہ دوسرا آدمی مقرر کرسکتا ہے یا نہیں؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں. کہ ایک آدمی ٹیوب ویل پر سرکاری ملازم ہے. اور اسکی تنخواہ پچیس ہزار ہے. اس سرکاری ملازم نے اپنی جگہ دوسرے آدمی کو مقرر کیا ہے حکومت کو اطلاع دئے بغیر اور اسکو سات ہزار ماہانہ تنخواہ دیتا ہے اور خود دوسرا کام کرتا ہے. اب عرض مسئلہ یہ ہے کہ اس سرکاری ملازم کا اپنی جگہ دوسرے آدمی کو مقرر کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

مستفتی: سید جمال شاہ سوات

﴿جواب﴾ یہ سرکاری ملازم اجیر خاص ہے جسکا حکم یہ ہے کہ اسکو صرف کام کی تنخواہ نہیں ملتی بلکہ کام اور وقت میں حاضری دونوں کی تنخواہ ملتی ہے. لہذا اسکا اپنی جگہ دوسرے آدمی کو مقرر کرنا غلط ہے۔ البتہ اگر وہ آدمی باصلاحیت ہو اور مذکورہ کام بخوبی انجام دے سکتا ہوں اور حکومت بھی اس بات

کی اجازت دیتی ہو یا حکومت میں ایسا قانون موجود ہو اور وہ آدمی کم تنخواہ لینے پر راضی ہو تو جائز ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۶۹/۶'طبع سعید)

(والثانی)هو الأجير (الخاص)۔۔۔۔(وهو من يعمل لواحد عملا مؤقتا بالتخصيص نفسه ويستحق الأجرة بتسليم نفسه فی المدة وان لم يعمل كمن استؤجر شهرا للخدمة اه

ولما فی فتح القدير:(۷۸/۹'طبع رشيديه)

(واذا شرط على الصانع أن يعمل بنفسه ليس له أن يستعمل غيره)لأن المعقود عليه العمل فی محل بعينه حيث قال وفيه تأمل لأنه ان خالفه الی خير بأن استعمل من هو اصنع منه فی ذلك الفن الخ

ولما فی الهدايه:(۲۹۹/۳' طبع رحمانيه)

واذا شرط على الصانع ان يعمل بنفسه فليس له أن يستعمل غيره۔۔۔وان اطلق له العمل فله أن يستاجر من يعمله لأن المستحق عمل فی ذمته ويمكن ايفائه بنفسه وبا لاستعانة بغيره بمنزلة ايفاء الدين

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق سواتی

۶ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۴۷

﴿سرکاری ملازمین کا ایام رخصت کی تنخواہ لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱) سرکاری اسکولوں کے اساتذہ اور دیگر سرکاری ملازمین کی سالانہ تعطیلات حکومت کی طرف سے مقرر ہوتی ہیں، اسکے علاوہ کسی مجبوری مثلا بیماری یا موسم کی خرابی کی وجہ سے یہ لوگ اپنی ڈیوٹی پر نہ جائیں اور رجسٹر پر حاضری لگ جائے تو ان کے لئے پوری تنخواہ لینا حلال ہوگا یا نہیں؟

(۲) بعض اساتذہ دوسرے کو اپنی جگہ ڈیوٹی پر بھیجتے ہیں ان کا یہ عمل شریعت میں کیسا ہے؟ اور اگر دوسرے کو اپنی جگہ بھیجیں اور اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ اسے دے کر باقی تنخواہ خود لیں کیا شرعاً ان کا خود بھی تنخواہ کا کچھ حصہ لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ جبکہ وہ خود ڈیوٹی پر نہیں جاتے۔

﴿جواب﴾ (۱) واضح رہے کہ ملازمت عقد اجارہ ہے، ملازم جن شرائط کے ساتھ کسی محکمہ میں ملازمت اختیار کرتا ہے ان کا پورا کرنا واجب ہے، اساتذہ اور تمام سرکاری ملازمین شرعاً اجیر خاص کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو صرف کام کی تنخواہ نہیں ملتی بلکہ کام اور طے شدہ وقت میں حاضری دونوں کی ملتی ہے، لہٰذا جتنا وقت محکمہ کی طرف سے ہو ڈیوٹی دینا ضروری ہوگا۔

مقررہ تعطیلات سے زائد ایام کی رخصت کر کے رجسٹر پر حاضری لگوانا جھوٹ اور دھوکہ ہے، نیز ان ایام کی تنخواہ بھی حلال نہ ہوگی۔

(۲) ملازمین کا دوسرے کو اپنی جگہ ڈیوٹی پر بھیجنا درست نہیں، البتہ محکمہ سے باقاعدہ اجازت لیکر کسی باصلاحیت شخص کو اپنی جگہ بھیج سکتا ہے اور اگر وہ شخص کم تنخواہ لے کر اسکی جگہ ڈیوٹی دینے پر راضی ہو تو ملازم کے لئے ایسا کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ اس محکمہ میں ایسا قانون موجود ہو یا کم از کم محکمہ کو صحیح صورت حال کا علم ہو۔

لما فی شرح المجلۃ:(۲/۶۷۱،المادۃ:۵۷۱،طبع رشیدیہ)

الاجیر الذی استوجر علی ان یعمل بنفسہ لیس لہ ان یستعمل غیرہ:مثلا لواعطی احد جبۃ لخیاط علی ان یخیطہا بنفسہ بکذا دراھم فلیس للخیاط ان یخیطہا بغیرہ.

ولما فی الفقہ الاسلامی:(۵/۳۸۴۵،طبع رشیدیہ)

فالاجیر الخاص او أجیر الوحد:ھو الذی یعمل لشخص واحد مدۃ معلومۃ. وحکمہ:انہ لا یجوز لہ العمل لغیر مستاجرہ.

ولما فی الھدایۃ:(۳/۳۱۲،طبع رحمانیہ)

والاجیر الخاص الذی یستحق الاجرۃ بتسلیم نفسہ فی المدۃ وان لم یعمل کمن استوجر شھرا للخدمۃ أو لرعی الغنم وانما سمی اجیر وحد لانہ لا یمکنہ ان یعمل لغیرہ لان منافعہ فی المدۃ صارت مستحقۃ لہ والاجر مقابل بالمنافع ولھذا یبقی الاجر مستحقا وان نقص العمل.

ولما فی الدر مع الرد:(۶/۷۰،طبع سعید)

ولیس للخاص ان یعمل لغیرہ، ولو عمل نقص من أجرتہ بقدر ما عمل فتاوی النوازل. وفی الشامیۃ:(قولہ ولیس للخاص أن یعمل لغیرہ)بل ولا أن یصلی النافلۃ.قال فی التاتارخانیۃ:وفی فتاوی الفضلی واذا استاجر رجلا یوما یعمل کذا فعلیہ ان یعمل ذلک العمل الی تمام المدۃ ولا یشتغل بشئ آخر سوی المکتوبۃ وفی فتاوی سمرقند:وقد قال بعض مشائخنا لہ ان یؤدی السنۃ ایضا.واتفقوا انہ لا یؤدی نفلا وعلیہ الفتوی.۔۔۔قال فی التاتارخانیۃ:نجار استوجر الی اللیل فعمل لآخر دواۃ بدرھم وھو یعلم فھو آثم.

واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۱۵۳۹

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ

﴿سرکاری ملازمین کا حکومت سے پیشگی تنخواہ لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سرکاری ملازمین بھی

ضرورت کے وقت حکومت سے پیشگی تنخواہ کے طور پر کچھ رقم لیتے ہیں جسے حکومت اسکی تنخواہ سے قسط وار بمعہ سود کے وصول کرتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ ملازم کا اس طرح پیشگی تنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں اور اس کا زیادہ رقم واپس کرنا سود میں شامل ہے یا نہیں؟ مستفتی: سید مخدوم حسین شاہ

﴿جواب﴾ سرکاری ملازمین حکومت سے جو رقم پیشگی تنخواہ کے نام سے لیتے ہیں وہ حقیقت میں قرض ہے، اس لئے کہ شرعاً ملازم تنخواہ کا حقدار اسی وقت سمجھا جائے گا جب وہ ڈیوٹی پوری کرنے کے بعد تنخواہ وصول کرے، لہٰذا مذکورہ رقم کو تنخواہ قرار دینا درست نہیں، یہ قرض ہے اور اس پر زائد رقم واپس کرنا سود ہے جو ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔

لمافی قوله تعالى:(ال عمران،ايت ۱۳۰)﴿يآايها الذين امنوا لا تاكلوا الربوا اضعافا مضاعفة﴾

ولمافی التنوير مع الدر:(۵/۱۶۸ تا ۱۷۰ طبع سعيد)

(هو) لغة: مطلق الزيادة وشرعا (فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لاحد المتعاقدين في المعاوضة)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

۹ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۵۹

﴿اجارہ کی ایک صورت اور اس کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص سعودی عرب میں ملازمت کرتا ہے، کمپنی والے اسے گاڑی اس شرط پر دیتے ہیں کہ اگر تو نے ایک ہزار سے کم کمایا تو تجھے نفع ۳۰ فیصد ملے گا اور اگر ایک ہزار یا اس سے زائد کمایا تو نفع ۳۵ فیصد کے حساب سے ملے گا اور کمپنی کا مقصد اس سے یہی ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آمدنی ہو، اب یہ شخص ۹۵۰ روپے کماتا ہے اور کمپنی کے ذمہ دار کے سامنے ۵۰ روپے اپنی جیب سے نکال کر ایک ہزار پورا کرکے اسے دیتا ہے تاکہ اسے نفع ۳۰ فیصد کے بجائے ۳۵ فیصد ملے تو کیا اس کا ایسا طریقہ اختیار کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: عبدالکریم صاحب کوہاٹ

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اگر شخص مذکور کو یقین ہے کہ اسے کمپنی کی طرف سے اس بات کی اجازت ہے کہ کم آمدنی ہونے کی صورت میں اپنی جیب سے پیسے پورے کرکے نفع زیادہ وصول کرلے تو اس کا زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کرنا شرعاً جائز ہے لیکن اگر

کمپنی کی طرف سے اس بات کی اجازت نہیں تو اس کا ایسا کرنا بھی جائز نہ ہوگا کیونکہ اس میں کمپنی کو گاڑی سے حاصل ہونے والے منافع کم اور دھوکہ سے اپنی اجرت بڑھانا لازم آتا ہے۔

مثلاً فرض کریں کہ اس شخص نے ۹۹۹ روپے کمائے اور ایک روپیہ اپنی جیب سے ملا کر ایک ہزار (۱۰۰۰) روپے پورے کر دیئے اس ایک روپیہ ملانے سے پہلے وہ کل آمدنی کے ۳۰ فیصد یعنی تین سو روپیہ کا مستحق تھا اور ایسا کرنے کے بعد اسے ۳۵۰ روپے ملیں گے جو معاہدہ اور طے شدہ معاملہ کے خلاف ہے، لہٰذا شرعاً یہ جائز نہ ہوگا۔

لمافی المعاییر الشرعیة: (ص ۲۴۰)

اذا اتفق الطرفان على انه اذا زادت الارباح عن نسبة معينة فان طرفی المضاربة يختص بالربح الزائد عن تلك النسبة فان كانت الارباح بتلك النسبة او دونها فتوزيع الارباح على ما اتفقا عليه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری

۲۵ رجب ۱۴۲۹ھ　　　　فتوی نمبر: ۱۶۸۷

﴿جھوٹ بول کر حاصل کی گئی ملازمت کی تنخواہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ادارے کی طرف سے ملازمت کے لیے اشتہار چھپا کہ ہمارے ادارے کو انٹر پاس لڑکوں کی ضرورت ہے جبکہ میں میٹرک پاس تھا، یہ ادارہ ایک غیر سرکاری فیکٹری تھی، جب انٹرویو کا وقت آیا تو ہم سے کاغذات نہیں دیکھے گئے۔ میں نے کہا کہ میں بھی انٹر پاس ہوں اور سب میٹرک انٹر والوں کو ایک ہی جیسے کام پر لگا دیا گیا، پوچھنا یہ ہے کہ میں نے چونکہ جھوٹ بول کر نوکری حاصل کی ہے تو کیا میرے لئے تنخواہ لینا جائز ہے؟

مستفتی: قاری تاج محمد صاحب

﴿جواب﴾ آپ اس کام کی پوری طرح صلاحیت اگر رکھتے ہیں تو آپ کے لیے تنخواہ لینا جائز ہے، ہاں جھوٹ اگر بول دیا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔

لمافی البحر الرائق: (۷/ ۲۹۷-۳۰۰ طبع سعید)

(قوله هي بيع منفعة معلومة باجر معلوم...... وقوله بل بالتعجيل او بشرطه او بالاستيفاء او بالتمكن) يعني لا يملك الأجرة الا بواحد من هذه الأربعة.

ولمافی بدائع الصنائع: (۴/ ۱۷۴-۱۷۵ طبع سعید)

لما ركنها فالايجاب والقبول وذلك بلفظ دال عليهما...... فاذا وجد ذلك فقد تم الركن...... وعلى هذا يخرج

استئجار الأقطع والأشل للخبز والطحن بنفسه والقصارة والكتابة وكل عمل لا يقوم إلا باليدين..... أنه غير جائز لأن الاجارة بيع المنفعة والمنفعة لا تحدث عادة إلا عند سلامة الآلات والأسباب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سید مزمل شاہ لکی مروت

۳ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۴۴

﴿کتابوں کو کرایہ پر دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب! ہمارا ایک مکتبہ ہے، جس میں دینی و دنیاوی کتب اور رسائل ہیں، ہمارے پاس ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو قیمت پر کتاب نہیں لینا چاہتے تو ہم ان کو کرایہ پر کتابیں وغیرہ دیتے ہیں ہر دن کا ایک متعین کرایہ ہوتا ہے لوگ کتابیں پڑھ کر ہم کو واپس کر دیتے ہیں، شریعت کی روشنی میں آگاہ فرمائیں کہ کتابوں کو کرایہ پر لینا دینا جائز ہے؟ مستفتی: احسان اللہ

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں کتابوں کو کرایہ پر دینا پہلے عرف کی وجہ سے ناجائز تھا جبکہ آج کل عرف عام کی بناء پر کتب و رسائل کو کرایہ پر دینے کی گنجائش ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اس کو مستقل پیشہ نہ بنایا جائے۔

لما فی الدر مع الرد:(۶/۳۴-۳۵،طبع سعید)

ولو استأجر بيتا ليصلى فيه أو طيبا ليشمه أو كتابا ولو شعرا ليقرأه أو مصحفا شرح وهبانية. وفي الشامية:(قوله أو كتابا الخ)لأن القرأة ان كانت طاعة كالقران أو معصية كالغناء فالاجارة عليها لا تجوز، وان كانت مباحة كالأدب والشعر فهذا مباح له قبل الاجارة فلا تجوز، ولو انعقدت تنعقد على الحمل وتقليب الأوراق، والاجارة عليه لا تنعقد ولو نص عليه لأنه لا فائدة للمستأجر والوالجية.

ولما فی بدائع الصنائع:(۴/۱۷۴-۱۷۵،طبع سعید)

وأما معنى الاجارة فالاجارة بيع المنفعة لغة..... وذكر بعض المشائخ أن الاجارة نوعان اجارة على المنافع واجارة على الأعمال..... وعلى هذا يخرج استئجار المصحف أنه لا يجوز لأن منفعة المصحف النظر فيه والقراءة منه والنظر في مصحف الغير والقراءة منه مباح والاجارة بيع المنفعة والمباح لا يكون محلا للبيع كالأعيان المباحة من الحطب والحشيش وكذا استئجار كتب ليقرأ فيها شعرا أو فقها لأن منافع الدفاتر النظر فيها والنظر في دفتر الغير مباح من غير أجر.

ولما فی تبيين الحقائق:(۱۱۸/۶،طبع سعید) ولا يجوز استئجار المصحف وكتب الفقه لعدم التعارف.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ

۳۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۵۴

﴿عورت کی ملازمت کی شرعی حیثیت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میں پی اے ایف میں ملازم ہوں اور میری بیوی چھوٹی لڑکیوں کے پرائمری اسکول میں ٹیچر ہے جبکہ میرے والد صاحب کی پنشن کی رقم ہوتی ہے مگر اس کے باوجود بھی گھر کا خرچہ پورا نہیں ہوتا، ان حالات میں شریعت کی نظر میں اپنی بیوی سے ملازمت کرانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ مستفتی: فاروق شاہ لکی مروت

﴿جواب﴾ اگر آپ اور آپکے والد صاحب کی تنخواہ سے گھر کی بنیادی ضروریات پوری نہ ہوتی ہوں تو آپ کی اجازت سے آپ کی اہلیہ کے لئے عورتوں اور کم سن بچوں کو پڑھانے کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہے بشرطیکہ دوران ملازمت غیر محارم سے اختلاط اور دیگر محظورات شرعیہ کا ارتکاب لازم نہ آئے۔

لما فی قوله تعالیٰ: (سورۃ الاحزاب، آیت ۳۳) ﴿وقرن فی بیوتکن...... الآیة.﴾

ولما فی مشکوٰۃ المصابیح: (۲/۲۶۹، باب النظر الی المخطوبة، طبع سعید)

وعنه (ابن مسعودؓ) عن النبی ﷺ قال المرأۃ عورۃ فاذا خرجت استشرفها الشیطان. رواہ الترمذی.

ولما فی المبسوط: (ج ۱۶ ص ۵۲-۵۵، طبع دار المعرفة بیروت)

ویکرہ له أن یستأجر امرأۃ حرۃ أو أمة یستخدمها ویخلو بها لقوله ﷺ لا یخلون رجل بامرأۃ لیس منها بسبیل فان ثالثهما الشیطان ولأنه لا یأمن من الفتنة علی نفسه أو علیها اذا خلا بها ولکن هذا النهی لمعنی فی غیر العقد فلا یمنع صحة الاجارۃ ووجوب الأجر اذا عمل کالنهی عن البیع وقت النداء...... وان استأجرت امرءۃ رجلا لیخدمها فهو جائز وأکرہ أن یخلو بها حرا کان أو عبدا لما فیه من خوف الفتنة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ

۱۲ جمادی الاول ۱۴۳۰ھ   فتویٰ نمبر: ۲۲۴۹

﴿اجارہ میں مارکیٹ ویلیو کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا یہاں ڈیفنس میں جنرل اسٹور ہے اور یہ دوکان میں نے مالک سے باہم رضامندی سے سولہ ہزار روپے کرایہ ماہانہ طے کر کے لی ہے اور مارکیٹ ویلیو کے حساب سے دوکان کا ماہانہ کرایہ تیرہ ہزار (۱۳۰۰۰) روپے بنتا ہے ہمارے علاقے کے مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ مارکیٹ ویلیو سے تم تین ہزار روپے زائد

کرایہ دے رہے ہو، یہ سود ہے، اس کی وجہ سے تمہارا سارا کاروبار حرام ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا واقعی صورت مذکورہ میں تین ہزار روپے سود کے شمار ہونگے؟ جبکہ سولہ ہزار روپے کرایہ ہم نے باہم رضا اور خوشی سے طے کیا ہے۔

مستفتی: عبدالحلیم ڈیفنس فیز ۲ کراچی

﴿جواب﴾ دوکان کے مالک اور آپ دونوں نے باہمی رضامندی سے دوکان کا کرایہ طے کیا ہے، شرعا یہ معاملہ اجارہ کہلاتا ہے اور اجارہ میں مارکیٹ ویلیو کا لحاظ رکھنا کوئی ضروری نہیں ہے، لہٰذا یہ معاملہ بلاشبہ جائز ہے، مولوی صاحب کے سامنے آپ نے معاملہ کی نوعیت شاید واضح نہیں کی، ورنہ سود کے ساتھ اس معاملہ کا دور تک کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

لمافی بدائع الصنائع:(۱۷۹/۴، طبع سعید)

اما الذی یرجع الی العاقد فرضا المتعاقدین لقوله عزوجل یاایها الذین امنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الاان تکون تجارة عن تراض منکم والاجارة تجارة لان التجارة تبادل المال بالمال والاجارة کذلک.....فدخلت تحت النص وقال النبی ﷺ لایحل مال امرئ مسلم الابطیبة من نفسه.

ولمافی البدائع:(۱۹۳/۴، طبع سعید)

ان تکون الاجرة مالا متقوما معلوما وغیر ذلک مماذکرناه فی کتاب البیوع والاصل فی شرط العلم بالاجرة قول النبی ﷺ من استاجر اجیرا فلیعلمه اجره والعلم بالاجرة لایحصل الابالاشارة والتعیین اوبالبیان وهکذافی الهندیة:(۴۱۱/۴، طبع رشیدیه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم: عبدالرزاق عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
فتویٰ نمبر: ۱۳۶۷

﴿کمیشن کا ایک مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ریلوے ادارے کے ایجنٹ سے سترہ ہزار نو سو پچاس روپے کے ٹکٹ لئے اور میں نے ٹکٹ لیتے وقت اس سے کہا کہ کچھ رعایت کرلو، تو اس نے اپنے کمیشن میں سے پانچ سو روپے کم کردئے اور مجھ سے سترہ ہزار نو سو پچاس کے بجائے سترہ ہزار چار سو پچاس روپے لے لئے۔

مذکورہ ٹکٹ کسی مجبوری کی بناء پر واپس کرنا چاہتا ہوں تو یہ اس اصل قیمت یعنی سترہ ہزار نو سو پچاس روپے میں واپس کرنا جائز ہے یا سترہ ہزار چار سو پچاس میں واپس کرنا ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں اگر آپ ریلوے ادارے کو یا جس ایجنٹ سے ٹکٹ خریدے

اس کے علاوہ کسی دوسرے ایجنٹ کو ٹکٹ واپس کریں تو واپسی کے وقت آپ سترہ ہزار نو سو پچاس (17950) روپے لے سکتے ہیں اور اس صورت میں پانچ سو روپے زائد لینا جائز ہے۔

لیکن جس ایجنٹ سے ٹکٹ خریدے اگر اسی کو واپس کریں تو پھر پانچ سو روپے زائد لینا جائز نہیں اور سترہ ہزار چار سو پچاس روپے کی واپسی ضروری ہے۔

لمافی الکفایۃ:(۶/ ۴۹،طبع رشیدیہ)البیع مبادلۃ المال بالمال بالتراضی.

ولمافی الھدایۃ:(۳/ ۸۰،طبع رحمانیہ)

ویجوزللمشتری ان یزیدللبائع فی الثمن ویجوزللبائع ان یزیدفی المبیع للمشتری فی البیع ویجوزان یحط عن الثمن ویتعلق الاستحقاق بجمیع ذلک۔

ولمافی التنویرمع الدر:(۷/ ۳۳۱،طبع امدادیہ)الاقالۃ(رفع البیع)وعم فی الجوھرۃفعبر بالعقد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

۱۶ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۲۳۳

﴿کسی کو پالنے کے لئے جانور دیا تو اسکا خرچہ خود مالک پر ہوگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ ہم قربانی کے ارادے سے دو تین مہینے پہلے جانور خریدتے ہیں پھر اس جانور کو کسی اور آدمی کو عید تک پالنے کے لئے اس شرط پر دیتے ہیں کہ وہ اسکی خوراک وغیرہ کا خرچہ ادا کریں گے اور ہم اسکو مہینہ کے حساب سے اتنی اجرت (مثلاً آٹھ ہزار روپیہ) دیں گے، از روئے شرع ایسا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد سلمان ڈی-ایچ-اے

﴿جواب﴾ سوال میں مذکورہ صورت میں متعاقدین کی آپس میں ناراضگی کا اندیشہ ہے، اس لئے جائز نہیں ہے، اسکی جائز صورت یہ ہوسکتی ہے کہ چارے کا خرچہ خود آجر (جانور کا مالک) برداشت کرے اور پالنے کی اجرت الگ متعین کردے، البتہ ناراضگی یا جھگڑے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو گنجائش معلوم ہورہی ہے۔

لمافی الھندیۃ:(۴/ ۴۴۳،طبع رشیدیہ)

وکل اجارۃ فیھا رزق أو علف فھی فاسدۃ الافی استئجار الظئر بطعامھا وکسوتھا.

ولمافی التنویرمع الدر:(۹/ ۶۴،طبع امدادیہ)

(الاجارۃ)......یفسدھا کجھالۃ ماجور او اجرۃ أو مدۃ أو عمل، وکشرط طعام عبد وعلف دابۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز الرحمٰن چارسدوی

۵ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۶۲

﴿بینک میں ملازمت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ بینک کی ملازمت کا شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ کنونشنل بینک میں ملازمت حرام ہے اس لئے کہ ایسے بینکوں کی آمدنی سودی کاروبار سے ہوتی ہے غلطی سے اگر ایسی ملازمت اختیار کی ہے تو حرام سمجھتے ہوئے جب تک حلال نہ ملے جاری رکھیں اور استغفار کرتے رہیں جیسے گذارہ کیلئے کوئی حلال روزگا ملے تو فوراً چھوڑ دیں ہاں جن بینکوں میں کاروبار اسلامی اصول کی بنیاد پر ہے جیسے میزان بینک وغیرہ تو ان میں ملازمت جائز ہے۔

لمافی روح المعانی:(۶/ ۵۷،طبع رشیدیه)

ولاتعاونوا على الاثم والعدوان ......الآية.فيعم النهي كل ما هو من مقولة الظلم والمعاصي ويندرج فيه النهي عن التعاون على الاعتداء والانتقام.

ولمافی احکام القرآن للجصاص:(۲/ ۴۲۹،طبع قدیمی)

ولاتعاونوا على الاثم والعدوان ......الآية.نهي عن معاونة غيرنا على معاصي الله تعالى.

ولمافی تکملة فتح الملهم:(۱/ ۶۱۹،طبع دارالعلوم کراچی)

عن جابرؓ قال:لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء .وفي التكملة:قوله ﷺ(وكاتبه)لان كتابة الربا اعانة عليه ومن هنا ظهران التوظف في البنوك الربوية لايجوز فان كان عمل الموظف في البنك مايعين على الربا كالكتابة او الحساب فذلك حرام لوجهين الاول اعانة على المعاصية.

والثاني اخذ الاجرة من المال الحرام فان معظم دخل البنوك حرام مستجلب بالربا واما اذا كان العمل لاعلاقة له بالربا فانه حرام للوجه الثاني فحسب فاذا وجد بنك معظم دخله حلال جاز فيه التوظف للنوع الثاني من الاعمال.

ولمافی المرقاة:(۶/ ۴۳،طبع رشیدیه)

تحت حديث المذكور قال الخطابيؒ سوى رسول الله ﷺ بين آكل الربا وموكله اذ كل لايتوصل الى اكله الا بمعاونته ومشاركته اياه فهما شريكان في الاثم كما كانا شريكين في الفعل......(وكاتبه وشاهده)قال النوويؒ:فيه تصريح بتحريم كتابة المترابيين والشهادة عليهما بتحريم الاعانة على الباطل(وقال)اى النبي ﷺ(هم سواء)اى في اصل الاثم وان كانوا مختلفين في قدره.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: محمد حسن

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ

فتویٰ نمبر: ۱۳۰۲

﴿آٹا پیسنے کی اجرت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک آٹا چکی کا مالک ہوں اور خود ہی اسی چکی پر کام کرتا ہوں یہاں اکثر لوگ کسان ہیں اجرت میں غلہ اور آٹا دینے کیلئے تیار ہوتے ہیں اور نقدی نہیں دے سکتے یا نہیں دیتے ہیں اگر کوئی نقدی دینا چاہے تو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا، پوچھنا یہ ہے کہ اجرت میں آٹا یا غلہ میں سے لینے کا طریقہ ازروئے شریعت درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو صحیح طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ جو گندم آپ پیس رہے ہیں اسی کے آٹے میں سے اجرت متعین کرنا جائز نہیں ہے، احادیث میں اسکی ممانعت آئی ہے، البتہ اس کے علاوہ عام گندم، آٹا اجرت میں طے کریں، مثلاً ایک من گندم پیس کر دونگا اور آپ کو دو سیر گندم یا آٹا ادا کرنا ہوگا، اسی طرح معاملہ طے کریں بعد میں وہ شخص اسی آٹے میں سے یا گندم میں سے دینا چاہے تو آپ لے سکتے ہیں کوئی خرابی نہ ہوگی لیکن پہلے سے اسی گندم کے آٹے میں سے اجرت طے کرنا جائز نہیں ہے یا جو اجرت بنتی ہے پسائی سے پہلے گندم سے الگ کر کے وہ دیدے تو یہ بھی جائز ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(٦/٥٦-٥٧،طبع سعید)

(أواستاجر بغلا ليحمل طعامه ببعضه أوثورا ليطحن برّه ببعض دقيقه)فسدت في الكل،لانه استاجره بجزء من عمله،والاصل في ذلك نهيه ﷺ عن قفيز الطحان وقدمناه في بيع الوفاء،والحيلة أن يفرز الاجرأولا أو يسمى قفيزا بلا تعيين ثم يعطيه قفيزا منه فيجوز.۔۔۔وفي الشامية:(قوله والحيلة ان يفرز الاجر أولا)اى ويسلمه الى الاجير،فلو خلطه بعد وطحن الكل ثم افرز الاجرة ورد الباقي جاز.

ولمافی تقریرات الرافعی:(ص٢٦٢)

نعم لا يكون بمعنى قفيز الطحان،لكن لا يستحق الاجر لكونه بالخلط صار مشتركا ولا اجر في العمل بالمشترك،ولو تحققت بعد العقد كما ياتي،الاان يقال:ان الشركة هنا شركة مجاورة ضرورة عدم امكان تميز نصيب كل،وفيما ياتي الشركة بينهما شركة ملك في جميع حبات واجزاء محل العمل تامل.

ولمافی خلاصة الفتاوی:(٢/١١٣ مطبع رشیدیه)

والحيلة ان يشترط صاحب الحنطة قفيزا من الدقيق الجيد ولا يقول من هذا الدقيق.

واللہ اعلم بالصواب: محمد ادریس چارسدوی

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر:١٣٩٠

یکم جمادی الاولی ١٤٢٩ھ

﴿اجیر مشترک کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کو ایک پلازہ میں روزمرہ کی صفائی کیلئے ماہانہ تین ہزار پانچ سو روپیہ کے عوض اجرت پر رکھا ہے، زید پوری صفائی پابندی کے ساتھ کرتا ہے، پلازہ میں دو دفاتر ایسے ہیں جن کی صفائی بھی زید کے ذمہ ہے، زید اس میں بھی صفائی کرتا ہے مگر دفتر والے بعد میں اپنی ضروریات کے سلسلے میں زید کو بازار یا دوسرے دفاتر میں بھیجتے ہیں اور مہینے کے آخر میں اپنی طرف سے زید کو کچھ رقم دیتے ہیں۔

اب ایک صاحب کہہ رہے ہیں کہ زید کیلئے دفتر والوں سے زائد رقم لینا اپنی ذمہ داری میں خیانت کا معاوضہ ہے جبکہ پلازہ کا مالک کہہ رہا ہے کہ ہماری طرف سے آپکے ذمہ صفائی ہے اسکے بعد تم آزاد ہو، پوچھنا یہ ہے کہ زید کیلئے یہ رقم وصول کرنا شرعاً کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ پلازہ کے مالک کی طرف سے زید پر اگر کوئی پابندی نہیں ہے تو زید صفائی سے فارغ ہونے کے بعد دفتر والوں کیلئے صفائی کے علاوہ دوسرا کوئی بھی کام کرسکتا ہے اور اسکی اجرت بھی لے سکتا ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۸۷/۹،طبع امدادیہ)

(الأجراء علی ضربین مشترک وخاص فالاول من یعمل لالواحد)......(أویعمل له عملاغیر موقت أوموقتابلاتخصیص)کان استاجره لیرعی غنمه شهرابدرهم کان مشترکا، الاأن یقول:ولاترعی غنم غیری.

ولمافی فقه السنة:(۱۹۲/۳-۱۹۳ ،طبع دارالکتب بیروت)

والاجیرالمشترک هوالذی یعمل الاکثرمن واحدفیشترکون جمیعافی نفعه کالصباغ والخیاط والحداد والنجار والکواء،ولیس لمن استاجره أن یمنعه من العمل لغیره،ولایستحق الأجرة الابالعمل،والاجیر الخاص لایجوزله أثناء المدة المتعاقد علیهاأن یعمل لغیرمستاجره فان عمل لغیره فی المدة نقص من أجرة بقدرعمل.

ولمافی الدرمع الرد:(۹۱/۹،طبع امدادیه)ولوعمل لغیره نقص من اجرته بقدرماعمل.

وفی الشامیة:قوله:(ولیس للخاص أن یعمل لغیره)بل ولاأن یصلی النافلة،قال فی التاترخانیة:وفی فتاوی الفضلی......العمل الی تمام المدة ولایشتغل بشئی آخرسوی المکتوبة......وعلیه الفتوی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ادریس چارسدوی

۲۳/ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۳۴۵

﴿مدرسہ کے سفیر کیلئے چندہ سے فیصد کے اعتبار سے حصہ لینا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دینی مدرسہ کے سفیر کی حیثیت سے اس مدرسہ کیلئے چندہ جمع کرتا ہوں، پوچھنا یہ ہے کہ اس چندے سے میرے لئے فیصد کے اعتبار سے حصہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: محمد عظیم عبدالخیل لکی مروت

﴿جواب﴾ مدرسہ کے سفیر کیلئے چندے سے فیصد کے اعتبار سے حصہ لینا جائز نہیں ہے. اسلئے کہ سفیر مدرسہ کا اجیر ہوتا ہے اور اجارہ میں عمل اور اجرت دونوں کا معلوم ہونا اجارہ کی صحت کیلئے ضروری ہے. مذکورہ صورت میں اجرت معلوم نہیں ہے، نیز اجیر کے عمل سے اجرت حاصل ہونے کی وجہ سے بھی اجارہ فاسد ہو جاتا ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۶/۴۶،طبع سعید)

(تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد فكل ما افسد البيع) مما مر (يفسدها) كجهالة مأجور او أجرة.الخ". وكذا فى الشامى:(۶/۴۶،طبع سعید)

ولما فى الهداية:(۳/۳۰۷،طبع رحمانيه)

"قال ومن دفع الى حائك غزلاً لينسجه بالنصف فله اجر مثله...لانه جعل الاجر بعض ما يخرج من عمله فيصير فى معنى قفيز الطحان وقد نهى النبى عليه السلام عنه.....والمعنىٰ فيه ان المستأجر عاجز عن تسليم الاجر وهو بعض المنسوج او المحمول او حصوله بفعل الاجير فلا يعد هو قادرا بقدرة غيره.

ولما فى الكفاية بهامش فتح القدير:(۹/۱۹،طبع رشيديه)

ولا تصح الاجارة حتى تكون المنافع معلومة وللاجرة معلومة لما روينا من قوله ﷺ "من استاجر اجيرا فليعلمه اجره" فانه كما يدل بعبارته على كون معلومية الاجر شرطا يدل بدلالته على اشتراط معلومية المنافع لان المعقود عليه فى الاجارة هو المنافع وهو الاصل المعقود وهو الاجرة كالتبع كالثمن فى البيع فاذا كان معلومية التبع شرطا كان معلومية الاصل اولى بذلك

ولما فى البحر الرائق:(۷/۲۹۷،طبع سعيد)

"وشرطها ان تكون الاجرةُ والمنفعة معلومتين لان جهالتهما تفضى الى المنازعة".

واللہ اعلم بالصواب: محمد شاکر اللہ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۱۲۹۸

۸ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ

﴿کفالت پر اجرت لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک آدمی کمپنی سے گاڑی ضمانت پر دلواتا ہے لیکن

اس میں ہوتا یہ ہے کہ مثلاً گاڑی کی قیمت ۳ لاکھ ہے وہ مشتری سے ۳ لاکھ پچاس ہزار وصول کرتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ شخص کیلئے مشتری سے پچاس ہزار زائد وصول کرنا صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ محض ضمانت کو شریعت نے عقد تبرع قرار دیا ہے، اس پر ثواب تو ملیگا، لیکن اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، البتہ محض ضمانت نہ ہو بلکہ اسکے علاوہ کفیل کو باقاعدہ کچھ کام مثلاً بھاگ دوڑ، اس معاملہ کے سلسلہ میں روابط، لکھت پڑھت وغیرہ بھی کرنی پڑتی ہو تو ایسی صورت میں یہ اجرت ضمانت کی نہ ہوگی بلکہ دلالی کی اجرت تصور کی جائیگی جو کہ جائز ہے۔

لمافی بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة:(۱/۲۲۰-۲۲۱،طبع دار العلوم کراتشی)

والحاصل أن أخذ الاجر على الضمان حرام شرعا...... وذلك لأنه أجر لايقابله عوض من المال،أو العمل وان الكفالة في الفقة الاسلامي تعتبر من عقود التبرع،لامن عقود المعاوضة وهذا لايحتاج الى دليل،ولكن الذى يجب على الضامن أن يباشره مجانا هو الضمان فقط فان احتاج لانشاء هذا الضمان الى عمل كالكتابة،أو الأعمال الادارية الاخرى أو الى مراجعة المضمون له... للضامن أن يطالب المكفول له... باجر المثل على مثل هذه الاعمال وان البنوك اليوم لاتباشر الضمان بالقول الخ.

ولمافی الشامی:(۹/۸۷،طبع امدادیه)

تتمة:قال في التاترخانية:وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل الخ.

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفا اللہ عنہ

۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۵۱۰

﴿سرکاری ادارے کی طرف سے مکان کے کرائے کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارا محکمہ اپنے ہر ملازم کو کرائے کا مکان لینے کیلئے علیحدہ سے ایک سہولت مہیا کرتا ہے، یہ سہولت ہر ملازم کے سکیل کے حساب سے ہے، اب کوئی شخص کسی کا مکان خود کرایہ پر لے لے یعنی (Self Hireing) کرالے حکومت اسے بھی سہولت دیتی ہے، یہ رقم اسے اپنے سکیل کے حساب سے ملے گی۔

سوال یہ ہے کہ ایک آدمی کو اس مد میں آٹھ ہزار (8000) روپے ملتے ہیں۔تو وہ کوئی ایسا مکان لے لے جس کا کرایہ (5000) روپے ہو، اب مالک مکان سے یہ معاہدہ ہو جاتا ہے کہ وہ (3000) روپے اس کو واپس کر دیگا کیونکہ کرایہ کی یہ رقم مالک مکان کے نام بذریعہ چیک آتی

ہے جبکہ حکومت نے اس شخص کے سکیل کیلئے رقم (8000) روپے ہی رکھی ہے، اب یہ فالتو رقم (3000) روپے اس کیلئے ناجائز تو نہیں ہو جاتی؟

ایک دوسرا شخص جس کے سکیل کے لحاظ سے رقم (10000) روپے ہے، وہ اپنے ہی مکان میں رہ رہا ہے، اس جگہ کے کاغذات یا کوئی اور وجہ ہے جسکی وجہ سے وہ حکومت کو اپنے مکان کی (Self Hireing) نہیں کروا سکتا، وہ حکومت سے وہ رقم جو اس کیلئے مخصوص ہے لینے کیلئے فرضی طور پر کسی کا مکان کرایہ پر لے لے اور اس میں رہائش نہ رکھے صرف اپنا حق لینے کیلئے ایسا کرے تو یہ اس کیلئے جائز ہے یا نہیں؟

یا اپنے مکان کی جو اس کا ذاتی ہے اور اس میں رہ رہا ہے، اس کے جعلی کاغذات یا دوسری شرائط پوری کر کے گورنمنٹ سے (Self Hireing) کرالے تو یہ کرنا اس کیلئے جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ اگر وہ Hireing نہیں کروائیگا تو اسے وہ رقم نہیں ملے گی جبکہ گورنمنٹ نے سب کیلئے یہ سہولت رکھی ہے۔ مستفتی: مسعود اختر واہ کینٹ

﴿جواب﴾ محکمے والے اگر ہر ملازم کو سکیل کے اعتبار سے مکان کے کرائے کیلئے ایک مخصوص رقم دیتے ہیں چاہے مکان کرایہ پر لے یا نہ لے یا کرایہ کم ہو یا زیادہ ہر حال میں مخصوص رقم دیتے ہیں تو پھر استفتاء میں ذکر کردہ تمام صورتیں جائز ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ محکمہ کی طرف سے ایک طرف تو یہ سہولت عام ہو دوسری طرف کاغذات شو کرنا خواہ جعلی ہوں اور زیادہ کرایہ شو کرنا خواہ کم پیسوں سے مکان حاصل کیا ہو، اس طرح جھوٹ بولنے پر اپنے ملازمین کو کیونکر مجبور کرتے ہیں۔

بہر حال جھوٹ تو جھوٹ ہے اسکا گناہ ضرور ہوگا۔ تاہم ایسی صورت میں حاصل کردہ زائد رقم حرام نہ ہوگی لیکن ناجائز ذریعہ سے حاصل ہونے کی وجہ سے نامناسب ضرور ہوگی۔

اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ کرایہ نامہ کو جمع کروا کے اس میں جتنی رقم لکھی جاتی ہے محکمہ والے اتنی ہی رقم دیتے ہیں تو اس صورت میں مکان کا جتنا کرایہ ہوگا اتنا ہی کرایہ نامہ میں لکھنا اور وصول کرنا جائز ہوگا، اس سے زائد لینا حرام ہوگا، اس سے آخری صورت کا حکم بھی واضح ہو گیا کہ رہائش اپنے مکان میں ہے اور محکمہ والوں کے سامنے کرایہ کا مکان شو کر رہا ہے یعنی واقعی ایسی

صورت اختیار کرنے کی اجازت محکمہ والوں کی طرف سے ہے تو کرایہ کی رقم حلال ہوگی لیکن جھوٹ کا گناہ ہوگا۔

واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفا اللہ عنہ
الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
فتویٰ نمبر: ۱۵۶۳
۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ

﴿دلال کی اجرت شرعاً جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص ایک کتاب ۱۰۰ روپے میں فروخت کررہا تھا، ایک دوسرے شخص نے اس سے کہا کہ میں آپ کیلئے خریدار ڈھونڈ لاؤنگا لیکن آپ اس کو کتاب کی قیمت ۲۰۰ روپے بتانا پس ۱۰۰ روپے سے جتنی زائد میں فروخت ہوا وہ زائد رقم میری ہوگی، ۱۰۰ روپے آپکے ہونگے کتاب ۱۵۰ روپے پر فروخت ہوئی ۵۰ روپے دلال نے لیا اور ۱۰۰ روپے بائع نے لیا، اس معاملہ کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

مستفتی: محمد عظیم صاحب لکی مروت عبدل خیل

﴿جواب﴾ دلالی پر اجرت لینا دینا جائز ہے بشرطیکہ اجرت متعین ہو یا کم از کم ثمن کی نسبت کے ساتھ اجرت کی شرح واضح ہو مسئولہ صورت میں نہ تو اجرت کی تعین ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی شرح مقرر ہوئی ہے کہ جتنی رقم پر کتاب کا سودا ہو جائے تو اتنی فیصد رقم دلال کو دیجائیگی، اس لئے یہ معاملہ خلاف شرع ہے ایسی صورت میں دلال کو مارکیٹ میں جو دلالی ملتی ہے بس اتنی اجرت کا وہ حق رکھتا ہے باقی کتاب جتنے میں فروخت ہوئی ہو پوری رقم مالک کی ہے۔

لما فی الشامی:(۹/۶۳ طبع امدادیہ)

قال فی البزازیۃ:اجارۃ السمسار والمنادی والحمامی والصکاک ومالا یقدر فیہ الوقت ولا العمل تجوز لما کان للناس بہ حاجۃ،ویطیب الاجر الماخوذ لو قدر اجر المثل.

ولما فی الشامی:(۹/۸۷،طبع امدادیہ)

وفی الحاوی:سئل محمد بن سلمۃ عن اجرۃ السمسار ،فقال:ارجو انہ لا باس بہ،وان کان فی الاصل فاسداً لکثرۃ التعامل،وکثیر من ھذا غیر جائز فجوزوہ لحاجۃ الناس الیہ کدخول الحمام.

ولما فی خلاصۃ الفتاوی:(۳/۱۱۶،طبع رشیدیہ)

وفی الاصل اجرۃ السمسار والمنادی والحمامی والصکاک ومالا تقدیر فیہ للوقت ولا مقدار لما یستحق بالعقد لکن للناس فیہ حاجۃ جاز وان کان فی الاصل فاسداً قال الامام خواھرزادہ فی نسختہ تطیب لہ من الاجر قدر اجر المثل.

دلال کو جو اجرت ملتی ہے وہ فیصد کے حساب سے متعین ہو یا وہ اجرت پانچ دس روپے کی صورت میں متعین ہو بہر صورت درست ہے اسی طرح کا جواب فتاوی محمودیہ اور فتاوی رحیمیہ اور احسن الفتاوی میں بھی ہے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ ۔۔۔ واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی

۸ صفر الخیر ۱۴۲۹ھ ۔۔۔ فتویٰ نمبر: ۱۱۸۵

﴿ٹیپ ریکارڈ اور ریڈیو میکینک کی اجرت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں فریز ر میکینک ہوں اور کبھی کبھار ٹیپ ریکارڈ اور ریڈیو بھی صحیح کرتا ہوں، ٹیپ ریکارڈ اور ریڈیو سے عام طور پر لوگ گانے سنتے ہیں لیکن بعض نیک لوگ تلاوت نعت وغیرہ سننے کیلئے بھی استعمال کرتے ہیں، میرے لئے ایسے کام کی اجرت کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی ذاکر اللہ چالیار سوات

﴿جواب﴾ ٹیپ ریکارڈ اور ریڈیو فی نفسہ برائی کیلئے نہیں ہیں اگر چہ لوگ اسے برائی کیلئے بھی استعمال کرتے ہیں اور جو چیز خاص برائی ہی کیلئے نہ ہو تو فقہاء کرام نے ایسی چیزوں کی اجرت کو جائز قرار دیا ہے۔

لما فی الدر المختار: (۹/۵۶۱، طبع امدادیہ)

قلت: وقدمنا ثمة معزيا للنهر أن ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريما، والا فتنزيها.

ولما فی التنویر مع الدر: (۹/۷۵، طبع امدادیہ)

(لاتصح الاجارة لعسب التيس) وهو نزوه على الاناث (و) لا (لأجل المعاصي مثل الغناء والنوح والملاهي) ولو أخذ بلا شرط يباح. قوله: (والملاهي) كالمزامير والطبل، واذا كان الطبل لغير اللهو فلا بأس به كطبل الغزاة والعرس لما في الاجناس.

ولما فی بدائع الصنائع: (۴/۱۸۹، طبع سعید)

وعلى هذا يخرج الاستجار على المعاصي انه لا يصح لانه استئجار على منفعة غير مقدورة الاستيفاء شرعا كاستيجار الانسان للعب وللهو كاستئجار المغنية والنائحة للغناء والنوح

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ ۔۔۔ واللہ اعلم: حبیب الوہاب سواتی

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ ۔۔۔ فتویٰ نمبر: ۱۳۵۲

﴿دلال کی اجرت فیصد کے اعتبار سے جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ دلال کی اجرت جب متعین ہو تو جائز ہے اور جب

غیر متعین ہوتو ناجائز ہے لیکن اگر فیصد کے اعتبار سے مقرر کی جائے تو اسکا کیا حکم ہے جس میں کم وزیادہ دونوں کا احتمال ہے یعنی جہالت ہے اور جہالت کیوجہ سے عموماً عقد فاسد ہو جاتا ہے۔

﴿جواب﴾ فیصد کے اعتبار سے دلال کی اجرت مقرر کی جائے مثلاً قیمت خرید کی نسبت ۲% فیصد وغیرہ تو یہ بھی تعیین کی ایک صورت ہے، نیز جب جہالت یسیرہ ہو یا عرف کی وجہ سے نزاع کا خطرہ نہ ہو تو ایسی جہالت سے عقد فاسد نہیں ہوتا آج کل کمیشن پر معاملات کرنے کا عرف عام ہو گیا ہے اس لئے اسکی گنجائش ہے۔

لمافی الشامی:(۹/۸۷،طبع امدادیه)

وفي الحاوي:سئل محمدبن سلمة عن اجرة السمسار،فقال:أرجوانه لاباس به، وان كان في الاصل فاسدالكثرة التعامل، وكثيرمن هذاغيرجائزفجوزوه لحاجة الناس اليه كدخول الحمام.وعنه قال:رأيت ابن شجاع يقاطع نساجاينسج له ثيابافي كل سنة.

ولمافي التنويرمع الدر:(۶/۴۶-۴۷،طبع سعيد)

(تفسدالاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد،فكل ماأفسدالبيع) ممامر(يفسدها) كجهالة ماجورأواجرةأومدةأوعمل.

وفي الشامية:(قوله اومدة)الافيمااستثنى قال في البزازية: اجارةالسمساروالمنادي والحمامي والصكاك ومالايقدرفيه الوقت ولاالعمل تجوز لماكان للناس به حاجة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۵۱۹

﴿بکریوں کی نسل کو ان کے پالنے کی اجرت بنانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے گاؤں میں یہ رواج ہے کہ جن کی گائے بکریاں زیادہ ہوتی ہیں وہ اپنے ساتھ مزدور اس شرط پر رکھتے ہیں کہ ان بکریوں سے آئندہ جو نسل ہوگی ان میں سے میں آپکو اتنی بکریاں دونگا یا پھر جب بکریوں کے بچے جننے کا وقت قریب آتا ہے تو مالک مزدور کو کہتا ہے کہ فلاں فلاں بکری کا حمل آپکا ہوگا، نیز بکریوں کا حمل ضائع ہو جائے یا بچے مرجائیں تو مزدور کو کچھ بھی نہیں ملتا، کیا از روئے شرع ایسا معاملہ کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ جاننا چاہیے کہ عقد اجارہ میں مزدور کی اجرت کا معلوم ہونا ضروری ہے، صورت مسئولہ میں اجرت چونکہ مجہول ہے اس لئے یہ عقد فاسد ہے اور معاملہ کو صاف کئے بغیر

جاری رکھنا گناہ ہے اور اب تک مزدور نے جو خدمات انجام دی ہیں علاقہ میں رائج مزدوری کے مطابق اس کا حق دینا ضروری ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۳۶/۶،طبع سعید)

(تفسد الاجارۃ بالشروط المخالفۃ لمقتضی العقد فکل ما افسد البیع)مما مر(یفسدھا) کجہالۃ ماجور او اجرۃ......الخ.

ولما فی البحر الرائق:(۲۱۲/۷،طبع سعید)

فکانت کالبیع فکل ماأفسد البیع افسدھا وقد ضبطہ الشیخ ابو الحسن الکرخی فقال: اذا کان ما وقع علیہ عقد الاجارۃ مجہولا فی نفسہ او فی اجرۃ او فی مدۃ الاجارۃ فالاجارۃ فاسدۃ.

ولما فی الھندیۃ:(۴۳۹/۴،طبع رشیدیہ)

الفساد قد یکون لجہالۃ قدر العمل بان لا یعین محل العمل وقد یکون لجہالۃ قدر المنفعۃ بان لا یبین المدۃ وقد یکون لجہالۃ البدل وقد یکون بشرط فاسد مخالف لمقتضی العقد فالفاسد یجب فیہ اجر المثل.

ولما فی القہستانی:(۱۳۳/۲،طبع سعید)

فیجب عند فسادھا اجر المثل ای اجر شخص مماثل لہ فی ذلک العمل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم: عبدالوہاب لغمانی عفا اللہ عنہ

۵ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ   فتویٰ نمبر: ۲۴۸۰

﴿کرایہ ادا نہ کرنے کی صورت میں کرایہ دار کی کسی چیز پر قبضہ کرنیکا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنا مکان کرایہ پر دوسرے شخص کو دیا ہے اور کرایہ دار دو ماہ سے کرایہ ادا نہیں کر رہا اور نہ ہی مکان خالی کر رہا ہے، لہٰذا اگر مالک مکان اپنے کرایہ کے حصول کے لئے یہ صورت اختیار کرے کہ اس کرایہ دار کی کوئی استعمال کی چیز مثلاً سائیکل وغیرہ لے لے تو کیا یہ صورت شرعاً درست ہے یا کہ نہیں؟

﴿جواب﴾ کسی شخص کا مالی حق (مثلاً پیسے) اگر دوسرے کے ہاں باقی ہو اور وہ ادا نہیں کر رہا تو ایسی صورت میں وہی چیز (مثلاً پیسے) کسی طرح ہاتھ آجائے تو اس کی مرضی کے بغیر لینا جائز ہے اور استعمال حلال ہے، البتہ اس چیز کے علاوہ مثلاً سائیکل وغیرہ ہاتھ لگ جائے تو اپنے حق کی وصول یابی کے لیے اس پر قبضہ کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، استعمال کرنا یا فروخت کرنا جائز نہیں ہے جب تک قاضی اس کا فیصلہ نہ کرے۔

لما فی الشامی:(۱/۵۰۰-۵۰۱،طبع سعید)
(اخذ عمامة المدیون لتکون رهنا عنده لم تکن رهنا)واذا هلکت تهلک هلاک المرهون قال:وهذا ظاهر اذا رضی المطلوب بترکه رهنا عادیة،ومفاده انه ان رضی بترکه کان رهنا والا،وعلیه یحمل اطلاق السراجیة وغیرها کما افاده المصنف: فی المجتبی لرب المال مسک مال المدیون رهنا بلا اذنه،وقیل اذا ایس فله اخذه مکان حقه قضاء عن دینه واقره المصنف.
[فرع] رجل دخل خانا فقال له صاحب الخان لا ادعک تنزل مالم تعطنی رهنا فدفع الیه ثیابه فهلکت عنده ان رهنها بأجر البیت فالرهن بما فیه،وان اخذه منه لاجل انه سارق او خفی علیه فانه یضمن قال ابو اللیث:وعندی لا ضمان فی الوجهین لانه غیر مکره فی الدفع خلاصة(قوله وقیل اذا ایس الخ)کذا عبر فی المنح: وظاهره انه من غیر جنس حقه والا فلو من جنسه فله اخذ قدر حقه منه بلا کلام ولا وجه لحکایته بقیل علی أنا قدمنا فی کتاب الحجر عن المقدسی عن بعضهم ان الفتوی الیوم علی جواز الاخذ مطلقا.

ولما فی البحر الرائق:(۸/۸۳،طبع سعید)
ولان البیع واجب علیه لایفاء دینه فاذا امتنع ناب القاضی منابه.

ولما فی التنویر مع الدر:(۶/۱۵۰،طبع سعید)
(لا)یبیع القاضی(عرضه ولا عقاره)للدین(خلافا لهما وبه)ای بقولهما ببیعهما للدین (یفتی) وفی الشامیة(قوله لبیع ماله)اطلق المال فشمل......وکل ما هو ملک له رملی ولا یکون ذلک اکراها لانه بحق کما مر فی محله اذ هو ظالم بالمنع (قوله یعنی بلا امره)لان للدائن ان یاخذ بیده اذا ظفر بجنس حقه بغیر رضا المدین فکان للقاضی ان یعینه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ	فتویٰ نمبر:۲۶۶۸

﴿اپنی مملوکہ زمین کا کرایہ اپنے حصے کے بقدر دوسرے شریک سے وصول کرنا﴾

﴿سوال﴾ میں مشرف حسین اپنے ایک دوست کے ساتھ پولٹری فارم میں چوزے پال کر بیچنے کا کاروبار کرنا چاہتا ہوں اور دونوں کا سرمایہ برابر ہے،البتہ پولٹری فارم میری ملکیت ہے،کیا میں اپنے شریک سے اس کے حصے کے بقدر اپنے پولٹری فارم کا کرایہ لے سکتا ہوں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں مشرف حسین کو اپنے شریک سے اس کے حصے کے بقدر اپنے ذاتی پولٹری فارم کا کرایہ لینا جائز ہے۔

لما فی الهندیة:(۲/۳۵۷،طبع رشیدیه)
ولو کان لاحدهما سفینة فاراد ان نقل الطعام فی بلد فقال احدهما للذی له السفینة اجرنی نصف

سليتتك احمل عليها حصتي من الطعام وحصتك منه في نصف سليتتك ففعل جاز وكل شي ليس يكون منه العمل استاجره احدهما من صاحبه فهو جائز مثل الجوالق وغيره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۲ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۳۰۵

﴿مطلقہ ثلاثہ کے لیے اجرت رضاعت لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بھائی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں اور بھابھی عدت میں ہے اسکی ایک چھوٹی بچی ہے جسے وہ اجرت پر دودھ پلا رہی ہے۔ بھابھی ابھی اجرت کا مطالبہ کر رہی ہے اور بھائی کہہ رہا ہے کہ عدت میں آپ کا خرچہ میں دے رہا ہوں۔ عدت کے بعد دودھ پلانے کے پیسے دونگا۔ براہ کرم شریعت کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل بتا دیں؟　　　　مستفتی: محمد عبداللہ

﴿جواب﴾ تین طلاق دینے سے میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے اب اگر وہ اپنی خوشی سے بچی کو بلا معاوضہ دودھ نہیں پلانا چاہتی تو اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا، بچی کے لیے دودھ پلانے کا انتظام شوہر کے ذمہ ہے۔ لہذا بچی کی ماں اگر مناسب اجرت کا مطالبہ کرتی ہے تو اسے اجرت دینا لازم ہے اور اگر وہ عدت شوہر کے گھر میں گزارتی ہے تو عورت کا نان ونفقہ بھی دینا ضروری ہے۔

لما في الهندية: (۱/۵۶۱، طبع: رشيديه)

"المعتدة عن الطلاق بائن أو طلقات ثلاث في رواية ابن زياد تستحق اجر الرضاعة، وعليه الفتوى كذا في جواهر الاخلاطي".

ولما في الشامي: (۳/۶۱۹، طبع: سعيد)

وعلى المولود له رزقهن، ففي حال الزوجية والعدة قائم برزقها بخلاف ما بعدها فيقوم اجر مقامه اه قلت: وتحقيقه ان فعل الارضاع واجب عليها ومؤنة على الاب لانها من جملة نفقة الولد، ففي حال الزوجية والعدة هو قائم بتلك المؤنة لا بعد البينونة فتجب عليه بعدها وان وجب على الام ارضاعه لقوله تعالى: لاتضار والدة بولدها. فان الزامها بارضاعه مجانا مع عجزها وانقطاع نفقتها عن الاب مضارة لها...... فساغ لها اخذ الاجرة بعد البينونة: لا تجبر على ارضاعه قضاء.

ولما في تقريرات الرافعي: (۳/۲۵۵، طبع: سعيد)

اما اذا كانت معتدة عن طلاق رجعي لا تستحق اجرة الرضاع على الزوج أيضاً واما اذا كانت الام معتدة عن طلاق بائن او طلقات ثلاث فقيل تستحق اجرة الرضاع ففيه

روایتان وفی العجمۃ روایۃ محمدؒ لایجوز وفی روایۃ الحسن یجوز وعلیہ الفتوی اھ.

ولما فی الفتاوی قاضی خان علی ھامش الھندیہ:(۴۲۶/۱،طبع:رشیدیہ)

وان کانت الام فی العدۃ من طلاق بائن او ثلاث فاستاجرھا لارضاع الولد..........الاصل تستحق الاجرۃ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب:تنویر الرحمٰن غفر لہ ولوالدیہ

۲۲جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ

فتوی نمبر:۳۸۰۵

﴿فلمی سی ڈیز بیچنے والے کو دوکان کرایہ پر دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بازار میں ایک دوکان ہے جو تقریباً دو ماہ سے خالی پڑی تھی، اب ایک شخص اس دوکان کو کرایہ پر حاصل کرنا چاہتا ہے اور فلمی سی ڈیز (C . D) اور کیسٹ وغیرہ کی دوکان کھولنا چاہتا ہے، ایسے شخص کو دوکان کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی:محمد ارشد بلال کالونی کورنگی

﴿جواب﴾ کسی شخص کا اپنی دوکان ایسے شخص کو کرایہ پر دینا جو کہ اس میں (C . D) یا اسی طرح کسی دوسرے گناہ کا ارتکاب کرے فی نفسہ اگر چہ جائز ہے لیکن چونکہ اس میں کچھ نہ کچھ دوسروں کے ساتھ گناہ کے کاموں میں تعاون کرنا ہے، اس لئے کراہت سے خالی نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے لئے بہتر یہ ہے اور تقوی کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ ایسی چیزوں کے لئے دوکان کو کرایہ پر نہ دیں۔

لما فی التنویر مع الدر:(۳۹۲/۶،طبع سعید)

جاز (اجارۃ بیت بسواد الکوفۃ)...... لان غالب اھلھا اھل الذمۃ (لیتخذ بیت نار او کنیسۃ او بیعۃ او یباع فیہ الخمر) وقالا لاینبغی ذلک لانہ اعانۃ علی المعصیۃ وبہ قالت الثلاثۃ زیلعی.قال ابن عابدینؒ:(قولہ جاز اجارۃ بیت الخ) ھذا عندہ ایضاً لان الاجارۃ علی منفعۃ البیت،ولھذا یجب الأجر بمجرد التسلیم ولا معصیۃ فیہ وانما المعصیۃ بفعل المستأجر وھو مختار فینقطع نسبتہ عنہ،فصار کبیع الجاریۃ ممن لا یستبرئھا او یاتیھا من دبر وبیع الغلام من لوطی والدلیل علیہ انہ لو آجرہ للسکنی جاز وھو لابد لہ من عبادتہ فیہ اھ زیلعی ومثلہ فی النھایۃ والکفایۃ قال فی المنح:وھو صریح فی جواز بیع الغلام من اللوطی،والمنقول فی کثیر من الفتاوی انہ یکرہ وھو الذی عولنا علیہ فی المختصر.

ولما فی خلاصۃ الفتاوی:(۱۴۹/۳،طبع رشیدیہ)

اما علی قول ابی حنیفۃؒ لایکرہ وکذا فی کل موضع تعلق المعصیۃ بفعل فاعل مختار

ومن جملۃ ذلک لو آجر بیتہ لیتخذ فیہ بیعۃ او کنیسۃ او بیت نار یطیب لہ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۱۸ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
فتویٰ نمبر: ۲۶۲۳

﴿سودی بینک کے ملازم کے گھر میں کرایہ پر رہنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم جس گھر میں کرایہ پر رہتے ہیں، اس کا مالک سودی بینک کا ملازم تھا اور اس نے اسی بینک کی آمدنی سے گھر بنایا تھا، آیا ایسے شخص کے گھر کو کرایہ پر لینا درست ہے یا نہیں؟

مستفتی: قاری نورالحق کوٹ غلام محمد

﴿جواب﴾ ایسے شخص کے بنائے ہوئے گھر میں کرایہ پر رہنے کی گنجائش ہے، تاہم بہتر اور احتیاط اسی میں ہے کہ ایسے لوگوں کا کرایہ دار بھی نہ بنیں۔

لما فی الشامی: (۲۳۵/۵ طبع ایچ ایم سعید)

(قولہ اکتسب حراما الخ) توضیح المسئلۃ ما فی التتارخانیۃ حیث قال: رجل اکتسب مالاً من حرام ثم اشتری فھذا علی خمسۃ اوجہ: اما ان دفع تلک الدراھم الی البائع اولاً ثم اشتری منہ بھا او اشتری قبل الدفع بھا ودفعھا، او اشتری قبل الدفع بھا ودفع غیرھا او اشتری مطلقاً ودفع تلک الدراھم، او اشتری بدراھم اخر ودفع تلک الدراھم ـ وقال الکرخی: فی الوجہ الاول والثانی لا یطیب وفی الثلاث الاخیرۃ یطیب، وقال ابوبکر: لا یطیب فی الکل لکن الفتوی الآن علی قول الکرخی دفعاً للحرج عن الناس وفی الولوالجیۃ: وقال بعضھم: لا یطیب فی الوجوہ کلھا وھو المختار ولکن الفتوی الیوم علی قول الکرخی دفعاً للحرج لکثرۃ الحرام.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
فتویٰ نمبر: ۲۶۲۷

﴿اجارہ کے معاملہ کو قرض کے معاملہ کیساتھ مشروط کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص مثلاً زید کو دو لاکھ روپے کی ضرورت تھی بکر نے اس شرط پر دو لاکھ روپے بطور قرض دیدیئے کہ تم مجھے اپنی زمین چار کنال مبلغ پانچ ہزار (۵۰۰۰) روپے ایک سال کیلئے اجارہ پر دینگے اور دونوں اس پر راضی بھی ہوگئے حالانکہ اتنی زمین علاقے میں دس ہزار (۱۰۰۰۰) روپے پر دی جاتی ہے، آیا شرعاً ان

دونوں کیلئے اجارہ کا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: ضیاء الرحمٰن زیدہ صوابی

﴿جواب﴾ قرض محض احسان وثواب کا کام ہے کسی ایسی شرط پر قرض دینا جس میں قرض خواہ کا دنیاوی کوئی فائدہ ہو جائز نہیں ہے، شریعت نے قرض کی بنیاد پر کسی بھی قسم کا فائدہ حاصل کرنے کو سود قرار دیا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے: (مصنف ابن ابی شیبۃ: ۵/۸۰، طبع امدادیہ)

حدثنا ابوبکر ..... قال، عن ابراھیم قال: کل قرض جر منفعۃ فھو ربا.

لہذا اس شخص نے دو لاکھ روپے بطور قرض اس شرط پر اگر دیئے ہیں کہ قرضدار زمین اس کو بطور اجارہ دیدے تو یہ سودی معاملہ ہے ہرگز جائز نہیں ہے، دونوں پر لازم ہے کہ اس معاملہ کو ختم کریں، البتہ قرض خواہ زمین اجارہ پر لینے کی شرط سے اگر صرف نظر کرلے تو قرض کی حد تک یہ معاملہ درست رہیگا۔

لما فی الشامی: (۵/۱۶۶، طبع ایچ ایم سعید)

(قولہ کل قرض جر نفعا حرام) ای اذا کان مشروطا کما علم مما نقلہ عن البحر وعن الخلاصۃ وفی الذخیرۃ.

ولما فی بدائع الصنائع: (۷/۳۹۵، طبع ایچ ایم سعید)

واما الذی یرجع الی نفس القرض فھو ان لایکون فیہ جر منفعۃ فان کان لم یجز نحو ما اذا اقرضہ دراھم غلۃ علی ان یرد علیہ صحاحا او اقرضہ وشرط شرطا لہ فیہ منفعۃ لما روی عن رسول اللہ ﷺ انہ نھی عن قرض جر نفعا ولان الزیادۃ المشروطۃ تشبہ الربا لانھا فضل لا یقابلہ عوض والتحرز عن حقیقۃ الربا وعن شبھۃ الربا واجب ھذا اذا کانت الزیادہ مشروطۃ فی القرض.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ　　　　فتوی نمبر: ۲۵۱۳

﴿بینک کے لئے مکان کرایہ پر دینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ کیا کسی بھی بینک کو جگہ کرایہ پر دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ سودی بینک کو مکان کرایہ پر دینا گناہ کا معاون اور سبب بننے کی وجہ سے نامناسب ہے، لہٰذا ایسے ادارے جو سودی معاملات کرتے ہوں مکان کرایہ پر دینے سے احتراز کیا جائے، ہاں جو سودی معاملات نہ کرتے ہوں انہیں مکان کرایہ پر دینا بلا شبہ جائز ہے۔

لما فی قولہ تعالیٰ: (سورۃ المائدۃ، آیت ۲) ﴿ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾

ولمافی المظھری:(۱۹/۳،طبع رشیدیه)
ای لاتعاونوا علیٰ ارتکاب المنهیات.....وعن ابی ثعلب قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم البرماسکنت الیه النفس واطمأن الیه القلب وان افتاك المفتون رواه احمد.
ولمافی المرقاۃ:(۴۳/۲،طبع رشیدیه)
عن جابر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم آکل الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه هم سواء(رواه مسلم)قال النووی:فیه تصریح بتحریم کتابة المترابیین والشهادة علیهمابتحریم الاعانةعلی الباطل.
ولمافی التنویرمع الدر:(۳۹۲/۲،طبع ایچ ایم سعید)
وجاز(اجارة بیت بسوادالکوفة)ای قراها(لابغیرهاعلی الاصح لیتخذبیت ناراوکنیسة اوبیعةاویباع فیه الخمر)وقالالاینبغی ذلک لانه اعانةعلی المعصیةوبه قالت الثلاثة زیلعی.
ولمافی الهندیة:ج۴ ص۴۴۹،مکتبه رشیدیه)
اذااستاجرالذمی من المسلم بیتالیبیع فیه الخمرجازعندابی حنیفةرحمه الله خلافا لهماکذافی المضمرات.ولواستاجرالذمی من الذمی بیتایباع فیه الخمرجازعندهم جمیعا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:عبدالوہاب لقمانی عفااللہ عنہ
۱۴صفرالخیر۱۴۱۳ھ — فتوی نمبر:۲۴۲۹

﴿ٹیوشن اکیڈمی کا ٹیچر کو ٹیوشن دلانے پر اجرت لینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ٹیوشن اکیڈمی کے پاس کوئی ٹیوشن آتی ہے تو اکیڈمی والے ٹیچر سے رابطہ کرتے ہیں اور معاہدہ کرتے ہیں کہ ٹیوشن سے پہلی سیلری پر پچاس فیصد ہمیں دیں گے اور اگر مسلسل چھ ماہ ٹیوشن پڑھائیں تو چھٹے مہینے کی سیلری میں سے تیس فیصد ہمیں دیں گے،دوسرا معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اس ٹیوشن سے کوئی دوسری جگہ ٹیوشن ملے گی اگرچہ اکیڈمی کے واسطہ سے نہ ہو تو بھی اس کی سیلری میں سے تیس فیصد ہمیں دیں گے،آیا ہمارا اسطرح کا معاہدہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

مستفتی:پروفیسر عبدالرحیم

﴿جواب﴾ ٹیوشن اکیڈمی کی حیثیت دلال کی ہے جسطرح دلال کیلئے اجرت لینا درست ہے،اسی طرح اکیڈمی کا ٹیچر کو ٹیوشن فراہم کرنا اور اسپر اجرت لینا بھی درست ہے،لہٰذا اکیڈمی کا ٹیچر کی پہلی سیلری میں سے پچاس فیصد لینا تو جائز ہے۔
لیکن معاہدہ میں یہ طے کرنا کہ اگر مسلسل چھ ماہ پڑھاتے ہو جائیں تو چھٹے ماہ کی کی سیلری سے ٹیچر اکیڈمی کو تیس فیصد دے گا یا یہ معاہدہ کرنا کہ اس ٹیوشن سے دوسری جگہ ٹیوشن مل جائے اگرچہ

اکیڈمی کا اس میں کوئی عمل ومحنت نہ ہو تو اس دوسری ٹیوشن کی سیلری میں سے بھی تیس فیصد اکیڈمی کو دینا ہوں گے تو معاملہ میں ان دونوں باتوں کو طے کرنا شرعاً غلط ہے، اس سے معاملہ فاسد ہو جاتا ہے۔

لما فی الشامی: (۶/ ۶۳ طبع ایچ ایم سعید)

قال فی التاترخانیة: وفی الدلال والسمسار یجب اجر المثل، وماتواضعوا علیه ان فی کل عشرة دنانیر کذا فذلک حرام علیهم وفی الحاوی: سئل محمد بن سلمة عن اجرة السمسار، فقال: ارجو انه لاباس به وان کان فی الاصل فاسد الکثرة التعامل وکثیر من هذا غیر جائز، فجوزوه لحاجة الناس الیه کدخول الحمام.

ولما فی التنویر مع الدر: (۵/ ۸۴-۸۵ طبع سعید)

(و) لا (بیع بشرط)..... (لایقتضیه العقد ولایلائمه وفیه نفع لاحدهما او) فیه نفع (لمبیع) هو (من اهل الاستحقاق) للنفع بان یکون آدمیا..... (ولم یجر العرف به و) لم (یرد الشرع بجوازه)

وفی الشامیة: (قوله ولایقتضیه العقد ولایلائمه) قال فی البحر: معنی کون الشرط یقتضیه العقدان یجب بالعقد من غیر شرط، ومعنی کونه ملائما ان یؤکد موجب العقد، وکذا فی الذخیرة وفی السراج الوهاج: ان یکون راجعا الی صفة الثمن او المبیع کاشتراط الخبز والطبخ والکتابة مافی البحر.

ولما فی الهدایة: (۳/ ۶۱ طبع رحمانیه)

وکل شرط لایقتضیه العقد وفیه منفعة لاحد المتعاقدین او للمعقود علیه وهو من اهل الاستحقاق یفسده.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدابخش

۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ | فتویٰ نمبر: ۲۶۹۰

﴿مدت اجارہ ختم ہونے سے پہلے مکان فروخت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے بکر سے پانچ سال کے لئے مکان کرایہ پر لیا اور دونوں میں یہ معاہدہ بھی ہوا کہ بکر زید سے پانچ سال سے پہلے مکان خالی نہیں کرائے گا لیکن تین سال کے بعد بکر نے وہ مکان فروخت کر دیا، کیا بکر کا وہ مکان فروخت کرنا ازروئے شرع درست ہے؟ نیز کیا اس صورت میں زید پر مکان خالی کرنا ضروری ہوگا؟ مستفتی: محمد آصف

﴿جواب﴾ بکر پر معاہدہ کی پابندی شرعاً واجب ہے پانچ سال سے پہلے زید سے مکان خالی نہیں کرا سکتا، معاہدہ کے مطابق اجارہ کی مدت ابھی باقی ہے اور بکر نے مکان بیچ دیا تو یہ عقد فی نفسہ صحیح ہے۔ البتہ قبضہ دینے میں زید کی رضامندی ضروری ہے، زید اجارہ کی مدت مکمل گزارنے سے پہلے مکان خالی کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو خریدار مقررہ مدت تک انتظار کرے یا

قاضی کی مدد سے عقد کو فسخ کرائے۔

لمافی شرح المجلۃ:(۶۹۰/۲،المادۃ:۵۹۰طبع رشیدیہ)

لو باع الاجر الماجور بدون المستاجر یکون البیع نافذا بین البائع والمشتری وان لم یکن نافذا بحق المستاجر،لان کون الماجور ملکا للاجر یقتضی نفاذ البیع وکونہ تعلق بہ حق المستاجر یمنع نفاذہ،فقدم المانع علی المقتضی فی حق المستاجر فلم ینفذ فی حقہ ومعنی نفاذہ فی حق المشتری انہ لایملک الفسخ لواجاز المستاجر البیع او انقضت مدۃ الاجارۃ.....حتی انہ بعد انقضاء مدۃ الاجارۃ یلزم البیع فی حق المشتری ولیس لہ الامتناع عن الاشتراء الاان یطلب المشتری تسلیم المبیع من البائع قبل انقضاء مدۃ الاجارۃ ویفسخ القاضی البیع لعدم امکان تسلیمہ وان اجاز المستاجر البیع یکون نافذا فی حق کل منھم ولکن لایوخذ الماجور من یدہ مالم یصل الیہ مقدار مالم یستوفہ من بدل الاجارۃ الذی کان اعطاہ نقدا ولو سلم المستاجر الماجور قبل استیفاء ذلک سقط حق حبسہ.

ولمافی التنویر مع الدر:(۸۳/۶،طبع ایچ ایم سعید)

بخلاف (بیع ماجرہ) فانہ ایضالیس بعذر بدون لحوق دین کمامر ویوقف بیعہ الی انقضاء مدتھا ھو المختار،وفی الشامیۃ:قولہ للمرتھن فسخہ قال الشرنبلالی فی شرح الوھبانیۃ:والمختار انہ موقوف فیفتی بان بیع المستاجر والمرھون صحیح لکنہ غیر نافذ ولا یملکان فسخہ فی الصحیح وعلیہ الفتوی.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:عدنان خدابخش

۲۲ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ　　　　فتوی نمبر:۲۶۴۷

اجارہ کی ایک صورت کا حکم

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص مثلاً زید اپنے دوست بکر کو اگر گائے دیدے تاکہ وہ اسکی رکھوالی کرے خوراک وغیرہ کا انتظام کرے اور حاصل ہونے والا دودھ آپس میں تقسیم کریں تو یہ جائز ہوگا یا ناجائز؟ جواز کیلئے کوئی بھی صورت بن سکتی ہو تو بتادیں؟

﴿جواب﴾ زید کی گائے ہو اور بکر کے ذمہ اسکی رکھوالی،خوراک دودھ نکالنا ہو اور زید بکر کو اس خدمت اور چارہ کے بدلے میں اس گائے سے حاصل ہونے والا دودھ کا مثلاً آدھا حصہ دے تو یہ اجارہ فاسدہ کی ایک صورت ہے شرعاً جائز نہیں ہے،اس لئے کہ گائے کا چارہ مجہول اور حاصل ہونے والا دودھ بھی مجہول بلکہ ممکن ہے دودھ ہی نہ نکلے اور آپس میں جھگڑے کی نوبت آئے شریعت اس طرح کے معاملات سے منع کرتی ہے۔

البتہ جائز صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یومیہ خوراک کیلئے چارہ، دانہ وغیرہ کی ایک خاص مقدار مقرر کرلیں مثلاً دو کلو یہ بکر کے ذمہ ہوگا اور زائد اپنی طرف سے دینا چاہے تو دیتا رہے اور زید خدمت اور اس چارہ کے عوض دودھ کی ایک خاص مقدار مثلاً ایک کلو، دو کلو دینا طے کرے پھر چاہے تو زیادہ بھی دیا کریں لیکن اپنے ذمہ ایک خاص مقدار مقرر کرلیں کہ اس کے بدلے دودھ دیا کروں گا یعنی کوئی سا دودھ خاص اس گائے کا بھی مقرر نہ کریں بعد میں عملاً بیشک اسی گائے کا دیا کریں تو اس صورت کی گنجائش معلوم ہورہی ہے۔

لما فی الهندية:(۴/۴۴۵،طبع رشیدیه)

دفع بقرة الى رجل على ان يعلفها ومايكون من اللبن والسمن بينهما انصافا فالاجارة فاسدة وعلى صاحب البقر للرجل اجر قيامه وقيمة علفه ان علفها من علف هو ملكه لا ما سرحها فى المرعى ويرد كل اللبن ان كان قائما وان اتلف فالمثل الى صاحبها لان اللبن مثلى.

ولما فی خلاصة الفتاوی:(۴/۱۱۴ طبع رشیدیه)

رجل دفع بقرة الى رجل بالعلف مناصفة وهى التى يسمى بالفارسية كاونيم سود بان دفع على ان مايحصل من اللبن والسمن بينهما نصفان فهذا فاسد والحادث كله لصاحب البقرة والاجارة فاسدة ولو اكل اللبن مع هذا والبعض قائم فما كان من اللبن قائما يرد على مالك البقرة وما كان اكل يرد مثله من اللبن والمصل الذى فعله وله على المالك قيمة علفها واجر المثل فى قيامه عليها.

ولما فی فیض الباری:(۴/۲۸۴،طبع رشیدیه)

ان من البيوع الفاسدة مالواتى بها احد جازت ديانة وان كانت فاسدة قضاء وذالك لان الفساد قد يكون لحق الشرع بان اشتمل العقد على ماثم فلا يجوز بحال، وقد يكون الفساد لمخافة التنازع ولا يكون فيه شىء آخر يوجب الاثم فذالك ان لم يقع فيه التنازع جاز عندى ديانة وان بقى فاسدا قضاء لارتفاع علة الفساد وهى المنازعة، ويدل عليه مسائلهم فى باب المضاربة والشركة فانها ربما تكون فاسدة مع ان الربح يكون طيبا وراجع "الهداية" ونبه الحافظ ابن تيمية فى رسالته على ان من البيوع مالا يقع فيه النزاع فتكون تلك جائزة فاذا ادخلتها فى الفقه وجدتها محظورة لان اكثر احكام الفقه تكون من باب القضاء، والديانات فيها قليلة وانما يصار الى القضاء بعد النزاع فاذا لم يقع النزاع ولم يرفع الامر الى القاضى نزل حكم الديانة لا محالة فيبقى الجواز. بحواله جدید فقہی مسائل(۴/۱۲۸ طبع زمزم پبلشرز)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۲۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ | فتویٰ نمبر: ۲۵۴۷

﴿اجارہ میں زمیندار کو کاشت کی عام اجازت دینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی زمین بکر کو چار سال کیلئے اجارہ پر دیدی اور ان دونوں کے درمیان عقد اجارہ اس طرح طے پایا کہ مالک زمین زید نے بکر کو کہا کہ آپ زمین میں جو چاہے کاشت کر سکتے ہیں، تو کیا رُوئے شرع ایسا عقد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: اعجاز علی بام خیل صوابی

﴿جواب﴾ زمین کاشت کیلئے بطور اجارہ دینا جائز ہے اور عقد کے وقت کاشت ہونے والی چیز کی تعیین ضروری ہے تاکہ بعد میں جھگڑے کی نوبت نہ آئے، اس لئے کہ بعض اشیاء بلدی انتہاء کو پہنچتی ہیں اور بعض بڑی مدت تک باقی رہتی ہیں، البتہ کسی علاقہ میں کاشت ہونے والی اشیاء متعارف ہوں یا مالک زمین کی طرف سے وضاحت کیساتھ کھلی اجازت ہو تو ایسی صورت میں چونکہ جھگڑے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے اسلئے ایسی صورت میں جائز ہے۔

لما في الهداية: (۳/۳۰۰، طبع رحمانيه)

ولا يصح العقد حتى يسمى ما يزرع فيها لانها قد تستاجر للزراعة ولغيرها وما يزرع فيها متفاوت فلا بد من التعيين كيلا يقع المنازعة او يقول على ان يزرع فيها ما شاء لانه لما فوض الخيرة اليه ارتفعت الجهالة المفضية الى المنازعة.

ولما في التنوير مع الدر: (۶/۲۹، طبع ایچ ایم سعید)

(و) تصح اجارة (ارض للزراعة مع بيان ما يزرع فيها او قال ان ازرع فيها ما اشاء) كي لا تقع المنازعة والا فهي فاسدة للجهالة.

ولما في الفتاوى الهندية: (۴/۴۴۰، طبع رشيديه)

ولا بد في اجارة الارض من بيان ما يستاجر له من الزراعة والغرس والبناء وغير ذلك فان لم يبين كانت الاجارة فاسدة الا اذا جعل له ان ينتفع بها با شاء. هكذا في البدائع.

واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۲۵۷۵

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

﴿ٹیوب ویل کا پانی اجارہ پر دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ٹیوب ویل کے مالک اور مالک زمین کے درمیان اس شرط پر عقد ہو جائے کہ مالک زمین اپنی زمین کیلئے پانی کے عوض

ٹیوب ویل کے مالک کو پچاس روپے فی گھنٹہ کے حساب سے دے گا، تو اس طریقہ سے معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: طارق احمد شیوہ واہ

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں مدت اور اجرت دونوں متعین ہے اور جب اجرت اور مدت متعین ہو تو ناجائز ہونے کی کوئی صورت بظاہر معلوم نہیں ہوتی، لہٰذا مذکورہ معاملہ درست ہے۔

لمافی خلاصة الفتاوی:(۱۰۳/۲، طبع رشیدیه)

فی شرح الطحاوی عقدالاجارة لایجوزالاان یبین البدل من الجانبین جمیعاامابیان المنفعةفباحدی معانی ثلاثةبیان الوقت وهوالاجل وبیان العمل وبیان المکان اما الاجران کان دراهم اودنانیرفالشرط بیان القدرویقع علی نقدالبلد.

ولمافی البزازیة علی هامش الهندیة:(۱۱/۵ طبع رشیدیه)

لایجوزعقدهاحتی یعلم البدل والمنفعةوبیان المنفعةباحدثلاث بیان الوقت وهوالاجل وبیان العمل والمکان فالاجرببیان القدروهوعلی غالب نقدالبلد.

ولمافی الدرالمختار:(۵/۶ طبع ایچ ایم سعید)

وشرطهاکون الاجرة والمنفعةمعلومتین لان جهالتهماتفضی الی المنازعة.

ولمافی مجمع الانهر:(۲۲۷/۲ طبع المنار کوئٹه)

وما احرزمن الماء بحب وکوزونحوه لایؤخذالابرضی صاحبه وله ای لصاحب الماء المحرزبیعه ای بیع الماء لانه ملکه بالاحراز.

ولمافی الفتاوی الهندیة:(۱۲۱/۳ طبع رشیدیه کوئٹه)

امابیع ماء جمعه الانسان فی حوضه ذکرشیخ الاسلام المعروف بخواهرزاده فی شرح کتاب الشرب ان الحوض اذاکان مجصصااوکان الحوض من نحاس اوصفرجاز البیع علی کل حال وکانه جعل صاحب الحوض محرزالماء بجعله بحوله ولکن بشرط ان ینقطع الجری حتی لایختلط المبیع بغیرالمبیع.

ولمافی اصول الافتاء لشیخ الاسلام محمد تقی العثمانی حفظه الله تعالی:(ص۵۸)

ان الحکم لایتغیربتغیرالحکمةوانمایتغیربتغیرالعلةومثال ذلک ماذکره الفقهاء من ان بیع الماء لسقی المزارع ممنوع ولکن علةهذاالمنع عدم ضبط مقدار الماء فحیث وجدت هذه العدادات انتفت علة المنع فجاز بیع الماء.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۵ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

فتویٰ نمبر: ۲۵۹۹

﴿رہن رکھا ہوا مکان کرایہ پر دینا﴾

﴿سوال﴾ زید کو کچھ رقم کی ضرورت پیش آئی تو زید نے مطلوبہ رقم بکر سے وصول کی اور

راہن کے طور پر زید نے بکر کو ایک خالی مکان دیا اور دونوں آپس میں مشورہ کر کے اس بات پر راضی ہو گئے کہ بکر یعنی مرتہن مکان کو اپنے قبضہ میں رکھتے ہوئے کرایہ پر دے گا جسمیں آدھا کرایہ زید کا ہوگا اور آدھا بکر کا اور جب راہن یعنی زید بکر کو اسکی رقم واپس کر دے گا تو بکر اسکا مکان واپس کر دے گا، از روئے شرع اس طرح معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: سلمان شیر

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں بکر کو دیئے گئے مکان کی حیثیت گروی کی ہے، لہذا بکر یعنی مرتہن کیلئے کسی بھی صورت میں اس مکان سے حاصل ہونے والا کرایہ اپنے لئے وصول کرنا جائز نہیں ہے اگرچہ راہن یعنی زید اسکی باقاعدہ اجازت بھی دیدے اسلئے کہ قرض کی بنیاد پر کوئی بھی نفع حاصل کرنا سود کے زمرے میں داخل ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

لما فی مصنف ابن ابی شیبۃ:(۸۰/۵،طبع امدادیہ)

حدثنا ابوبکر......عن ابراھیم قال:کل قرض جر منفعۃ فھو ربا.

البتہ زید چونکہ مکان کا مالک ہے اس کیلئے کرایہ وغیرہ حاصل کرنا جائز ہے بشرطیکہ بکر اسکی اجازت دے اسی طرح بکر زید ہی کے لئے مکان کا کرایہ وصول کر کے اسکو دیتا رہے تو یہ بھی جائز ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۴۸۲/۶،طبع ایچ ایم سعید)

(لا انتفاع بہ مطلقا)لا باستخدام ولا سکنی ولا لبس ولا اجارۃ ولا اعارۃ سواء کان من مرتھن او راھن(الا باذن)کل للاخر وقیل لا یحل للمرتھن لانہ ربا.

وفی الشامیۃ:(قولہ لا یحل للمرتھن)قال فی المنح عبداللہ محمد بن اسلم السمرقندی وکان من کبار علماء سمرقند انہ لا یحل لہ ان ینتفع بشیئ منہ بوجہ من الوجوہ وان اذن لہ الراھن لانہ اذن لہ فی الربا لانہ یستوفی دینہ کاملا فتبقی لہ المنفعۃ فضلا فیکون ربا وھذا امر عظیم وبعد اسطر قال:قلت والغالب من احوال الناس انھم انما یریدون عند الدفع الانتفاع ولولاہ لما اعطاہ الدراھم وھذا بمنزلۃ الشرط لان المعروف کالمشروط وھو مما یعین المنع واللہ تعالی اعلم..

ولما فی الشامی:(۵۲۲/۶،طبع ایچ ایم سعید)

ثم نقل عن التھذیب انہ یکرہ للمرتھن ان ینتفع بالرھن وان اذن لہ الراھن قال المصنف وعلیہ یحمل ما عن محمد بن اسلم من انہ لا یحل للمرتھن ذالک ولو بالاذن لانہ ربا قلت وتعلیلہ یفید انھا تحریمیۃ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر:۲۶۰۰

﴿سودی رقم سے تنخواہ لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ مسجد کے امام صاحب کو جو لوگ تنخواہ دیتے ہیں وہ سودی کاروبار کرتے ہیں، آیا امام صاحب کیلئے ان سے تنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تو اب تک جو وصول کی ہے اسکا کیا حکم ہے؟ حالانکہ امام صاحب کو انکے سودی کاروبار ہونے کا علم نہیں تھا اور آئندہ کیلئے امام صاحب کس طریقے سے ان سے تنخواہ وصول کرے؟ مستفتی: محمد یاسر مری پنجاب

﴿جواب﴾ امام صاحب کو چونکہ اب تک ان لوگوں کے سودی کاروبار کا علم نہیں تھا، اس لئے اب تک ان سے تنخواہ لینا جائز تھا اور اب علم ہونے کے بعد ان پر واضح کردیں کہ مجھے پاک مال سے ہی تنخواہ دیتے رہیں سودی رقم سے نہ دیں پھر دیتے وقت یہ لوگ اگر یہی ظاہر کریں کہ یہ سودی رقم نہیں ہے تو امام صاحب کیلئے لینا جائز ہے زیادہ کرید میں نہ پڑے۔

لماقوله تعالىٰ:(سورة البقرة،آيت ۱۷۲)يايها الذين آمنوا كلوا من طيبٰت مارزقنكم۔۔۔ الآية.

ولمافي احكام القرآن للجصاص:(۷۴/۲،طبع قديمى)

قوله تعالىٰ ولاتتبدلوا الخبيث بالطيب فانه روى عن مجاهدوابى صالح "الحرام بالحلال اى ولاتجعل بدل رزقك الحلال حراما.

ولمافي الدر المختار:(۹۸/۵،طبع ايچ ايم سعيد)

الحرمة تتعددمع العلم بها،وقال الشامي: نقل الحموى عن سيدى عبدالوهاب شعرانى انه قال فى كتابه المنن ومانقل عن بعض الحنفية من ان الحرام لايتعدى ذمتين سالت عنه الشهاب بن الشلبى فقال:هو محمول على ما اذالم يعلم بذلك.وهكذافى ردالمحتار:(۳۸۵/۲،طبع ايچ ايم سعيد)

ولمافي الفتاوى الهندية:(۳۴۳/۵،طبع رشيديه)

آكل الربا وكاسب الحرام اهدى اليه اواضافه وغالب ماله حرام لايقبل ولاياكل مالم يخبره ان ذلك المال اصله حلال ورثه اواستقرضه وان كان غالب ماله حلالالابأس بقبول هديته والاكل منها كذافى الملتقط ومثله فى البزازية:(۳۶۰/۲،طبع رشيديه)والاشباه:(ص ۱۱۳،طبع قديمى)والولوالجية (۳۳۱/۲،طبع فاروقيه پشاور)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۶۲

﴿کمیشن پر چندہ کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ مدرسہ کے سفیر حضرات

کمیشن پر چندہ کرتے ہیں یعنی انکے ساتھ یہ طے کیا جاتا ہے کہ جتنا چندہ وصول کریں گے اس کا نصف یا ثلث انکو دیا جائے گا، یہ معاملہ شرعا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: آصف محمود کراچی

﴿جواب﴾ مدرسہ کے لئے چندہ کرنے والے کے لئے باقاعدہ ماہانہ یا یومیہ اجرت متعین کر کے معاملہ ہو تو جائز ہے، کمیشن کے طور پر اجرت لینا جائز نہیں، اجرت کے معاملہ میں اجرت مجہول ہو تو معاملہ فاسد ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس صورت میں چندہ ہی سے سفیر اپنا معاوضہ وصول کرتا ہے، اس لئے یہ معاملہ قفیز الطحان کے معنی میں بھی ہے، لہٰذا یہ فاسد معاملہ ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔

اور چندہ کا معاملہ تو بڑا نازک ہے کمیشن پر چندہ کرنے والے شخص کا مقصد خدمت دین باقی نہیں رہ سکتا اپنی لالچ غالب آجاتی ہے پھر نام چندہ کا ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اپنی ذات کے لئے سوال کرنے کے جذبات غالب آجاتے ہیں جس سے مدرسہ والے بھی لوگوں کی نظروں سے گرتے ہیں اس لئے کسی بھی درجہ میں اس کی اجازت نہیں ہے۔

لما فی الدر المختار: (۵/۶، طبع سعید)

وشرطها كون الاجرة والمنفعة معلومتين لان جهالتهما تنفضى الى المنازعة.

ولما فی التنویر مع الدر: (۴۸/۶، طبع سعید)

(و) تفسد (بجهالة المسمى) كله او بعضه كتسمية ثوب اودابة أومائة درهم على ان يرمها المستاجر لصيرورة المرمة من الاجرة فيصير الاجر مجهولا.

ولما فی البحر الرائق: (۳۱۲/۷، طبع سعید)

فكانت كالبيع فكل ما أفسد البيع افسدها وقد ضبطه الشيخ ابوالحسن الكرخي فقال اذا كان ماوقع عليه عقد الاجارة مجهولا فى نفسه اوفى اجرة اوفى مدة الاجارة فالاجارة فاسدة.

ولما فی مجمع الانهر: (۵۳۹/۳، طبع المنار کوئٹہ)

(وفسد استئجار حائك لينسج له غزلا بنصفه) اى بنصف الغزل اوثلثه اواستجار (حمارا ليحمل عليه طعاما) الى بيته (بقفيز منه) اى من الطعام بان جعل القفيز اجرته (او) استاجر (ثورا) ليطحن له برا بقفيز من دقيقه اى دقيق ذالك البر امافساد الاولىٰ والثانية فلانه جعل الاجر بعض مايخرج من عمله فصار فى معنى قفيز الطحان.

ولما فی جامع الرموز: (۱۲۳/۲، طبع سعید)

(فيجب) عند فسادها (اجر المثل) اى اجر شخص مماثل له فى ذلك العمل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عبدالوہاب لقمانی عفااللہ عنہ

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ فتویٰ نمبر: ۲۶۵۶

﴿سودی ادارے کو زمین یا مکان کرایے پر یا ملکیۃ دینا کیسا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میرا ایک مکان ہے بینک والے اس کو بینک کیلئے کرایے پر لینا چاہتے ہیں ان کو کرایہ پر دینا کیسا ہے؟ اور اسی طرح ان کو زمین یا مکان فروخت کرنا کیسا ہے؟ حاصل شدہ قیمت کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ اگر آپ جانتے ہیں کہ میرا یہ مکان بینک کیلئے کرایہ پر حاصل کررہے ہیں یا زمین بینک کیلئے خرید رہے ہیں تو ایسے معاملے سے آپ گریز کریں، البتہ اسلامی بینک کو زمین دیں تو کوئی حرج نہیں ہے، سودی ادارے کو زمین یا مکان دینا گویا گناہ میں تعاون کے مترادف ہے، اس لئے اس سے حاصل شدہ رقم میں سود کا اثر ضرور ہوگا۔

لمافی قوله تعالى:(سورة المائدة،آیت۲)

﴿وتعاونوا على البر والتقوى ولاتعاونوا على الاثم والعدوان واتقوالله ان الله شديد العقاب.﴾

ولمافی سنن ابی داود:(۱۱۸/۲،طبع رحمانیه)

عن عبدالرحمن بن عبدالله ابن مسعود عن ابيهؓ قال: لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا وموكله وشاهده وكاتبه وفي المرقاة: عن جابرؓ قال: لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه قال النووی: فيه تصريح لتحريم كتابة المترابين والشهادة عليهما وبتحريم الاعانة على الباطل وقال هم سواء (المرقاة:(۵۱/٦،طبع رشيديه)

ولمافی الهداية:(۳۰٦/۳،طبع رحمانيه)

لايجوز الاستيجار على الغناء والنوح وكذاسائر الملاهی لانه استيجار على المعصية والمعصية لاتستحق بالعقد.

ولمافی الدر مع الرد:(۲٦۸/۳،طبع ایچ ایم سعید)

(ويكره)تحريما(بيع السلاح من اهل الفتنةان علم)لانه اعانة على المعصية.... وكذالايكره بيع الجارية المغنية والكبش النطوح والديك المقاتل والحمامة الطيارة لانه ليس عينها منكرا وانما المنكر فی استعمالها المحظور قلت لكن هذه الاشياء تقام المعصية بعينها لكن ليست هی المقصودة الاصلی منها، فان عين الجارية للخدمة مثلا والغناء عارض فلم تكن عين المنكر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالستار

۱٦ المحرم الحرام ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ٦۳۳

﴿اشیاء کا کرایہ وصول کرنا سود نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب! ایک شخص کہتا ہے کہ گاڑی یا مکان وغیرہ کا کرایہ وصول

کرنا بھی سود ہے، سوال یہ ہے کہ کرایہ وصول کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: حاجی شیراز صاحب

﴿جواب﴾ استعمال کی چیزوں کا کرایہ وصول کرنا جائز ہے، اس کو سود قرار دینا درست نہیں ہے، کہنے والے کو شاید اس بات سے غلط فہمی ہوئی ہے کہ جس طرح پیسہ قرض دیکر اس پر مشروط زیادتی وصول کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح گاڑی وغیرہ کا کرایہ وصول کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

یہ اس کا غلط قیاس ہے اسلئے کہ گاڑی اور پیسہ میں کئی وجوہ سے فرق پایا جاتا ہے اور اسی فرق کی بناء پر دونوں کے احکام مختلف ہو جاتے ہیں۔

(۱) گاڑی یا مکان وغیرہ بذات خود قابل انتفاع چیزیں ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کیلئے ان چیزوں کو خرچ کرنا نہیں پڑتا بلکہ انکا وجود برقرار رکھتے ہوئے ان سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے، لہٰذا ان کا کرایہ درحقیقت ان فوائد کا معاوضہ ہے جو براہ راست گاڑی وغیرہ سے وصول کئے جاتے ہیں، اس کے برعکس روپیہ ایسی چیز ہے جو بذات خود قابل انتفاع نہیں وہ اسوقت انسان کو فائدہ نہیں پہنچاتا جب تک اسے خرچ کر کے اس کے بدلے قابل انتفاع چیز نہ خرید لی جائے، لہٰذا جس نے کسی کو روپیہ فراہم کیا اس نے کوئی ایسی چیز فراہم نہیں کی جو براہ راست قابل انتفاع ہو، یہ شخص روپیہ خرچ کریگا تو مقصد حاصل ہوگا، اس لئے اس پر کرایہ وصول کرنے کا سوال نہیں کیونکہ کرایہ اس چیز کا ہوتا ہے جس سے اس کا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ اٹھایا جائے۔

(۲) گاڑی کے استعمال سے اسکی قدر میں کمی ہوتی ہے، اس لئے اسکو جتنا استعمال کیا جائے اس کی قدر اتنی ہی گھٹتی چلی جائے گی، لہٰذا ان جیسی چیزوں کا جو کرایہ وصول کیا جاتا ہے، اس میں قدر کے نقصان کی تلافی بھی شامل ہوتی ہے، اس کے برخلاف روپیہ ایسی چیز ہے کہ محض استعمال سے اسکی قدر میں کمی نہیں ہوتی۔

(۳) اگر کوئی شخص گاڑی کرایہ پر لیتا ہے تو اس کے ضمان (Risk) میں نہیں ہوتی بلکہ اصل مالک کے ضمان میں رہتی ہے جس کا مطلب ہے کہ گاڑی کرایہ دار کی کسی غفلت یا زیادتی کے بغیر کسی سماوی آفت کے نتیجے میں تباہ ہو جائے یا چوری ہو جائے تو نقصان کرایہ دار کا نہیں بلکہ اصل مالک کا ہوگا اور چونکہ اصل مالک اسکی تباہی کا خطرہ برداشت کر رہا ہے اور کرایہ دار کو اس خطرے سے آزاد کر کے اپنی ملکیت کے استعمال کا حق دے رہا ہے، اس لئے وہ متعین کرایہ کا

بجا طور پر حق دار ہے، اس کے برعکس جو شخص کسی کو روپیہ قرض دے رہا ہے وہ روپیہ اسکے ضمان میں نہیں آتا بلکہ قرض دار کے ضمان میں چلا جاتا ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ قرضدار کے قبضہ میں جانے کے بعد اگر وہ روپیہ کسی ناوی آفت سے تباہ ہو جائے یا چوری ہو جائے تو نقصان قرض دینے والے کا نہیں قرض لینے والے کا ہے یعنی قرض دار اس صورت میں بھی اتنا روپیہ قرض خواہ کو لوٹانے کا ذمہ دار اور پابند ہے چونکہ قرض دینے والے نے قرض دیکر اس روپیہ کا کوئی خطرہ مول نہیں لیا، اس لئے وہ اس پر کسی معاوضہ کا حقدار بھی نہیں۔ (تلخیص از اسلام اور جدید معیشت وتجارت ص ۴۷)

لمافی الھدایۃ:(۳۰۱/۲،طبع رحمانیہ)

ویجوز استیجار الدواب للرکوب والحمل،وکذافی التنویر مع الدر:(۳۲/۶،طبع سعید)

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: ریاض الرحمٰن کوہاٹی

۲۶ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتوی نمبر:۱۶۰۸

﴿کمیشن کی رقم دے کر گاہک بڑھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص کمپنی کا مال بیچتا ہے اور گاہک بڑھانے کے لئے کچھ کمیشن کی رقم اپنی جیب سے گاہک کو دیدیتا ہے تو شرعاً ایسا کرنا کیسا ہے؟ مستفتی:احسان

﴿جواب﴾ کمیشن پر مال بیچنے والا چونکہ اپنی جیب سے گاہک کو رقم دیتا ہے اور اس میں کمپنی کا بھی کوئی نقصان نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ شخص کا ایسا کرنا جائز ہے۔

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:ظہور احمد شمس

۱۴۲۹/۱/۲۰ھ　　　　فتوی نمبر:۱۱۳۰

﴿دلال (کمیشن ایجنٹ) کے پاس ایڈوانس جمع کی ہوئی رقم کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ویزا بنا کر لوگوں کو باہر ملکوں میں ملازمت کے لئے بھیجنے کا کام کرتا ہوں، ہمارا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ میرا ایک ایجنٹ کیساتھ تعلق ہے، اس نے مجھے کہہ رکھا ہے کہ آپ لوگ تیار کیا کریں اور ہر ایک کے بدلے میں کچھ پیسے لیتے رہو اب میں لوگوں کو تیار کرتا ہوں اور انکے لئے سارا دوڑ دھوپ میں ہی کرتا ہوں، اسکے ساتھ ان سے ایڈوانس کچھ رقم بھی رکھ لیتا ہوں اور یہ پوری رقم کام نہ ہونے کی

صورت میں واپس کرنی ہوتی ہے۔

پوچھنا یہ ہے کہ اب جو پیسے میرے پاس جمع ہوتے ہیں انکو اس دوران اپنی ضروریات میں خرچ کرسکتا ہوں یا نہیں؟ اور بعد میں پھر دوبارہ جمع کروں، نیز ان کیطرف سے اگر صراحۃ یا دلالۃ اجازت ہو تو کیا حکم ہے؟

مستفتی: اورنگ زیب کوہاٹی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپکی حیثیت دلال (کمیشن ایجنٹ) کی ہے اور آپکے پاس لوگوں کا جمع شدہ مال مستقل آپکے ذمے قرض ہے جسکو اپنی ضروریات میں خرچ کرنا منع نہیں ہے اور اس بات کی مستقل اجازت لینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے، دلالۃ اجازت ہوتی ہے وہی کافی ہے، البتہ کام نہ ہونے کی صورت میں پورا قرض واپس کرنا آپکی ذمہ داری ہے۔

لما فی المبسوط: (ج ۱۵ ص ۱۱۵ مطبع دار المعرفۃ بیروت)

والسمسار اسم لمن یعمل للغیر بالاجر بیعا وشراء ومقصوده من ایراد الحدیث بیان جواز ذلک ولهذا بین فی الباب طریق الجواز ثم ذکران النبی صلی الله علیه وسلم سماهم بما هو أحسن مما کانوا یسمون به انفسهم وهو الالیق بکرم رسول الله صلی الله علیه وسلم وحسن معاملته مع الناس وانما کان اسم التجار أحسن.

ولما فی الفقه الاسلامی: (۳۲۲۶/۵ مطبع رشیدیه)

السمسرة هی الوساطة بین البائع والمشتری لاجراء البیع والسمسرة جائزة والاجر الذی یأخذه السمسار حلال، لانه أجر علی عمل وجهد معقول.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود

۱۲ رجب ۱۴۳۰ھ | فتویٰ نمبر: ۲۳۵۸

﴿دلال کے لئے کمیشن کے علاوہ منافع رکھنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ (۱) خالد بطور ایجنٹ احمد سے زیورات لیکر علی کو فروخت کرتا ہے اور جو قیمت احمد نے بتائی ہے اس سے زیادہ قیمت پر بیچ کر، زائد قیمت خود رکھ لیتا ہے، کیا خالد کے لیے وہ زائد رقم جائز ہے؟ اگر نہیں تو جواز کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

(۲) مذکورہ معاملے میں خالد کے ذمہ احمد اور علی کو زیورات کی قیمت خرید اور قیمت فروخت بتانا ضروری ہے؟

(۳) اگر احمد خالد کو صراحۃ یہ کہدے کہ مجھے ان زیورات کی اتنی رقم مطلوب ہے جو زائد رقم ملے وہ تمہاری، کیا ایسی صورت میں خالد کے لئے وہ زائد رقم جائز ہو جائیگی؟ اگر درمیان میں زیورات ضائع ہو گئے تو کس کا مال ضائع ہوا؟

(۴) احمد سے خریدے ہوئے زیورات علی بیچ دے اور کچھ قیمت اسی وقت احمد کو دیدے اور بقیہ بذریعہ چیک بعد میں ادا کرنے کا خالد وعدہ کرے اور احمد بھی اسپر راضی ہے تو اس طریقہ سے رقم کی ادائیگی جائز ہے؟

(۵) اسلامی لاکٹ کی خرید وفروخت اور انکو پہننا اسی طرح غیر اسلامی لاکٹ کی خرید و فروخت جائز ہے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: احسن سبحان

﴿جواب﴾ خالد اپنے دونوں دوستوں کیلئے صرف کمیشن پر اگر کام کرتا ہے تو یہ سمسار اور دلالی کی صورت ہے طے شدہ کمیشن لینا جائز ہے لیکن سوال میں ذکر کردہ صورت میں خالد کمیشن بھی لے رہا ہے اور دونوں پر معاملہ پوشیدہ رکھتے ہوئے اپنی طرف سے زیورات کی قیمت متعین کرکے فروخت کررہا ہے گویا ایک لحاظ سے زیورات ذاتی ملکیت شمار کرکے زائد رقم لیتا ہے تو یہ ہرگز جائز نہیں ہے، خالد کے دونوں دوستوں کو علم ہو اور وہ راضی ہوں تب بھی یہ صورت جائز نہیں ہے، معاملہ کو ختم کرنا واجب ہے اسلئے کہ اس معاملہ کا مدار دیانت پر ہے اور یہ صورت امانت و دیانت کے خلاف ہے۔

البتہ خالد کو بعد میں 'علی' یا 'احمد' کمیشن کے علاوہ اضافی رقم بطور انعام دیں تو کوئی قباحت نہیں ہے، خالد کو زیادہ منافع اگر چاہیے تو سونا 'احمد' سے باقاعدہ خریدلیا کرے پھر جتنے میں چاہے ''علی'' کو یا کسی اور کو بیچدیا کرے لیکن اس صورت میں ''احمد'' واپس لینے کا پابند نہ ہوگا اور ضائع ہونے کی صورت میں خالد کا سونا ضائع ہوگا، کمیشن کی صورت میں احمد واپس لینے کا پابند ہے اور ضائع ہونے کی صورت میں احمد کا مال ضائع ہوگا بشرطیکہ خالد کی طرف سے بد احتیاطی وغیرہ نہ ہو۔

نقصان سے بچنے کے لئے خالد چاہے تو یہ تدبیر بھی اختیار کرسکتا ہے کہ کسی ایک جانب سودا کئے بغیر پہلے پوری طرح معلومات حاصل کرلے مثلاً علی کو بتادیا کہ اسطرح کے زیورات اتنے میں آپکو دے سکتا ہوں وہ لینے کو تیار ہے تو اب احمد کے ساتھ خود سودا کرلے اور علی کو وہ زیورات

دیدے یعنی پوری طرح معلومات حاصل کرنے سے پہلے حتمی طور پر کوئی قدم نہ اٹھائے۔

لمافی الشامی:(۶۰/۶،طبع سعید)

واماالدلال فان باع العین بنفسه باذن ربها فاجرته علی البائع وان سعی بینهما وباع المالک بنفسه یعتبر العرف (فاجرته علی البائع) ولیس له اخذشئی من المشتری لانه هو العاقد حقیقة وظاهره انه لایعتبر العرف هنا لانه لا وجه له (قوله یعتبر العرف) فتجب الدلالة علی البائع او علی المشتری او علیهما بحسب العرف وفیها ایضا (ج ۲ ص ۱۳) قال فی التاتارخانیة: وفی الدلال والسمسار یجب اجرالمثل وماتواضعوا علیه ان فی کل عشرة دنانیر کذافذاك حرام علیهم وفی الحاوی: سئل محمدبن سلمة عن اجرة السمسار فقال ارجوانه لاباس به وان کان فی الاصل فاسدالکثرة التعامل وکثیرمن هذا غیرجائز فجوزوه لحاجة الناس الیه کدخول الحمام.

ولمافی شرح المجلة:(۶۷۷/۲،المادة:۵۷۸،طبع رشیدیه)

لواعطی احدماله للدلال وقال بعه بکذادراهم فان باعه الدلال باریدمن ذلک فالفاضل ایضا لصاحب المال ولیس للدلال سوی الاجرة) ای اجرة المثل بالغة مابلغت لولم یکن سمی له اجرة ولاتزیدعلی المسمی لوکان سمی لفسادالاجارة من کل وجه بقی ما لوقال للدلال بعه بعشرة ومازادفهولک اجرة الظاهرانه لااجرله اصلا.

(۴) سونے چاندی کو روپے کے عوض ادھار بیچنا جائز ہے بشرطیکہ مجلس میں ایک جانب سے قبضہ پایا جائے، لہٰذا سودے کے وقت سونے پر خریدار اگر قبضہ کر لیتا ہے تو پیسوں کا ادھار رہنا باہمی رضامندی سے جائز ہے، مذکورہ صورت میں ''علی'' خریدار کے پاس سے سونا جلدی بکے یا تاخیر سے اور اسکا پیسہ ہاتھ میں آئے یا نہ آئے اسکے ساتھ اب احمد کے سودے کا کوئی تعلق نہیں رہا لہٰذا جیسے ادا کرے شرعاً منع نہیں ہے۔

لمافی الشامی:(۱۸۰/۵،طبع سعید)

(تنبیه) سئل الحانوتی عن بیع الذهب بالفلوس نسیئة فاجاب بانه یجوزاذاقبض احدالبدلین لمافی البزازیة لواشتری مائة فلس بدرهم یکفی التقابض من احدالجانبین.

(۵) اللہ، محمد کے نام والے لاکٹ کی تعظیم کا خیال نہیں رکھا جاتا، اسکے علاوہ اسماء گرامی کو کندہ کرتے ہوئے تیز آگ سے گذارا جاتا ہے اور اللہ کے اسماء گرامی کو اسی طرح نبی ﷺ کے اسم گرامی کو آگ میں ڈالنا خلاف ادب ہے، اس لئے ایسی چیزوں کا کاروبار کرنا، اسی طرح استعمال کرنا اگرچہ جائز ہے لیکن مناسب نہیں ہے۔

لمافی الشامی:(۶/۳۶۱،طبع سعید)

قلت ولعله كان وبان فتبصر وينقشه اسمه اواسم الله تعالى لاتمثال الانسان وطير الخ(قوله اواسم الله تعالى)فلونقش اسمه تعالى اونبيه ﷺ استحب ان يجعل الفص فى كمه اذادخل الخلاء

ولمافی الدرمع الرد:(۶/۴۲۲،طبع سعید)

الكتب التى لاينتفع بها يمحى عنهااسم الله وملائكته ورسله ويحرق الباقى.

وفى الشامية:المصحف اذاصارخلقاوتعذرالقراءة منه لايحرق بالنار اليه اشارمحمد وبه ناخذ

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:نعمان اقبال عفااللہ عنہ

۲۰ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۶۰۹

﴿سامان دلانے پرکمیشن لیناجائز ہے﴾

﴿سوال﴾(۱) کیافرماتے ہیں علماءکرام کہ میری جیولری کی دکان ہے اورتمام مال میں نے کریڈٹ پراٹھایاہے،اب میرے پڑوس میں میرے دوست نے دکان کھولی ہے،وہ سامان لینا چاہتاہے کیش پرتوجہاں سے میں نے سامان لیاہے وہ کہتاہے کہ کیش کی پارٹی لیکرآؤمیں دس ہزار کے مال پردوہزارتم کوکمیشن دونگا کیامیراکمیشن لینادرست ہے یانہیں؟

(۲) جب میرے پاس کوئی آتاہے کہ میرے کوموبائل فون لیناہےتومیں اسکودکان دار کے پاس مارکیٹ میں لیکرجاتاہوں اورموبائل کاسوداکرتے ہیں (یعنی کمی زیادتی وغیرہ) جب سوداکمل ہوجاتاہے پھردوسرے دن دکان والامیرے کودوسوروپے کمیشن دیتاہےتوکیامیرایہ لینا درست ہے یانہیں؟ جواب دےکرعنداللہ ماجورہوں۔ مستفتی:محمدفہدلانڈھی

﴿جواب﴾ مذکورہ دونوں صورتوں میں آپ کاکمیشن لینادرست ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(۴/۵۶۰،طبع ایم سعید)

واماالدلال فان باع العين بنفسه باذن ربهافاجرته على البائع وان سعى بينهماوباع المالك بنفسه يعتبرالعرف.

وفى الشامية:(قوله فاجرته على البائع)وليس له اخذشئى من المشترى لانه هوالعاقدحقيقةوظاهره انه لايعتبرالعرف هنالانه لاوجه له(قوله يعتبرالعرف)فتجب الدلاله على البائع اوعلى المشترى اوعليهمابحسب العرف.

ولمافی الشامی:(۶/۶۳،طبع بابچ ایم سعید)

قال فى التاتاخانية:وفى الدلال والسمسار يجب اجرالمثل وماتواضعواعليه ان فى كل

عشرۃ دنانیر کذالک حرام علیھم وفی الحاوی :سئل محمد بن سلمۃ عن اجرۃ السمسار فقال ارجوانہ لاباس بہ وان کان فی الاصل فاسدالکثرۃ التعامل وکثیر من ھذا غیر جائز فجوزوہ لحاجۃ الناس الیہ کدخول الحمام.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب :محمد زبیر اکرام

۵ رجب ۱۴۳۱ھ
فتویٰ نمبر :۲۷۳۵

﴿پڑوسی سے گیس کی کنکشن لگانا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ھمارا ایک پڑوسی ہے اسکے گھر میں گیس نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ آپ لوگ گیس کی کنکشن دو میں آپ کو اسکا معاوضہ ہر مہینہ دونگا، یا مستقل طور پر کچھ مقرر رقم ہر مہینہ دونگا یا جو بل کا خرچہ ہوتا ہے وہ نصف نصف کرینگے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ ہم اسکو کنکشن دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اور اس سے کتنا رقم ھم وصول کر سکتے ہیں۔

﴿جواب﴾ گیس کنکشن آپ لائن سے دیں گے گیس آپکی ذاتی نہیں ہے بلکہ لائن بھی آپکی اپنی نہیں ہے یہ تو محکمہ گیس کیطرف سے بطور اجارہ آپکو سہولت ملی ہے لھذا انکی اجازت ہو تو ٹھیک ہے ورنہ نہیں۔

لمافی ردالمختار ج ۶/ ۲۰۰)کتاب الغصب سعید)ولا یجوز التصرف فی مال غیرہ بلااذنہ

لمافی المشکوۃ باب الغصب والعاریۃ:ص،۲۱۹)

قال رسول اللہ ﷺ:ألالاتظلمون الالایحل مال امری الا بطیب نفس منہ رواہ البیھقی فی شعب الایمان

لمافی شرح المجالۃ :ص ۶۱ المادۃ:۹۶)لایجوز لاحد ان یتصرف فی ملک غیرہ بلااذنہ

الجواب صحیح :مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب :صفی اللہ عفرلہ والوالدیہ

۲۵ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
فتویٰ نمبر :۳۰۸۲

﴿کتاب الودیعۃ والعاریۃ والغصب﴾

﴿امانت کی رقم بغرض حفاظت بڑے نوٹوں میں تبدیل کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ (۱) دراہم ودنانیر یعنی نقود متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے، کیا یہ قاعدہ تمام معاملات میں جاری ہوتا ہے یا بعض معاملات اس سے مستثنیٰ ہیں؟ (۲) اگر کوئی شخص بطور امانت رکھے ہوئے چھوٹے نوٹوں کو بغرض حفاظت بڑے نوٹوں میں تبدیل کرے تو کیا یہ امین کی طرف سے تعدی شمار ہوگی؟ اور اس صورت میں ہلاک ہوجانے کیوجہ سے امین پر ضمان آئیگا؟ (۳) دونوں صورتوں یعنی ضمان لازم آنے یا نہ آنے میں کیا یہ شخص گنہگار بھی ہوگا؟ سائل: فیاض احمد ایبٹ آبادی

﴿جواب﴾ (۱) مذکورہ بالا قاعدہ صرف عقود معاوضہ میں جاری ہوتا ہے، مثلاً بیع وشراء، اجارہ، ھبہ بشرط العوض، مہر نذر وغیرہ، لہٰذا ان عقود میں نقود متعین کرنے سے بھی متعین نہیں ہوتے اور امانات مثلاً شرکت، مضاربت، غصب، وکالت، ودیعت وتبرعات مثلاً صدقہ، ہبہ بلاعوض میں یہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا، لہٰذا ان عقود میں نقود متعین کرنے سے متعین ہوجاتے ہیں۔

لمافی الهداية:(۶۹/۳،طبع رحمانيه)الدراهم والدنانير لاتتعينان في العقود.

ولمافی فتح القدير:(۲۲۲/۶،طبع رشيديه)

قوله لاتتعين في العقوداي عقودالمباعات بخلاف ماسواها من الشركة والوديعة والغصب.

ولمافی الشامی:(۲۹۸/۷،طبع امداديه ملتان)

وفي الاشباه:النقدلايتعين في المعاوضات.....قال وتتعين في الامانات والهبة....الخ.

(۲) اس شخص کے پاس یہ رقم بطور امانت ہے اور بڑے نوٹوں میں تبدیل کرنا بظاہر حفاظت کی غرض سے ہے مالک کی طرف سے بھی ایسے تصرف کی دلالۃ اجازت ہوتی ہے، لہٰذا ہلاک ہونے کی صورت میں اس پر کوئی ضمان نہیں آئیگا۔

لمافی المجلة الاحكام العدلية:(المادة ۷۷۹،طبع رشيديه)

فعل مالايرضى به المودع في حق الوديعة تعدمن الفاعل.

ولمافی شرحه لخالدالاتاسیؒ:(۲۲۲/۳،طبع رشيديه)

المتعدي هوالذي يفعل بالوديعة مالايرضى به المودع.

(۳) حفاظت کی غرض سے نوٹ تبدیل کئے ہوں تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

لما فی قولہ تعالی:(سورۃ البقرۃ،آیت۲۲۰)واللہ یعلم المفسد من المصلح۔ الآیۃ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: عبید اللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ صفر المظفر ۱۴۳۰ھ
فتویٰ نمبر: ۱۹۲۸

﴿امانت کی رقم سے کوئی چیز خریدنا خیانت ہے رقم لوٹانا واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شریف کو ۳۰ لاکھ روپے کی ضرورت تھی۔ چاول خریدنا تھا۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ کریم نے کہا چاول میں خرید لیتا ہوں اور آپ کو مرابحہ کے طور پر دے دیتا ہوں۔ آپ دس ماہ بعد مجھے پیسے دینا۔ دونوں کا اتفاق ہوا۔ کریم نے ایک تیسرے شخص کو ۳۰ لاکھ روپے دیے کہ اس سے چاول خرید کر قبضہ کر کے شریف کو اتنے میں دے دینا۔ اتفاق سے وہ تیسرا شخص شریف کا بھی دوست تھا۔ اس نے شریف پر اعتماد کرتے ہوئے ۳۰ لاکھ روپے دے دیے کہ کل پرسوں ان شاء اللہ آؤں گا اور چاول خرید کر دوں گا۔ شریف مسائل سے واقف نہیں تھا۔ اس نے خود چاول کا سودا کر لیا یہ سوچ کر کہ مرابحہ میں جو رقم طے ہوئی تھی مثلاً ۵ لاکھ روپے بس اتنی رقم کریم کو دے دوں گا۔ ایسی صورت میں اس پانچ لاکھ کا کیا حکم ہے؟ جواز کی کوئی صورت بن سکتی ہے تو براہ کرم بتا دیں۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں تیسرا شخص جس کو کریم نے چاول خرید کر شریف کو مرابحہ کے طور پر دینے کے لئے ۳۰ لاکھ روپے دیے تھے۔ یہ تیسرا شخص کریم کا وکیل تھا اور ۳۰ لاکھ روپے اس کے پاس امانت تھے۔ اس تیسرے شخص کا ۳۰ لاکھ روپے شریف کے پاس امانۃً رکھنا صحیح نہیں تھا اس لئے کہ امین کو اصل مالک کی اجازت کے بغیر کسی اور کے پاس امانت رکھنا جائز نہیں ہوتا۔ اسی طرح شریف کے پاس بھی یہ رقم امانت تھی۔ اس میں تصرف کا حق اسے حاصل نہیں تھا۔ اب چونکہ اس نے اس رقم سے چاول خرید لیا ہے تو یہ امانت میں خیانت ہے۔ اس لئے شریف کو توبہ و استغفار کرنا چاہیے۔ شریف کے ذمہ لازم ہے کہ ۳۰ لاکھ روپے اصل مالک کریم کو بلا تاخیر لوٹائے۔ چاول کا سودا شریف نے خود ہی کر لیا ہے اس لئے وہی مالک ہے۔ کریم اپنی رقم کا مطالبہ شریف اور وکیل یعنی اس تیسرے شخص ہر دونوں سے کر سکتا ہے۔

باقی ۵ لاکھ روپے جو مرابحہ کے طور پر کریم نے شروع میں شریف کے ساتھ طے کیے تھے۔ سو یہ ۵ لاکھ روپے کریم کے لئے اب جائز نہیں ہیں۔ اس لئے کہ کریم اور شریف کے درمیان جو بات ہوئی تھی اس کی حیثیت وعدہ بیع کی ہے اور وعدہ بیع سے کوئی چیز لازم نہیں ہوتی۔

اب جواز کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ شریف چاول واپس کر کے ۳۰ لاکھ روپے کریم کو دے دے۔ پھر کریم چاول خرید کر شریف کو مرابحہ کے طور پر دے دے تو نفع لینا جائز ہوگا۔ اور اگر کریم شریف پر پہلے سے واضح کر دے کہ اب میرا ۵ لاکھ روپے کا کوئی حق نہیں بنتا۔ اس کے باوجود شریف اپنی خوشی سے ۵ لاکھ روپے یا کم وبیش دے دے اور کریم شریف کا احسان سمجھ کر لے لے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے بلکہ شریف کو اس کا اجر بھی ملے گا۔

لما فی شرح المجلۃ:(۴/۲۰۴، طبع المکتبۃ الرشیدیۃ کوئٹہ)

والوکیل امین فیما فی یدہ کالمودع فیضمن بما یضمن بہ المودع و یبرأ بہ

ولما فی الھندیۃ:(۴/۳۳۸، طبع المکتبۃ الرشیدیۃ کوئٹہ)

والودیعۃ لا تودع ولا تعار ولا تواجر ولا ترھن وان فعل شیئا منھا ضمن کذا فی البحر الرائق

ولما فی الفتح القدیر:(۸/۴۶۷، طبع المکتبۃ الرشیدیۃ کوئٹہ)

ولیس للمودع والوکیل الایداع والتوکیل

ولما فی المبسوط للسرخسی:(۱۱/۱۲۲، طبع بیروت)

ولیس للمودع حق التصرف والاسترباح فی الودیعۃ

ھکذا فی العنایۃ:(۸/۴۹۰، طبع بیروت)

ولما فی المحیط البرھانی:(۱۲/۶۲، طبع ادارۃ القرآن)

ومودع المودع یضمن اذا استھلک عندھم جمیعاً

ولما فی الھندیۃ ایضاً:(۴/۳۴۰، طبع المکتبۃ الرشیدیۃ کوئٹہ)

ولو استھلک الثانی الودیعۃ ضمن بالاجماع ویکون صاحب الودیعۃ بالخیار ان شاء ضمن الاول او الثانی فان ضمن الاول رجع بھا علی الثانی وان ضمن الثانی لا یرجع علی الاول کذا فی السراج الوھاج

ولما فی الھدایۃ:(۳/۱۹، طبع رحمانیہ)

البیع ینعقد بالایجاب والقبول اذا کانا بلفظی الماضی مثل ان یقول احدھما بعت والأخر اشتریت لان البیع انشاء و تصرف والانشاء یعرف بالشرع والموضوع للاخبار قد استعمل فیہ فینعقد بہ

ولما فی کنز الدقائق:(ص:۲۲۸، طبع قدیمی)

باب الربوا وهو فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال وعلته القدر والجنس فحرم الفضل والنساء بهما والنساء فقط باحدهما

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: نعیم اللہ شیخ غفرلہ ولوالدیہ

۹ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ　　فتوی نمبر ۳۰۰۲

﴿امانت رکھی ہوئی چیز خراب ہو رہی ہو تو کیا کیا جائے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے میرے پاس پیاز کی پانچ بوریاں یہ کہہ کر بطور امانت رکھیں کہ میں چالیس دن کے لئے تبلیغ پر جارہا ہوں واپس آ کر لے لونگا، ابھی پیاز کے میرے پاس بیس دن ہونے کو ہیں کہ وہ خراب ہونا شروع ہو گئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس آدمی کا انتظار کر کے چالیس دن تک پیاز اپنے پاس رکھوں تو مشکل سے آدھی بوری بھی سالم نہیں بچے گی جبکہ رکھنے والے کا کوئی پتہ نہیں چل رہا اور نہ اس سے رابطے کی کوئی صورت ہے، تو کیا میں یہ پیاز بیچ کر اس کے پیسے اس آدمی کیلئے بطور امانت رکھ سکتا ہوں؟　　مستفتی: عبدالوہاب ٹانکوی

﴿جواب﴾ امانت رکھی ہوئی چیز ازخود اگر خراب ہو جائے، تو امانتدار پر اس کا کوئی تاوان لازم نہیں ہے۔ لہذا پیاز خراب ہو جائے تو آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، تاہم زیادہ امانتداری اور خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ پیاز کے مالک کو نقصان سے بچایا جائے، جس کی ترتیب شریعت نے یہ بتائی ہے کہ امانتدار قاضی کو معاملہ کی خبر دے اور وہی اس چیز کو فروخت کرے اور قاضی کی مدد حاصل کرنا مشکل ہو تو محلہ کے علماء کرام یا دیگر چند دیانتدار معتبر لوگ ملکر اس چیز کو فروخت کریں اور مالک کیلئے بدل کو محفوظ رکھیں۔

لما فی الدر المختار (۶۷۵/۵، طبع سعید)
خیف علی الودیعة الفساد رفع الأمر للحاکم لیبیعه ولولم یرفع حتی فسد فلاضمان.

ولما فی الهندیة (۳۴۲/۴، طبع رشیدیة)
اذا کانت الودیعة شیئا یخاف علیه الفساد وصاحب الودیعة غائب فان رفع الأمر الی القاضی حتی یبیعه جاز وهو الاولی وان لم یرفع حتی فسدت لاضمان علیه.

ولما فی الولوالجیة (۶/۴، طبع مکتبۃ فاروقیۃ محلہ جنگی پشاور)
الودیعة اذا کانت شیئا من الصوف، والمودع غائب، فخیف علیه الفساد فان دفع الی

القاضي حتى يبيعه جاره هو الأولى لأن القاضي نصب ناظرا للمسلمين وفي البيع نظر وإن لم يدفع حتى فسد لا ضمان عليه لأنه حفظ الوديعة بحسب ما أمر به.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: صدیق الور

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ | فتوی نمبر: ۳۳۵۲

﴿محکمہ کی گاڑی کو ذاتی کام کیلئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک محکمہ میں ملازم ہوں اسی محکمہ کیطرف سے مجھے ایک گاڑی مل گئی ہے محکمہ کی کام سرانجام دینے کیلئے لیکن بسا اوقات میں اس گاڑی کو اپنی ذاتی کاموں کیلئے استعمال کرتا ہوں اب پوچھنا یہ ہے کہ میں اس گاڑی کو اپنی ذاتی کام کیلئے استعمال کرسکتا ہوں یا نہیں؟ از روئے شریعت اس کا کیا حکم ہے۔ مستفتی: ارشاد درگئی

﴿جواب﴾ محکمہ کیطرف سے گاڑی محض محکمہ کے کام انجام دینے کیلئے آپکو اگر ملی ہے اور آپ ذمہ دار افیسرز سے چھپ کر اپنی ضروریات کیلئے گاڑی استعمال کرتے ہیں تو اسکی گنجائش نہیں ہے البتہ محکمہ کیطرف سے صراحۃً یا کم از کم دلالۃً اسکی اجازت ہو تو استعمال کرسکتے ہیں۔

لما في الدر المختار :(۲۰۰/۶ طبع سعید)

يجوز التصرف في مال غيره بلا اذنه ولا ولايته الا في مسائل مذكورة في الأشباه.

ولما في شرح المجلة المادة (۹۶) (۲۶۲/۱ طبع رشيديه)

لا يجوز لأحد أن يتصرف في مال الغير بلا اذنه

ولقوله تبارك وتعالى 'ان الله يأمركم أن تؤدوا الامنت الى اهلها' الاية سورة النساء اية ۵۸.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق منکوری

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ | فتوی نمبر: ۴۰۲۰

﴿عاریہ موقت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری اپنی گاڑی ہے کچھ دن پہلے ارشاد نے آکر کہا کہ میں نے آج پشاور جانا ہے۔ اپنی گاڑی دے، میں نے کہا کہ گاڑی شام تک واپس پہنچانی ہے۔ ارشاد گاڑی لے گیا شام کے بجائے دو دن بعد گاڑی لے آیا نیز واپسی میں آتے آتے کسی گاڑی سے ٹکرائی جس سے گاڑی کو کافی نقصان پہنچا۔ اب پوچھنا یہ

ہے کہ میرے لئے ارشاد سے تاوان لینا جائز ہے؟
مستفتی: اکرام اللہ کوہاٹی

﴿جواب﴾ ارشاد کو آپ نے صرف شام تک کیلئے گاڑی بطور عاریت دی تھی عاریت حکماً امانت ہے یعنی اس دوران احتیاط کے باوجود گاڑی لگتی تو ارشاد کے ذمہ تاوان واجب نہ ہوتا لیکن شام تک گاڑی واپس نہ کرنے کیوجہ سے عاریت کا معاملہ باقی نہ رہا، اس کے بعد گاڑی کو قبضہ میں رکھنا غاصبانہ قبضہ شمار ہوتا ہے، اس لئے ایسی صورت میں ارشاد کے ذمہ تاوان واجب ہے۔

لما فی الشامی: (۶۹/۵، طبع: سعید)

(قوله بالهلاك) هذا إذا كانت مطلقة فلو مقيدة كان يعيره يوما فلو لم يردها بعد مضيه ضمن اذا هلكت كما في شرح المجمع وهو المختار كما في العمادية قال في الشرنبلالية سواء استعملها بعد الوقت أو لا وذكرها صاحب المحيط وشيخ الاسلام: أنما يضمن اذا انتفع بعد مضى الوقت لانه حينئذ يصير غاصبا .ابو سعيد

ولما في بدائع الصنائع: (۲۱۸/۶ طبع: سعيد)

حتى لو حبس العارية بعد انقضاء المدة أو بعد الطلب قبل انقضاء المدة يضمن لانه واجب الردة في ها تين حالتين لقوله عليه السلام العارية مؤداة

ولما في مجمع الضمانات: (۱۰۳، طبع: دار الكتب)

لو كانت العارية مقيدة في الوقت لو في غيره نحو أن يعير يوما فهذه عارية مطلقة الا في حق الوقت حتى لو لم يردها بعد مضى الوقت مع الامكان ضمن اذا هلكت سواء استعملها بعد الوقت ام لا.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوہاٹی

۲۸ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۲۴

﴿امانت میں تصرف کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص نے دینی مدرسے کی حیلہ شدہ رقم حفاظت کی غرض سے کسی آدمی کے پاس رکھوائی، اُس آدمی نے اُن پیسوں سے کاروبار کیا یعنی اُنہیں استعمال کرلیا پھر کچھ عرصے کے بعد اس نے پوری رقم مدرسے کو واپس کردی، کیا اس رقم کا استعمال مذکورہ شخص کے لئے جائز تھا؟ اب وہ اس پر بہت شرمندہ ہے کہ مدرسے کی رقم کو ذاتی استعمال میں لایا، اب اُن کے حق میں کیا حکم ہے، کفارہ یا کچھ اور؟
مستفتی: ابوعمر

﴿جواب﴾ مذکورہ شخص نے چونکہ امانت میں ناحق تصرف کیا یعنی اُنہیں کاروبار میں لگایا جبکہ

دیتے ہوئے یہ قید لگائی ہو کہ فلاں لکڑی میں استعمال کریں اور فلاں میں نہیں اور اس نے اس کے قول کے خلاف دوسری سخت لکڑی میں استعمال کیا تو بھی ضامن ہوگا۔

زید نے کلہاڑا استعمال کرنے کے لئے وقت کی تحدید کی ہو اور بکر نے "کلہاڑے" کو وقت معینہ سے زیادہ اپنے پاس روک کر استعمال کیا ہو اور اس میں نقص آیا ہو تب بھی ضامن ہوگا۔

لما فی الھندیۃ:(۳۶۹/۴،طبع رشیدیہ)

ولو استعار من رجل سلاحا لیقاتل به فضرب بالسیف فانقطع نصفین أو طعن بالرمح فانکسر فلا ضمان علیه وان ضرب به حجرا فهو ضامن کذا فی المبسوط.

لما فی التنویر مع الدر:(۴۷۹/۸،طبع امدادیہ)

(وان قیده) بوقت أو نوع أو بهما (ضمن بالخلاف الی شر فقط) لا الی مثل أو خیر.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم: محمد عزیز چترالی فیض آبادی

۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:

﴿مستعار چیز کے ہلاک ہونے کی صورت میں ضمان کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے متعلق کہ زید نے بکر سے شادی کے موقع پر پلیٹیں ڈونگے وغیرہ عاریت پر لئے تقریب کے اختتام پر زید نے بتایا کہ کچھ پلیٹیں اور ڈونگے گم ہو گئے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ کیا زید پر ان چیزوں کا تاوان آئے گا یا نہیں؟ جبکہ اس نے ہلاک نہیں کئے بلکہ خود ہلاک ہو گئے ہیں۔ بینوا و تو جروا۔ مستفتی: شیر زمان خان

﴿جواب﴾ عاریت میں دی ہوئی چیز "امانت" کے حکم میں ہوتی ہے اگر مستعار کی ہلاکت میں "مستعیر" کے کسی عمل کا کوئی دخل نہ ہو اور اس کی حفاظت میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی بھی نہ کی ہو تو وہ ضامن نہ ہوگا بصورت دیگر اس پر "شئی مستعار" کا ضمان آئے گا۔

لما فی التنویر مع الرد:(۶۷۹/۵ طبع سعید)

(ولا تضمن بالهلاك من غیر تعد)

وفی الشامیة:(قوله بالهلاك) هذا اذا كانت مطلقة فلو مقیدة كان یعیره یوما فلو لم یردها بعد مضیه ضمن اذا هلکت کما فی شرح المجمع وهو المختار کما فی العمادیۃاه.

قال فی الشرنبلالیة: سواء استعملها بعد الوقت أو لا وذكر صاحب المحیط وشیخ الاسلام: انما یضمن اذا انتفع بعد مضی الوقت لانه حینئذ یصیر غاصبا ابو السعود.

مذکورہ حکم اس وقت ہے جب "معیر" نے "شئی مستعار" کے لئے کسی وقت کی تحدید نہ کی ہو

لیکن جب اس نے وقت کی تحدید کردی ہو مثلاً (تین دن کے لئے) اور "مستعیر" نے تحدید وقت کا لحاظ کئے بغیر "مستعار" کو وقت معینہ سے زیادہ اپنے پاس روک کے رکھا تو ضامن آئےگا چاہے استعمال کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر:

﴿مرمت کرنے والے کے پاس دوسروں کا سامان امانت ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ ہماری کمپنی اجرت پر باہر کی کمپنیوں کا کام بھی کر کے دیتی ہے، ہمارے پاس ایک رولز مرمت ہونے کیلئے آیا جس کی اجرت تقریباً 20,000 (مبلغ بیس ہزار) طے ہوئی جس وقت وہ رولر تیار ہوگیا، اس دوران وہ کمپنی دیوالیہ ہوگئی اور بند ہوگئی، کارخانے کا مالک بہت سارے لوگوں کا نادہندہ تھا، اس لئے ملک سے باہر بھاگ گیا، بینک سے بھی قرض لیا تھا، یہاں پاکستان میں سب سے پہلے حکومت اپنا قرض وصول کرتی ہے، دوسرے نمبر پر بینک وصول کرتا ہے، باقی تمام قرضخواہوں کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔

مذکورہ صورت میں چونکہ بینک کا بھی قرضہ تھا حکومت بھی بینک کا ساتھ دیتی ہے اس لئے بینک نے کمپنی پر قبضہ کرلیا اور نیلام کردیا، نیلام کرنے کیلئے بینک اعلان کرتا ہے، خواہشمند حضرات کمپنی دیکھ کر قیمت لگاتے ہیں، کاغذوں میں موجود اثاثوں کی بنیاد پر کوئی سودا نہیں ہوتا یہاں پر بھی ایسا ہی ہوا۔

ہمارے پاس وہ رولر رہ گئے اور اس شخص کے ذمہ ہمارا بھی قرضہ رہ گیا، بینک والوں نے سب کو نظر انداز کرتے ہوئے کمپنی نیلام کردی جس نے کمپنی خریدی اس کو کسی طرح پتا چلا کہ رولر ہمارے پاس ہے اس لئے اب وہ ہم سے رابطہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ رولر ہمیں دیدو، اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ رولر اس کو یا بینک کو دیدیں؟ واضح رہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ بھاگا ہوا شخص کس کا نادہندہ ہے اور کتنا؟ اور نہ ہی یہ معلوم کرسکتے ہیں!　　مستفتی: فیصل جنید، مظہر یعقوب

﴿جواب﴾ یہ رولر آپ کے پاس اصل مالک کی طرف سے امانت کے حکم میں ہے، اس کو یا اس کے ورثاء کو دینا ضروری ہے، کمپنی کے خریدار یا بینک کو نہیں دے سکتے۔

البتہ گر مالک تک پہنچانا ممکن نہیں اور ورثاء تک بھی پہنچانا مشکل ہو تو ان کی ملاقات کی امید پر یہ رولر آپ اپنے پاس بطور امانت رکھ سکتے ہیں، اگر رولر کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو آپ اس کو بیچ کر اپنی اجرت کاٹ لیں اور بقیہ رقم اصل مالک کی طرف سے صدقہ کر دیں۔

لقوله تعالیٰ:(سورة النساء :آیت ۵۸پ۵):﴿إن الله یامرکم ان تؤدالامانات إلی اهلها.﴾

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر:

﴿بچے کی عاریۃً دی ہوئی چیز کا استعمال﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ اگر کسی شخص کو کوئی چیز عاریۃ لینے کی ضرورت پڑ جائے اور وہ اپنے پڑوسی کے گھر سے طلب کرتا ہے لیکن گھر پر کسی مرد یا عورت کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اگر کوئی بچہ اس شخص کی مطلوبہ چیز لاکر عاریۃً دے دے تو کیا یہ شخص اس کو استعمال کر سکتا ہے یا کہ نہیں نیز یہ کہ عاریت پر لی گئی چیز سے کس حد تک نفع اٹھا سکتا ہے؟

﴿جواب﴾ ناسمجھ بچے کی عاریۃً دی ہوئی چیز اگر ایسی ہے کہ عرف میں عام طور پر ایسی چیز بلا روک ٹوک کے عاریۃً دی جاتی ہے تو ایسی صورت میں لینے والے کے لئے اسکا استعمال درست ہے لیکن اگر وہ زیادہ قیمتی ہو یا عام طور پر لوگ ایسی چیزیں عاریۃً دینے میں تأمل سے کام لیتے ہوں تو ایسی صورت میں اس چیز کا استعمال مالک کی اجازت کے بغیر درست نہیں اور بچہ اگر سمجھدار ہے اور گھر والوں کی نظر میں با اعتماد ہے تو ایسا بچہ اگرچہ نابالغ ہے لیکن اس قسم کے تصرفات میں بڑے کے حکم میں ہے۔

لمافی بدائع الصنائع :(۲۱۴/۶،طبع سعید)

واما الشرائط التی یصیر الرکن بها اعارة شرعا فانواع منها العقل فلا تصح الاعارة من المجنون والصبی الذی لا یعقل واما البلوغ فلیس بشرط عندنا حتی تصح الاعارة من الصبی الماذون لانها من توابع التجارة وانه یملک التجارة فیملک ماهو من توابعها.

اگر عاریت پر دینے والے شخص نے عاریۃً دیتے ہوئے اس شیٔ کے استعمال کی شرائط مثلاً استعمال کا وقت، حد، جگہ یا نفع کی مقدار وغیرہ کا تذکرہ نہیں کیا تو ایسی صورت میں ہر اس طریقے سے اور اتنی مقدار میں نفع حاصل کر سکتا ہے جو کہ لوگوں میں رائج اور معروف ہو۔

لیکن اگر عاریت پر دینے والے نے استعمال کی مقدار، وقت، حد، جگہ وغیرہ کی شرائط لگائی ہوں تو ایسی صورت میں ان شرائط کی رعایت ضروری ہوگی اور اس کے خلاف کر کے زیادہ نفع حاصل کرنا درست نہیں ہوگا۔

لمافی بدائع الصنائع :(۲۱۵/۶ طبع سعید)

عقد الاعارة اما ان كان مطلقاً واما ان كان مقيداً فان كان مطلقاً بان اعار دابته انساناً ولم يسم مكاناً ولا زماناً ولا الركوب ولا الحمل فله ان يستعملها في اى مكان وزمان شاء فكان له ان يستوفيها على الوجه الذى ملكها الا انه لايحمل عليها مايعلم ان مثلها لايطيق بمثل هذا الحمل......لان العقدوان خرج مخرج الاطلاق لكن المطلق يتقيدبالعرف والعادة دلالة كمايتقيدنصاً......اذا اعار انساناً دابة على ان يركبها المستعير بنفسه ليس له ان يعيرها من غيره لماذكرنا ان الاصل في المقيداعتبار القيد فيه الااذاتعذر اعتباره.

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۸ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر :۲۵۶۳

﴿عاریۃً لی ہوئی چیز دوسروں کو دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ میرا فلاں جگہ پر کام ہے اور آپ دو تین گھنٹوں کیلئے اپنی سائیکل استعمال کرنے کیلئے دیدیں، پوچھنا یہ ہے کہ جس نے سائیکل عاریتاً لی ہے وہ اس سائیکل کو کسی دوسرے شخص کو استعمال کرنے کیلئے دے سکتا ہے یا نہیں؟ اور اس بارے میں اصل مالک سے اجازت لینا ضروری ہے یا بغیر اجازت بھی دے سکتا ہے؟

مستفتی: ذاکر اللہ چھوٹا لاہور

﴿جواب﴾ عاریۃً لی ہوئی چیز ایسی ہو کہ استعمال کرنے سے اسمیں کچھ فرق اور تبدیلی آتی ہو تو اصل مالک کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو عاریت پر نہیں دی جاسکتی اور اگر استعمال کرنے سے اس میں کوئی فرق نہیں آتا تو پھر دوسرے کو عاریۃً دی جاسکتی ہے، لہذا صورت مسئولہ میں سائیکل چلانے والے چلانے میں مختلف ہوتے ہیں اور اس میں فرق اور تبدیلی آتی ہے تو اصل مالک کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو عاریۃً نہیں دی جاسکتی۔

لمافی التنویر مع الدر :(۶۷۹/۵ طبع ایچ ایم سعید)

(ولا توجر ولا ترهن)......بخلاف العارية على المختار.

وفی الشامیۃ:(قولہ علی المختار)لانہاتعاراشباہ قال محشیہا:اذاکان ممالایختلف بالاستعمال کالسکنی والحمل والزراعۃ وان شرط ان ینتفع ھوبنفسہ،لان التقیید بما لایختلف غیرمفید کمافی شروح المجمع.....والمستعیرللبس اورکوب لیس لہ ان یعیر لمن یختلف استعمالہ والمستاجرلیس لہ ان یؤجرلغیرہ مرکوباکان اوملبوساالاباذن.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۱ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ فتوی نمبر:۲۵۷۶

﴿دہ غائب مالک امانت کے امانتدار تصرف کولے نہ شی﴾

﴿سوال﴾ :فرمائی مفتیان کرام دہ دے مسئلے پہ بارہ کے چہ یوسڑے دہ ڈیرے مودے راسے غائب دے،دہ ھغہ خزہ دہ خپل اولادسرہ دہ خپل مورو پلارکورتہ تلے دہ،دہ یووخت پورے دہ ھغہ سڑی مورپہ دی کورکے اوسیدہ اوس ھغہ ھم نامعلوم مقام تہ تلے دہ اوسامان یے زمونگ پہ کورکے دہ یوسوورزودہ پارہ ایخودلے دے،دی سامان زمونگ دہ کوریوہ کمرہ مستقلہ معروفہ کڑی دہ،دہ دی سامان دہ مالک یادہ ھغہ دہ رشتہ داروھیچ درک نشتہ،مونگ لرہ دہ شریعت نہ حکم دے؟ زکہ چی ددے سامان ساتل زمونگ دہ پارہ ڈیرگران دی۔ مستفتی:مولانارحمت اللہ کورنگی نمبرا

﴿جواب﴾ :دہ دے سامان حیثیت دہ امانت دے اوامانتدارپہ امانت کے دہ خپل طرفہ ھیچ قسم تصرف نشی کولے لیکن کہ چرتہ دہ امانت دہ مالک اودہ ھغہ دہ وارثانوپہ بارہ کی نہ معلومات نہ وی اودہ ھغی امانت ساتل سخت گران ھم وی نوپہ دی صورت کے دہ عدالت پہ اجازت دھغہ سامان خرچولے شی۔

کہ چرتہ عدالت تہ تللو کی مشکلات وی نودہ دیندارومسلمانانوپہ حضوراواجازت سرہ دے خرچ کڑی،اوروپے دی دہ جان سرہ امانت اوساتی،روپی صدقہ کولے ھم شی لیکن کہ مالک یادھغہ وارثان میلاؤشواوھغودہ پیسومطالبہ اوکڑہ،نوصدقہ کونکی باندی بہ پیسے واپس کول لازمی وی،اودہ صدقے ثواب بہ صدقہ کونکی تہ رسی۔

لمافی الشامی:(۶۷۶/۵،طبع سعید)

غاب رب الودیعۃولایدری أھوحی ام میت یمسکھاحتی یعلم موتہ ولایتصدق بہا بخلاف اللقطۃوان انفق علیہابلاامرالقاضی فھومتطوع ویسألہ القاضی البینۃعلی کونہاودیعۃعندہ وعلی کون المالک غائبافان برھن،فلوممایؤجروینفق علیہامن

غلتها امره به اولاً يأمره بالاتفاق يوماً ويومين اوثلاثة ترجاء ان يحضر المالك لا أكثر بل يأمره بالبيع وامساك الثمن وان أمره بالبيع ابتداء فلصاحبها الرجوع عليه به اذا حضر.

الجواب صحيح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد دیروی

۲۴ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ　　فتوی نمبر: ۲۷۳۱

﴿مغصوبہ زمین کی پیداوار اور ہلاک ہونے کی صورت میں ضمان کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے عمرو کی زمین پر قبضہ کرلیا تھا اور اس سے فائدہ حاصل کررہا تھا، عمرو نے اس پر عدالت میں مقدمہ دائر کرلیا اور مقدمہ چل رہا تھا کہ سیلاب کا حادثہ پیش آیا اور وہ زمین اس سیلاب میں بہ گئی اور ختم ہوگئی، پوچھنا یہ ہے کہ زید نے زمین سے جو پیداوار زمانہ غصب میں حاصل کی ہیں، عمرو، زید سے اپنے حصہ کے بقدر پیداوار کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ اور زید، عمرو کیلئے اس زمین کا ضامن ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ کسی کا مال غصب کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا ناجائز اور حرام ہے، خصوصاً زمین دبانے سے متعلق تو بڑی سخت وعید آئی ہے، اس دوران غاصب نے اس زمین سے جس قدر پیداوار حاصل کی ہے علاقہ میں رائج دستور کے مطابق زمین والے کو مزارع جتنا حصہ دیتا ہے مثلاً کل پیداوار کا آدھا یا ایک تہائی وغیرہ اتنا غلہ ہر مرتبہ پیداوار کا زمین کے مالک کو دینا ضروری ہے۔

رہا یہ کہ زمین اب سیلاب میں بہ گئی سو اس میں غاصب کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، بالفرض مالک کے قبضہ میں ہوتی تب بھی تو بہ جاتی، اس لئے آسمانی آفت سے ہونے والے نقصان کا مطالبہ غاصب سے نہیں کیا جاسکتا۔

ولما في الهندية: (۱۴۲/۵، طبع رشيديه)

وسئل شيخ الاسلام عطاء بن حمزه عمن زرع أرض انسان ببذرنفسه بغيراذن صاحب الارض هل لصاحب الأرض أن يطالبه بحصة الأرض قال نعم ان جرى العرف في تلك القرية انهم يزرعون الأرض بثلث الخارج اوربعه اونصفه اوبشئي مقدرشائع يجب ذلك القدر الذي جرى به العرف. وكذافي تنقيح الحامدية: (۱۴۲/۲، طبع حقانيه)

ولما في التنوير مع الدر: (۱۸۹/۶، طبع سعيد)

(والغصب) انما يتحقق (فيما ينقل فلو أخذ عقاراً وهلك في يده) بآفة سماوية كغلبة سيل لم يضمن خلافاً لمحمد وبقوله قالت الثلاثة وبه يفتى في الوقف.

ولما في البحر: (۱۱۱/۸، طبع سعيد)

(فان غصب عقاراً وهلك في يده لم يضمنه) وهذا عند الامام وأبي يوسف وقال محمد

وزفر والشافعي يضمنه وهو قول أبي يوسف أولا وفي العيني ويفتى بقول محمد في عقار الوقف الى ان قال لوغصب عقارا وهلك في يده بأن غلب السيل عليه فهلك تحت الماء او غصب دارا فهدمت بآفة سماوية اوسيل فذهب بالبناء لم يضمن عند أبي حنيفة وأبي يوسف وقال محمد والشافعي وزفر وهو قول أبي يوسف أولا يضمن وفي البزازية والصحيح قول أبي حنيفة وأبي يوسف.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ ۵ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

واللہ اعلم بالصواب: محمد عمران چارسدہ فتویٰ نمبر: ۲۹۷۲

﴿غیر کی زمین میں کسی بھی قسم کا مالکانہ تصرف کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ (۱) اگر کوئی شخص دوسرے کی زمین پر اس کی اجازت کے بغیر پھل دار درخت لگا دے تو کیا زمین والا پھلوں سے نفع حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟ (۲) نیز مشترکہ زمین میں اگر کوئی شریک دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر پھلدار درخت یا باغ لگا دے تو کیا دوسرے شرکاء کو پھلوں سے نفع حاصل کرنے کی اجازت ہے؟

﴿جواب﴾ (۱) شریعت مطہرہ نے کسی دوسرے کی زمین پر اس کی اجازت کے بغیر مالکانہ تصرف کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دی ہے، غیر کی زمین میں مالک کی اجازت کے بغیر درخت یا کاشت کرنا غصب ہے اگرچہ کھیت اور درخت کا مالک بیج کاشت کرنے والا ہے زمیندار مالک نہیں ہے لیکن خود کاشت کرنے والے کیلئے بھی، اب درخت وغیرہ سے نفع حاصل کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک زمیندار کو ضمان ادا نہ کرے اور زمیندار کو زمین اس کاشت سے فوری طور پر فارغ کرانے کا حق حاصل ہے۔

(۲) مشترکہ زمین میں اگر کوئی شریک اس قسم کا تصرف کرلے تو وہی اس کا مالک ہے، البتہ تقسیم کے دوران اگر یہ حصہ جس پر باغ وغیرہ لگایا ہے کسی اور شریک کے حصہ میں چلا جائے تو وہ شریک اس باغ وغیرہ کو اکھاڑنے کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

لمافي الهندية:(۱۴۲/۵ طبع رشيديه)

غصب من آخر ارضا فزرعها ونبت فلصاحبها ان ياخذ الارض ويامر الغاصب بقلع الزرع تفريغا للملكه.

ولمافيه ايضا:(۱۴۰/۵ طبع رشيديه)

وعلى هذا لوغصب نوى فانبته اوتالة فغرسها روى عن ابى يوسف انه قال في التالة لا

یحل له ان ینتفع بها حتی یودی الضمان الخ.

ولمافی تبیین الحقائق:(۲۲۳/۶،طبع سعید)

(وملک بلا حل انتفاع قبل اداء الضمان الخ)لانه لولم یملکه بذلک للحقه ضرروکان ظلما والظالم لایظلم بل ینصف.

ولمافی التنویرمع الدر:(۲۶۸/۶،طبع سعید)

(بنی احدهما)ای احدالشریکین(بغیراذن الآخر)فی عقارمشترک بینهما(فطلب شریکه رفع بنائه قسم)العقار(فان وقع)البناء(فی نصیب البانی فبها)ونعمت(والاهدم)البناء ، وحکم الغرس کذلک بزازیة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:عبدالوہاب لقمانی عفااللہ عنہ

۸ربیع الاول۱۴۳۱ھ   فتویٰ نمبر:۲۴۹۳

﴿مغصوبہ زمین کی پیداوار کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے دوسرے کی زمین غصب کر لی اور اس سے پانچ سال تک پیداوار حاصل کرتا رہا جسکا کچھ حصہ مساجد اور دیگر اچھے کاموں میں لگایا اور کچھ حصہ اپنے استعمال میں لاتا رہا، بعد میں اصل مالک نے وہ زمین لے لی تو کیا اصل مالک اس سے تمام خرچ شدہ رقم کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی:فیض محمد

﴿جواب﴾ کسی کی زمین پر زبردستی قبضہ کرنا سخت گناہ ہے، احادیث میں اس پر بڑی وعید آئی ہے، ایسی زمین کی آمد کو کار خیر میں اور مساجد میں لگانے کا اجر وثواب ضمان (تاوان) ادا کئے بغیر نہیں ملتا، پانچ سال تک اس زمین میں غاصب خود اگر کاشت کرتا رہا تو پوری پیداوار کا مالک زمین حقدار نہیں بنتا بلکہ اس علاقے میں رائج عرف کے مطابق مزارعت پر زمین دینے کی صورت میں مالک کا جو حصہ بنتا ہے اتنا دینا ضروری ہے، باقی غاصب کی ملکیت ہے یا زمین کرایہ پر دینا اگر رائج ہے تو جتنا کرایہ اس زمین کا بنتا ہے اتنی رقم لینے کا مالک حقدار ہے، البتہ کاشت اصل مالک کی اگر تھی مثلاً کھجور یا آم وغیرہ کی آمد اگر غاصب نے حاصل کی ہے تو تمام آمد کا ضمان (تاوان) وصول کرنے کا مالک کو حق حاصل ہے۔

لمافی الهندیه:(۱۴۲/۵،طبع رشیدیه)

وسئل شیخ الاسلام عطاء بن حمزة عمن زرع ارض انسان ببذرنفسه بغیراذن صاحب

الارض هل لصاحب الارض ان يطالبه بحصة الارض قال نعم ان جرى العرف في تلك القرية انهم يزرعون الارض بثلث الخارج اوربعه اونصفه اوبشئى مقدرشائع يجب ذلك القدرالذى جرى به العرف.

ولمافي الشامي:(۱۹۶/۶ طبع ایچ ایم سعید)

والحاصل انهاان كانت الارض ملكا،فان اعدهاربهاللزراعةاعتبرالعرف في الحصة، والافان اعدهاللايجار،فالخارج للزارع،وعليه اجرالمثل والافعليه النقصان ان انتقصت.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ ‏ ‏ ‏ واللہ اعلم بالصواب:احمد علی عفی عنہ

۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ ‏ ‏ ‏ فتوی نمبر:۲۶۲۹

﴿تبرع میں رجوع نہیں ہوسکتا﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب دامت برکاتہم جامعہ دارالعلوم کراچی کا فتوی پیش خدمت ہے اور ہمارے گھریلو مسائل سے بھی آپ اچھی طرح واقف ہیں، اسی تنازع کے سلسلے میں ہم دونوں بھائی رئیس احمد صاحب اور جناب وقار احمد صاحب جب آپکی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور بھائی نے آپ کے سامنے بار بار کہا تھا کہ میں نے والد صاحب پر جو کچھ خرچ کیا ہے وہ میرا قرض نہیں ہے اسکا اجر میں اللہ تعالی سے لوں گا، اور دارالعلوم سے انہوں نے جو سوال کیا ہے اس میں صراحت ہے کہ میں والد صاحب سے کہتا رہا کہ یہ رقم آپکی ذاتی ہے اس لیے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں لیکن اب بھائی وقار احمد نے چند روز پہلے والد مرحوم کی جائیداد تقسیم کرتے ہوئے ۵ لاکھ روپے جو کہ علاج کے سلسلے میں انھوں نے والد پر خرچ کیے تھے وہ روک لیے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے بھائیوں اور بہنوں نے علاج کے خرچے میں اپنے حصے سے رقم شامل کرنے کی حامی بھری تھی بعض نے کہا جتنی رقم میرے ذمے آتی ہے وہ دونگا جبکہ بعض نے کہا تھا کہ اپنی صوابدید پر دونگا لیکن ابھی تقسیم کے وقت والدہ، بھائی زبیر، شاہد اور دو تین بہنیں دینے کو تیار ہیں جبکہ دیگر بھائی اس رقم کو اپنے حصہ سے دینے کو تیار نہیں ہیں۔ شریعت کی روشنی میں مسئلے کا حل بتلائیں؟

دارالعلوم کا فتوی بھی منسلک ہے براہ کرم تبرع کی وضاحت فرمائیں اس کا کیا مطلب ہے۔

﴿جواب﴾ مذکورہ بیان کے مطابق آپ کے بھائی نے یہ اخراجات والد مرحوم کی خدمت اور تبرع کی نیت سے کیے ہیں جسکا اجر وثواب اللہ تعالی دنیا وآخرت میں دینگے، لہٰذا آپ کے بھائی کو مذکورہ اخراجات ترکہ میں سے لینا درست نہیں ہے۔ البتہ اگر تمام ورثاء عاقل بالغ ہیں اور

اپنی خوشی سے انکی خدمات کے اعتراف میں اور والد مرحوم کی خواہش کے مطابق اپنے اپنے حصے میں سے ادا کردیں تب ان کے لیے لینا جائز ہے

تبرع احسان اور خیرات کرنے کو کہتے ہیں جس کا حکم یہ ہے کہ اس میں رجوع جائز نہیں ہے چونکہ تبرع سے مقصود ثواب حاصل کرنا ہوتا ہے جسکا بدلہ صرف اللہ تعالیٰ سے لینا مقصود ہوتا ہے لہٰذا آپکے بھائی کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ ورثاء کی رضامندی کے بغیر یہ رقم ترکہ میں سے وصول کرے۔

(لما فی التنویر والدر ۵/۷۰۹ طبع سعید)

والصدقة كالهبة بجامع التبرع وحينئذ (لا تصح غير مقبوضة ولا في مشاع يقسم ولا رجوع فيها) ولو على غنى لان المقصود فيها الثواب لا العوض

(ولما فی البحر الرائق ۷/۲۵۲ طبع سعید)

ودين الصحة وما لزمه في مرضه بسبب معروف قدم على ما أقر به في مرض موته ولو وديعة والسبب المعروف كالنكاح المشاهد بمهر المثل والبيع المشاهد والاتلاف كذلك وغيرها مما ليس من التبرعات

(ولما فی الفقه الاسلامی ۱۰/۷۵۹۶ طبع سعید)

ورجع بما جهزه بالمعروف على تركته حيث كانت ،أو على من يلزمه كفنه ان لم يترك شيئا ،لانه قام عنه بواجب ،وذلك ان نوى الرجوع أو استاذن حاكما في تجهيزه ،فان نوى التبرع فلا رجوع له كما لا رجوع له ان لم ينو تبرعا ولا رجوعا

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اتکی غفرلہ

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۲۳۱

﴿بغیر اجازت کے دوسرے کی زمین فروخت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض علاقوں میں لوگ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو میراث میں انکے ترکے سے محروم کرتے ہیں تو ایسے لوگوں سے اس قسم کی زمین یا جائیداد خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: محمد طارق صوابی

﴿جواب﴾ بہنوں اور بیٹیوں کو انکے مقررہ حصوں سے محروم کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، بڑا ظلم ہے اور انکے حصوں پر انکی رضامندی کے بغیر قبضہ کرکے فروخت کرنا مغصوبہ چیز کو فروخت کرنے کے حکم میں ہے، اصل وارث اجازت دے تو بیع نافذ ہوگی ورنہ باطل ہوگی۔

لما فی التنویر مع الدر: (۶/۳۰۰، طبع ایچ ایم سعید)

(وكل لمن شركة الملك (اجنبي) في الامتناع عن تصرف مضر (في مال صاحبه (لعدم تضمنها الوكالة

ولمافی الھندیۃ:(۲/۳۰۱مطبع رشیدیہ)

ولا یجوز لاحدھما ان یتصرف فی نصیب الاخر الا بامرہ وکل واحد منھما کالاجنبی فی نصیب صاحبہ.

ولمافی البحر:(۵/۱۶۷ مطبع ایچ ایم سعید)

(وکل اجنبی فی قسط صاحبہ)ای وکل واحد من الشریکین ممنوع من التصرف فی نصیب صاحبہ لغیر الشریک الا باذنہ لعدم تضمنھا الوکالۃ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:احمد علی عفی عنہ

۲۸ربیع الاول ۱۴۲۱ھ فتویٰ نمبر:۲۵۵۵

﴿وصولی حق کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے متعلق کہ زید ادھار پر کاروبار کرتا ہے یعنی اپنی دکان کی اشیاء ادھار پر فروخت کرتا ہے اور متعینہ مدت میں اگر مشتری ثمن ادانہ کرے تو زید مشتری کی گائے ،بکری وغیرہ پر قبضہ کر لیتا ہے حالانکہ انکی قیمت مطلوبہ ثمن سے زیادہ ہوتی ہے،کیا ازروئے شرع اس طریقے سے اپنا حق وصول کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ اگر مقروض تنگ دست ہو تو قرض خواہ کو چاہیئے کہ اس کی آسودہ حالی تک اس کے ساتھ رعایت کا معاملہ کرے یعنی مقروض کو مزید مہلت دے تاکہ وہ بآسانی اپنے قرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو،احادیث مبارکہ میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے تنگ دست کو مہلت دی اور اس پر آسانی کا معاملہ کیا،اللہ اسکے ساتھ دنیا وآخرت میں آسانی کا معاملہ فرمائیں گے۔

لمافی المظھری:(۱/۴۱۲مطبع رشیدیہ)

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من یسر علیٰ معسر یسر اللہ علیہ فی الدنیا والآخرۃ.

البتہ اگر مقروض حق کی ادائیگی میں تاخیر اور ٹال مٹول کر رہا ہو جیسا کہ عموماً ہمارے زمانے میں لوگ حقوق کی ادائیگی میں تساہل اور تاخیر سے کام لیتے ہیں،تو صاحب حق کو اختیار ہے کہ وہ اپنا حق بذریعہ عدالت حاصل کرنے کی کوشش کرے،قاضی کی ذمہ داری ہے کہ وہ صاحب حق کو اپنا حق دلوادیں،لہٰذا مذکورہ بالا صورت میں زید کے لئے از خود مقروض کا مال یعنی گائے بکری

وغیرہ پر قبضہ کر کے ان کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

البتہ وصول یابی حق کی کوئی صورت نہ بنتی ہو تو قاضی کو حق حاصل ہے کہ وہ مقروض کا مال فروخت کر کے حق دلوادے، ہاں قرض خواہ کے ہاتھ مقروض کے پیسے لگ جائیں تو اپنے حق کی بقدر لینے میں گنجائش ہے، اپنے حق سے زیادہ لینا ہرگز جائز نہیں۔

لمافی التنویرمع الدر:(۱۵۱،۱۵۰/٦ طبع ایچ ایم سعید)

(والقاضی یحبس الحر المدیون لیبیع ماله لدینه وقضی دراهم دینه من دراهمه ... لا) یبیع القاضی (عرضه ولا عقاره) للدین (خلافا لهما وبه) ای بقولهما ببیعهما للدین (یفتی)

وفی الشامیة:(قوله لیبیع ماله)...... ولا یکون ذلک اکراها لانه بحق کما مر انه ظالم بالمنع (قوله یعنی بلا امره) لان للدائن ان یاخذ بیده اذا ظفر بجنس حقه بغیر رضا المدین فکان للقاضی ان یعینه زیلعی.

ولمافی البحر الرائق:(۸۳/۸ طبع ایچ ایم سعید)

ولان البیع واجب علیه لایفاء دینه فاذا امتنع ناب القاضی منابه.

ولمافی الشامی:(۵۰۱/٦، طبع ایچ ایم سعید)

(قوله وقیل اذا ایس الخ)...... وظاهره انه من غیر جنس حقه والا فلو من جنسه فله اخذ قدر حقه بلا کلام ولا وجه لحکایة بقیل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالوہاب لقمانی عفااللہ عنہ

یکم صفر الخیر ۱۴۳٦ھ — فتویٰ نمبر: ۲۴۱۱

﴿غصب کردہ چیز مالک کو واپس کرنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص نے اپنے پڑوسی کی ایک چیز اٹھائی تھی اور کئی سال سے اپنے پاس رکھی ہوئی ہے، اب چونکہ پڑوسی کا انتقال ہوگیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ وہ چیز واپس کردے تاکہ ذمہ فارغ ہو تو انکے ورثاء کو واپس کرے یا انکی طرف سے صدقہ کردے؟

﴿جواب﴾ مغصوبہ چیز اگر بعینہ موجود ہے تو وہی چیز اصل مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، اصل مالک چونکہ انتقال فرماگئے ہیں اور سوائے استغفار و توبہ کے اس گناہ کے ازالہ کی کوئی صورت نہیں ہے، تاہم ورثاء جو مرحوم کے نائب ہیں ان تک پہنچانا بھی اب شرعی حکم ہے، صدقہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، لہٰذا چیز ورثاء کو پہنچادیں اور ساتھ ساتھ توبہ کا اہتمام کریں اور

مرحوم کی روح کو خوش کرنے کیلئے ایصال ثواب بھی کریں تو امید ہے اللہ تعالیٰ معاف فرمائیگا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱۸۲/۶،طبع سعید)

(ویجب رد عین المغصوب)مالم یتغیر تغیرافاحشامجتبی(فی مکان غصبہ)لتفاوت القیم باختلاف الاماکن(ویبرأبردھاولوبغیرعلم المالک)فی البزازیة غصب دراھم انسان من کیسہ ثم ردھافیہ بلاعلمہ برئ وکذالوسلمہ الیہ بجھةأخریٰ کھبةأوایداع أوشراء الخ.

ولمافی تکملة ردالمحتار حاشیة قرة عیون الاخیار:(۳۵۵/۸،طبع سعید)

رجل تناول مال انسان فی حال حیاتہ ثم ردہ الی ورثتہ بعدموتہ یبرأعن الدین ویبقیٰ حق المیت فی مظلمتہ ایاہ ولایرجیٰ لہ الخروج عنہاالاباالتوبة والاستغفارللمیت والدعاء لہ،نورالعین عن الخانیة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:حبیب الرحمٰن ندیم سواتی

۱۰ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۲۳۲۴

﴿غصب کے اقرار کے بعد انکار کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ باری داد نامی شخص کشمیر نامی شخص کے گودام میں کام کرتا تھا، باری داد کی تنخواہیں موخر ہوتے ہوتے 12 ہزار روپے کشمیر نامی شخص پر قرض بن گئیں، اتفاق سے کشمیر نامی شخص کے حسابات کا رجسٹر گم ہوگیا تو اس نے باری داد کو اس کے غائب کرنے کا ملزم ٹھہرادیا، باری داد نے کسی کے سامنے (لاأبالی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے) رجسٹر کی موجودگی کا اقرار کرلیا جو کشمیر کو بھی پتہ چل گیا جس پر اس نے باری داد کو کہلا بھیجا کہ جب تک آپ رجسٹر مجھے نہیں دوگے اس وقت تک تمہارے 12 ہزار روپے تمہیں نہیں دوں گا۔

واضح رہے کہ جامعہ دارالعلوم کراچی والوں نے باری داد کے پہلے (جھوٹے) اقرار کی بنیاد پر باری داد کے ذمہ جسٹرڈ کی واپسی لازم ہونے کا فتویٰ ارشاد فرمایا تھا، تاہم باری داد کا کہنا ہے کہ میں اپنے (پہلے) اقرار میں جھوٹا تھا اور حسابات کا رجسٹر میرے پاس بالکل موجود ہی نہیں ہے۔

براہ کرم مذکورہ مسئلہ کا جواب مرحمت فرمائیں، نیز یہ بھی بتائیں کہ کیا کشمیر نامی شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ باری داد کی خطیر رقم کو رجسٹرڈ بازیاب نہ ہونے کے بل بوتے پر ہڑپ کرجائے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ مسئلے میں اگر باری داد اپنے دعویٰ کو "میں نے لاأبالی پن میں مزاحا

اقرار کیا تھا" دو گواہوں اور قرائن سے ثابت کرلے تو معتبر ہے اور اس کے اقرار کو جھوٹ سمجھا جائے گا اور اگر گواہ نہ پیش کرسکے تو ایسی صورت میں کشمیر پر قسم آتی ہے، کشمیر اگر قسم کھالے کہ باری داد اپنے اقرار میں سنجیدہ تھا نہ کہ مذاق کیا تھا تو اس کا حق ثابت ہوجائے گا اور باری داد پر حسابات رجسٹر واپس کرنا لازم ہوجائے گا چونکہ کاپی واپس کرنا ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا یہ صورت اختیار کی جائے گی کہ دو صالح تجربہ کار آدمیوں کو حکم بنائیں جو اپنے صوابدید کے مطابق کاپی کا تاوان باری داد پر لازم کردیں گے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵/۶۰۳-۶۰۲،طبع سعید)

(اقر ثم ادعی)المقر(انه کاذب فی الاقرار یحلف المقر له ان المقر لم یکن کاذبا فی اقراره)

ولما فی شرح المجلة:(۲/۶۴۹ طبع رشیدیه)

اذا ادعی احد کونه کاذبا فی اقراره الذی وقع یحلف المقر له علی عدم کون المقر کاذبا مثلاً اذا اعطی احد سندا لاخر محررا فیه انه قد استقرضت کذا درهم من فلاں ثم مال وان کنت اعطیت هذا السند لکننی ما اخذت المبلغ المذکور منه یحلف المقر له علی عدم کون المقر کاذبا فی اقراره هذا.

ولما فی للفتاوی التنقیح الحامدیة:(۲/۴۷-۴۸،طبع حقانیه)

سئل:فیما اذا ادعی زید علی عمرو بان لی بذمتک کذا من الدراهم قرضا فقال عمرو انک ابرأتنی من القرض المذبور فادعی زید بان الابراء المزبور صدر بینهما علی سبیل التلجئة وفسرها واقام بینة علیها فهل تقبل بينة.

الجواب :نعم اذا ادعی ان ما صدر بینهما ما ذکر کان بطریق التلجئه والمواضعة و فسرها واقام بینة علی طبق مدعاه تقبل بینته بطریقها الشرعی ثم کما لا یجوز بیع التلجئه لا یجوز الاقرار بالتلجئه بان یقول لآخر انی اقر لک فی العلانیه کما ل وتواضعا علی فساد الاقرار لا یصح اقراره حتی لا یملک المقر له من البدائع وان ادعی احدهما ان هذا الاقرار هزل والتلجئه وادعیٰ الاخر انه جدا فالقول لمدعی الجد وعلی الاخر البينة من الثامن من بیوع التتارخانیه ومثله فی فتاویٰ عطاء الله افندی من الکفالة واحاله الی البدائع ایضا قال فی البزازیة قال لی علیک کذا فقال صدقت یلزمه اذا لم یقله علی وجه الاستهزاء والقول لمنکر الأستهزا بیمینه والظاهر انه علی نفی العلم لانه علی فعل الغیر من حاشية البحر للخیر الرملی من باب دعوی الرجلین.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم :محمد شریف حسین

فتویٰ نمبر:

۱۴۲۷ھ

﴿کتاب الھبۃ والرشوۃ﴾

﴿نابالغہ کے ہبہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک آدمی کا انتقال ہوگیا، اس کی ایک اکلوتی لڑکی تھی، اس آدمی کے انتقال کے بعد اس لڑکی کے چچازاد بھائی اس کو اپنے گھر لیجا کر پرورش کرنے لگے اور اس کی تمام جائیداد پر قابض ہوگیا اس وقت لڑکی کی عمر کم وبیش سات آٹھ سال تھی، اس دوران اس آدمی نے کچھ لوگوں کو بلا کر کہا کہ اس لڑکی نے اپنی تمام جائیداد میرے لئے ہبہ کی ہے اور لڑکی نے بھی اقرار کرلیا اور وہ لوگ اس پر گواہ بن گئے بعد میں جب لڑکی بڑی ہوئی اور اس کی شادی ہوگئی تو اس نے ہبہ سے رجوع کرلیا اور کہا کہ مجھ سے زبردستی ہبہ کروایا تھا میں نے خوف کے مارے ہبہ کیا تھا ورنہ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دی جاتی تھی، لہٰذا اب میری تمام جائیداد مجھے واپس کردی جائے۔

اب مسئلہ یہ ہے چونکہ لڑکی نے بالغ ہونے سے پہلے ہبہ کیا تھا اور بقول اس کے کہ زبردستی ہبہ کروایا تھا تو اس صورت میں اس کے چچازاد بھائی کے لئے اس لڑکی کا مال استعمال میں لانا جائز تھا یا نہیں اور اب لڑکی کا ہبہ سے رجوع کرنا درست ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ لڑکی کا مال ومتاع اس کی پرورش کے خرچے سے کئی گنا بڑھ کر ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ ہبہ کے درست ہونے کے لئے بالغ ہونا شرط ہے، صورت مذکورہ میں چونکہ لڑکی نے بالغ ہونے سے پہلے ہبہ کیا تھا اور بقول اس کے اس سے زبردستی ہبہ کروایا گیا تھا، اس لئے ہبہ درست نہ ہوا۔ لہٰذا اس کے چچازاد بھائی کو اس کی جائیداد پر قابض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ جائیداد اس کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے اگر لڑکی چاہے تو عدالت کے ذریعے یا علاقائی جرگہ کے ذریعے اپنی جائیداد واپس لے سکتی ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۸/ ۲۸۹، طبع امدادیہ)

(وشرائط صحتها فی الواهب: العقل والبلوغ والملك) فلا تصح هبة صغير ورقيق ولو مكاتبا.

ولمافی الھندیة: ۴/ ۳۷۴، طبع رشیدیه)

وأما ما يرجع الى الواهب فهو ان يكون الواهب من اهل الهبة وكونه من أهلها ان يكون حرا عاقلا بالغا مالكا.

وفی شرح المجلۃ:(۲/۳۷۶،طبع رشیدیہ)

یلزم فی الھبۃ رضاء الواھب فلاتصح الھبۃ التی وقعت بالجبر والاکراہ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ ۔۔۔ واللہ اعلم:صلاح الدین چترالی

۲۹جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۴۹۴

﴿زندگی میں جائیداد تقسیم کرنا ھبہ ہے یا میراث؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے زندگی میں اپنی جائیداد بیٹوں کے درمیان بطور میراث ایسے تقسیم کردی کہ ہر بیٹے کا نام کاغذات میں لکھ دیا گیا،ایک بیٹے بکر کے حصہ میں وہ مکان آیا جسمیں زید خود اسکے ساتھ رہائش پذیر تھا،زید نے بوقتِ تقسیم یہ بھی کہا تھا کہ بعد میں کسی کو دوسرے پر کسی قسم کے مطالبہ کا حق نہیں ہوگا۔پوچھنا یہ ہے کہ یہ تقسیم شرعاً کیسی ہے؟اگر ھبہ ہے تو بکر کا حصہ تام ہوا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ صورتِ مسئولہ میں زید کا اپنی جائیداد زندگی میں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر کے ان کے حوالے کردینا ھبہ ہے،میراث نہیں،کیونکہ میراث وہ مال ہے جو کسی کی وفات کے بعد ورثاء کیطرف منتقل ہوتا ہے،بکر کے علاوہ زید کے تمام بیٹے اپنے اپنے حصہ کے مالک بن گئے،زید نے بکر کو جو گھر دیا ہے چونکہ وہ خود اسمیں رہائش پذیر تھا،اس لئے اس گھر میں ھبہ تام نہیں ہوا،ھبہ تام ہونے کے لئے ضروری تھا کہ ھبہ کرنے والا یعنی والد اس مکان سے اپنا تسلط و قبضہ مکمل ختم کرتے اور بکر کے حوالے کرتے تو ھبہ تام ہوجاتا اور بکر کی ملکیت ثابت ہوجاتی،لیکن اس طرح نہ کرنے کی وجہ سے صرف کاغذوں میں نام کرانے سے بکر کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی، اب اگر زید کا انتقال ہوگیا ہے تو یہ مکان مالِ وراثت ہے،بکر کے علاوہ دیگر ورثاء اپنے حق کا مطالبہ اگر کریں تو کرسکتے ہیں،بقدرِ حصہ ان کو دینا ضروری ہے۔

اور اگر حیات ہے تو اس گھر سے اپنا سامان باہر نکال کر مکان بکر کے حوالے کرے اور اس کے بعد اگر چاہے تو بطورِ عاریت اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے تو بکر کے حصہ میں ھبہ تام ہوجائے گا۔

لمافی الشامی:(۸/۴۹۳،کتاب الھبۃ،طبع امدادیہ)

واعلم أن الضابط فی ھذا المقام أن الموھوب اذا اتصل بملک الواھب اتصال خلقة وأمکن فصلہ لاتجوز ھبتہ مالم یوجد الانفصال والتسلیم ۔۔۔۔ولو وھب دارأ دون ما

فیہامن متاعہ لم یجزوان وھب مافیہاوسلمہ دونہاجازکذافی المحیط شرح مجمع.

ولمافی الھندیۃ:(۳۸۰/۴،طبع رشیدیہ کوئٹہ)

ولو وھب دارأفیہامتاع الواھب وسلم الدارالیہ مع المتاع لم تصح والحیلۃفیہ أن یودع المتاع أولاعندالموھوب لہ ویخلی بینہ وبینہ وسلم الدارفتصح الھبۃ فیہا وبعکسہ لو وھب المتاع دون الدار وخلی بینہ وبینہ صح وان وھب لہ الداروالمتاع جمیعاوخلی بینہ وبینہما صح فیہما جمیعاصح فیہاجمیعاً.

ولمافی الفتاوی الولوالجیۃ:(۱۲۶/۳،طبع فاروقیہ پشاور)

ولو وھب لرجل دارأفیہامتاع الواھب دفعہاالی الموھوب لہ فالھبۃ غیر تامۃ،لأن تمام الھبۃ بتمام القبض.

ولمافی درر الحکام:(۴۰۱/۱،برکن الھبۃ،طبع ماجدیہ کوئٹہ)

ألتخلیۃ:ھی عبارۃعن أن یجعل الواھب المال الموھوب بحالۃیستطیع معہا الموھوب لہ أخذہ وان یلزمہ بقبضہ.

ولمافی الفقہ الاسلامی وأدلتہ:(۲۹۹۳/۵-۲۹۹۴،شروط الھبۃ،طبع رشیدیہ)

وکذالووھب دارأفیہامتاع الواھب أوظرفأفیہ متاع للموھب دون المتاع ......وقبض الموھوب فانہ لاتجوزالھبۃ ولایزول الملک عن الواھب الی الموھوب لہ ،لأن الموھوب مشغول بغیرہ فیکون بمنزلۃھبۃالمشاع وتکون الھبۃ حینئذ فاسدۃ،فلو میزالموھوب عن غیرہ وسلمہ وحدہ جازت الھبۃ.

والخلاصۃ:أن ھبۃالمشغول لاتصح بخلاف الشاغل وھبۃالمتصل بغیر الھبۃ اتصال خلقۃمع امکان الفصل لاتجوز.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۱۲صفرالخیر۱۴۳۲ھ　　فتوی نمبر:۲۸۴۹

﴿والد جو مال اپنی زندگی میں بیٹوں کو دے وہ ہبہ ہے اسمیں وراثت جاری نہیں ہوگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم تیرہ بھائی ہیں ہمارے والد مرحوم کا ایک ہی بھائی تھا ایک سال پہلے دونوں وفات پاچکے ہیں چچامرحوم کا اہل وعیال کچھ بھی نہیں تھا یعنی بیوی بچے نہیں تھے والد اور چچا کی وفات سے تقریباسات آٹھ سال قبل ہمارے دو بڑے بھائیوں (سید عبدالکریم اور سید عبداللہ) نے یکے بعد دیگرے علیحدہ ہونے کا مطالبہ کیا والد اور چچا کے مال وجائیداد میں اپنے حصے کا مطالبہ کرنے لگے چچا مرحوم نہیں دیناچاہتے

تھے لیکن وہ بضد ہو گئے بالآخر والد اور چچا نے بھائیوں کو بٹھا کر تمام جائیدادوں کی قیمتوں کا تعین کر کے قول و اقرار کرنے اور اسٹام پیپر پر دستخط کرنے کے بعد دونوں بھائیوں کو ان کے مطلوبہ حصے الگ الگ کر کے دے دیئے اس کے بعد والد اور چچا نے باقی ماندہ مال و جائیداد ہم گیارہ بھائیوں کے قبضے میں دیدیا اور خود مکمل طور پر دستبردار ہو گئے اور پھر کئی موقعوں پر اسکی صراحت بھی کی کہ سید عبدالکریم اور سید عبداللہ کو ہم نے مال میں سے انکا حصہ دیدیا ہے موجودہ مال و جائیداد آپ گیارہ بھائیوں کیلئے ہبہ ہے، لیکن ہم گیارہ بھائیوں میں سے ہر ایک کو الگ الگ حصہ نہیں دیا گیا جسطرح کہ پہلے دو بھائیوں کو دیا گیا تھا، ہم نے بھی تقسیم نہیں کیا بلکہ مشترک رکھا اسلئے کہ ہم گیارہ بھائی ہیں اور جائیدادیں تین ہیں اگر ہم اسکو فروخت کرتے اور گیارہ حصوں میں تقسیم کرتے تو اس سے ہم معاشی طور پر بہت کمزور ہو سکتے تھے کیونکہ جائیدادیں تین ہیں اگر ان کے گیارہ حصے کریں تو ان کی افادیت ہی ختم ہو جائیگی اس لئے ہم نے باہمی رضامندی سے مشترک رکھا جس پر ہم سب خوش ہیں لیکن اب ہمارے سب سے بڑے بھائی سید عبدالکریم نے دعویٰ کیا کہ والد اور چچا مرحومین کے بعد ان کی جائیداد میراث ہے اور اس میں میرا حصہ ہے وہ مجھے دے دو، اب پوچھنا یہ ہے کہ ہمارے بھائی صاحب کا یہ کہنا درست ہے یا نہیں؟ اسی طرح ہماری چار بہنیں اور والدہ صاحبہ ہیں جن کو ہم حصہ دیں گے لیکن والد اور چچا نے ان کیلئے کسی حصے کا تذکرہ نہیں کیا تو کس طرح دیں؟ برائے کرم وضاحت فرما کر اس مشکل کو حل فرمائیں۔

﴿جواب﴾ والد جب تک حیات ہوں اپنی مملوکہ جائیداد اور دیگر اشیاء کا خود ہی مالک اور مختار ہوتے ہیں کوئی اولاد اگر سمجھتی ہے کہ والد کے مرنے کے بعد چونکہ ہم اس جائیداد وغیرہ کے مالک ہوں گے اس لئے ابھی سے ہم والد کے مال و جائیداد میں اپنا حق رکھتے ہیں تو یہ انتہائی غلط سوچ ہے البتہ والد صاحب خود ہی اپنی حیات میں جائیداد وغیرہ تقسیم کرنا چاہیں تاکہ ان کے انتقال کے بعد اولاد میں جھگڑے فساد نہ ہو تو اس کا انہیں اختیار حاصل ہے لیکن یاد رہے کہ یہ تقسیم میراث نہیں بلکہ باپ کی طرف سے اولاد کیلئے ہبہ (گفٹ) ہے۔ چنانچہ میراث کی ترتیب سے تقسیم کرنا کوئی ضروری نہیں ہے بہتر ہے کہ سب کو برابر دیں لڑکی کو بھی لڑکے کے جتنا دینا چاہیے۔ ہاں کسی خاص وجہ سے کسی کو کم یا زیادہ دینا چاہے تو اس کا بھی انہیں اختیار حاصل ہے

بشرطیکہ دوسروں کی دل آزاری مقصود نہ ہو اور کسی کو بالکل محروم نہ کیا جائے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ جس کو دینا چاہے اس کو باقاعدہ مالک وقابض بنانا ضروری ہے اور اپنا قبضہ وتصرف مکمل ختم کرنا لازم ہے اگر اپنا تصرف ختم نہیں کیا تو ہبہ تام نہ ہوگا اور جس کو دیا ہے وہ مالک نہیں بنے گا بعد میں دیگر ورثاء کو اس میں مطالبہ کا حق رہیگا۔

لمافی شرح المجلة:(۱/۲۶۰،طبع:رشیدیہ)

قال العلامة محمد خالد الاتاسیؒ تحت المادة ۹۵ الامر بالتصرف فی ملک الغیر باطل الملک مایملکه الانسان سواء کان اعیانا او منافع اثبت الشرع لصاحبه فقد قدرة علی التصرف به.

ولمافی التنویر مع الدر:(۵/۶۸۶،۶۸۷،۶۸۸،۶۸۹،طبع:سعید کراچی)

الهبة(هی)لغة التفضیل علی الغیر ولو غیر مال وشرعا(تملیک العین مجانا)ای بلاعوض (وسببها ارادة الخیر للواهب)

وشرائط صحتها فی الواهب العقل والبلوغ والملک وفی الموهوب ان یکون مقبوضا غیر مشاع ممیزا غیر مشغول ورکنها هو الایجاب والقبول وحکمها ثبوت الملک للموهوب له غیر لازم وانها لاتبطل بالشروط الفاسدة ولو علی وجه المزاح وتتم بالقبض الکامل فی محوز (مفرغ)مقسوم ومشاع لایقسم فان قسمه وسلمه صح

ولمافی الشامی:(۶/۷۵۸،طبع:سعید کراچی)

وشروطه(ای الارث)ثلاثة موت مورثه حقیقة اوحکما کمفقود او تقدیرا کجنین فیه غرة ووجودوارثه عند موته حیا حقیقة اوتقدیرا کالحمل والعلم بجهة ارثه.

ولمافی البحر:(۸/۴۸۸،طبع:سعید کراچی)

واما بیان الوقت الذی یجری فیه الارث فنقول هذا فصل اختلف فیه المشائخ قال مشائخ العراق :الارث یثبت فی آخر جزء من اجزاء حیاة المورث،وقال مشائخ بلخ: الارث یثبت بعد موت المورث.

وهکذا فی المحیط البرهانی :(۲۳/۲۸۲،طبع:ادارة القرآن)

ہبہ میں چونکہ رضامندی شرط ہے اس لئے کسی کی زبردستی کرنے سے یا دھمکانے سے اگر والد نے دیدیا یا علاقائی تأثر سے والد کو بھی غلط فہمی تھی کہ میرے مال وجائیداد میں اولاد کا حصہ ہے اس سوچ کی بنیاد پر اگرچہ باقاعدہ قبضہ بھی دیدیا ہو پھر بھی مالک نہیں بنے گا دوبارہ یہ مال میراث میں شامل ہوگا۔لہذا آپ کے والد اور چچا نے اگر خوشی اور رضامندی سے سید عبدالکریم اور سید عبداللہ کو مال میں سے کچھ دیدیا ہے اور قبضہ بھی کرایا ہے تو وہ مالک ہوگئے ہیں اور اگر ان کی زبردستی

اور برادری والوں کے دباؤ میں آ کر بادل نخواستہ دیا ہے تو ہبہ صحیح نہیں ہوا وہ مال واپس میراث ہوگا۔

ولمافی شرح المجلۃ:(۳۶۷/۳،طبع:رشیدیہ)

یلزم فی الھبۃ رضا الواھب فلاتصح الھبۃ التی وقعت بالجبر والاکراہ وفی فتاوی علی آفندی معزیا للظھیریۃ:الاکراہ بالھبۃ اکراہ بالتسلیم حتی لو وھب مکرھا وسلم طائعا لم یجز.

اسی طرح آپ دیگر بھائیوں کو جو مال وجائیداد دیا ہے اگر غلط فہمی کی بنیاد پر دیا ہے یا باقاعدہ قابض نہیں بنایا ہے تو ہبہ صحیح نہیں ہوا ہے دوبارہ تقسیم ہوگا اور تمام ورثاء کو حق ملے گا اور اگر رضامندی سے دیا ہے اور باقاعدہ مالک وقابض بنایا تھا اور اپنا تصرف مکمل ختم کردیا تھا۔ یہاں تک کہ جس مکان میں رہائش تھی اس سے بھی اپنا ذاتی سامان وغیرہ نکال کر اور خود بھی نکلے تھے اور آپ لوگوں کو حوالہ کردیا ہو تو ہبہ تام ہوگیا ہے اگرچہ بعد میں پھر اسی مکان میں آپ لوگوں کے ساتھ رہائش اختیار کی ہو لیکن ایک بار اپنا تصرف ختم کرنا ہبہ کے تام ہونے کیلئے شرط ہے اس تفصیل سے سید عبدالکریم اور سید عبداللہ کے مطالبے کا حکم معلوم ہوجاتا ہے۔

ولمافی شرح المجلۃ:(۳۶۸/۳،۳۶۹،طبع:رشیدیہ)

واما مالایقبلھا(ای القسمۃ)بان کان لاینتفع بہ بعد القسمۃ انتفاعا من جنس الانتفاع الذی کان قبل القسمۃ کبیت صغیر اوحمام فتصح ھبتہ وتتم بقبضہ شائعا بان یقبض الکل لان قبض کل شیئ بحسبہ وھذا لایکون قبضہ الاکذالک فاکتفی بذلک وتمت بہ الھبۃ.

ولمافی الدر:(۶۹۰/۵،۶۹۱،طبع:سعید کراچی)

والاصل ان الموھوب ان مشغولا بملک الواھب منع تمامھا وان شاغلالا،فلو وھب جرابا فیہ طعاما الواھب اودارا فیھا متاعہ اودابۃ علیھا سرجہ وسلمھا کذالک لاتصح وبعکسہ تصح فی الطعام والمتاع والسرج فقط۔

ایک بات یہ بھی بتانے کی ہے کہ آپ کے والد نے اپنی لڑکیوں اور بیوی کا حصہ اگر نہیں کیا ہے تو ان کی بڑی غلطی ہے آپ تمام بھائی اپنے حصے سے آدھے کے تناسب سے بہنوں کو اور کل مال سے آٹھویں کے تناسب سے والدہ صاحبہ کو بھی دیدیں امید ہے اس سے آپ کے والد مرحوم کیلئے آسانی ہوجائیگی اور والدہ اور بہنوں کو اپنا اپنا حق مل جائیگا۔

ولمافی مشکوۃ المصابیح:(۲۶۶طبع:سعید کراچی)

عن انس رضی اللہ عنہ قال:قال رسول اللہ ﷺ:من قطع میراث وارثہ قطع اللہ میراثہ من الجنۃ یوم القیمۃ رواہ ابن ماجہ.

ولمافی البدائع:(۱۱۲/۸تا۱۱۵،طبع:دارالکتب العلمیہ،بیروت)

وذکر محمد فی "الموطا" ینبغی للرجل ان یسوی بین ولدہ فی النحلی ولایفضل

بعضهم بعضا وظاهر هذا يقتضي ان يكون قوله مع قول ابي يوسف وهو الصحيح لما روى ان بشير ابا النعمان اتى بالنعمان الى رسول الله ﷺ فقال :اني نحلت ابني هذا غلاما كان لي فقال له رسول الله ﷺ اكل ولدك نحلته مثل هذا؟ فقال :لا ،فقال النبي ﷺ :"فارجعه" وهذا اشارة الى العدل بين الاولاد في النحلة وهو التسوية بينهم ولان في التسوية تاليف القلوب والتفضيل يورث الوحشة بينهم فكانت التسوية اولى۔

ولما في الهنديه:(۴/۳۹۱،طبع رشيديه كوئٹه)

سوى بينهم (اى الاولاد)يعطى الابنة مثل ما يعطى للابن وعليه الفتوى هكذا في فتاوى قاضي خان.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ　　　فتوی نمبر: ۳۹۵۴

﴿ماں کا اپنے ایک بیٹے کو پوری جائیداد ہبہ کرنا﴾

﴿سوال﴾: علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک آدمی (محمود خان) کو اپنی ماں (رحیم بی بی) نے اپنی حیات میں تمام جائیداد نام کرادی تھی، اسکے بعد محمود خان نے اپنی زندگی میں وفات سے پہلے اپنی جائیداد فروخت کردی، اب محمود خان کی ماں شریک بہن جرہ بی بی (جو محمود خان کی وفات سے پہلے انتقال کرگئی ہے) کی دو بیٹیاں مسماۃ زہرہ بی بی اور رنگیلہ بی بی محمود خان کی وفات کے بعد انکی جائیداد میں حصہ یا حق رکھتی ہیں؟ جبکہ محمود خان اپنی حیات ہی میں موت سے پہلے اپنی جائیداد فروخت کرچکا ہے؟ شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

تنقیح: محمود خان کی والدہ نے اپنے بیٹے محمود خان کو زمین صرف نام کردی تھی یا باقاعدہ اس کے قبضہ بھی دیدی تھی؟

جواب تنقیح بذریعہ فون: والدہ نے نہ صرف نام کردی تھی بلکہ باقاعدہ محمود خان کے قبضہ میں بھی دی تھی چنانچہ محمود خان کے قبضہ اور مکمل تصرف مذکورہ جائیداد رہی یہاں تک کہ اس نے فروخت کردی۔

﴿جواب﴾ مرحومہ رحیم بی بی نے اپنی زندگی میں جائیداد واقعی محمود خان (بیٹے) کو نہ صرف کاغذوں میں نام کرادی تھی بلکہ باقاعدہ مالک وقابض بنا کر مستقل طور پر ہبہ (گفٹ) کر کے دی تھی ،تو ایسی صورت میں محمود خان شرعاً مالک قرار پایا تھا ،اسکے بعد محمود خان کو فروخت کرنا بھی شرعاً معتبر اور درست سودا شمار ہوتا ہے ،لہذا اس جائیداد میں مرحومہ رحیم بی بی کی بیٹی جرہ بی بی کا کوئی حق

باقی نہیں رہا، اور نہ انکی بیٹیاں (زہرہ بی بی اور رنگیلہ بی بی) اس جائیداد کی وارثہ بن سکیں۔

یہ الگ بات ہے کہ مرحومہ رحیم بی بی نے اپنی بیٹی جرہ بی بی کو اپنی پوری میراث سے اگر محروم رکھا ہے یعنی اس جائیداد کے علاوہ ترکہ مثلاً سونا چاندی یا نقد روپوں کی صورت میں بھی کچھ حصہ نہیں دیا ہے، اور اپنا پورا ترکہ بیٹے کو دیا ہے، تو اس سے وہ سخت گنہگار ہوئی ہے، اور آخرت میں اس عمل کی وجہ سے گرفت کا اندیشہ ہے! اس لیے کہ کسی وارث کو میراث سے محروم کرنا جائز نہیں ہے لیکن زندگی میں چونکہ وہ خود مالک تھی اس لیے تصرف معتبر ہے۔

لما فی المختار (۶۹۶/۵، طبع سعید)

معزیاالی الخانیۃ ولو وہب فی صحتہ کل المال جاز وأثم

و لمافی الہندیۃ (۳۹۱/۴) طبع رشیدیہ

رجل وہب فی صحتہ کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثماًفیماصنع.

ولما فی الخانیۃ (۲۷۹/۳، طبع رشیدیہ)

رجل وہب فی صحتہ کل المال للولد جاز وفی القضاء ویکون آثما

ولمافی فتاویٰ قاضی خان (۱۵۰/۳ طبع: قدیمی)

رجل وہب فی صحتہ کل الما ل للولد جاز فی القضاء، ویکون آثما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سیف اللہ

۱۲ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۱۲۳

﴿بھائی کو ہبہ کی ہوئی چیز میں رجوع جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم تین بھائی ہیں اور ایک ہمارا چچازاد بھائی ہے، ہم پہلے ضلع پشین میں ایک ساتھ رہتے تھے، پھر ہمارے ایک بھائی نے ضلع قلعہ عبداللہ میں ایک جگہ خریدی اور وہاں اپنا گھر بنادیا، اور ہمارے لئے بھی الگ الگ گھر بنادئے، ہم سے اس بھائی نے کہا کہ آپ لوگ بھی قلعہ عبداللہ میں آجائیں لیکن ہم وہاں جانے کیلئے تیار نہیں تھے، وہ بھائی بار بار اصرار کرتا رہا، آخرکار اس بھائی نے کہا کہ جو گھر تمہارے لئے بنایا ہے وہ تمہاری ملکیت ہے میں واپس کبھی بھی نہیں لونگا اس پر ایک خط بھی لکھا اور گواہوں کے سامنے اقرار کیا اور خط پر دستخط اور انگھوٹا لگوایا اب ۱۸ سال گذرنے کے بعد وہ بھائی کہتا ہے کہ میں نے یہ گھر ملکیت کے طور پر نہیں دیا تھا، اب یہ گھر واپس کرو، ہم نے اس گھر کو ازسرنو تعمیر کیا اور بہت خرچہ ہو

ا ہے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا شرعاً یہ گھر ہمارا حق ہے، یا اس بھائی کا حق بنتا ہیں؟ مستفتی: محمد موسیٰ

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں آپ کے بھائی کو یہ حق حاصل نہیں ہے، کہ وہ آپ سے گھر واپس لے لئے، اس لئے کہ یہاں پر دو چیزیں رجوع سے مانع ہیں: (۱) اپنے کسی ذی رحم محرم کو ہبہ کرنے کے بعد رجوع نہیں کیا جاسکتا (۲) ہبہ شدہ چیز میں زیادتی کرلی جائے تو رجوع نہیں کیا جاسکتا، لہذا یہ گھر آپ ہی کا حق ہے۔

لما فی الهدایه: (۲۹۲/۳ مطبع: رحمانیه)

وان وهب هبة لذی رحم محرم منه لم یرجع فیها ،لقوله علیه السلام اذا كانت الهبة لذی رحم محرم لم یرجع فیها ولأن المقصود صلة الرحم وقد حصل

ولما فی فتاوی قاضی خان :(۱۴۲/۳ مطبع: قدیمی)

ولا یرجع فی الهبة من المحارم بالقرابة كالآباء والامهات وان علوا ولا ولاد وان سفلوا لولا د البنین واولا البنات فی ذلک سواء وكذا الاخوة والاخوات والاعمام والعمات

والما فی خلاصة الفتاوی :(۲۰۲/۴ مطبع: رشیدیه)

ولو وهب له دارا فبنا ها علی غیر ذلک البناء ترك بعضها علی حالها لم یرجع فیهما بسبب البناء فی بعضها ......وان زاد بناء او غلق بابا او جصصه او طینه او اصلحه لم یرجع

ولما فی المبسوط :(۵۶/۱۲ مطبع: بیروت)

والموانع من الرجوع فی الهبة ......وان یزداد الموهوب فی نفسه خیرأفان حق الرجوع فیما تتناوله الهبة وتلک الزیادة لم تتناو لهبة ولا یتأتی الرجوع فی بدون الزیادة المتصلة

ولما فی البحر الرائق: (۲۹۱/۷ مطبع: سعید)

(قوله)منع الرجوع دمع خزقة ای ومنع الرجوع فی الموهوب الموانع السبعة الاتی تفصیلها (قوله فالدال الزیادة المتصلة كالغرس والبناء والسمن)

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ

۳۰ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ

واللہ اعلم بالصواب: عزیز اللہ عفی عنہ

فتوی نمبر:

﴿بیٹے کی شادی پر خرچ کردہ رقم کی واپسی کا مطالبہ کرنا والد کیلئے جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے حسب خواہش اپنے بیٹے کی شادی پر کافی روپیہ خرچ کیا بعد ازاں بیٹے کا والد کے ساتھ کسی بات پر منہ ماری ہوئی جس کی وجہ سے باپ نے بیٹے عاق کرتے ہوئے شادی میں خرچ شدہ رقم کی واپسی کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا والد کو اس کا حق حاصل ہے وہ اپنے بیٹے سے خرچ شدہ

رقم کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ براہ کرم شرعی حکم سے مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

﴿جواب﴾ والدصاحب نے ازخود بیٹے کی شادی میں پیسہ اگر خرچ کیا ہے تو یہ والد صاحب کی طرف سے محض احسان ہے، واپسی کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

لما فی البخاری: ج ۱/ ۳۵۷ (طبع قدیمی)

عن ابن عباس رضی اللہ تعالی عنه قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس لنا مثل السوء الذی یعود فی ھبته کالکلب یرجع فی قیئه.

ولما فی التنویر: ج ۵/ ۱۹۹ (طبع سعید)

(ویمنع الرجوع فیھا) حروف (دمع خزقة) وفی الشامیة: قال الرملی قد نظم ذلک والدی العلامة شیخ الاسلام محی الدین فقال: منع الرجوع من المواھب سبعة: فزیادة موصولة موت عوض، وخروجھا عن ملک موھوب له، زوجیة قرب ھلاک قد عرض.

ولما فی العالمگیریة: ج ۴/ ۳۸۵ (طبع سعید)

ولا یرجع فی الھبة من المحارم بالقرابة کالآباء والامھات وان علوا والأولاد وان سفلوا وأولاد البنین والبنات فی ذلک سواء.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: فضل حق زیزاروی

۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ | فتویٰ نمبر: ۳۱۴۵

﴿ہبہ کی ایک خاص صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد محترم نے میری والدہ محترمہ کو بطور مہر ایک مکان دیا تھا، جو کہ فیزے میں ہے، پچھلے سال جب میری والدہ صاحبہ بیمار ہوئی تو فوت ہونے سے تین چار دن پہلے والدہ محترمہ نے وہ مکان واپس والد محترم کو دے دیا، اب والد محترم اس مکان کو اپنی بہن کے جہیز میں دینا چاہتے ہیں، جبکہ میں والد محترم کو منع کرتا ہوں، کیونکہ یہ مکان تو میری والدہ کا ہے، والد صاحب فرماتے ہیں، کہ آپ کی والدہ محترمہ نے یہ مکان ہبۃً مجھے دیا ہے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا والد محترم اس مکان کے مالک ہیں اور میرے لئے اس مکان میں شرعاً کوئی حصہ بنتا ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں؟

تنقیح: آپ کی والدہ نے آپ کے والد صاحب کے قبضہ میں یہ مکان دیا تھا یا صرف زبانی کہہ دیا تھا۔

جواب تنقیح: ہبہ کرنے کے بعد والد صاحب نے قبضہ کیا تھا۔

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں یہ مکان آپ کے والد صاحب کی ملکیت شمار ہوگی، آپ کیلئے اسمیں کوئی حصہ نہیں ہے، انکی مرضی ہے وہ جہیز میں دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔

لما في الهداية: (۲۸۵/۳ طبع: رحمانيه)

الهبة عقد مشروع لقوله عليه السلام تهادوا تحابوا وعلى ذلك انعقد الاجماع وتصح بالأيجاب والقبول والقبض

ولما في فتاوى العالمگيريه: (۴۰۲/۴ طبع: رشيديه)

مريضة وهبت صداقها من زوجها فان برأت من مرضها صح وان ماتت من ذلك المرض فان كانت مريضة غير مرض الموت فكذالك الجواب، وان كانت مريضة مرض الموت لا يصح الا باجازت الورثة وتكلموا في حد مرض والمختار للفتوى أنه اذا كان الغالب منه الموت كان مرض الموت سواء كانت صاحبة فراش او لم تكن كذا في المضمرات

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عزیز اللہ آغا عفی عنہ

۳۰ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ | فتویٰ نمبر:

﴿موھوب لہ کے قبضہ کے بعد سرکاری کاغذات کا اعتبار نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہم دو بھائی ہیں، والد مرحوم کی زندگی میں ہم دونوں بھائی مشترکہ طور پر کاروبار کرتے تھے والد صاحب ہمارے ساتھ کاروبار میں شریک نہیں تھے، ہم جو کچھ کماتے والد صاحب کو دیتے تھے، والد صاحب نے ہمارے ان پیسوں سے زمین خریدی، کچھ زمین والد صاحب کی اپنی ذاتی بھی تھی، پھر والد صاحب بیمار ہوگئے، انہوں نے اپنی ذاتی زمین اور وہ زمین جو ہمارے پیسوں سے خریدی تھی (اور جو ابھی تک کاغذات میں والد صاحب کے نام ہے) اس طرح تقسیم کردی کہ اپنی ذاتی زمین جو کہ عمدہ تھی بڑے بیٹے کو دی اور جو زمین ہمارے پیسوں اور اتنی اعلیٰ نہ تھی چھوٹے بیٹے کو دی اور بیٹوں نے اس پر قبضہ بھی کرلیا، اس تقسیم میں والد صاحب نے ہماری بہنوں کا کوئی حصہ نہیں رکھا۔

اس تقسیم کے بعد والد صاحب ۲۰۰۱ء تک زندہ رہے، والد صاحب کی وفات کو دس (۱۰) برس گذر گئے ہیں، اور اس تقسیم کے تقریباً بتیس (۳۲) سال ہوئے ہیں، اب ہماری بہنیں کہتی ہیں کہ ان زمینوں میں ہمارا بھی حصہ ہے، ہم کہتے ہیں کہ والد صاحب کی ذاتی زمین میں آپ کا

حق ہے لیکن جو زمین والد صاحب نے ہماری کمائی سے خریدی تھی اس میں آپ کا حق نہیں بنتا کیونکہ وہ تو والد صاحب نے ہماری کمائی سے خریدی تھی۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ہماری بہنوں کا اس زمین میں جو والد صاحب نے ہمارے پیسوں سے خریدی تھی اور اس زمین میں بھی جو والد صاحب کی ذاتی تھی حق بنتا ہے یا نہیں؟ براہ کرم اس مسئلے کی وضاحت تحریر فرما کر مشکور فرمائیں۔　　　مستفتی: حبیب الرحمٰن سوات

﴿جواب﴾ زندگی میں جائیداد کی تقسیم کرنا جائز ہے، شریعت کی اصطلاح میں اس کو ہبہ کہتے ہیں آدمی اپنی زندگی میں حالت صحت میں اپنی پوری جائیداد کسی ایک فرد کو بھی ہبہ کر سکتا ہے اسی طرح کسی کو کم اور کسی کو زیادہ بھی دے سکتا ہے اور محروم بھی کر سکتا ہے، البتہ بلا کسی وجہ شرعی کے بعض ورثاء کو زیادہ دینے یا بالکل محروم کرنے سے گناہ گار ہوگا۔

صورت مسئولہ میں چونکہ باپ نے اپنی ذاتی زمین اور اسی طرح وہ زمین جو کہ اپنے بیٹوں کے پیسوں سے خریدی تھی اپنی زندگی میں تقسیم کی ہے، اور بیٹوں نے اس پر قبضہ بھی کر لیا ہے جس کی وجہ سے یہ دونوں ان زمینوں کے مالک بن گئے ہیں اور اس میں کسی اور کا حق نہیں بچا، چاہے کاغذات میں والد کے نام ہوں، لہٰذا مذکورہ دونوں قسم کی زمینوں میں بہنوں کا کوئی حق نہیں ہے، بہنیں ان مذکورہ زمینوں میں کسی حصہ کا مطالبہ نہیں کر سکتیں۔

تاہم بھائیوں کو چاہیے کہ وہ اپنی بہنوں کو اس زمین سے کچھ حصہ دیں، یہ بہنوں پر احسان ہوگا اور والد نے چونکہ بہنوں کا کوئی حصہ زمین و جائیداد میں نہیں رکھا حالانکہ اس طرح ان کو نہیں کرنا چاہیے تھا، لڑکی بھی اولاد ہے ان کا حصہ بھی رکھنا چاہیے تھا، اب اگر آپ لوگ بہنوں کو کچھ دیں گے تو یہ مرحوم والد کے لئے بھی آسانی کا باعث ہوگا۔

لما فی الدر المختار :(۶۹۶/۵ طبع سعید)

وفی الخانیۃ لا باس بتفضیل بعض الاولاد فی المحبۃ لانها عمل القلب وکذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار وان قصده فسوی بینهم یعطی البنت کالابن عند الثانی وعلیه الفتوی ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز واثم.

ولما فی البحر الرائق :(۲۸۸/۷ طبع سعید)

یکره تفضیل بعض الاولاد علی البعض فی الهبة حالة الصحة الا لزیادة فضل له فی الدین وان وهب ماله کله جاز قضاء وهو اثم کذا فی المحیط.

ولما فی الھندیہ :(۴/۲۱۴طبع رشیدیہ)

رجل وھب فی الصحۃ کل المال للولد جاز فی القضاء ویکون آثما فیما صنع کذا فی قاضی خان

ولما فی الھندیہ:(۴/۲۷۶طبع رشیدیہ)

ولا یتم حکم الھبۃ الا مقبوضۃ ویستوی فیہ الاجنبی والولد اذا کانا بالغین ھکذا فی المحیط

ولما فی الھدایہ :(۳/۲۸۵طبع رحمانیہ)الھبۃ عقد مشروع وتصح بالایجاب والقبول والقبض

ولما فی شرح المجلۃ :(۳/۴۴۲طبع رشیدیہ)تنعقد الھبۃ بالایجاب والقبول وتتم بالقبض۔

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :شاہد خان سواتی

یکم رجب المرجب ۱۴۳۲ھ فتوی نمبر :۳۱۱۷

﴿زندگی میں دی جانے والی رقم ھبہ ہے میراث نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے ۳ عدد بیٹے اور ۳ عدد بیٹیاں ہیں جبکہ میری اہلیہ بھی ماشاء اللہ حیات ہیں۔ میں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو ۲۰۰۰ء میں اس وقت جو بھی حصہ بنتا تھا ادا کر دیا تھا اور ان سے تحریر لے لی تھی۔ جس میں ان کی طرف سے تحریر ہے کہ ہم نے اپنے والد کی جائیداد کا حصہ ان کی زندگی میں لے لیا ہے۔ آئندہ جو بھی جائیداد ہوگی وہ صرف تینوں بھائیوں اور والدہ کی ہوگی۔ کاپی منسلک ہے۔

غرض مسئلہ یہ ہے کہ یہ بتائیں کہ میری وفات کے بعد جو بھی جائیداد ہوگی اس کے وارث یہ تین بیٹے اور میری اہلیہ ہوں گی یا بیٹیوں کو بھی حصہ دینا پڑے گا؟

اگر شرعی طور پر بیٹیوں کو حصہ دینا ہوگا تو اس رقم کا کیا ہوگا جو میں ۲۰۰۰ء میں ان کو وراثت کے طور پر دے چکا ہوں؟ مستفتی: قمر الزمان صدیقی

﴿جواب﴾ والد جب تک حیات ہوتا ہے اپنے ذاتی مال و جائیداد کا خود ہی مالک و مختار ہوتا ہے۔ کوئی بیٹا، بیٹی اس کے مال و جائیداد میں حصہ دار نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کو اپنا حق سمجھ کر مطالبہ کرنے کی گنجائش ہوتی ہے البتہ والد اپنی خوشی اور مرضی سے زندگی میں مال و جائیداد اولاد میں تقسیم کرنا چاہے تاکہ بعد میں بھائی بہنوں میں یہ مال و جائیداد تلخی و ناراضگی کا سبب نہ بنے تو یہ جائز ہے۔ لیکن یہ تقسیم میراث نہیں بلکہ ھبہ (گفٹ) کہلائیگی۔ جس کا بہتر اور مستحب طریقہ یہ ہے کہ ہر ایک کو بیٹا ہو یا بیٹی سب کو برابر دے ہاں کسی خاص وجہ سے کسی کو کم زیادہ دینے کی بھی

گنجائش ہے۔اور یہ بھی واضح رہے کہ ہر ایک کو باقاعدہ قبضہ بھی کرائے اور اپنا قبضہ بھی مکمل ختم کرے ورنہ وہ مالک نہیں بنے گا۔

آپ نے اپنی بیٹیوں کو جو کچھ دیا ہے وہ ان کو ھبہ (گفٹ) ملا ہے اپنے بیٹوں کو بھی اس نسبت سے دوگنا دیدیں اور باقاعدہ اپنا قبضہ ختم کر کے ان کو قابض و مالک بھی بنادیں تو بعد میں آپ کی کوئی لڑکی ان کے مال سے حصے کا مطالبہ نہیں کر سکے گی لیکن باقاعدہ قبضہ میں دیدینا ضروری ہے۔صرف کاغذوں میں نام کرانا کافی نہیں ہے۔اور آپ اور آپکی اہلیہ چونکہ حیات ہیں اس لیے اپنی ضروریات کیلئے بھی ایک خاص مقدار جتنا آپ مناسب سمجھتے ہیں اپنے پاس رکھ لیں زندگی کا بھی کچھ پتہ نہیں اور پیش آنے والے حالات کا بھی کچھ علم نہیں۔ایسا نہ ہو کہ بعد میں خود کو یا اہلیہ کو پریشانی ہو جائے۔تو یہ مال وجائیداد جو آپ کی ملکیت میں رہیگا آپ کی وفات کے بعد بطور میراث سب میں تقسیم ہوگا۔اور جو اولاد کو مالک وقابض بنا کر دیدیا تھا اس میں کوئی اور حقدار نہیں ہوگا۔

لمافی صحیح المسلم:(باب کراھۃ التفضیل بعض الاولاد فی الھبۃ ۲/۳۶طبع: قدیمی)

عن النعمان بن بشیر انه قال ان اباه اتی به رسول الله ﷺ فقال انه نحلت ابنی هذا غلاما لی فقال رسول الله ﷺ أکل ولدك نحلته مثل هذا فقال لا فقال رسول الله ﷺ فارجعه.

ولما فی تکملة فتح الملهم تحت هذاالحدیث:(۲/۱۳ طبع :دارالعلوم کراچی)

فالذی یظهر لهذاالعبد الضعیف عفاالله عنه ،ان الوالد ان وهب لاحد ابنائه هبة أکثر من غیره اتفاقا او بسبب علمه او عمله ابره بالوالدین من غیر ان یقصد بذالک اضرارالآخرین ،ولا الجور علیهم ،کان جائزاعلی قول الجمهور ،وهو محمل آثارالشیخین ،وعبد الرحمن بن عوف رضی الله عنهم ،اما اذاقصد الوالد الاضرار او تفضیل احد الابناء علی غیره بقصد التفضیل من غیر داعیة مجوزة لذالک فانه لایبیحه احد.

ولما فی الشامی :(۴/۴۲۵طبع: سعید کراچی)

قلت:وقد کنت قدیما جمعت فی هذه المسالة رسالة [العقودالدریة فی قول الواقف علی الفرضیة الشرعیة] حققت فیها المقام وکشفت عن مخدراته اللثام بماحاصله :انه صرح فی الظهیریه بانه لو اراد ان یبر اولاده فالافضل عند محمد ان یجعل للذکر مثل حظ الانثیین وعند ابی یوسف یجعلها سواء وهوالمختار .

ولما فی الشامی:(۶/۷۵۸،۷۵۹،طبع: سعید کراچی)

وهل ارث الحی من الحی ام من المیت ؟ المعتمد الثانی .

ولما فی البحر ۲۸۹/۸ طبع سعید کراچی

واما بیان الوقت الذی یجری فیه الارث فنقول هذا فصل ،اختلف المشائخ فیه قال مشائخ العراق الارث یثبت فی آخر جزء من اجزاء حیاة المورث قال مشائخ بلخ الارث یثبت بعدموت المورث.

ولما فی الهدایه ۲۹۲/۳ طبع رحمانیه لاہور

وان وهب هبة لذی رحم محرم منه لم یرجع فیها لقوله علیه السلام اذاکانت الهبة لذی رحم محرم لم یرجع فیها ولان المقصود صلة الرحم وقد حصل.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اویس غفراللہ لہ ولوالدیہ

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۵۸۷

﴿زندگی میں ہبہ کی گئی زمین میں دیگر ورثاء کا کوئی حق نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک لڑکی ہے اس کے والدین زندہ ہیں اس کا اور کوئی بہن، بھائی نہیں ہے۔اس کی شادی فیملی سے باہر ہوئی ہے۔اس کے والد نے اپنی زمین اس بیٹی کو دے دی ہے اور خود اس میں کچھ نہیں کرتا اور دونوں میاں بیوی اپنی بیٹی کے پاس رہتے ہیں تو کیا دوسرے رشتہ دار والدین کے مرنے کے بعد اس زمین کو میراث میں تقسیم کر سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ والد نے زمین اپنی بیٹی کو ھبہ کر کے باقاعدہ اس کے قبضہ میں بھی اگر دیا ہے اور اپنا تصرف مکمل طور پر ختم کیا ہے تو یہ زمین اس بیٹی کی ملکیت ہے۔دیگر ورثاء کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔

لما فی الهدایة:(۲۹۲/۳ طبع رحمانیة)

وان وهب هبة لذی رحم محرم منه لم یرجع فیها" لقوله علیه السلام اذا کانت هبة لذی رحم محرم لم یرجع فیها "ولان المقصود صلة الرحم وقد حصل.

ولما فی التنویر مع الدر:(۶۸۸/۵ طبع سعید)

(و)شرائط صحتها (فی الموهوب ان یکون مقبوضاغیر مشاع ممیزاًغیر مشغول).

ولما فی البحر الرائق :(۲۸۸،۲۸۶/۷،طبع سعید)

(قوله فان قسمه وسلمه صح)أی ولووهب مشاعایقسم ثم قسمه وسلمه صح وملکه لان تماماً بالقبض ....وان وهب ماله کله لواحد جاز قضاءً.

ولما فی الهندیة:(۳۸۷/۴ طبع رشیدیة)

ولا یرجع فی الهبة من المحارم بالقرابة کالآباء والامهات وان علوا والاولاد وان سفلوا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: تنویر الرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۳ جمادی الاولی ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۷۰۶

﴿ہبہ سے رجوع کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ہذا کے بارے میں کہ زید نے اپنے بیٹے کو زمین ہبہ کی، بیٹے نے قبضہ کر کے اس پر تعمیر کی، اب والد صاحب رجوع کر رہا ہے تو کیا اسکو رجوع کا حق ہے یا نہیں؟ اور اگر والد صاحب زبردستی لے لے تو کیا حکم ہے؟ مستفتی: بتوسط انعام اللہ لیلیر

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں جب والد صاحب نے اپنے بیٹے کو زمین ہبہ کی اور بیٹے نے قبضہ کر لیا تو اب زمین بیٹے کی ملکیت میں آ گئی، بیٹا زمین کا مالک بن گیا اور بیٹے نے جو تعمیر کی ہے وہ تعمیر بھی بیٹے کی ملکیت ہے، لہذا مالک کی اجازت کے بغیر والد صاحب کو زمین واپس لینے کا حق حاصل نہیں ہے اور اگر زبردستی لے لی ہو تو ان کے ذمے واجب ہے کہ وہ زمین بیٹے کو واپس کر دیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۵/۷۰۲، طبع سعید)

(والقاف القرابة، فلو وهب لذی رحم محرم منه) نسبا (ولو ذميا او مستأمنا لا يرجع)

ولمافی الهندية:(۴/۳۸۵، باب الخامس رجوع فی الهبة، طبع رشيديه)

ليس له حق الرجوع بعد التسليم فی ذی الرحم المحرم وفيماسوی ذلک له حق الرجوع.

ولمافی قاضی خان:(۳/۱۲۲، فصل فی رجوع الهبة، طبع قديمی)

لايرجع فی الهبة من المحارم بالقرابة كالآباء والأمهات وان علوا والاولاد وان سفلوا.

ولمافی الهداية:(۳/۲۹۲، باب مايصح رجوعه ومالا يصح، طبع رحمانيه)

وان وهب هبة لذی رحم محرم منه لم يرجع فيها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ذیشان احمد ملازئی

۲۳ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۶۱

﴿اپنے وارث کو زمین ھبہ کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مرحوم حیاء الدین نے اپنی زندگی میں صحت کی حالت میں سب بیٹوں کے سامنے تین جریب زمین اپنی بیوی کو دیدی کہ تم اس زمین میں ہر قسم کا تصرف کر سکتی ہو، پوچھنا یہ ہے کہ مرحوم کی میراث میں مزید حصہ اسکی بیوی کو ملے گا یا نہیں؟ اور اس تین جریب زمین کو کل مال میں شامل کیا جائے گا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ مرحوم نے اپنی زندگی میں صحت کی حالت میں جو زمین بیوی کو دی ہے، وہ ھبہ ہے اور اب یہ زمین مرحوم کی بیوی ہی کی ہے بشرطیکہ مرحوم کی بیوی نے اس پر باقاعدہ

قبضہ کیا ہو اور مرحوم نے اپنے قبضہ کو ختم کیا ہو تب یہ زمین مال میراث میں سے شمار نہیں ہوگی، البتہ میراث میں عورت کا حصہ متعین ہے اس لئے جب میراث تقسیم ہوگی تو بیوی کو اپنا حصہ مکمل ملے گا اور اس زمین کی وجہ سے بیوی کے حصہ میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائیگی۔

لمافی الھندیۃ(۳۷۵/۴،کتاب الھبۃ طبع رشیدیہ)

لو قال نحلتک داری اواعطیتک اووھبت منک کانت ھبۃ کذافی شرح الطحاوی لو قال جعلت لک ھذہ الدار اوھذہ الدارلک فاقبضھا فھو ھبۃ ھکذافی فتاوی قاضیخان قولہ ھذہ الدارلک اوھذہ الارض لک ھبۃ لااقرار کذا فی القنیۃ.

ولمافی الھدایۃ:(۲۹۲/۳،باب مایصح رجوعہ ومالایصح،طبع رحمانیہ)

وکذلک ماوھب احدالزوجین للآخرلان المقصود فیھاالصلۃ کمافی القرابۃ.

ولمافی الشامی:(۶۸۹/۵،کتاب الھبۃ طبع سعید)

لو قال ملکتک ھذاالثوب مثلاًفان قامت قرینۃ علی الھبۃ صحت والافلالان التملیک اعم منھاالصدقہ علی البیع والوصیۃ والاجارۃ وغیرھا.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب:محمد امین چارسدوی

۲۳صفرالخیر۱۴۳۲ھ	فتویٰ نمبر:۲۹۱۹

﴿زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے کا شرعی طریقہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی آدمی اپنی زندگی میں اپنی جائیداد کو اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہتا ہے تو اس کا بہتر طریقہ کیا ہے؟ برابر تقسیم کرے یا میراث کے طریقے پر کہ بیٹے کو دو اور بیٹی کو ایک حصہ دیا جائے؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی ہی میں اپنی جائیداد کو اپنی اولاد کے درمیان تقسیم کرنا چاہے تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمام اولاد میں برابر سرابر جائیداد کو تقسیم کرے تاکہ سب کے ساتھ انصاف ہو جتنا حصہ بیٹے کو دے رہا ہے اتنا ہی حصہ بیٹی کو بھی دیدے تو زیادہ بہتر ہے لیکن بیٹے کی نسبت بیٹی کو بلا وجہ آدھے سے کم دینا جائز نہیں ہے، البتہ اگر کسی خصوصیت کی وجہ سے کسی ایک کو اوروں کی بنسبت کچھ زیادہ دے اور مقصد اوروں کو تکلیف دینا نہ ہو تو اسکی بھی گنجائش ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(۶۹۶/۵،طبع سعید)

وفی الخانیۃ:لاباس بتفضیل بعض الاولاد فی المحبۃ لانھا عمل القلب وکذافی العطایاان لم

يتصدبه الاضرار وان قصده فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثانى وعليه الفتوى.

وفى الشامية:(قوله وعليه الفتوى)اى على قول ابى يوسف من ان التنصيف بين الذكر والانثى أفضل من التثليث وهو قول محمد.

ولما فى البحر الرائق(۷/۲۸۸،طبع سعید)

يكره تفضيل بعض الاولاد على البعض فى الهبة حالة الصحة الالزيادة فضل له فى الدين..... وفى الخلاصة المختار التسوية بين الذكر والانثى فى الهبة.

ولما فى الهندية:(۴/۳۷۴،طبع قدیمی)

ولو وهب رجل شيئا لاولاده فى الصحة واراد تفضيل البعض على البعض فى ذلك لارواية لهذا فى الاصل عن اصحابنا وروى عن ابى حنيفة انه لا بأس به اذا كان التفضيل لزيادة فضل له فى الدين وان كان سواء يكره وروى المعلى عن ابى يوسف انه لا بأس به اذا لم يقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوى بينهم يعطى الابنة مثل ما يعطى للابن وعليه الفتوى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد عمران غفرلہ ولوالدیہ

۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۸۸

﴿بغیر قبضہ کے ہبہ تام نہیں ہوتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والد صاحب نے کچھ زیورات اس غرض سے بنائے ہیں کہ جب میری شادی ہوگی تو اسکو بطور مہر کے میری بیوی کو دینگے لیکن نہ ان زیورات کو میرے حوالے کیا ہے اور نہ ہی زبانی طور پر مجھے یہ بتایا ہے کہ یہ آپ کے ہوگئے، پوچھنا یہ ہے کہ ان زیورات کی زکوٰۃ کس کے ذمہ ہے میرے یا والد صاحب کے؟

﴿جواب﴾ زیورات کا انتظام آپکے والد نے اپنے پیسہ سے کیا ہے اور ابھی تک انہی کے پاس ہیں تو وہی خود مالک ہیں، زکوٰۃ بھی انہی کے ذمہ واجب ہے، آپ کی شادی میں مہر کے طور پر دیں گے تو محض اس ارادہ سے آپ مالک قرار نہ پائے۔

لما فى خلاصة الفتاوى:(۱/۲۳۵،رشیدیہ)الزكوٰة انما تجب اذا ملك نصابا تاما ناميا حولا كاملا.

ولما فى التنوير مع الدر:(۵/۶۸۸،طبع ایچ ایم سعید)

(و)شرائط صحتها(فى الموهوب أن يكون مقبوضا غير مشاع مميز غير مشغول) كما سيتضح (وركنها)هو(الايجاب والقبول)

ولما فى التنوير:(۲/۲۵۹،طبع سعید)وسببه ملك نصاب حولى تام فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عباد اللہ غفرلہ ولوالدیہ

ا ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۳۶

﴿والد کی زندگی میں اس کی جائیداد پر خرچ کردہ رقم ترکہ سے وصول کرنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہم اپنے والد صاحب کے ساتھ ان کے مکان کے رہتے تھے پھر والد صاحب کی اجازت سے ہمارے چھوٹے بھائی نے وہ مکان اپنے نام کروایا، لیکن والد صاحب نے اسے مکمل قبضہ نہیں دیا تھا کیونکہ وہ بھی اسی مکان تاحیات رہائش پذیر رہے۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ وہ مکان نام کروانے سے وہ اس کا مالک ہوگیا یا ہم تمام بہن، بھائی اس میں شریک ہوں گے؟ اگر وہ مالک نہیں بنا تو مکان اپنے نام کرواتے وقت بھائی کا جو خرچہ ہوا تھا کیا وہ اس کو میراث میں سے وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں راہنمائی فرمائیں۔

﴿جواب﴾ صرف دستاویزات میں مکان اپنے نام کرانے سے آپ کا بھائی اس کا مالک نہیں بنا، کیونکہ ھبہ کیلئے قبضہ شرط ہے وہ اس صورت میں مکمل ہوتا جب والد صاحب اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ بھی اپنے ذاتی سامان کے ساتھ کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتے، لیکن وہ چونکہ تاحیات یہیں رہائش پذیر رہے اس لئے انہی کا قبضہ باقی رہا، لہذا مذکورہ مکان میں تمام بہن بھائی شریک ہیں۔

باقی جہاں تک خرچ کا تعلق ہے وہ آپ کے بھائی نے اگرچہ والد صاحب کی اجازت سے کیا لیکن اپنے ذاتی مفاد کیلئے کیا، والد صاحب کے ذمہ بطور قرض واجب نہیں ہوا اس لئے مرحوم کے ترکہ سے وصول کرنے کا کوئی حق آپ کے بھائی کو حاصل نہیں ہے۔

لمافی شرح المجلۃ:(۳/۲۲۲-۲۲۵،طبع:رشیدیہ کوئٹہ)

تنعقد الهبة بالايجاب والقبول وتتم بالقبض ـــ واعلم ان المراد بالقبض الذى تتم به الهبة هو القبض الكامل وهو فى المنقول مايناسبه وفى العقار مايناسبه ـــ رجل وهب داراً وسلم وفيهامتاع الواهب ،لاتجوز لان الموهوب مشغول بماليس بهبة ،ولايصح التسليم.

ولمافی الھدایۃ:(۳/۲۸۵-۲۸۶طبع:رحمانیہ،لاہور)

الهبة عقد مشروع تصح بالايجاب والقبول والقبض ـــ والقبض لابد منه لثبوت الملك ـــ فان قبضه الموهوب له فى المجلس بغيرامرالواهب جاز استحساناوان قبض بعد الافتراق لم يجزالاان يأذن له الواهب فى القبض.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری

۲۱ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر:۴۲۰۱

﴿ھبہ تام ہونے سے ملکیت ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ ایک شخص کی ملکیت میں پانچ کنال زمین ہے اور اس کے تین بیٹے ہیں اس نے اس زمین سے ایک کنال زمین اپنے ایک بیٹے کے نام منتقل کر دی اور اس کو باقاعدہ قبضہ بھی دے دیا اس کی وفات کے بعد مرحوم کے دوسرے بیٹوں نے مرحوم کے اس بیٹے کی زمین میں بھی وراثت کا دعویٰ کیا ہے کہ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے جبکہ یہ بیٹا اپنی اس زمین میں جو اس کو باپ کی طرف سے باپ کی زندگی میں ملی ہے، مرحوم کے دوسرے دو بیٹوں کو حصہ دینے سے انکار کرتا ہے، اس صورت میں اس بیٹے کے حصہ کی زمین میں مرحوم کے دوسرے بیٹوں کا حق بنتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

مستفتی کلیم اللہ

﴿جواب﴾ باپ اپنی زندگی میں اپنی زمین میں سے جو حصہ اپنے کسی بیٹے کو دیتا ہے تو یہ اس کی طرف سے اپنے بیٹے کے لئے ہبہ ہوتا ہے۔

مذکورہ صورت میں چونکہ باپ نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کے نام زمین منتقل کر دی اور باپ کی زندگی میں بیٹے نے زمین پر قبضہ بھی کر لیا تو یہ زمین اسی بیٹے کی ملکیت ہو گئی ہے، اس میں مرحوم کے دوسرے بیٹوں کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ اس زمین پر ان کا دعویٰ ملکیت صحیح ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۵/۶۸۸،طبع سعید)

(و)شرائط صحتها(فی الموهوب ان یکون مقبوضا غیر مشاع ممیزا غیر مشغول)

ولمافی الدر المختار:(۵/۶۹۶،طبع سعید)

وفی الخانیة:لاباس بتفضیل بعض الاولاد فی المحبة لانها عمل القلب وکذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار وان قصده فسوی بینهم یعطی البنت کالابن عندالثانی وعلیه الفتوی ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز واثم۔

ولمافی البحر الرائق:(۷/۲۸۶،طبع سعید)

(قوله فان قسمه وسلمه صح)ای لو وهب مشاعا یقسم ثم قسمه وسلمه صح وملکه لان التمام بالقبض

ولمافی البحر:(۷/۲۸۸،طبع سعید)

(فروع)یکره تفضیل بعض الاولاد علی البعض فی الهبة حالة الصحة الا لزیادة فضل له فی الدین وان وهب ماله کله لواحد جاز قضاء وهو آثم کذا فی المحیط۔

واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

فتویٰ نمبر:۴۳۲

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

۱۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ

﴿ہبہ قبضہ کرائے بغیر تام نہیں ہوتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کہ بارے میں کہ میرے پاس دو تولہ سونا ہے اور کچھ نقدی بھی ہے، عید الاضحیٰ سے پہلے میں نے اپنے شوہر سے کہہ دیا تھا کہ میری طرف سے آپکو اجازت ہے کہ جس چیز میں خرچ کرنا چاہتے ہو خرچ کرلو لیکن سونا ابھی تک میرے پاس ہے تو کیا میرے اوپر قربانی و زکوٰۃ لازم ہے یا نہیں؟ نیز میرے شوہر نے اس سے پہلے بھی میری اجازت سے میرے سونے سے کچھ بیچ دیا تھا۔ مستفتی ام داؤد شاہ

﴿جواب﴾ آپ نے شوہر کو اپنا ذاتی سونا اگر ہبہ کر کے باقاعدہ ان کے قبضہ میں دیدیا تو شوہر مالک ہو جائینگے اور آپ کی ملکیت ختم ہو جائے گی پھر آپ پر اسکی زکوۃ اور قربانی واجب نہ ہوگی لیکن صرف زبانی کہہ دینے سے کہ ''اسکو خرچ کرنا چاہتے ہو تو خرچ کرلو'' ہبہ تام نہیں ہوتا نہ وہ مالک قرار پاتے ہیں، اس لئے آپ ہی پر زکوۃ وغیرہ واجب ہوگی، البتہ اپنا قبضہ توڑ کرا نکے حوالہ کردیں پھر وہ مالک ہونگے اور زکوۃ وغیرہ بھی ان پر واجب ہوگی۔

لمافی الهداية:(۲/۲۸۶،طبع رحمانيه)

وتصح بالايجاب والقبول والقبض لماالايجاب والقبول فلانه عقدوالعقدينعقد بالايجاب والقبول والقبض لابدمنه لثبوت الملک۔۔۔ولناقوله عليه السلام: لايجوز الهبةالا مقبوضة.

ولمافی الفقه الاسلامی وادلته:(۵/۳۹۹۲،طبع رشيديه)

فالقبض فی الهبةان يكون الموهوب مقبوضا،فلايثبت الملک للموهوب له قبل القبض بل لاتتحقق الهبةالابالقبض والقبض مولدلاثار الهبة عندالحنفية.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:اسلام بادشاہ ہمیشئی

۲۴محرم الحرام ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۱۸۸۸

﴿شادی کے موقع پر تحفے تحائف وغیرہ دینے کی شرعی حیثیت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں یہ طریقہ رائج ہے کہ جب خاندان میں کسی کی شادی ہوتی ہے تو خاندان کے دوسرے افراد گندم، گھی، چینی وغیرہ کے ذریعے سے مدد کرتے ہیں لیکن مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ مقصود انکا یہ ہوتا ہے کہ جب ہمارے ہاں شادی ہوگی تو یہ بھی اس سے زیادہ چیز لیکر آئیں گے اگر خدانخواستہ کوئی شخص بدلہ نہ

دے یا کم دیں تو ناراضگی کا اظہار بھی کر دیتے ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ خاندان والوں سے ایسی چیزیں لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور لینے کے بعد واپس کرنا لازمی ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد داؤد شاہ

﴿جواب﴾ خاندان والوں کی طرف سے یہ سامان جسکو دیا جاتا ہے، یہ ہبہ کی صورت ہے، لہٰذا فی نفسہ لینا دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ پسندیدہ عمل ہے لیکن ہبہ دینے والے کا اس پر نظر رکھنا کہ اس کا بدلہ ملیگا یہ ناپسندیدہ سوچ ہے، اس سے بچنا چاہیے، البتہ جس شخص کو کوئی ہبہ، عطیہ وغیرہ کسی دوست، عزیز کی طرف سے ملے، اس کے لئے اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ وہ بھی مناسب موقع پر اس کی مکافات کرے ہاں مکافات کی صورت ایسی نہ بنائے کہ دوسرا آدمی یہ محسوس کرے کہ میرے ہدیہ کا بدلہ دے رہا ہے اور آپ کے علاقہ میں یہ لینا دینا قرض کے درجے میں اگر رائج ہے جسطرح سوال میں ذکر ہے کہ ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں کم دینے کی صورت میں تو یہ ایک صحیح اور پسندیدہ عمل کو غلط نہج ملا ہے، علاقہ کے علماء کرام کو ہی صحیح صورتحال کا علم ہوگا، وہ مناسب سمجھیں تو ہبہ کی اس صورت کو منع کر دیں۔

لمافی قوله تعالی:(سورة الروم، آیت ۳۸)

وما اتيتم من ربا ليربوا في اموال الناس فلا يربوا عند الله ..... الآية.

ولمافی المظهری:(۷/۲۳۶، طبع رشیدیه)

قال البغوى اختلفوا فى معنى الاية فقال سعيد بن جبير ومجاهد وطاؤس وقتادة واكثر المفسرين هو الرجل يعطى غيره العطية ليثيب اكثر منها وهذا جائز حلال ولكن لا يثاب عليه يوم القيامة وهو معنى قوله لا يربوا عند الله ..... وقال الضحاك هو الرجل يعطى قريبه او صديقه ليكثر ماله ولا يريد به وجه الله.

ولمافی المرقاة:(۶/۱۲۲، طبع رشیدیه)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الا لا تظلموا الا لا يحل مال امرء الا بطيب نفس منه) رواه البيهقى فى شعب الايمان والدارى مسلم او ذمى (الا بطيب نفس) اى بامر او رضا منه.

واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۱۹۰۴

۱۷ صفر ۱۴۳۰ھ

﴿شادی کے موقع پر دلہن کو تحفہ تحائف دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں۔ کہ جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو اسکی سہیلیاں اسکے لئے گفٹ یعنی تحفہ وغیرہ لاتی ہیں لیکن طریقہ کار اس

کا کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ جس لڑکی کو شادی میں تحفہ دیا جاتا ہے یہ لڑکی بھی دینے والی کی شادی میں تحفہ دینے کو ضروری سمجھ لیتی ہے بلکہ اگر یہ تحفہ لینے والی تحفہ دینے والی کو تحفہ کسی مجبوری کی بناء پر نہیں دے پاتی تو اس صورت میں لعن طعن کا خوب شکار ہوتی ہے آیا یہ فعل درست ہے؟

﴿جواب﴾ علاقہ کا عرف واقعی اگر ایسا ہی ہے کہ تحفہ دینے والے کو اس کا بدل لوٹانا ضروری سمجھا جاتا ہے تو ایسی صورت میں تحفہ قبول کرنے سے اس کا بدل مناسب موقع پر لوٹانا ضروری ہوگا لھذا تحفہ میں مثلی چیز مثلاً گندم، چینی یا نقد روپے اگر دیئے ہیں تو وہی چیز لوٹانا ضروری ہوگا اور غیر مثلی چیز اگر دی ہو مثلاً کپڑا، فرنیچر وغیرہ تو اس چیز کی قیمت یا اتنی قیمت کی دوسری کوئی چیز دینا ضروری ہوگا۔

معلوم نہیں مستفتی کا تعلق کونسے علاقہ سے ہے شادی کے موقع پر تحائف لینے دینے کا رواج تو تقریباً ہر علاقہ میں ہوتا ہی ہے لیکن عموماً تعاون احسان ہی کے درجہ میں تحفہ لیتے دیتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ احسان کرنے والا دوسرے سے بھی احسان کی توقع رکھتا ہے لیکن قرض کے درجہ میں اس کا بدل باقاعدہ مطلوب نہیں ہوتا۔

کسی علاقہ میں اگر قرض کے درجہ میں اسکا بدل لوٹانا ضروری سمجھا جاتا ہو تو ایسے رواج کو ختم کرنا چاہئے علماء کرام اور دیندار طبقہ اسمیں کردار ادا کر سکتے ہیں اسلئے کہ ایسے رواج کیوجہ سے آپس میں دل ٹوٹتے ہیں اور ناراضگیاں ہوجاتی ہیں اور رضائے الٰہی چونکہ مقصود نہیں ہوتا تو ثواب بھی کچھ نہیں ہوگا تو یہ رواج نقصان کا باعث ہے اسلئے ختم کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔

لمافی الشامی :(ج۵/۶۹۶طبع سعید)

بان کان من اقرباء الزوج او المرأة اوقال المهدی :اهديت للزوج او المرأة كمافی التاتارخانية ،وفی الفتاوی الخيرية سئل فيمايرسله الشخص الی غيره فی لاعراس ونحوهاهل يكون حكمه حكم القرض فيلزم الوفاء به ام لا؟اجاب :ان كان العرف بانهم يدفعونه علی وجه البدل يلزم الوفاء به مثليافبمثله ،وان كان قيميافبقيمته وان كان العرف خلاف ذلك بان كانوايدفعونه علی وجه الهبة ولاينظرون فی ذلک الی اعطاء البدل فحكمه حكم الهبة فی سائراحكامه فله رجوع فيه بعدالهلاك اوالاستهلاك،ن والاصل فيه ان المعروف عرفاكالمشروط شرطا.

ولمافی مجموعه رسائل الكهنوی (سباحة الفكرفی الجهربالذكرج۳/۳۲طبع ادارة القرآن)

فكم من مباح يصيربالالتزام من غيرلزوم والتخصيص من غيرمخصص مكروها.

ولمافی التفسير المظهری (ج۷/۲۳۶طبع رشيدية)

قال البغوی اختلفوافی معنی الآية فقال سعيد بن جبيرومجاهد وطاوس وقتاده

واکثر المفسرین ھو الرجل یعطی غیرہ العطیة لیثیب اکثر منھا وھذا جائز حلال ولکن لایثاب علیه یوم القیامة وھو معنی قوله لایربو عندالله وقال الضحاك ھو الرجل یعطی قریبه اوصدیقه لتکثیر ماله ولایرید به وجه الله.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: محمد داؤد فاروقی تانکوی

۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۴۱۰۶

﴿کسی مشترک چیز کا ہبہ کرنا صحیح نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا کاروبار بھائیوں کیساتھ مشترک ہے، میرا اس میں پانچواں حصہ ہے یہ ایک کمپنی ہے جس کو ہم مشترک طور پر چلا رہے ہیں، میرے بیٹے نے کافی اصرار کیا کہ مجھے اس میں باقاعدہ حصہ دار بنایا جائے حالانکہ اس کے لئے باقاعدہ تنخواہ مقرر تھی اور میرے بھتیجے بھی ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں لیکن ان کے لئے کوئی بھی تنخواہ مقرر نہیں ہے، ہم بھائیوں نے مشورہ سے بیٹوں کے لئے الگ الگ کاروبار بھی شروع کر کے دیدیا وہ خود ہی سنبھال رہے ہیں لیکن میرے بیٹے کا برابر اصرار رہا کہ مجھے مکمل طور پر پارٹنر بنایا جائے تو مصلحت کی خاطر میں نے کہدیا کہ تجھے پارٹنر بنادیا۔

(۱) اب سوال یہ ہے کہ میرا بیٹا پارٹنر ہے یا نہیں ہے؟ اگر پارٹنر ہے تو میرے لئے شرعاً یہ جائز ہے جبکہ میری دیگر اولاد بھی ہے اور اہلیہ بھی حیات ہے۔ (۲) پارٹنر ہے تو صرف نفع نقصان میں یا کمپنی کے اثاثوں میں بھی شریک ہوگا۔ (۳) کمپنی کے علاوہ بھی ہم بھائیوں کی مشترکہ جائیداد، اثاثے وغیرہ ہیں کیا ان میں بھی شریک ہوگا؟ مستفتی: حاجی مظہر یعقوب ابوبکر مسجد فیز 2

﴿جواب﴾ یادر ہے کہ جب تک والد حیات ہوتے ہیں اپنے مال وجائیداد کے خود ہی مالک اور مختار ہوتے ہیں، بالغ اولاد کو والد کے مال وجائیداد میں سے مطالبہ کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا، لہذا آپکے بیٹے کا مطالبہ کہ مجھے پارٹنر بنایا جائے خلاف شریعت ہے۔

البتہ والد اپنی مرضی اور خوشی سے اولاد کو مالکانہ طور پر جائیداد وغیرہ دینا چاہے تو اسکا بھی اسے اختیار ہے لیکن سب کو برابر دینا چاہیے، یہی اصل حکم ہے، بلاوجہ فرق کرنا مناسب نہیں ہے۔

لمافی الدر المختار: (۸/۵۵۵ مطبع سعید) ولو وھب فی صحته کل المال للولد جاز واثم.

ولمافی تکملة فتح الملھم: (۸/۷۰ مطبع دار العلوم کراچی)

فقد انعقد الاجماع علی جواز اعطاء الرجل ماله لغیر ولده فاذا جاز له ان یخرج جمیع ولده

من ماله جازله ان يخرج عن ذلک بعضهم ذكره ابن عبدالبر وتعقبه الحافظ فى الفتح.

ہاں اگر کسی خاص وجہ سے ایک کو زیادہ دیا دوسرے کو نسبتاً کم دیدیا تو اس طرح فرق کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لمافى الدر المختار:(۵/۶۹۶،طبع سعيد)

لاباس بتفضيل بعض الاولاد فى المحبة لانها عمل القلب وكذافى العطايا ان لم يقصد به الاضرار وان قصده فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عندالثانى وعليه الفتوى.

ولمافى الهندية:(۶/۴۲۷،طبع رشيديه)

ولو وهب جميع ماله من ابنه جاز واثم نص عليه محمد رحمه الله تعالى ولو خص بعض اولاده لزيادة رشده لاباس به.

زندگی میں والد اپنی اولاد کو اگر مالکانہ طور پر جائیداد وغیرہ دیتا ہے تو یہ شرعاً "ہبہ" کہلاتا ہے اور ہبہ صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جو چیز بطور ہبہ دیجائے وہ مشترک نہ ہو بلکہ الگ اور ممتاز ہو اور جس کو ہبہ کیا جائے باقاعدہ اس کے قبضے میں دیا جائے ورنہ ہبہ مکمل نہ ہوگا اور وہ چیز بدستور والد کی ملکیت میں رہے گی۔

لمافى الفقه الاسلامى وادلته:(۵/۳۹۹۰،طبع رشيديه)

فلاتصح عندالحنفيةهبةالمشاع اذاكان يحتمل القسمة كالدار والبيت الكبير وتكون الهبة فاسدة.

ولمافى شرح الزيادات:(۴/۱۱۴۲،طبع دارالفكر بيروت)

والشيوع فى مايحتمل القسمة يمنع تمام القبض فيمنع تمام الهبة.

ولمافى الهندية:(۶/۴۲۹،طبع رشيديه)

وهب نصيبه ممايقسم كالدار والارض والمكيل والموزون من غير شريكه لايجوز عند الكل وان من شريكه لايجوز عندنا.

مندرجہ بالا حوالوں سے آپ کے تمام سوالوں کا جواب واضح ہوگیا کہ آپ نے بیٹے سے اگر چہ یہ کہدیا ہے کہ "ہم تینوں تمام کاروبار میں برابر کے پارٹنر ہوں گے" اس سے وہ نہ نفع ونقصان میں پارٹنر بنے ہیں اور نہ ہی اثاثوں میں، بھائیوں کے ساتھ مشترکہ کاروبار میں اپنے حصے کے آپ خود ہی مالک ہیں، بیٹوں کا کوئی حق نہیں بنتا، اس لئے کہ یہ ہبہ کی ناتمام صورت ہے ہبہ تب صحیح ہوتا کہ آپ اپنے بھائیوں سے اپنا حصہ الگ کرتے اور اپنا تصرف بھی مکمل ختم کرتے اور بیٹے کے حصے میں دیتے تو ہبہ تام ہوجاتا لیکن آپ نے ایسا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا۔

البتہ تمام بھائیوں نے اپنے بیٹوں کو جو الگ کاروبار دیا ہے اور بیٹے خود ہی وہ کاروبار چلا رہے ہیں، آپ

لوگوں کا یعنی والد کا انکے کاروبار پر کوئی قبضہ تصرف باقی نہیں رہا ہے تو صرف ایسے کاروبار کے وہ مالک ہیں۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی

۳ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۷۷۵

﴿کاغذات میں بیوی کا نام لکھوانے سے بیوی مکان کی مالک نہیں بنتی﴾

﴿سوال﴾ محترم مفتی صاحب السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ (۱۳/۰۱/۰۹) کو میری بیوی کا انتقال ہوگیا ہے، اس کے نام ایک مکان ہے جو کہ میں نے اپنے پیسے سے بنایا تھا یعنی رقم میری تھی اور رجسٹری میری بیوی کے نام تھی، اس طرح سے یہ مکان بیوی کے نام تھا، معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ مکان میری بیوی کی ملکیت کہلائے گی یا میری ملکیت؟ جبکہ رقم میری تھی، وارثوں میں کل چار وارث اس طرح ہیں میں (شوہر) دو بیٹے ایک بیٹی، مکان کی اس وقت مالیت پچاس 5000000 لاکھ ہے۔ برائے مہربانی یہ بتادیجئے کہ خدا کے قانون کے مطابق اس مکان یا رقم کے کتنے حصہ ہونگے؟ اور ہر ایک کو کتنی رقم ملیگی؟ حصہ اور رقم دونوں بتادیجئے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے اور بیوی مرحومہ نے اپنی زندگی میں ایک فلیٹ اپنی بیٹی کو دیدیا تھا اور گفٹ ڈیڈ رجسٹری بیٹی کے نام کروادی میں نے بیوی کی زندگی میں بیوی سے کہا تھا کہ یہ جو مکان ہے اس میں اگر دونوں بھائی بیٹی یعنی بہن کو حصہ دے دیں تو ٹھیک ہے ورنہ بیٹی اسی فلیٹ کو اپنا حصہ سمجھے جس پر میری بیوی یہ کہتی تھی کہ مکان میں بیٹی کا بھی حصہ ہے، سوال یہ ہے کہ کیا بیٹی میرا یا اپنے دونوں بھائیوں کا خیال کرتے ہوئے ان کے حق میں اپنا حصہ معاف کرسکتی ہے کہ اس مکان میں وہ حصہ دار نہیں ہے یہ تم دونوں بھائی لے لو تو اس طرح اس مکان کے کتنے حصہ ہوئے اور کتنی رقم تینوں وارثوں کو ملیگی پچاس لاکھ میں سے؟

تنقیح: کیا آپ نے صرف کاغذی کاروائی میں بیوی کا نام لکھوایا تھا یا مالکانہ حقوق بھی بیوی کو دیدیئے تھے؟

جواب تنقیح: صرف کاغذی کاروائی میں بیوی کا نام لکھوایا تھا مالکانہ حقوق اسکے حوالے نہیں کئے تھے آخر تک مکان اپنے قبضے میں تھا اور اب بھی ہے۔

﴿جواب﴾ صرف کاغذوں میں مکان کسی کے نام کروانے سے وہ مالک قرار نہیں پاتا،

مالک بنانا منظور ہو تو اپنا قبضہ اور تصرف مکمل طور پر ختم کر کے اس کے باقاعدہ قبضہ میں دینا ضروری ہے، آپ نے قبضہ اور تصرف آخر تک اپنا رکھا تو صرف نام کروانے سے مکان آپکی بیوی کی ملکیت میں منتقل نہیں ہوا، مکان بدستور آپکی ملکیت میں ہے، آپ اگر چاہتے ہیں کہ یہ مکان صرف میرے دو بیٹوں کا ہو اور اپنی بیٹی کو جو مکان آپنے دیا ہے وہی اسکے لئے کافی سمجھتے ہو تو مکان دونوں کو باقاعدہ تقسیم کر کے انکے نام کر دیں اور اپنا قبضہ خواہ تھوڑی دیر کیلئے ہو مکمل ختم کر کے مکان پوری طرح لڑکوں کے قبضہ اور تصرف میں دیدیں بعد میں بیشک آپ اپنے بیٹوں کیساتھ اسی مکان میں رہائش رکھیں لیکن ایک مرتبہ اپنا قبضہ مکمل طور پر ختم کرنا اور بچوں کے قبضہ میں دیدینا ضروری ہے تا کہ ہبہ تام ہو۔

لما فی خلاصۃ الفتاوی:(۴۰۰/۴ طبع رشیدیہ)

وفی الفتاوی رجل له ابن وبنت اراد ان یهب لهما شیأ فالافضل ان یجعل ----بینهما سواء وهو المختار لورود الأثار ولو وهب جمیع ماله لابنه جاز قضاء وهو اثم نص عن محمد هكذا فی العیون.

ولما فی الدر المختار:(۶۹۶/۵ طبع رشیدیہ)

وفی الخانية لابأس بتفضيل بعض الاولاد فی المحبة لانها عمل القلب وكذا فی العطايا ان لم يقصد به الاضرار وان قصده فسوى بينهم يعطى البنت كالابن عند الثانی وعليه الفتوى ولو وهب فی صحته كل المال للولد جاز واثم.

ولما فی شرح المجلة:(۴۹۶/۲ المادة ۸۳۷ طبع ماجدیہ)(تنعقد الهبة بالايجاب والقبول وتتم بالقبض)

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زئی

۲۷ صفر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۴۳

﴿ھبہ سے رجوع کرنے کی چند مستثنیٰ صورتیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ھبہ میں کن کن صورتوں میں رجوع نہیں کیا جاسکتا؟

﴿جواب﴾ شرعاً ہبہ کی ہوئی چیز میں دوبارہ رجوع کیا جاسکتا ہے، البتہ چند صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں یعنی اسمیں ہبہ شدہ چیز میں رجوع نہیں کیا جاسکتا۔

(۱) ہبہ شدہ چیز میں زیادتی کرلی جائے مثلاً کسی نے ایک شخص کو زمین ہبہ کی پھر اس نے اس زمین میں عمارت یا کنواں بنایا تو اس صورت میں ہبہ کی ہوئی زمین میں رجوع نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) ہبہ کرنے والا یا جس کو ہبہ کیا ہے ان دونوں میں سے کوئی انتقال کر جائے تو پھر ہبہ میں ملک ورثاء کی طرف منتقل ہونے کی وجہ سے بھی رجوع نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) ہبہ کرنے والا اپنی ہبہ شدہ چیز کا عوض لے لے اگرچہ عوض تھوڑا ہو یا زیادہ، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، ہبہ کی جنس سے ہو یا نہ ہو اس صورت میں بھی اپنی ہبہ شدہ چیز میں رجوع نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) ہبہ کی ہوئی چیز موہوب لہ (جسکو ہبہ کی ہو) کی ملکیت سے نکلنے کے بعد بھی واہب (ہبہ کرنے والا) رجوع نہیں کر سکتا۔

(۵) میاں بیوی نے ایک دوسرے کو کوئی چیز ھبہ کی تو اس صورت میں رجوع نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اس سے قطع تعلق کا اندیشہ ہے۔

(۶) اپنے کسی ذی رحم محرم کو ھبہ کرنے کے بعد بھی رجوع نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ ہبہ سے مقصود صلہ رحمی ہے، ان کے علاوہ تمام صورتوں میں رجوع کیا جا سکتا ہے اگرچہ ناپسندیدہ ہے۔

لما فی الھدایۃ:(۳/۲۹۰-۲۹۱،طبع رحمانیہ)

واذا وھب ھبۃ لاجنبی فلہ الرجوع فیھا الاان یعوضہ عنھا اوزیادۃ متصلۃ اویموت احدالمتعاقدین اویخرج الھبۃ عن ملک الموھوب لہ الخ.

ولما فی التنویر مع الرد:(۵/۶۹۹،طبع سعید)

(ویمنع الرجوع فیھا دمع خزقۃ) قال الرملی: قدنظم ذلک والدی العلامۃ شیخ محیی الدین فقال:

منع الرجوع من المواھب سبعۃ ☆ فزیادۃ موصولۃ موت عوض

وخروجھا عن ملک موھوب لہ ☆ زوجۃ قرب ھلاک قدعرض.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زئی

۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۲۰

﴿والد صاحب کی حیات میں تقسیم شدہ جائیداد کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہم چار بھائی ہیں جنکے درمیان جائیداد کی تقسیم والد صاحب نے بقید حیات کردی تھی جس میں ہر بھائی کو اپنا حصہ دے دیا تھا اور ایک بھائی مثلاً زید جنکے حصے میں دکان آئی اور والد صاحب کی خدمت بھی وہ کرتا تھا تو تحریر میں یہ لکھا گیا کہ یہ دکان زید اور والد صاحب کی ہے اس وقت والد صاحب نے یہ اعتراض بھی کیا تھا

کہ میرا نام کیوں اسمیں ڈالا تو تحریر والے نے کہا کہ آپ اور زید میں کیا فرق ہے یعنی زید آپ کی خدمت کرتا ہے آپکے ساتھ ہے لیکن دکان میں والد صاحب کا کوئی تصرف نہیں تھا۔

اس تقسیم کے پانچ سال بعد بھائیوں نے زید پر یہ دعویٰ کیا کہ والد صاحب چونکہ آپکے ساتھ تھے تو آپکی ساری جائیداد میں ہم سب بھائی شریک ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ زید کے ساتھ دوسرے بھائیوں کا حصہ ہے یا نہیں ؟ اگر شریک ہیں تو زید نے جو پانچ سال محنت کر کے پلاٹ وغیرہ خریدے ہیں اسکا کیا حکم ہے؟ مستفتی؛ عبدالحسیب فیز ۲ ڈی ایچ اے کراچی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں پہلے یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ والد صاحب جب اپنی جائیداد بقید حیات تقسیم کرتے ہیں وہ ہبہ سمجھا جائیگا نہ کہ میراث، اسلئے کہ میراث کا تعلق موت سے ہے تو جب والد صاحب نے ہر ایک کو اپنا حصہ الگ کر کے دیدیا اور ہر ایک نے اس پر قبضہ بھی کرلیا تو یہ ہبہ تام ہوگیا، اب اسمیں کسی کا کوئی حق باقی نہیں رہا، لہذا زید کے حصہ میں جو دکان آئی ہے اور والد صاحب کی حیات میں صرف زید کے تصرف میں رہی تو اب یہ زید کی ملکیت ہے کسی بھی بھائی کا اسمیں کوئی حصہ نہیں ہے، تحریر میں لکھنے والے کی غلطی سے دکان میں والد صاحب کو حصہ دار سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۶۹۰/۵،طبع سعید)

(وتتم)الھبۃ(بالقبض)الکامل(ولو الموھوب شاغلا لملک الواھب لا مشغولا بہ) والاصل ان الموھوب ان کان شاغلا بملک الواھب منع تمامھا.

ولمافی الھندیۃ:(۳۷۶/۴،طبع رشیدیہ)

قال الاب جمیع ماھو حقی وملکی فھو ملک لولدی ھذا الصغیر فھو کرامۃ لاتملیک بخلاف مالو عینہ فقال حانوتی الذی املکہ اوداری لابن الصغیر فھو ھبۃ وتتم بکونھا فی یدالاب کذافی القنیہ.

ولمافی التنقیح الحامدیۃ:(۹۳/۲،کتاب الھبۃ،طبع رشیدیہ)

ومنھا ان یکون الموھوب مقبوضا حتی لایثبت الملک للموھوب لہ قبل القبض وان یکون مقسوما اذاکان ممایحتمل القسمۃ.

ولمافی بدائع الصنائع:(۱۲۲/۶،کتاب الھبۃ سعید)یملک الموھوب لہ الموھوب بالقبض.

واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

یکم صفر الخیر ۱۴۳۱ھ

فتویٰ نمبر: ۲۴۰۹

﴿اپنی زندگی میں جائیداد ورثاء میں تقسیم کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں ہیں، میں اپنی زندگی ہی میں ان کے درمیان جائیداد تقسیم کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرے انتقال کے بعد ان میں تلخیاں نہ ہوں، کیا میرا اپنی زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو تقسیم کی کیا صورت ہوگی؟ مستفتی: رشید اللہ خان

﴿جواب﴾ یاد رہے کہ زندگی میں اپنی جائیداد ورثاء میں تقسیم کرنا وراثت نہیں بلکہ ہبہ کہلاتا ہے، مذکورہ صورت بھی ہبہ ہی کی ہے۔

زندگی میں جائیداد تقسیم کی جا سکتی ہے، اس کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ بیٹے اور بیٹیوں کو برابر حصے دیے جائیں، تاہم بیٹوں کو بنسبت بیٹیوں کے دوگنا دینا بھی جائز ہے اور اگر کسی بچے کو دینداری یا فرمانبرداری اور خدمت کی وجہ یا کسی اور وجہ سے مثلاً اس کی مالی حالت کمزور ہو اور اولاد کا بوجھ اس پر زیادہ ہو دیگر ورثاء سے زیادہ دے دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس لئے کہ ذاتی مال میں جائز تصرف کا آپ کو حق حاصل ہے۔

لما فی خلاصۃ الفتاوی: (۴/۴۰۰ طبع رشیدیہ)

وفی الفتاوی رجل له ابن وبنت اراد ان یهب لهما شیئاً فالافضل ان یجعل للذکر مثل حظ الانثیین عند محمدؒ وعند ابی یوسفؒ بینهما سواء هو المختار لورود الاثار ولو وهب جمیع ماله لابنه جاز فی القضاء وهو اثم نص عن محمدؒ هکذا فی العیون ولو اعطی بعض ولده شیئاً دون البعض لزیادة رشده لاباس به وان کانا سواء لاینبغی ان یفضل ولو کان ولده فاسقاً فاراد ان یصرف ماله الی وجوه الخیر ویحرمه من المیراث هذا خیر من ترکه لان فیه اعانة علی المعصیة ولو کان ولده فاسقاً لایعطی له اکثر من قوته.

ولما فی التنویر مع الدر: (۵/۶۹۶ طبع سعید)

وفی الخانیة: لاباس به بتفضیل بعض الاولاد فی المحبة لانها عمل القلب وکذا فی العطایا ان لم یقصد به الاضرار وان قصده فسوی بینهم یعطی البنت کالابن عند الثانی وعلیه الفتوی.

ولما فی الشامی: (۵/۶۹۶ طبع ایچ ایم سعید)

(قوله وعلیه الفتوی) ای علی قول ابی یوسف من ان التنصیف بین الذکر والانثی افضل من التثلیث الذی هو قول محمد رملی.

واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش
الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۲۷۳۹
۸ رجب المرجب ۱۴۳۱ھ

﴿واپڈا کے ملازم کیلئے مفت یونٹس کسی کو ہبہ کرنا درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی واپڈا میں ملازم ہے اور واپڈا والے کمپنی ہر ملازم کو اسکے سکیل کے بقدر بجلی کے کچھ یونٹ مفت دیتے ہیں، یہ یونٹس کمپنی کی طرف سے رعایتی ہوتے ہیں، اب پوچھنا یہ ہے کہ ان یونٹوں کو کسی دوسرے آدمی کو ہبہ کرنا یا فروخت کرنا کیسا ہے؟ مستفتی ڈاکٹر حازم صاحب

﴿جواب﴾ واپڈا والے یہ یونٹس اپنے ملازم کو اباحۃ دیتے ہیں، تملیکا نہیں دیتے یعنی اتنی یونٹس تک استعمال مفت قرار دیتے ہیں جسکی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر واپڈا والے کو معلوم ہو جائے کہ اس ملازم نے ان یونٹوں کو بیچ دیا یا کسی کو ہبہ کر لیا تو یہ قانونی جرم شمار کیا جاتا ہے اور ان کی طرف سے قانونی کاروائی کی جاتی ہے، لہٰذا رعایتی یونٹ کسی کو ہبہ کرنا یا آگے بیچنا صحیح نہیں ہے۔

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز الرحمن

۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ فتوی نمبر: ۱۴۳۲

﴿حكم العطية والوصية باعضاء الانسانية﴾

﴿انسانی اعضاء کو عطیہ کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ من اراد ان يعطى او يوصى باعضائه هل يجوز له ام لا ؟

﴿جواب﴾ الحكم الاصلى لهذه المسئلة انه لا يجوز لاحد ان يعطى او يوصى عضوا من اعضائه بحال لكرامة الانسانية وفى ابتذاله اهانة لها كما هو مقتضى قوله تعالى (ولقد كرمنا بنى آدم) وقوله ﷺ (لعن الله الواصلة والمستوصلة) الا ان بعض العلماء جوزوها عند الضرورة الشديدة بشرط ان لا ينفعه اعضاء غير الانسانية وان لا يفضى الى موت متبرع كالقلب او الى تعطيل له من تمام المنفعة كاليدين والرجلين واما نقل احدى الكليتين او احدى العينين او بعض الدم اذا لم يؤدى الى ضرر بالغ بتفويت اصل الانتفاع او جله جائز بشرط حصول الاذن من المنقول منه وعند الضرورة الشديدة بطريق يقين كاخبار طبيب حاذق مسلم واما البيع فلا يجوز بكل حال ولكن جانب الجواز مقصورا على الضرورة الشديدة بحيث تتوقف حياة

المنقول اليه على ذلک العمل وان لايؤدى هذاالعمل الى ضرربالغ بتفويت اصل الانتفاع للمتبرع ومع هذاينبغى ان يستغفرعلى هذاالعمل ويتصدق بشىء احتياطا وان كان هذاالعمل تحسنية مثلالوكان له عين وهويريدعين آخراواضافة بعض الاسنان فلاخلاف فى عدم الجواز.

لمافى الشامى:(۳۳۸/۶،طبع سعيد)

وان قال له آخراقطع يدى وكلهالايحل لان لحم الانسان لايحل فى الاضطرار لكرامته.

ولمافى الفتاوى الهندية:(۳۳۸/۵،طبع رشيديه)

مضطر لم يجد ميتة وخاف الهلاك فقال له رجل اقطع يدى وكلهااوقال اقطع منى قطعة وكلهالايسع له ان يفعل ذالک ولايصح أمره به كمالايسع للمضطران يقطع قطعة من نفسه فيأكله.

ولمافى التنويرمع الدر:(۲۰۴/۱،طبع سعيد)

(وآدمى)فلايدبغ لكرامته ولودبغ طهروان حرم استعماله،حتى لو طحن عظمه فى دقيق لم يؤكل على الاصح احتراما.

ولمافى سنن ابى داود:(۱۰۲/۲،طبع رحمانيه)كسرعظم الميت ككسره حيا.

ككسره حيايعنى فى الاثم كمافى رواية قال الطيبىؒ اشارة الى انه لايهان ميتاكما لايهان حياوقال ابن الملکؒ والى ان الميت يتالم وقال ابن الحجرؒ ومن لازمه ان يستلذبمايستلذبه الحى انتهى وقدأخرج ابن ابى شيبةؒ عن ابن مسعودرضى الله عنه قال اذى المؤمن فى موته كاذاه فى حياته ذكره فى المرقات.

واللہ اعلم بالصواب: معراج الدین
فتویٰ نمبر:۱۲۷۱

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
۲۹ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ

﴿والد سے مانگی گئی رقم قرض ہے یا ہبہ؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اپنے تمام بھائیوں میں سے بڑا ہوں ہم کل سات بھائی دو بہنیں ہیں ۱۹۹۶ء میں میں نے اپنے والد سے درخواست کی کہ مجھے کچھ پیسے دیدیں تاکہ میں کراچی میں اپنا کاروبار شروع کروں والد صاحب نے دو لاکھ روپے نقد دیدیا جس سے میں نے ایک فلیٹ قسطوں پر لیا دو لاکھ نقد دیکر اور مزید قسطیں ادا کرنی تھیں، قسطوں کی ادائیگی کیلئے اسی طرح مزید کچھ میرے ذمہ اس فلیٹ کے سلسلہ میں رقم واجب ہوئی، میرے پاس رقم نہیں تھی تو اپنے بھائیوں سے بطور قرض مزید رقم لی بلکہ کئی مرتبہ قرض لیا پھر

والد صاحب کا انتقال ہوا، پوچھنا یہ ہے کہ میں نے والد صاحب کی رقم سے جو فلیٹ لیا ہے آیا اس میں میرے بھائیوں کا حق ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ رقم دیتے وقت والد صاحب نے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ یہ قرض ہے اور نہ ہی بعد میں کوئی مطالبہ یا واپسی کا تذکرہ کیا۔

﴿جواب﴾ والد صاحب نے آپکو جو رقم دی ہے اور اسکے بعد اس رقم کے بارے میں قرض ہونے کی صراحت نہیں کی اور نہ ہی بعد میں مطالبہ کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقم آپکے والد صاحب نے آپکو بطور ہبہ دی ہے، لہذا اس رقم کا لوٹانا اور میراث میں شامل کرنا آپکے ذمہ واجب نہیں ہے، البتہ آپکے بھائیوں نے گواہوں وغیرہ کے ذریعہ اگر ثابت کر دیا کہ والد صاحب نے یہ رقم بطور قرض دی تھی تو اتنی رقم والد صاحب کے ترکہ میں شامل کرنا ضروری ہوگا اور مکان کا سودا آپ نے خود ذاتی طور اپنے لئے کیا ہے اس میں کسی اور بھائی وغیرہ کا کوئی حصہ نہیں ہے، البتہ بھائیوں سے جو قرضہ لیا ہے اسکی ادائیگی آپکے ذمہ ہے۔

لمافی الھندیۃ:(۴/۳۹۲،طبع رشیدیہ کوئٹہ)

ولودفع الی ابنہ مالافتصرف فیہ الابن یکون للأب الااذادلت دلالۃ علی التملیک کذافی الملتقطرجل دفع الی ابنہ فی صحتہ مالایتصرف فیہ ففعل فیہ وکثرذلک فمات الأب ان أعطاہ ھبۃ فالکل لہ وان دفع الیہ لان یعمل فیہ للأب فھومیراث کذا فی جواھرالفتاوی۔

ولمافی الدرالمختار:(۵/۷۰۹،طبع ایچ ایم سعید)

دفع لابنہ مالالیتصرف فیہ ففعل وکثرذلک فمات الأب ان أعطاہ ھبۃ فالکل لہ والافمیراث وتمامہ فی جواھرالفتاوی۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۵۴۵

﴿صدقہ اور ھبہ میں فرق﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ھبہ اور صدقہ میں کیا فرق ہے؟

﴿جواب﴾ ھبہ میں ابتداء صلہ رحمی اور اکرام مقصود ہوتا ہے اگرچہ مآلاً اسمیں بھی ثواب ہوتا ہے اور صدقہ میں ابتداء ہی ثواب مقصود ہوتا ہے، البتہ دونوں کے حکم میں یہ فرق ہے کہ ھبہ میں چیز دینے کے بعد بعض صورتوں میں رجوع کر سکتا ہے اور صدقہ میں رجوع نہیں کر سکتا ہے۔

لمافی کشف اصطلاحات الفنون:(۲/۱۴۴۹،طبع سھیل اکیڈمی)

الھبۃ عندالفقہاء تملیک عین بلاعوض ای بلاشرط عوض لاان عدم العوض شرط فیہ

حتی ینتقض بالھبة بشرط العوض فتدبر ویشتمل بھذا الھدیة المراد بھا اکرام المھدی والصدقة المراد بھا وجه الله وقیل الصدقة لیست بھبة اذ لا یصح الرجوع فیھا بخلاف الھبة.

ولما فیه ایضاً:(۱/۸۵۱ طبع سھیل اکیڈمی)

الصدقة بفتحتین من الصدق سمی بھا عطیة یراد بھا المثوبة لا التکرمه لان بھا یظھر صدقه فی العبودیة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

۲۵ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زئی

فتویٰ نمبر: ۲۰۷۸

﴿بھکاری سے صدقہ یا ہبہ میں کوئی چیز لینا کیسا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بھیک مانگنے والے سے صدقہ یا ہبہ میں کوئی چیز لینا کیسا ہے؟

مستفتی: قاری محمد دین

﴿جواب﴾ پیشہ ور مانگنے والے کے پاس جو مال ہوتا ہے شرعاً بھکاری اس کا مالک قرار پاتا ہے لیکن طیب نہیں ہوتا یعنی اس مال میں خبث ہوتا ہے اور خبیث مال کا حکم یہ ہے کہ وہ اپنے مالکوں کو واپس کر دیا جائے لیکن اگر مالک معلوم نہ ہوں تو اس مال کو صدقہ کرنے کا حکم ہوتا ہے، اور بھکاری نے جن سے مال لیا ہوتا ہے وہ بھی چونکہ معلوم نہیں ہوتے اس لئے اس کو بھی اپنا مال صدقہ کرنا واجب ہوتا ہے بلہٰذا اگر وہ کسی کو صدقہ یا ہبہ کرے تو وہ لے سکتا ہے اس میں کوئی خرابی نہیں ہے، اور خباثت کا جو حکم اس مال میں بھکاری کے پاس موجود تھا وہ مالک کے تبدیل ہونے سے باقی نہیں رہے گا یعنی دوسروں کے لئے جائز ہوگا۔

(لما فی صحیح البخاری ۱/۲۰۲ طبع: قدیمی)

عن عائشة انھا ارادت ان تشتری بریرة للعتق واراد موالیھا ان یشترطوا ولاءھا فذکرت عائشة للنبی صلی الله علیه وسلم فقال لھا النبی صلی الله علیه وسلم اشتریھا فانما الولاء لمن اعتق قالت واوتی النبی صلی الله علیه وسلم بلحم فقلت ھذا ما تصدق به علی بریرة فقال ھو لھا صدقة ولنا ھدیة.

(ولما فی التنویر مع الدر ۶/۱۱۶، طبع سعید)

(وطاب لسیدہ وان لم یکن مصرفا) للصدقة (ما ادی الیه من الصدقات فعجز) لتبدل الملک واصله حدیث بریرة.

(وفی الشامی تحت ھذا): (قوله ما ادی) ای المکاتب الیه: ای الی المولی (قوله فعجز) وکذا لو عجز قبل الاداء الی المولی وھذا عند محمد ظاھر لانه بالمعجز یتبدل

الملک،وکذاعندابی یوسف وان کان بالعجزتقررملک المولیٰ عنده،لأنه لاخبث فی نفس الصدقة وانما الخبث فی فعل الأخذلکونه اذلالابه،ولایجوزذالک للغنی من غیرحاجة ولاللهاشمی لزیادة حرمته ولأخذلم یوجدمن المولی هدایة(قوله لتبدل الملک)فان العبدیتملکه صدقة والمولیٰ عوضاعن العتق.

(ولمافی الشامی ۳۸۵/۶، طبع:سعید)

قال بعض مشائخنا:کسب المغنیة کالمغصوب لم یحل أخذه ،وعلی هٰذاقالوالومات الرجل وکسبه من بیع الباذق اوالظلم اوأخذالرشوة یتورع الورثة،ولایأخذون منه شیئاوهواولیٰ بهم ویردونهاعلیٰ اربابهاان عرفوهم،والاتصدقوابهالان سبیل الکسب الخبیث التصدق اذاتعذرالردعلیٰ صاحبه اه

لکن فی الهندیةعن المنتقی عن محمدفی کسب النائحة،وصاحب طبل اومزمار، لوأخذبلاشرط،ودفعه المالک برضاه فهوحلال ومثله فی المواهب،وفی التاتارخانیة وماجمع السائل من المال فهوخبیث.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صدیق انور

۹صفرالخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:۳۱۷۳

﴿تاحیات ہبہ کرنے سے ہمیشہ کے لئے ہبہ ہوجاتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنے پڑوسی کو مکان ہبہ میں دیا اور کہا کہ آپ اپنی حیات تک اس مکان میں رہیں اور آپ کے انتقال کے بعد میں یہ مکان واپس لوں گا، اتفاق سے مکان کا مالک پہلے فوت ہوگیا اور اس کے بعد اسکا پڑوسی جس کو مکان دیا تھا وہ فوت ہوگیا، عرض یہ ہے کہ ابھی یہ مکان اصل مالک (واھب) کے ورثاء کو ملے گا یا اس کے پڑوسی (موھوب لہ) کے ورثاء کو ملے گا؟

﴿جواب﴾ مذکورہ ہبہ کی صورت کو شریعت میں عمریٰ کہا جاتا ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ موھوب لہ اس کا مالک ہوجاتا ہے اور اصل مالک کی طرف سے لگائی ہوئی شرط کہ آپ کے مرنے کے بعد مکان واپس میرا ہوجائیگا کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، احادیث میں اسکی صراحت ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں موھوب لہ (جو اصل مالک کا پڑوسی ہے) کے ورثاء کو یہ مکان میراث میں ملے گا۔

لمافی سنن ابی داؤد:(۱۲۵/۲،طبع رحمانیه)

عن جابران النبی ﷺ قال من اعمرعمری فهی له ولعقبه یرثهامن یرثه من عقبه.

ولمافی الهدایة:(۲۹۲/۳طبع رحمانیه)

(والعمری جائزة للمعمرله حال حیاته ولورثته من بعده)لماروینا ومعناه ان یجعل داره

له مدة عمره واذامات ترد عليه فيصح التمليك ويبطل الشرط لمارويناوقدبيناان الهبة لاتبطل بالشروط الفاسدة.

ولمافی التنویرمع الدر:(۵/ ۶۸۷ طبع سعید)(جاز العمرى)للمعمرله ولورثته بعده لبطلان الشرط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ والله اعلم بالصواب: عبداللہ عفااللہ عنہ

۱۵جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ فتوی نمبر:۹۹۵

﴿منگنی کے موقع پرلڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کوانگوٹھی دینا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ منگنی کے موقع پرلڑکے کے گھر والے لڑکی کوانگوٹھی دیتے ہیں شرعااس کی کیاحیثیت ہے؟ کیایہ درست ہے یانہیں؟

﴿جواب﴾ منگنی کے موقع پرلڑکے والوں کالڑکی کوانگوٹھی دیناشرعاہدیہ اورہبہ ہے،جس کے لینے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن بہاں باقاعدہ رسم ورواج بن جائے ہدیہ اورہبہ مقصودنہ رہے توایسے علاقوں میں اس رواج کوختم کرنے کی کوشش ہونی چاہیے،اس سے کافی مفاسدپیداہوتے ہیں۔

لمافی التنویرمع الدر:(۵/ ۶۸۲،طبع سعید)

الهبة:هی لغة التفضل على الغير ولوغيرمال وشرعا(تمليك العين مجانا)

ولمافی التنویرمع الدر:(۳/ ۱۵۳،طبع سعید)

(خطب بنت رجل وبعث اليهااشياء ولم يزوجهاابوهافمابعث للمهريسترد عينه قائما)....

(وكذا)يسترد(مابعث هدية وهي قائمة دون الهالك والمستهلك)لانه في معنى الهبة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ والله اعلم بالصواب: عبدالوہاب عثمانی عفااللہ عنہ

۲۸ربیع الاول ۱۴۳۱ھ فتوی نمبر:۲۵۴۹

﴿قبضہ کے بغیرھبہ تام نہیں ہوتا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والدمحمدیوسف شکلاکی پہلی بیوی روقیہ بی بی سے ہم تین بہن بھائی ہیں،میں ایک بھائی صدیق اورمیری دوبہنیں ہیں،میری والدہ روقیہ بی بی کاہمارے بچپن میں ہی انتقال ہوگیاتھا،اس کے بعدہمارے والد صاحب نے صغری بی بی سے شادی کی جنھوں نے سگی ماں کی طرح ہماری شادیاں کی،میری بہنیں مجھ سے بڑی ہیں اورصاحب حیثیت ہیں،میرے والدنے اپنی زندگی میں ہی کچے اسٹامپ پیپرپروصیت لکھ دی تھی کہ میراآدھامکان میرے بیٹے صدیق کاہے اورآدھامکان

میری دوسری بیوی صغریٰ کا ہے جوکہ پکی کے ڈی اے کی فائل بنی ہوئی ہے، ہم دونوں کے نام پر میرے والد کر کے گئے ہیں اور ساتھ میں وصیت میں بھی یہ لکھ کر گئے ہیں کہ میرے اس مکان میں میری بیوی اور بیٹے کے علاوہ کوئی حصہ دار نہیں ہے، لہٰذا اب میری بہنیں اس مکان میں سے حصہ مانگ رہی ہیں شرعاً انکا حق اس میں بنتا ہے یا نہیں؟ سائل: محمد صدیق

تنقیح: مرحوم محمد یوسف نے یہ مکان اپنی حیات میں اس طور پر آپکے قبضہ میں بھی دیدیا تھا کہ خود اپنا قبضہ باقی نہ رکھا ہو یا اسی مکان میں آخر تک رہائش پذیر تھے؟

جواب تنقیح: مرحوم محمد یوسف تادم حیات اسی مکان میں رہائش پذیر تھے، اپنا قبضہ بھی باقی رکھا تھا۔

﴿جواب﴾ آپکے والد مرحوم محمد یوسف نے یہ مکان اگرچہ اپنی بیوی صغریٰ اور آپکے نام کرایا تھا اور اسکی وصیت بھی اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دی ہے لیکن خود چونکہ تادم حیات اسی مکان میں رہائش پذیر رہے اور اپنا قبضہ باقی رکھا اس لئے یہ ہبہ تام نہ ہوا اور ملکیت آپ اور مرحوم کی زوجہ صغریٰ کی طرف منتقل نہ ہوئی بلکہ مرحوم محمد یوسف ہی کی ملکیت میں یہ مکان آخر تک باقی رہا، لہٰذا یہ مکان مرحوم کے ترکے میں شمار ہوگا اور قانون وراثت کیمطابق ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

لہٰذا آپکے والد مرحوم نے اپنی ذاتی ملکیت میں مکان سمیت جو کچھ منقولہ وغیر منقولہ گھریلو سامان وغیرہ چھوڑا ہے سب سے پہلے مرحوم کی تکفین و تدفین سے متعلق جائز اخراجات ادا کئے جائیں پھر دیکھیں اگر مرحوم کے ذمہ کوئی واجب الاداء قرضہ ہے تو وہ ادا کریں، اس کے بعد دیکھیں اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت غیر وارث کیلئے کی ہے تو باقی ماندہ ترکہ میں سے ایک تہائی (۱/۳) کی حد تک اس پر عمل کریں مسئلہ وصیت چونکہ وارث کیلئے کی ہے اس لئے شرعاً یہ معتبر نہیں ہے، اس کے بعد جو کچھ باقی رہے تمام کے کل بتیس (۳۲) حصے بنالیں جن میں سے مرحوم کی بیوہ صغریٰ کو چار (۴) حصے، مرحوم کی ہر ایک بیٹی کو سات (۷) حصے اور مرحوم کے بیٹے یعنی آپ کو چودہ (۱۴) حصے ملیں گے۔ تقسیم میراث کیلئے نقشہ ملاحظہ ہو:

32/8
تصحـــ
مسئلـــــہ
میـــــت

بیوہ (صغریٰ)	بیٹا (محمد صدیق)	بیٹی (حمیدہ)	بیٹی (زلیخا)
4	14	7	7

لمافی التنویر مع الدر:(۵/۶۹۰،طبع ایچ ایم سعید)

(وتتم)الھبۃ(بالقبض)الکامل(ولو الموھوب شاغلا لملک الواھب لا مشغولا بہ) والاصل ان الموھوب ان کان مشغولا بملک الواھب منع تمامھا.

ولمافی التنقیح الحامدیۃ:(۲/۹۳،کتاب الھبۃ،طبع حقانیہ)

ومنھا ان یکون الموھوب مقبوضا حتی لا یثبت الملک للموھوب لہ قبل القبض وان یکون مقسوما اذا کان مما یحتمل القسمۃ.

ولمافی بدائع الصنائع:(۶/۱۲۲،طبع سعید)یملک الموھوب لہ الموھوب بالقبض.

لمافی شرح المجلۃ:(۳/۳۴۴،المادہ ۸۳۷،طبع رشیدیہ)

(تنعقد الھبۃ بالایجاب والقبول وتتم بالقبض)وقال الشارح اعلم ان المراد بالقبض الذی تتم بہ الھبۃ ھو القبض الکامل وھو فی المنقول ما یناسبہ وفی العقار ما یناسبہ.

ولمافی الھدایۃ:(۳/۲۸۵-۲۸۶،طبع رحمانیہ)

وتصح بالایجاب والقبول والقبض اما الایجاب والقبول فلانہ عقد والعقد ینعقد بالایجاب والقبول والقبض لابد منہ لثبوت الملک...... لقولہ علیہ السلام:لایجوز الھبۃ الامقبوضۃ.

ولمافی الفقہ الاسلامی وادلتہ:(۵/۱۹،طبع رشیدیہ)

فالقبض فی الھبۃ ان یکون الموھوب مقبوضا فلا یثبت الملک للموھوب لہ قبل القبض بل لا تتحقق الھبۃ والقبض مولد لآثار الھبۃ عند الحنفیۃ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبیداللہ عابد دیروی

۱۰ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۵۰۷

﴿والد نے زندگی میں کسی اولاد کو حصہ دیا تو وہ ھبہ ہے﴾

﴿سوال﴾ (۱) کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے والد صاحب نے اپنی زندگی میں سب سے بڑے بھائی کو زمین میں سے حصہ دیا تھا،اور رجسٹری پر بھی یہ الفاظ لکھوائے تھے کہ باقی زمین میں سے اس بھائی کو کوئی حصہ نہیں دینا،والد صاحب کی وفات کے بعد اب ہم بھائی باقی زمین تقسیم کرتے ہیں،تو بڑا بھائی کہتا ہے کہ جو زمین والد صاحب نے مجھے دی تھی وہ تو میں کمائی کرکے جو پیسے والد صاحب کو دیتا رہا ان پیسوں کی زمین والد صاحب نے خریدی ہے اور مجھے دی ہے،لہٰذا اب باقی زمین میں بھی میرا حصہ ہے یعنی باقی زمین تین کے بجائے چار حصوں میں تقسیم کرو،تفصیل سے جواب مرحمت فرمائیں۔

(۲) ہماری بہنیں بھی تھیں، ایک بہن پیدائشی معذور تھی اور اسکی وفات والد صاحب کی وفات کے بعد ہوئی اور دوسری بہن شادی شدہ بال بچے دار تھی اور انکی بھی وفات والد صاحب کی وفات کے بعد ہوئی، ہمارے بہنوئی نے شادی کے بعد زمین خرید کر مکان بنایا تو والد صاحب نے انکے ساتھ کافی مدد کی میرے بھائی جان نے یہ بتایا کہ والد صاحب نے اپنی زندگی میں یہ بات کہی تھی کہ میں نے اپنی اس بیٹی کا جو حصہ بنتا تھا وہ زمین خریدنے اور مکان بننے میں ادا کر دیا ہے، اب ہم اپنی ان دونوں بہنوں کا حصہ زمین سے کیسے ادا کریں یا والد صاحب نے جس طریقہ سے ادا کیا وہ ادا ہو گیا؟ مستفتی: مسعود اختر داہ کینٹ

﴿جواب﴾ (۱) والد اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو جو کچھ بھی دے وہ ہبہ ہوتا ہے چاہے میراث ہی کے نام پر کیوں نہ دیا ہو، آپ کے والد صاحب نے بڑے بیٹے کو جو زمین دی تھی اگر وہ اپنی حیات ہی میں ان کی ملک میں مکمل طور پر دے دی تھی یعنی اس پر سے اپنا قبضہ ختم کر کے انکو قبضہ دے دیا تھا تو یہ ہبہ تام ہوگا، اب اسمیں کسی کا حصہ نہیں ہے، والد مرحوم کو چاہیے تھا کہ دیگر تمام اولاد کو بھی بڑے بیٹے کی طرح الگ الگ ہبہ کر کے مستقل طور پر ملکیت اور قبضہ میں دیتے، ایسا نہیں کیا اور باقی تمام زمین وغیرہ اپنے قبضے میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں تو اب باقی میراث میں آپ کے بڑے بھائی کا بھی اتنا ہی حصہ ہوگا جتنا باقی سب بھائیوں کا ہے۔

(۲) اور آپ کی دونوں بہنوں کا حصہ بھی میراث میں سے جدا کیا جائے گا، باقی رہی یہ بات کہ آپ کی بہن کو انہوں نے حصہ دے دیا تھا تو وہ بھی ہبہ ہوگا وراثت میں انکا حصہ جدا کیا جائے گا اگر وہ فوت ہو چکی ہیں تو انکا حصہ انکے ورثاء کے حوالے کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح جو بہن معذور تھی اسکا حصہ بھی جدا کر کے ورثاء کے حوالے کرنا ضروری ہے یاد رہے ایک بہن کا حصہ بھائی کے حصہ کا نصف ہے۔

لما فی قوله تعالى: (پارہ ۴ سورة النساء، آیت ۶)

للرجال نصيب مما ترك الوالدان والاقربون وللنساء نصيب مما ترك الوالدان والأقربون مما قل منه أو كثر نصيبا مفروضا...... الأية.

ولما فی قوله تعالى: (سورة النساء، آیت ۱۱)

يوصيكم الله في أولادكم للذكر مثل حظ الانثيين...... الأية.

ولمافی التنویر مع الدر:(۵/۶۸۸،طبع سعید)

(و)شرائط صحتها(فی الموهوب أن یکون مقبوضا غیر مشاع ممیزا غیر مشغول کما سیتضح بهلور کنها)هو(الایجاب والقبول)کماسیجیء به(وحکمها ثبوت الملک للموهوب له غیر لازم)

ولمافی البحر الرائق:(۷/۲۸٦،طبع سعید)

(قوله فان قسمه وسلمه صح)أی لو وهب مشاعا یقسم ثم قسمه وسلمه صح وملکه لأن التمام بالقبض.

ولمافیه ایضا:(۷/۲۸۸،طبع سعید)

(فروع)یکره تفضیل بعض الأولاد علی البعض فی الهبة حالة الصحة الا لزیادة فضل له فی الدین وان وهب ماله کله لواحد جاز قضاء وهو آثم کذا فی المحیط.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ خیر الوارثین:شاہد محمود عفی عنہ

۱۸جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر:۱۵٦۷

﴿والد کو اپنی حیات میں اپنی جائیداد میں جائز تصرف کا مکمل اختیار حاصل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ ایک آدمی کی بیوی کا انتقال ہوا، اس نے دوسری شادی کر لی، اس پر ان کے بیٹوں نے غصے میں آکر والد کو کلہاڑی سے زدوکوب کر کے بری طرح زخمی کیا، علاج ومعالجہ کے بعد اب والد کی صحت بہتر ہے، والد اپنے مذکورہ درندہ صفت بیٹوں کو اپنی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد سے محروم کرنا چاہتا ہے، کیا ان کے لئے ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

﴿جواب﴾ والد صاحب جب تک حیات ہیں، اپنے مال میں ہر طرح کے جائز تصرف کرنے کا انہیں مکمل اختیار حاصل ہے چاہے تو جائیداد بیچ کر نیک کاموں میں خرچ کریں یا اپنی بیوی اور بچے کو ہبہ کریں اور مکمل طور پر ان کے تصرف اور قبضہ میں بھی دیدیں تاکہ مذکورہ درندہ صفت بیٹوں کیلئے باقی نہ رہے لیکن یہ یاد رہے، کہ والد کے انتقال کے وقت جو کچھ انکی ملکیت میں باقی رہیگا، اس میں مذکورہ درندہ صفت بیٹوں کا بھی حصہ ہوگا والد کے محروم کرنے سے وہ محروم نہیں ہونگے۔

لمافی البزازیة بهامش الهندیة:(٦/۲۳۷،طبع رشیدیه)

وان اراد ان یصرف ماله الی الخیر وابنه فاسق فالصرف الی الخیر افضل من ترکه له.

ولمافی الخانیه علی الهندیه:(۳/۲۷۹،رشیدیه)رجل وهب فی صحته کل المال للولد جاز فی القضاء

لمافی السراجی فی المیراث:(ص۵،طبع قدیمی)

المانع من الارث اربعة،الی ان قال والقتل الذی یتعلق به وجوب القصاص اوالکفارة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۴ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر:۱۷۸۵

﴿اولاد نہ ہونے کی صورت میں زندگی میں تقسیم جائیداد وغیرہ کی تفصیل﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری اپنی اولاد نہیں ہے، البتہ اپنی ایک بھتیجی کو گود لیا ہے جسکی عمر تقریباً ۳۰ سال ہوگئی ہے اور گود لیتے وقت لڑکی کی عمر ایک سال تھی اور اس دوران اسکی تعلیم و تربیت کی ہے شادی ابھی تک نہیں ہوسکی جس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت ہے بہر حال میں اپنی زندگی میں اپنی جائیداد اور مکان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں کہ شریعت اسلامیہ نے میرے ورثاء کا اس میں کیا حق مقرر کیا ہے اور میری گود لی ہوئی بچی کا بھی کچھ حق بنتا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ میرے تین بھائی اور چار بہنیں حیات ہیں اور ایک اہلیہ ہے، میں اپنی حیات میں اگر سب کو ان کا حق دے دوں تو اپنے لئے بھی کچھ رکھ سکتا ہوں یا نہیں؟ اس لئے کہ زندگی کا کسی کو بھی علم نہیں ہے مزید یہ کہ میری اہلیہ کا خرچہ اور رہائش بھی میرے ذمہ ہے اسکو کتنا دے سکتا ہوں؟　　　　مستفتی: ریٹائرڈ کیپٹن ذکاء اللہ ڈیفنس فیز۲

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ جب تک آپ حیات ہیں آپ کے مال و جائیداد میں کسی کا کوئی حق نہیں ہے، البتہ بیوی کا نان و نفقہ اور رہائش آپ کے ذمہ واجب ہے، لے پالک لڑکی اور دیگر رشتہ داروں کے لئے جائز نہیں ہے کہ آپ سے جائیداد وغیرہ کی تقسیم کا مطالبہ کریں، البتہ آپ اپنی خوشی اور مرضی سے کسی کو کچھ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں اور اصول میراث کے مطابق اپنی حیات میں تقسیم کرنا چاہیں تو اسکا بھی آپکو اختیار ہے لیکن حیات میں تقسیم کرنا میراث نہیں کہلائیگا بلکہ ھبہ اور احسان کہلائیگا، ھبہ صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ جس کو جتنا دینا چاہتے ہیں، وہ الگ کر کے اس شخص کو باقاعدہ مالک بنائیں اور اپنا قبضہ و تصرف مکمل طور پر اس جگہ سے ختم کر کے اس کے قبضہ میں دیدیں ورنہ ھبہ تام نہیں ہوگا اور آپ کے انتقال کے بعد دیگر ورثاء کو مطالبہ کا حق باقی رہیگا، اس لئے اپنا قبضہ و تصرف مکمل ختم کرنا ضروری ہے۔

آپ کی اپنی اولاد نہیں ہے اور زندگی و موت کی کسی کو کوئی خبر نہیں ہے مستقبل میں کیسے حالات پیش آئیں گے؟ بیوی اور آپ دونوں صحت مند رہیں گے یا بیماریوں کا سامنا ہوگا؟ اس کا بھی آپکو علم نہیں ہے، اسلئے جائیداد وغیرہ ابھی سے تقسیم کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتے لیکن منع بھی نہیں کرتے، اسلئے کہ اپنے مال میں آپکو تصرف کرنے کا اختیار ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ آپ اپنے

مال وجائیداد میں جب تک حیات ہیں اپنی مرضی کا تصرف کر سکتے ہیں، آپ کے انتقال کے بعد ورثاء کا حق بن جائیگا، آپکی لے پالک لڑکی چونکہ وارث نہیں ہے اسلئے اسکو کچھ نہیں ملے گا، اپنی حیات میں اسکو کچھ دینا چاہتے ہیں یا صدقہ جاریہ کے طور پر کسی دینی نیک کام میں لگانا چاہتے ہیں تاکہ آخرت میں کام آئے تو اب اسکا موقع ہے کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ وصیت کر دیں اور آپ کے انتقال کے بعد آپ کے ورثاء اس پر عمل کر لیں لیکن اسوقت آپ کا جتنا مال باقی ہوگا اسمیں سے ایک تہائی (۱/۳) کی حد تک اس پر عمل کرنا ورثاء کے ذمہ واجب ہوگا، یہ تو بتا دیا کہ آپکی حیات میں کسی وارث کو مطالبہ کا حق نہیں ہے اور یہ معلوم کرنا چاہیں کہ آپ کے انتقال کے بعد مذکورہ ورثاء کا کیا حق بنے گا؟ سو آپ کے مال کے کل چالیس (۴۰) حصے بنیں گے، جن میں سے آپکی بیوی کو دس (۱۰) حصے، آپ کے ہر بھائی کو چھ (۶) اور ہر ایک بہن کو تین (۳) حصے ملیں گے بشرطیکہ آپ کے انتقال کے وقت مذکورہ تمام ورثاء حیات ہوں، آپ سے پہلے کسی کا انتقال ہوگیا تو ہوسکتا ہے کہ آپ اسکے وارث بن جائیں، آپ کی لے پالک لڑکی کا وراثت میں حصہ نہیں ہے، بے شک وہ آپکی بھتیجی ہے لیکن بھائیوں کی موجودگی میں بھتیجی وارث نہیں بن سکتی۔

لما فی خلاصة الفتاوی:(۴/۴۰۰،مطبع رشیدیه کوئٹه)

رجل له ابن وبنت أرادأن یهب لهماشیئاًفالأفضل أن یجعل للذكرمثل حظ الانثیین عندمحمدوعندابی یوسف بینهماسواء هوالمختارلورودالاثار.....ولواعطی بعض ولده شیئاً دون البعض لزیادة رشده لابأس به وان کان سواء لاینبغی ان یفضل ولوکان ولده فاسقافارادأن یصرف ماله الی وجوه الخیرویحرمه عن المیراث هذاخیرمن ترکه لان فیه اعانة علی المعصیة.

ولما فی التنویرمع الدر:(۵/۶۸۸،طبع سعید)

(و)شرائط صحتها(فی الموهوب)ان یکون مقبوضا.....)

ولما فی التنویرمع الدر:(۵/۶۹۰-۶۹۱،طبع سعید)

(وتتم)الهبة(بالقبض) الکامل.....فلو وهب جرابافیه طعام الواهب اودارالیهامتاعه اودابة علیهاسرجه وسلمهاکذلک لا تصح.

واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ
فتوی نمبر: ۱۲۶۲

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
۲۹ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ

﴿زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے والدصاحب نے تقریباً (۴۰) سال قبل ایک بلڈنگ تعمیر کرائی، اس بلڈنگ میں گراؤنڈ فلور پر دو کانیں، پہلی منزل، دوسری منزل اور تیسری منزل تعمیر کرائی، ہم تین بھائی سلیم احمد، اقبال احمد، ضمیراحمد، والدصاحب کے ساتھ رہائش پذیر تھے، والدصاحب نے پہلی منزل کی چھت سلیم احمد کودی اور دوسری منزل کی چھت ضمیراحمد کودی، ہم دونوں بھائیوں نے اپنے پیسوں سے دونوں فلیٹ تعمیر کر کے قبضہ حاصل کیا اور اب تک رہائش پذیر ہیں، سب سے چھوٹا بھائی اقبال احمد والد اور والدہ صاحبہ کے ساتھ رہائش پذیر تھا، ۹۳/۱۲/۵ کو والدصاحب نے ایک وصیت نامہ لکھوایا جس کے مطابق والدصاحب نے پہلی منزل اقبال احمد کے نام کردی تھی کچھ عرصہ کے بعد اقبال احمد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دوسرے گھر منتقل ہو گئے، والد اور والدہ اس گھر میں تنہا رہائش پذیر تھے، اقبال احمد جب دوسرے گھر چلے گئے تو انھوں نے والدصاحب سے کہا یہ مکان میرے نام کردیں تو انھوں نے انکار کردیا لیکن وصیت نامہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی، والدصاحب کا انتقال ۱۹۹۶ء میں ہوا، والدہ صاحبہ مزید چھ سال حیات رہیں ۲۰۰۲ء میں انکا بھی انتقال ہوگیا، اب اقبال احمد کا دعویٰ ہے کہ یہ مکان والدصاحب نے مجھے دیا تھا اس لئے یہ میرا ہے۔

مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں علماء کرام کیا فرماتے ہیں؟

(۱) مکان اقبال احمد کو دیا جائے یا وارثوں کا ہے؟ (۲) دوبیٹوں کو اپنی زندگی میں چھت دے دی تھی، جس پر سلیم احمد، ضمیراحمد نے مکان تعمیر کر کے قبضہ حاصل کرلیا تھا، اب تک رہائش پذیر ہیں سلیم احمد اور ضمیر احمد کا بقایا ترکہ میں حصہ ہوگا یا نہیں ہوگا؟ (۳) ہر سال عیدالاضحیٰ کے موقع پر دو قربانیاں والدصاحب کی طرف سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کرسکتے ہیں؟

(۴) ماہانہ ایک سو (۱۰۰) روپے چھوٹی مسجد اور ایک سو (۱۰۰) روپے شمیم مسجد کو دینے کے لئے لکھا ہے۔ (۵) پوتی، نواسی کی شادی کے موقع پر پانچ ہزار (۵۰۰۰) روپیہ دے دیدیں، اسکے علاوہ مدارس اور ضرورت مندوں کی امداد کریں۔

مستفتی: سلیم احمد دہلی کالونی کراچی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ والدصاحب جب تک حیات ہوتے ہیں، اولاد کو ان کی ذاتی

جائیداد وغیرہ میں کوئی حق نہیں ہوتا، ہاں وہ اپنی خوشی سے کسی کو کچھ دینا چاہیں یا اپنی حیات میں تقسیم کرنا چاہیں تو انھیں اختیار ہے اور یہ محض احسان وھبہ ہوگا، تقسیم میراث نہیں کہلائے گا، اس لئے کسی وجہ سے بعض کو کم یا زیادہ بھی دے سکتے ہیں، البتہ بہتر یہ ہے کہ ایسی صورت میں تمام اولاد کو برابر دیدیں۔

لہٰذا حافظ محمد تقی (مرحوم) نے اپنی بلڈنگ وغیرہ کو اپنی حیات میں تقسیم کیا ہے تو یہ تقسیم میراث نہیں بلکہ ہبہ کہلائے گا اور ہبہ کے تام ہونے کے لئے قبضہ شرط ہے، بدون قبضہ ہبہ تام نہیں ہوتا، حافظ محمد تقی (مرحوم) کے بعض ورثاء جیسا کہ سوال میں بیان ہے، سلیم احمد، ضمیر احمد نے اپنے اپنے حصوں پر قبضہ بھی کرلیا، اس لئے ان کی ملکیت تام ہو چکی ہے، البتہ فرسٹ فلور جو کہ اقبال احمد کو والد نے ہبہ کرلیا تھا، وہ ہبہ تام نہیں ہوا، اس لئے کہ والد صاحب تا حیات اسی مکان میں رہائش پذیر رہے اور اپنا قبضہ برقرار رکھا، اقبال احمد کو ہبہ کرنے کی صورت میں ضروری تھا کہ اپنا قبضہ بھی خواہ تھوڑی دیر کے لئے ہو ختم کرتے یعنی والد مرحوم کم از کم ایک مرتبہ اپنا ذاتی سامان اس مکان سے نکالکر خود بھی نکلتے اور مکان اپنے بیٹے اقبال احمد کے حوالے کرتے تو اس سے اقبال احمد کا قبضہ شرعاً معتبر تصور کیا جاتا، بعد میں بیشک اقبال احمد اپنے والد کو اسی مکان میں ساتھ رکھتے۔

سو اگر یہ طریقہ اختیار کیا تھا تو مکان اقبال احمد کا ذاتی کہلائیگا کسی دوسرے وارث کو اس میں حق کا دعویٰ کرنا غلط شمار ہوگا اور اگر یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا تھا یعنی تھوڑی دیر کے لئے بھی والد صاحب نے اپنا قبضہ ختم نہیں کیا تھا تو ھبہ تام نہ ہونے کی وجہ سے تمام ورثاء اس مکان میں شریک ہونگے، البتہ ایسی صورت میں بھی اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ دیگر ورثاء اپنے والد صاحب (مرحوم) کی منشاء کے مطابق اس مکان کو اقبال احمد کے حوالہ کردیں، اس لئے کہ بظاہر والد صاحب (مرحوم) یہ مکان اقبال احمد کو دینا چاہتے تھے، اسلئے تو آخر تک اپنی تحریر پر قائم رہے اور بیٹے کے روٹھنے پر بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی اگر مسئلہ معلوم ہوتا تو تھوڑی دیر کے لئے اس مکان سے سامان سمیت نکلنا ان کے لئے کیا مشکل تھا؟!

لما فی التنویر مع الدر: (۶۸۹/۸، طبع امدادیہ ملتان)

(و) شرائط صحتها (فی الموهوب ان یکون مقبوضا غیر مشاع ممیزا غیر مشغول)......

ولما فی التنویر مع الدر: (۶۹۲/۸-۶۹۴، طبع امدادیہ)

(ولو نهاه) عن القبض (لم یصح) قبضه (مطلقا) ولو فی المجلس لان الصریح اقوی من

الدلالة (وتتم) الهبة (بالقبض) الكامل..... فلو وهب جرابا فيه طعام الواهب أو دارا فيها متاعه او دابة عليها سرجه وسلمها كذلك لا تصح.

(۲) بالائی چھت اور نیچے والی دو دکانیں تمام ورثاء کا حق ہے، ان میں اصول میراث کے مطابق تمام ورثاء شریک ہونگے، ورثاء کی تفصیل لکھ کر دیدیں تو تقسیم میراث کے لئے دوسرا جواب دیدیں گے۔

(۳) ایک تہائی مال کی حد تک وصیت پر عمل کرنا شرعا ضروری ہوتا ہے، لہذا تجہیز و تکفین اور ادائیگی قرض کے بعد باقی ماندہ ترکہ کا حساب کر کے اس سے ایک تہائی مال کی مقدار وصیت پر عمل کرنے کے لئے الگ کریں اور جب تک مرحوم کی وصیت پر عمل ہو سکے کرتے رہیں، مال کا یہ مخصوص حصہ جب ختم ہو جائے تو آئندہ کے لئے مذکورہ ہدایات کے مطابق عمل کرنا ضروری نہیں ہوگا، ہاں کوئی بیٹا وغیرہ بعد میں بھی اپنے مال سے والد مرحوم کی خواہش نیک کو پورا کرنے کی کوشش کرتا رہے گا تو اس کی خوش نصیبی ہوگی اور بلا شبہ باعث اجر و برکت ہوگا۔

لما في الهندية: (۲۲۷/۶ طبع رشيديه)

ثم تنفذ وصاياه من ثلث ما يبقى بعد الكفن والدين الا ان تجيز الورثة أكثر من الثلث.

ولما في الهداية: (۶۳۸/۲ طبع رحمانيه)

ولا تجوز بما زاد على الثلث الا ان تجيزها الورثة بعد موته وهم كبار لان الامتناع لحقهم وهم اسقطوه

ولما في اعلاء السنن: (۲۶۷/۱۷ طبع دار الكتب العلمية)

عن عليؓ قال: أمرني رسول الله ﷺ ان أضحي عنه فانا أضحي عنه أبدا، قال العلامة ظفر احمد العثمانيؒ تحت هذا الحديث: ولما ثبت انه ﷺ أوصى عليا بان يضحي عنه وذلك دليل حبّه ﷺ تضحية عنه فينبغي لمن وجد سعة أن يضحي عن حبيبه ونبيه ﷺ كل عام ولو بشاة أو بسبع بقرة نسأل الله العظيم ان يوفقنا لذلك أبدا كما وفقنا له منذ اعوام ويرزقنا المواظبة عليه والدوام ويرضى عنا ويرضي حبيبه عنا عليه الصلاة والسلام..... فرع: من ضحى عن الميت يصنع كما يصنع في أضحية نفسه من التصدق والأكل..... وينبغي تقييد الامر بما اذا امره بالتضحية من تركته في الثلث ولو امره بها من عند نفسه كامره ﷺ فحكمه حكم لو يضحي عنه بلا امره صريحا ولكنه مقتضى القواعد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
۲۹ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ

واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی
فتویٰ نمبر: ۱۲۰۴

﴿معاشرے کے خوف سے بہن کا بھائیوں کو زمین بخش دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں میراث کی تقسیم کے وقت عورت اپنے بھائیوں سے کہتی ہے کہ میں نے اپنے حصہ کی زمین تمہیں بخش دی ہے اور ایسا اس لئے کہتی ہے کیونکہ اگر اس نے زمین میں حصہ لے لیا تو اس کے بھائی اور دیگر خاندان والے ناراض ہو جاتے ہیں اور لوگ ان کو طعنہ دیتے ہیں کہ کیسی عورت ہے بھائیوں سے زمین لی۔ براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں بتلائیں کہ معاشرے اور خاندان والوں کی ناراضگی کے خوف سے اگر عورت اپنے حصہ کی زمین بھائیوں کو بخش دے تو بھائی اس کے حصہ کی زمین کے مالک بن جائیں گے؟

﴿جواب﴾ بہن اگر بالغ ہے اور شرم وحیا، برادری اور رسم ورواج کے دباؤ میں آئے بغیر پوری طرح دل کی خوشی سے اپنا حصہ بھائی یا کسی اور کو دینا چاہے تو دے سکتی ہے اور لینے والا مالک ہو جائے گا بشرطیکہ بہن نے اپنا حصہ میراث میں سے الگ کر کے باقاعدہ اپنے قبضہ میں لینے کے بعد دیا ہو، مذکورہ صورت میں بہن کا اس طرح اپنا حصہ الگ کیے بغیر بھائی کو بخش دینے سے بھائی مالک قرار نہیں پاتا بلکہ ایسے علاقہ میں جہاں اسطرح کا رواج بن گیا ہو وہاں اگر چہ بہن کا حصہ الگ کر کے اس کو دے دیا جائے اور پھر وہ رواج کے تحت اپنے بھائی کو بخش دے تب بھی بھائی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو اپنا ملک سمجھے، اس لئے کہ یہ ھبہ ہے اور ھبہ کی صورت میں دوسرے کے مال کا مالک بننے کے لیے اس کا دل سے راضی ہونا شرط ہے جبکہ مذکورہ صورت میں محض رسم ورواج اور دوسروں کے طعنوں سے بچنے کی خاطر بہن نے اپنا حصہ بھائی کو بخشا ہے۔

البتہ کوئی بہن اگر خوشی سے اپنا حصہ بھائی کو دینا چاہے اور بھائی کو اس کا یقین ہو کہ بہن نے مکمل دل کی رضا سے دیا ہے تو بلا کراہت جائز ہے بشرطیکہ ایک مرتبہ بہن کا حصہ الگ وممتاز کر کے اس کو دیدیا جائے۔

لمافی قوله تعالی:(سورة النساء، آیت ۱۱)

یوصیکم الله فی أولادکم للذکر مثل حظ الأنثیین فان کن نساء......الأیة.

ولمافی مشکوة المصابیح:(ص۲۵۵، باب الغصب والعاریة، طبع سعید)

وعن أبی حرة الرقاشی عن عمه قال قال رسول الله ﷺ:ألا لا تظلموا، ألا لا یحل مال

امرئ الا بطیب نفس منه رواه البیهقی فی شعب الایمان والدار قطنی فی المجتبیٰ.

ولمافی الهداية:(۲/۲۸۷،طبع رحمانيه)

ولا یجوز الهبة فیما یقسم الا محوزة مقسومة وتحت قوله لایجوز الهبة،وفی الحاشية:لایثبت الملک فیه الا محوزة مقسومة..... فانه اذا وهب مشاعافیما یقسم ثم أفرزه و سلمه صحت ووقعت مثبتة للملک.فعلم بهذا أن هبة المشاع فیما یقسم وقعت جائزة فی نفسها لکن توقف اثباتها الملک علی الافراز والتسلیم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:مزمل شاہ لکی مروت

۲۷صفر۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۹۴۴

﴿والد کا اپنی حیات میں اولاد کے درمیان مال وجائیداد کو تقسیم کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میری کل چھ اولاد ہے، چار بیٹے اور دو بیٹیاں اور اہلیہ الحمدللہ حیات ہیں میں اسوقت عمر رسیدہ اور ضعیف ہوں، میں نے اپنی جائیداد اولاد میں اس طرح تقسیم کی ہے کہ ہر ایک بیٹے کو پچاس لاکھ کی جائیداد تقریبا دیدی اور ہر ایک بیٹی کو تقریبا پندرہ لاکھ کی جائیداد دیدی، بیٹیوں کے حصہ پر میرے بیٹوں میں سے بعض کو اعتراض ہے، یہاں تک کہدیا ہے کہ" قیامت کے روز معاف نہیں کرونگا"۔

براہ کرم آپ بتادیں میں نے کوئی زیادتی کی ہے؟ اگر غلط کیا ہے تو شریعت کے مطابق مجھے کس طرح تقسیم کرنا چاہیے تھا؟ کیا میں اپنی ذات اور اہلیہ کے لئے بھی رکھ سکتا ہوں؟

﴿جواب﴾ یادرہے کہ زندگی میں ہر شخص کو اپنے ذاتی مال وجائیداد میں مکمل اختیار حاصل ہے، ہر جائز تصرف میں وہ آزاد ہے اولاد یا کسی بھی وارث کے لئے اس کی حیات میں مال وجائیداد کا مطالبہ کرنا درست نہیں، البتہ کوئی شخص اپنی خوشی اور رضامندی سے اپنی زندگی میں اولاد کے درمیان مال کو تقسیم کرنا چاہے تو اسکا مستحب طریقہ یہ ہے کہ بیٹے اور بیٹیوں کو برابر حصے دیئے جائیں تاہم بیٹیوں کی بنسبت بیٹوں کو دوگنا دینا یا پھر کسی بیٹے کو اس کی ضرورت کے پیش نظر زیادہ دینے کی بھی گنجائش ہے۔

صورت مسئولہ میں آپ نے جس طرح اپنی اولاد میں مال کو تقسیم کیا ہے اگر اس تقسیم کو برقرار رکھنا چاہیں تو بھی درست ہے اور اگر ازسر نو تقسیم کرنا چاہیں تو مندرجہ بالا طریقہ کے مطابق تقسیم

کرلیں، آپ بہر حال اللہ جل شانہ کے ہاں ان شاء اللہ بری الذمہ قرار پاتے ہیں، والد کا اپنی حیات میں اپنی اولاد کے درمیان جائداد کو تقسیم کرنا اولاد پر احسان ہے، بجائے شکر ادا کرنے کے بیٹے کا اعتراض کرنا کہ "قیامت کے دن معاف نہیں کرونگا" سخت گناہ بلکہ اللہ جل شانہ کی ناراضگی کو اپنی طرف متوجہ کرنے والی بات ہے، نیز ایسی صورت حال میں آپ اپنے لئے اور اہلیہ کے لئے بھی جتنا چاہیں رکھ لیں تا کہ آئندہ کے لئے کسی قسم کی معاشی پریشانی نہ ہو۔

لمافی مشکاۃ المصابیح:(ص ۲۹۱،طبع سعید)

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان رجلا اتی النبی صلی الله علیه وسلم فقال ان لی مالا وان والدی یحتاج الی مالی قال انت ومالک لوالدك.....الخ.

ولمافی التنویرمع الدر:(۵/۶۹۶،طبع ایچ ایم سعید)

وفی الخانیة لاباس بتفضیل بعض الاولادفی المحبة لانها عمل القلب وکذا فی العطایاان لم یقصد به الاضرار وان قصده فسوی بینهم یعطی البنت کالابن عندالثانی وعلیه الفتوی.

وفی الشامیة:قوله وعلیه الفتوی:ای علی قول ابی یوسف من ان التنصیف بین الذکر والانثی افضل من التثلیث الذی هو قول محمدرحمه الله.

ولمافی خلاصة الفتاوی:(۴/۴۰۰،طبع رشیدیه)

وفی الفتاوی رجل له ابن وبنت اراد ان یهب لهما شیئاً فالافضل ان یجعل للذکر مثل حظ الانثیین عند محمدؒ وعند ابی یوسفؒ بینهماسواء هو المختارلورودالاثار ولووهب جمیع ماله لابنه جازفی القضاء وهو اثم نص عن محمدؒ هکذا فی العیون.
ولواعطی بعض ولده شیئادون البعض لزیادة رشده لاباس به وان کانا سواء لاینبغی ان یفضل ولوکان ولده فاسقاًفاراد ان یصرف ماله الی وجوه الخیر ویحرمه عن المیراث هذاخیر من ترکه لان فیه اعانة علی المعصیة ولو کان ولده فاسقاً لایعطی له اکثرمن قوته.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: عبدالوہاب لغمانی عفا اللہ عنہ

۱۴ ار جب المرجب ۱۴۳۱ھ　　　　فتوی نمبر: ۲۷۴۷

﴿زندگی میں مال تقسیم کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ میں کہ صاحب اولاد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنا مال اولاد میں سے کسی کو زیادہ اور کسی کو کم دیں؟ مستفتی: فضل الرحمن اورنگی ٹاؤن

﴿جواب﴾ صاحب اولاد کا مال اگر اپنا ذاتی ہے تو اسے اختیار ہے کسی کو کم یا زیادہ دیں،

البتہ تمام اولاد کو برابر دینا یہاں تک کہ لڑکی کو بھی لڑکے کے برابر دینا مستحب ہے، لھذا بلاوجہ کسی کو کم یا زیادہ دینا خلاف اولیٰ ہے گناہ نہیں ہے اور اگر کسی وجہ سے ایک کو کم دوسرے کو زیادہ دیا مثلاً ایک خدمت گزار ہے، دوسرا نافرمان ہے یا ایک کی مالی حیثیت کمزور دوسرے کی بہتر تو ایسی صورت میں خلاف اولیٰ بھی نہیں ہے لیکن اس طرح کرنے سے کسی ایک کو تکلیف واذیت دینا مقصود نہ ہو ورنہ گناہ ہے اور یہ بھی یاد رکھیں کہ کسی کو بلاوجہ مکمل محروم کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

لما فی الدر المحتار:(۵/۶۹۶،طبع ایم سعید)

وفی الخانية لا بأس بتفضيل بعض الاولاد فی المحبة لانها عمل القلب وكذا فی العطايا ان لم يقصد به الاضرار وان قصده فسوى بينهم.

ولما فی الخلاصة:(۴/۴۰۰،طبع رشیدیہ)

ولو وهب جميع ماله لابنه جاز فی القضاء وهو آثم نص محمدؒ هكذا فی العيون ولو اعطى بعض وُلده شيأ دون البعض لزيادة رشده لاباس به وان كانا سواء لاينبغی ان يفضل.

ولما فی البحر:(۷/۲۸۸،طبع سعید)

يكره تفضيل بعض الاولاد على البعض فی الهبة حالة الصحة الا لزيادة فضل له فی الدين وان وهب ماله كله لواحد جاز قضاء وهو آثم كذا فی المحيط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۳۰۵

﴿زندگی میں اولاد کے درمیان جائیداد تقسیم کرنا﴾

﴿سوال﴾ زید نے اپنی حیات میں اپنے ۵ بیٹوں اور ۵ بیٹیوں کے درمیان اپنی جائیداد اور دس لاکھ نقد رقم تقسیم کردی۔ زید کے مرنے کے بعد اسکے بعض ورثاء نے کہا کہ ہم پہلی والی تقسیم پر راضی نہیں ہیں، لہٰذا از سر نو تقسیم کی جائے، کیا ایسی صورت میں پہلی والی تقسیم ہی کو کافی سمجھا جائے گا یا از سر نو تقسیم کی جائے گی؟ دوسرا یہ کہ بالفرض اگر زید خود اپنی زندگی میں اس تقسیم کو ختم کرنا چاہے تو کیا اس کو یہ حق حاصل تھا؟

﴿جواب﴾ زید کا اپنی زندگی میں اپنی اولاد کے درمیان جائیداد کو تقسیم کرنا تقسیم میراث نہیں بلکہ ہبہ کہلائے گا، زید کے بعض ورثاء کا اُن کے انتقال کے بعد از سر نو تقسیم کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے کیونکہ مورث کی زندگی میں ورثاء کا اپنے اپنے حصوں پر قبضہ کرنے سے اُنکی ملکیت تام ہوگئی ہے، لہٰذا اب انکی رضامندی کے بغیر ان کے حصوں کو از سر نو تقسیم نہیں کیا جاسکتا، بالفرض اگر

زید خود زندہ ہوتا اور پہلی والی تقسیم کو ختم کر کے از سرِ نو تقسیم کرنا چاہتا تو انہیں بھی یہ حق حاصل نہ ہوتا کیونکہ موہوب ''موہوب لہم'' کی ملکیت میں جا چکا ہے، اب دوبارہ تقسیم کرنا رجوع فی الہبہ کی مانند ہوگا جو کہ بعض صورتوں میں ناجائز ہے مثلاً اگر کوئی اپنے اصول وفروع (ذی رحم محرم) پر ہبہ کرے تو پھر رجوع کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

لما فی البحر: (۲۹۲/۷، طبع سعید)

(الموهب لذی رحم محرم منه) اذا کانت الهبة لذی رحم محرم لم یرجع فیها.

ولما فی الهندیة: (۳۸۷/۴، طبع رشیدیه)

ولا یرجع فی الهبة من المحارم بالقرابة کالآباء و الأمهات وان علوا والأولاد وان سفلوا واولاد البنین والبنات فی ذلک سواء.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ		واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفا اللہ عنہ

۲۱ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ		فتویٰ نمبر: ۴۳۹

﴿حکومت کی طرف سے میت کے بچوں کو ملنے والی امداد کے وہ خود حقدار ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دبئی میں ایک شخص کا انتقال ہوا تو حکومت کی طرف سے اسکے بچوں کو امدادی رقم ملی چونکہ میت کے خاندان والے اکھٹے رہتے ہیں اور میت کے بیٹے بھی بالغ ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم چونکہ پڑھ رہے ہیں، لہٰذا یہ رقم آپس میں تقسیم کرنے کی بجائے مشترکہ طور پر استعمال کریں گے تو کیا مذکورہ رقم کو مشترکہ کاروبار کا حصہ بنانا درست ہے ؟		مستفتی: مفتی عبدالکریم کوہاٹ

﴿جواب﴾ حکومت کی طرف سے جو امدادی رقم میت کے بیٹوں کو ملی ہے یہ مرحوم کی اولاد اور بیوی کا حق ہے، مرحوم کے بھائی اگرچہ ایک ساتھ رہ رہے تھے کاروبار بھی مشترک تھا لیکن یہ رقم ممتاز ہونے کی وجہ سے مشترکہ کاروبار کا حصہ نہیں ہے، تاہم مرحوم کے بیٹے چونکہ بڑے ہیں اور اس رقم کو مشترکہ قرار دینے پر بھی باہم رضامند ہیں جیسا کہ سوال میں مذکور ہے، لہٰذا تقسیم کرنے کی بجائے مشترکہ کاروبار کا حصہ بنانے کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

کذا فی فتاوی رحیمیه: (۲۸۹/۱۰، طبع دار الاشاعت کراچی)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ		واللہ اعلم بالصواب: ریاض الرحمٰن کوہاٹی

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ		فتویٰ نمبر: ۱۶۰۷

﴿باپ کا ایک بیٹے کو زندگی میں وارث بنانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں کہ علماء کرام دریں مسئلہ کہ ایک شخص کی ملکیت میں پانچ کنال زمین ہے اور اس کے تین بیٹے ہیں اس نے اس زمین سے ایک کنال زمین اپنے ایک بیٹے کے نام منتقل کردی اور اس کو باقاعدہ قبضہ بھی دے دیا۔

اس کی وفات کے بعد مرحوم کے دوسرے بیٹوں نے مرحوم کے اس بیٹے کی زمین میں بھی وراثت کا دعویٰ کیا ہے کہ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے جبکہ یہ بیٹا اپنی اس زمین میں جو اس کو باپ کی طرف سے باپ کی زندگی میں ملی ہے، مرحوم کے دوسرے دو بیٹوں کو حصہ دینے سے انکار کرتا ہے اس صورت میں اس بیٹے کے حصہ کی زمین میں مرحوم کے دوسرے بیٹوں کا حق بنتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ باپ اپنی زندگی میں اپنی زمین میں سے جو حصہ اپنے کسی بیٹے کو دیتا ہے تو یہ اس کی طرف سے ہبہ ہوتا ہے، مذکورہ صورت میں چونکہ باپ نے اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کے نام زمین منتقل کردی اور باپ کی زندگی میں بیٹے نے زمین پر قبضہ بھی کرلیا تو یہ زمین اسی بیٹے کی ملکیت ہوگئی ہے، اس میں مرحوم کے دوسرے بیٹوں کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ اس زمین پر ان کا دعویٰ ملکیت صحیح ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۵/۶۸۸، طبع سعید)

(و) شرائط صحتها (فی الموهوب ان یکون مقبوضا غیر مشاع ممیزا غیر مشغول)

ولمافی الدر المختار:(۵/۶۹۶، طبع سعید)

وفی الخانیة: لاباس بتفضیل بعض الاولاد فی المحبة لانها عمل القلب وکذافی العطایا ان لم یقصد به الاضرار وان قصده فسوی بینهم یعطی البنت کالابن عند الثانی وعلیه الفتوی ولو وهب فی صحته کل المال للولد جاز واثم الخ.

ولمافی البحر الرائق:(۷/۲۸۶-۲۸۸، طبع سعید)

(قوله فان قسمه وسلمه صح) ای ولو وهب مشاعا یقسم ثم قسمه وسلمه صح وملکه لان التمام بالقبض..... (فروع) یکره تفضیل بعض الاولاد علی البعض فی الهبة حالة الصحة الا لزیادة فضل له فی الدین و ان وهب ماله کله لواحد جاز قضاء وهو آثم کذافی المحیط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۳۳

﴿زندہ گائے کا متعین حصہ ہبہ کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ اگر کوئی اپنی زندہ گائے کے ایک متعین حصہ کو ھبہ کر کے کسی کو اپنے ساتھ اسمیں شریک کرسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: ابو محمد کوہاٹی

﴿جواب﴾ کرسکتا ہے۔

لمافی الھدایۃ:(۲۸۷/۳ طبع رحمانیہ) وھبۃ المشاع فیما لا یقسم جائز.

قال فی الحاشیۃ علیہ نعنی بما لا یحتمل القسمۃ مالا یبقی منتفعا بعد القسمۃ اصلا کعبد واحد ودابۃ واحدۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

۱۴ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتوی نمبر: ۳۰۵۷

﴿قابل تقسیم میراث میں سے قبل از تقسیم اپنا حصہ ھبہ کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم تین بھائی اور تین بہنیں ہیں، والد صاحب انتقال فرما گئے ہیں، بہنوں نے میراث لینے سے انکار کیا، کہا کہ ہم خوشی سے اپنا اپنا حصہ بھائیوں کو دیتی ہیں جبکہ اب تک وراثت تقسیم نہیں ہوئی، پوچھنا یہ ہے کہ بہنوں کا اپنا حصہ بھائیوں کو ھبہ کر دینا درست ہے یا نہیں؟ اور اب تک بھائی اس زمین کو استعمال کر رہے ہیں تو انکے لئے حلال ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ بعض علاقوں میں بہنوں کو میراث میں سے حصہ نہیں دیا جاتا اور بعض دیندار بھائی اگر دیتے بھی ہیں تو بہنوں کا وصول کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور اس کا طعنہ بھی دیا جاتا ہے، اس رواج اور غلط تاثر کو ختم کرنے کے لئے بھائیوں کو چاہیے کہ بہنوں کے انکار پر توجہ نہ دیں انکا حصہ الگ کر کے ان کے لئے چھوڑ دیا جائے، تاہم انکار کی صورت میں زمین وغیرہ کے منافع بھائیوں کیلئے حلال ہیں لیکن بہنوں کے حصہ کے مالک نہیں بن سکتے، کسی بھی موقع پر بہنیں یا انکی اولاد مطالبہ کرے تو ان کا حصہ واپس کر دینا ضروری ہوگا۔

البتہ تقسیم کر کے تمام کے حصوں کو الگ اور ممتاز کرنے کے بعد بہنیں اپنا اپنا حصہ کسی ایک بھائی یا تمام کو ھبہ کر دیں اور بھائی انکے حصوں پر قبضہ بھی کر لیں تو بھائی مالک ہو جائیں گے اور پھر کسی کو مطالبہ کا حق نہیں رہیگا۔

لما فی الشامی:(۶۸۸/۵،طبع سعید)

(و)شرائط صحتہا (فی الموهوب أن يكون مقبوضاً غير مشاع مميزا غير مشغول)

ولما فی التنویر مع الرد:(۶۹۲/۵،طبع سعید)(ولو سلمه شائعا لايملكه فلاينفذتصرفه فيه)

وفی الشامية:قال فی الفتاوى الخيرية:ولاتفيدالملك فی ظاهرالرواية قال الزيلعی:ولو سلمه شائعا لايملكه حتى لاينفذ تصرفه فيه فيكون مضمونا عليه و ينفذ فيه تصرف الواهب.....ومع افادتها للملك عند البعض أجمع الكل على ان للواهب استردادها من الموهوب له، ولوكان ذارحم محرم من الواهب.....وكمايكون للواهب الرجوع فيها يكون لوارثه بعد موته لكونهامستحقةالرد، ويضمن بعد الهلاك كالبيع الفاسد اذا مات احدالمتهبين فلو رثته نقضه،لأنه مستحق الردومضمون بالهلاك .....وذكر قبله هبةالمشاع فيمايقسم لا تفيد الملك عند ابی حنيفة . وفی القهستانی لا تفيد الملك وهوالمختاركمافی المضمرات، وهذامروی عن ابی حنيفةؒ وهوالصحيح اه.

ولما فی الخلاصة:(۳۹۰/۴،طبع رشیدیہ)

وفی الاصل ومن شرائط الهبة الافرازحتى لايجوزهبةالمشاع فيمايحتمل القسمة كالبيت والدار والارض ونحوهاوان كان لايحتمل القسمةيجوزكالبئروالحمام والرحى.

ولما فی الهدایۃ:(۲۸۶/۳،طبع رحمانیہ)

ولا يجوزالهبة فيما يقسم الا محوزة مقسومة وهبةالمشاع فيمالا يقسم جائز.....ولنا ان القبض منصوص عليه فی الهبة فيشترط كماله والمشاع لا يقبله الا بضم غيره اليه وذلك غير موهوب ولان فی تجويزه الزامه شيئاً لم يلتزمه و هو القسمة و لهذا امتنع جوازه قبل القبض كيلا يلزمه التسليم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:حبیب الوہاب سواتی

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۳۳۵

﴿رشوت کی حقیقت کا بیان﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رشوت کی کیا حقیقت ہے اور آج کل معاشرے میں بہت بگاڑ آگیا ہے تو کیا کسی صورت میں رشوت جائز ہے یا ہر صورت میں ناجائز ہے مثلاً میں روڈ پر جارہا ہوں میری گاڑی بالکل ٹھیک ہوتی ہے اگر میں پولیس والوں کو دس روپے نہ دوں تو وہ میرے خلاف تین سو روپے کا پرچہ کاٹ دیتے ہیں تو کیا مجھے اس صورت میں دس روپے دینے کی گنجائش ہے تاکہ تین سو کے نقصان سے بچ سکوں؟

﴿جواب﴾ رشوت لغت میں کسی کام کیوجہ سے مقصود تک پہنچنے کو کہتے ہیں۔

لما فی تاج العروس:(۱۵۰/۱۰،طبع دار احیاء التراث العربی)

قال ابن الأثیر الرشوۃ الوصلۃ الی الحاجۃ بالمصانعۃ واصلہ من الرشاء الذی یتوصل بہ الی الماء ......الخ.

جبکہ شریعت میں حق کو باطل کرنے کیلئے یا باطل کو ثابت کرنے کیلئے کسی کو مال دیا جائے اسے رشوت کہتے ہیں۔

لما فی قواعد الفقہ:(ص۵۳،طبع میر محمد)ما یعطی لابطال حق او لاحقاق باطل.

اسکی دو قسمیں ہیں (۱) ظلم پر مدد کرنے کیلئے کسی کو کچھ دینا اس صورت میں لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔(۲) جان یا مال کی حفاظت کی خاطر یا اپنے حق کی وصول یابی کیلئے کسی کو پیسے دینا اس صورت میں جائز ہے لیکن لینے والے کے حق میں یہ رشوت اور حرام ہے، مذکورہ بالا صورت اس صورت کے تحت داخل ہے۔

لما فی المرقاۃ:(۲۹۵/۷،طبع رشیدیہ کوئٹہ)

عن عبداللہ ابن عمروؓ قال لعن رسول اللہ ﷺ الراشی والمرتشی رواہ ابو داود.اما اذا اعطی لیتوصل بہ الی حق او لیدفع بہ عن نفسہ ظلما فلا بأس بہ.

لما فی الھندیۃ:(۳۳۱/۳،طبع رشیدیہ کوئٹہ)

واعلم بان الرشوۃ انواع...... نوع منھا ان یھدی الی السلطان مالا لیدفع ظلمہ عن نفسہ او عن مالہ ھذا نوع لایحل الأخذ لأحد واذا اخذ یدخل تحت الوعید المذکور فی الباب وھل یحل للمعطی الاعطاء عامۃ المشایخ علی انہ یحل لانہ یجعل مالہ وقایۃ لنفسہ اویجعل بعض مالہ وقایۃ الباقی ونوع منھا ان یھدی الرجل الی رجل لیسوی مالاامرہ فیما بینہ وبین السلطان ویعینہ فی حاجتہ وانہ علی وجھین الأول ان تکون حاجتہ حراما وفی ھذا الوجہ لایحل للمھدی الأعطاء وللمھدی الیہ الأخذ الوجہ الثانی ان تکون حاجتہ مباحۃ وانہ علی وجھین ایضا الوجہ الأول ان یشترط انما یھدی الیہ لیعینہ عند السلطان وفی ھذا الوجہ لا یحل لأحد الاخذ وھل یحل للمعطی الأعطاء تکلموا فیہ منھم من قال لا یحل ومنھم من قال یحل.

لما فی الشامی:(۳۶۲/۵،طبع ایچ ایم سعید)

وفی الاقضیۃ قسم الھدیۃ وجعل ھذا من أقسامھا فقال......حرام منھما کالاھداء لیعینہ علی الظلم وحرام علی الآخذ فقط وھو ان یھدی لیکف عنہ الظلم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد

۴ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ

فتویٰ نمبر: ۷۳۰

﴿اپنا جائز حق وصول کرنے کیلئے رشوت دینے کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں حدیث شریف میں رشوت لینے اور دینے کی ممانعت آئی ہے لیکن آج کل عام طور پر خصوصاً کسی سرکاری ادارے میں بغیر رشوت کے اپنا جائز حق وصول کرنا ممکن ہی نہیں اور رشوت کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں اپنا حق وصول کرنے کیلئے رشوت دینے کی گنجائش ہے؟ مستفتی: حبیب الوہاب

﴿جواب﴾ اسلام میں رشوت لینا و دینا دونوں حرام ہیں، حدیث شریف میں رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت فرمائی ہے، چنانچہ امام ابوداوٗدؒ نے ''کتاب الاقضیۃ: (۱۴۸/۲، طبع رحمانیہ) میں حدیث ذکر فرمائی ہے:

عن عبداللہ بن عمرؓ قال: لعن رسول اللہ ﷺ الراشی والمرتشی.

ترجمہ، عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے رشوت دینے اور لینے والے پر لعنت فرمائی، اس کے علاوہ بھی متعدد احادیث میں رشوت کی مذمت آئی ہے ایک حدیث میں جہنم کو دونوں کا ٹھکانہ قرار دیا گیا ہے ''العیاذ باللہ'' لہٰذا ہر مسلمان کیلئے رشوت جیسی لعنت سے خواہ بصورت لین ہو یا دین احتراز کرنا ضروری ہے، البتہ فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ کہیں اپنا جائز حق وصول کرنا بغیر رشوت کے ممکن ہی نہ ہو تو وہاں اپنا جائز حق وصول کرنے کیلئے رشوت دینے کی گنجائش ہے تاہم رشوت دیتے وقت اس عمل کو دل سے برا سمجھیں اور بعد میں اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار بھی کریں۔

لمافی اعلاء السنن: (۱۵/۶۳-۶۲، طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)

عن ابی ہریرۃؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: لعنة اللہ علی الراشی والمرتشی......

وقال القاری: لعن رسول اللہ الراشی والمرتشی أی معطی الرشوة وآخذها وهی الوصلة الی الحاجة بالمصانعة قیل الرشوة ما یعطی لابطال حق أو لاحقاق باطل اما اذا اعطی لیتوصل به الی حق او لیدفع به عن نفسه ظلماً فلا بأس به.

ولمافی الشامی: (۷۲/۵، طبع سعید)

کما لو اضطر الی دفع مرشوة لاحیاء حقه جاز له الدفع وحرم علی القابض.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق

۲ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۷۵

﴿ویزا کے حصول کے لئے رشوت دینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کسی غیر ملکی سفارت خانہ سے ویزا لینا چاہتا ہے جس پر کل دس ہزار روپے کا خرچ آتا ہے لیکن چند وجوہات کی بناء پر وہ ویزا لینے میں کامیاب نہیں ہو سکا لیکن دوسرا آدمی جو اس محکمہ میں کام کرتا ہے کہتا ہے کہ تم مجھے تیس ہزار روپے دیدو تو میں تمہارے لئے ویزا کا انتظام کر سکتا ہوں اور دونوں کے درمیان تیس ہزار روپے کا معاہدہ ہو گیا تو کیا اس صورت میں یہ رقم لینا اور دینا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ویزا اس شخص کا اگر حق بنتا ہے اور بلاوجہ ذمہ دار افسران جاری نہیں کرتے تو اپنے حق کو وصول کرنے کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے، البتہ رشوت لینے والے گنہگار ہونگے اور یہ دوسرا شخص جو اس محکمہ میں ملازم ہے، ویزا جاری کرنا اسی کی ڈیوٹی میں اگر شامل ہے تو ایسی صورت میں یہ رشوت لینے والا شمار ہوگا اور اسکی ڈیوٹی اگر نہیں ہے اپنے اثر و رسوخ کیوجہ سے ویزا جاری کروا سکتا ہے تو بھاگ دوڑ اور اس سلسلہ میں اپنے وقت وغیرہ کا معاوضہ لے سکتا ہے۔

لمافی الشامی:(۵/۶۵۲،طبع سعید)

استوجر على ان يبيع ويشترى لم يجز لعدم قدرته عليه والحيلة ان يستأجره مدة للخدمة ويستعمله فى البيع(زيلعى)وتمام كلامه وانما جازت هذه الحيلة لان العقد يتناول المنفعة :وهى معلومة ببيان قدرالمدة وهو قادر على تسليم نفسه فى المدة ولو عمل من غير شرط واعطاه شيئا لا بأس به لانه عمل معه حسنة فجازاه خيرا وبذلك جرت العادة وما رآه المسلمون حسنا فهو عندالله حسن.

ولمافى التنوير مع الدر:(۵/۳۶۲،طبع ایچ ایم سعید)

(اخذ القضاء برشوة)للسلطان او لقومه وهو عالم بها او بشفاعة جامع الفصولين،اخذالمال ليسوى امره عندالسلطان دفعا للضرر او جلبا للنفع وهو حرام على الأخذ فقط وحيلة حلها ان يستأجره يوما الى الليل اويومين فتصير منافعه مملوكة ثم يستعمله فى الذهاب الى السلطان لامرالفلانى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۳ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۷۷

﴿چیک پوسٹ والوں کو پیسہ دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ باڈر پر کام کرتے

ہیں، صبح جاتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں، اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ باڈر پار کرتے وقت چیک پوسٹ والے بہت تنگ کرتے ہیں اور مار پیٹ بھی کرتے ہیں اور باڈر پار کرنا بھی نہیں دیتے مقصد صرف پیسہ لینا ہوتا ہے، اب اگر ہم ان کو پیسہ نہیں دیتے تو بڑا نقصان ہوتا ہے، اور اگر دیتے ہیں تو خوف ہوتا ہے کہ یہ تو رشوت ہے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا ایسے وقت میں ان چیک پوسٹ والوں کو پیسہ دینا جائز ہے یا نہیں، کیا یہ پیسہ دینا رشوت کے ذمرے میں آتا ہے یا نہیں؟

مستفتی: نعمت اللہ؛ چمن باڈر

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں اگر آپ سرکاری قوانین کے مطابق باڈر پار کرتے ہو، پھر بھی چیک پوسٹ والے آپ کو تنگ کر کے ظلم کرتے ہیں، پیسہ دیئے بغیر باڈر پار کرنا نہیں دیتے، اور ساتھ ساتھ مار پیٹ کا بھی خطرہ ہوتا ہے، تو آپ کیلئے اپنی جان مال کی حفاظت کی خاطر ان چیک پوسٹ والوں کو پیسہ دینے کی گنجائش ہے، اس صورت میں آپ رشوت کی وعید کے تحت نہیں آتے، آپ کے حق میں یہ رشوت نہیں ہے، البتہ لینے والوں کیلئے رشوت ہے اور حرام ہے۔

لما في مشكوٰة المصابيح:(ص:۲۵۵ طبع:سعيد)

وعن ابى حرة الرقاشى عن عمه قال :قال رسول الله ﷺ الا لا تظلموا الا لا يحل مال امرئ الا بطيب نفس منه

لما في اعلاء السنن:(۲۳۱/۵ طبع:بيروت)

اقول :اعطاء الرشوة ان كان للظلم فهو متفق على حرمة ......بخلاف الا عطاء لدفع الظلم فانه يد فع عن نفسه ظلما هو اشد بتحمل ظلم هو أخف وله دفع الظلم عن نفسه دون تحمل ظلم اصلاً ،فبتحمل الظلم اولى ،فقد علم من أن المراد من الراشى فى الحديث هو الذى يرشى ليظلم الغير لا الذى يرشى لدفع الظلم عنه ،لا نه مظلوم فكيف يكون مستحقا للعنة ؟

لما في الهندية:(ج۳/ص ۳۳۱ طبع:رشيديه)

واعلم بأن للرشوة أنواع ـــ ونوع منها أن يهدى الرجل الى رجل مالا بسبب أن ذلك الرجل قد خوفه فيهدى اليه مالا ليدفع الخوف عن نفسه او عن ماله وهذالنوع لا يحل الاخذ لأحد واذا اخذ يدخل تحت الوعيد المذكور فى هذالباب وهل يحل للمعطى الا عطاء عامة المشايخ على أنه يحل لأنه يجعل ماله وقاية لنفسه او يجعل بعض ماله وقاية للباقى

ولما في الشامي:(۳۶۲/۵ طبع:سعيد)

الرابع :مايدفع لدفع الخوف من المدفوع اليه على نفسه او ماله حلال للدافع حرام على الأخذ،لأن دفع الضرر على المسلم واجب ولا يجوز اخذ المال ليفعل الواجب.

ولما فی البحر:(۲۶۲/۶،طبع:سعید)

منها اذادفع الرشوة خوفا علی نفسه او ماله فهو حرام علی الأخذغیر حرام علی الدافع وکذا الطمع فی ماله فرشاه ببعض المال.

ولما فی شرح المجلة:(المادة۹۷،۲۶۴/۱،طبع:رشیدیه)

لا یجوز لأحد ان یأخذمال احد بلا سبب شرعی ای لا یحل فی کل الا حوال عمداًاو خطأ اونسیاناًجداًاو لعباًان یا خذاحد مال احد بوجه لم یشرعه الله تعالیٰ ولم یبحه لان حقوق العباد محترمة لا تسقط بعذر الخطأ والنسیان والهزل وغیره وذلک کا لغصب والسرقة والقما والربا والرشوة والدعاوی لباطلة وهادة الزور والمین الکا ذبة والعیاذبا لله تعالیٰ والصلح مع العلم بان المقضی له ظالم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:عزیز اللہ آغا عفی عنہ

۲۷جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ　　　　فتویٰ نمبر:۳۲۸۳

﴿لڑکی والوں کا مہر کے علاوہ رقم کا مطالبہ کرنا رشوت ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں بعض لوگ شادی سے پہلے لڑکے والوں سے حق مہر کے علاہ کچھ نقد رقم لیتے ہیں تو کیا شادی سے پہلے لڑکی والوں کا لڑکے سے حق مہر کے علاوہ نقد رقم لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟اور کیا لڑکا شادی کے بعد یا پہلے اس رقم کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟　　　　مستفتی:محمد جمیل کراچی

﴿جواب﴾ لڑکی کے والدین یا دوسرے اولیاء کے لئے حق مہر کے علاوہ لڑکے سے نقد رقم لینا حرام اور ناجائز ہے،ایسا مال لڑکے کی ملکیت ہے اور وہ کسی بھی وقت اس کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے،ہاں لڑکے نے بخوشی مال دیدیا ہو،لڑکی والوں نے زبردستی یا شادی کے لئے شرط لگا کر مطالبہ نہ کیا ہو تو جائز ہے اور واپس لینے کا حق بھی نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۱۵۶/۳،طبع سعید)

(أخذأهل المرأةشیاعندالتسلیم فللزوج أن یسترده)لانه رشوة.

وفی الشامیة:قوله عندالتسلیم:أی بان أبی أن یسلمهاأخوهاأونحوه حتیٰ یاخذشیاً، وکذالوأبی ان یزوجهافللزوج الاستردادقائماًاوهالکالانه رشوة.

ولما فی الهندیة:(۳۲۷/۱،طبع رشیدیه):لوأخذأهل المرأةشیاعندالتسلیم فللزوج أن یسترده لانه رشوة

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:رضوان اللہ حقانی

۲۸جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۲۱۴

﴿پیسے دیکر نمبرات اور فیصد بڑھوانا رشوت ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اپنی اسناد کے لئے پیسے دیکر نمبرات اور فیصد بڑھوانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ دیئے گئے نمبرات اور فیصد مذکورہ شخص کی قابلیت کے اعتبار سے درست ہیں۔ مستفتی: سید عبدالباسط پی اینڈ ٹی کورنگی کراچی

﴿جواب﴾ پیسے دیکر نمبرات اور فیصد بڑھوانا جائز نہیں ہے، اس طرح پیسے لینا اور دینا رشوت ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔

لمافی: کنز العمال: (۲۵/۶ طبع رحمانیہ) الراشی والمرتشی فی النار.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب کان اللہ لہ

۱۶ صفر ۱۴۳۶ھ فتویٰ نمبر: ۲۴۳۱

﴿افسروں کے ظلم سے بچنے کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ چند دنوں بعد بولان ایئر لائن کا افتتاح ہونے والا ہے، اسمیں نوکریاں آئی ہیں، میں نے اپنی سی وی وغیرہ وہاں جمع کروادی ہیں، میرا ایک دوست دوسری ایئر لائن میں کام کرتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ نوکری حاصل کرنے کے لئے آپ کو کچھ روپے خرچ کرنے ہونگے یعنی افسروں کو رشوت وغیرہ دینی ہوگی، معلوم یہ کرنا ہے کہ میرا رقم دینا درست ہے یا نہیں؟ جب کہ نوکری بہت اچھی ہے سہولیات بہت زیادہ ہیں اور اس نوکری سے مجھے جو تنخواہ ملے گی وہ جائز ہوگی یا نہیں؟ واضح رہے کہ آجکل حالات کی وجہ سے نوکری ملنا بہت مشکل ہے۔ مستفتی: محمد شعبان کورنگی

﴿جواب﴾ مسئولہ صورت میں اگر آپ اس نوکری کو درست طریقے سے انجام دینے کے اہل ہیں لیکن رشوت دیئے بغیر افسر لوگ آپکو اس نوکری کا اہل ظاہر نہیں کر رہے ہیں تو انکے ظلم سے بچنے کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے، آپکو گناہ نہیں ہوگا، البتہ افسر لوگ رشوت لینے کے گنہگار ہونگے اور اگر آپ میں اس نوکری کی اہلیت نہیں ہے صرف رشوت کے ذریعہ اپنے کو اس کا اہل ظاہر کردیتے ہیں تو اس صورت میں رشوت لینا دینا دونوں حرام ہیں اور صحیح خدمات نہ دینے کیوجہ سے تنخواہ بھی آپ کے لیئے حلال نہ ہوگی۔

لمافی الھندیۃ:(۴/ ۳۳۱،طبع رشیدیہ)

ونوع منھا ان یھدی الرجل الی الرجل مالا بسبب ان ذلک الرجل قد خوفہ فیھدی الیہ مالا لیدفع الخوف عن نفسہ او یھدی الی السلطان مالا لیدفع ظلمہ عن نفسہ او عن مالہ و ھذا نوع لا یحل الا خذ لا حد واذا خذ یدخل تحت الوعید المذکور فی ھذاالباب وھل یحل للمعطی الا عطاء عامۃ المشایخ علی انہ یحل لانہ یجعل مالہ وقایۃ لنفسہ او یجعل بعض مالہ وقایۃ للباقی.

لمافی التنویر مع الدر:(۵/ ۳۶۲،طبع سعید کمپنی)

(اخذالقضاء برشوۃ)الثالث : اخذ المال لیسوی امرہ عند السلطان دفعاللضرر او جلبا للنفع وھو حرام علی الا خذ فقط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۵۸۸

﴿منگنی سے انکار کے بعد اس دوران بھیجے گئے ہدایا کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میرے بھائی کی منگنی خاندان میں ہوئی اور منگنی کے بعد ہم نے عید وغیرہ کے موقع پر مختلف سامان مثلاً سونا و کپڑے وغیرہ ہدیہ کے طور پر بھیجے، منگنی کے دو سال بعد لڑکی کے والد اور بھائیوں نے انکار کر دیا، سوال یہ ہے کہ دو سال کے بعد لڑکی کے والد اور بھائیوں کے انکار کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اور جو ہدایا و سامان وغیرہ ہم نے اس دوران دیا ہے کیا شرعاً اس کے مطالبہ کا حق ہمیں حاصل ہے؟

﴿جواب﴾ منگنی دراصل وعدہ نکاح اور عہد ہوتا ہے، فریقین کو اس پر قائم رہنا چاہیے۔ چنانچہ قرآن کریم میں عہد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "واوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا......الآیۃ (اور عہد و پیمان کو پورا کرو بے شک عہد کے متعلق سوال کیا جائے گا) اور مسلمان کی شان کے لائق نہیں کہ وہ بلا وجہ اپنے کئے ہوئے عہد و پیمان سے پھر جائے، لہذا لڑکی کے والد اور بھائیوں کا بلا وجہ شرعی انکار کر دینا مناسب نہیں، کوئی معقول وجہ ہو تو مضائقہ نہیں، رہے ہدایا وغیرہ جو آپ نے اس دوران دیے ہیں ان میں سے جو اشیاء بعینہ موجود ہوں تو ان کا مطالبہ آپ کر سکتے ہیں لیکن جو اشیاء خود ہلاک ہو چکی ہیں یا ان میں تصرف کر کے استعمال میں لائی جا چکی ہیں مثلاً کپڑوں وغیرہ کی سلائی کر دی گئی ہے تو ایسی اشیاء کے مطالبہ کا حق آپ کو حاصل

نہیں، البتہ سونا اور دیگر قیمتی اشیاء عرف کے مطابق بہر حال واپس کرنی چاہیے۔

لمافی الدر المختار:(۲/۳۰۲،طبع امدادیہ)

خطب بنت رجل وبعث الیها اشیاء ولم یزوجها ابوها فما بعث للمهر یسترد عینه قائما ......وکذا یسترد مابعث هدیة وهو قائم دون الهالک والمستهلک لانه فی معنی الهبة.

وفی الشامیة: لانه فی معنی الهبة ای والهلاک والاستهلاك مانع من الرجوع بها..... وکذا یشترط عدم ما یمنع من الرجوع کما لو کان ثوبا فصبغته او خاطته.

ولما فی الشامی:(۲/۳۰۵،طبع امدادیه)

وعلی هذا فما یقع فی قری دمشق من ان الرجل یخطب امراة و یصیر یکسوها ویهدی الیها فی الاعیاد ویعطیها دراهم للنفقة والمهر الیٰ ان یکمل لها المهر فیعقد علیها لیلة الزفاف فاذا ابت ان تتزوجه ینبغی ان یرجع علیها بغیر الهدیة الهالکة علیٰ الاقوال الاربعة المارة لان ذلک مشروط التزوج.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۴۵۲

﴿گاڑی والے کا پولیس کو رشوت دینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی گاڑی والے کے پاس گاڑی کی صحیح کاغذات، لائسنس موجود ہے اور سرکاری ٹیکس ادا کرنے کی رسید بھی موجود ہے اور کسی طرح کے قانونی خلاف ورزی نہیں کی، پھر بھی بلا وجہ پولیس والے تنگ اور پریشان کر کے گاڑی روک لیں اور پھر گاڑی والے چالان سے بچنے کیلئے پولیس والے کو کچھ پیسے دیدیں تو کیا شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: اورنگزیب بنارس

﴿جواب﴾ گاڑی کے کاغذات، لائسنس وغیرہ سب موجود ہوں اور کسی قسم کی قانونی خلاف ورزی نہیں کی ہو اسکے باوجود پولیس والے اگر تنگ و پریشان کریں تو ایسی صورت میں ظلم سے بچنے کیلئے رشوت دینے کی گنجائش ہے، دینے والا گنہگار نہیں ہوگا لیکن پولیس والے گنہگار ہونگے اور انکے حق میں یہ پیسے رشوت کہلائینگے جو کہ حرام ہے۔

لمافی الفتاوی الهندیة:(۳/۳۳۱،طبع رشیدیه کوئٹه)

منها ان یهدی الرجل الی رجل مالا بسبب ان ذلک الرجل قد خوفه فیهدی الیه مالا لیدفع المخوف عن نفسه او یهدی الی السلطان مالا لیدفع ظلمه عن نفسه اوعن ماله

وھذا نوع لا یحل الاخذ لاحدواذا اخذ یدخل تحت الوعید المذکور فی ھذا الباب وھل یحل للمعطی الاعطاء عامة المشائخ علی انه یحل لانه یجعل ماله وقایة لنفسه او یجعل بعض ماله وقایة للباقی.

ولمافی الدرمع الرد:(۶/۴۲۴،طبع ایچ ایم سعید)

ولاباس بالرشوة اذا خاف علی دینه والنبی ﷺ کان یعطی الشعراء ولمن یخاف لسانه.

وفی الشامیة:(قوله لمن خاف علی دینه)عبارة المجتبی لمن یخاف وفیه ایضا دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوة یعنی فی حق الدافع

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۷۷

﴿رخصتی سے قبل دلہن کے ماموں کا رقم لینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ بعض علاقوں میں ایسا ہوتا ہے کہ دلہن کی رخصتی سے قبل اس کا ماموں لڑکے والوں سے رقم کا مطالبہ کرتا ہے جو کہ پانچ سے دس ہزار تک ہوتی ہے اس رقم کی ادائیگی کے بغیر دلہن کی رخصتی نہیں کی جاتی، اس رقم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس طرح کی رقم کا لینا جائز ہے؟ مستفتی: عبدالخالق گلشن معمار کراچی

﴿جواب﴾ شریعت مطہرہ نے بغیر کسی سبب شرعی کے مال لینے کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے صورت مسئولہ میں دلہن کے ماموں کا رقم وصول کرنا شرعاً رشوت ہے جسکا لینا حرام اور ناجائز ہے، شوہر کو اپنا مال واپس وصول کرنے کا حق حاصل ہے۔

لمافی مشکوٰۃ المصابیح:(ص۲۵۵،طبع سعید)

عن ابی حرة الرقاشی عن عمه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الا لاتظلموا الالا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفسه منه.رواه البیهقی فی شعب الایمان.

ولمافی التنویرمع الدر:(۳/۱۵۶،طبع رشیدیه)

(اخذ اهل المرأة شیئا عند التسلیم فللزوج ان یسترده لانه رشوة)ای بان ابی ان یسلمها اخوها او نحوه حتی یاخذ شیئا.

ولمافی الهندیة:(۱/۳۲۷،طبع رشیدیه)

ولو اخذاهل المرأةشیئاعندالتسلیم فللزوج ان یسترده لانه رشوة کذافی البحر الرائق.

ولمافی شرح المجلة للاتاسی:(۱/۲۶۴،المادة۹۷،طبع رشیدیه)

لایجوز لاحد ان یا خذمال احد بلاسبب شرعی ای لایحل فی کل الاحوال عمدا اوخطا او نسیا نا جدا اولعبا ان یاخذ احد مال احد بوجه لم یشرعه الله تعالیٰ ولم یبحه لان

حقوق العباد محترمة لاتسقط بعذر الخطاء والنسيان والهزل وغيره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم: عبدالوہاب لغمانی عفا اللہ عنہ

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ   فتویٰ نمبر: ۲۵۵۱

﴿نقل، سفارش اور رشوت کے ذریعے ڈپلومے کی سند حاصل کرنا گناہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص محنت ولگن کے ساتھ ایک ادارے سے کسی فن میں ڈپلومہ کرتا ہے اور پھر اس ڈپلومہ کی بنیاد پر کوئی ملازمت اختیار کرتا ہے جبکہ دوسرا شخص نقل، سفارش اور رشوت کے ذریعے ڈپلومہ کی سند حاصل کر کے اسکی بنیاد پر ملازمت اختیار کرتا ہے شرعاً ایسی ملازمت کا کیا حکم ہے؟   مستفتی محمد عاصم ڈیفنس کراچی

﴿جواب﴾ ڈپلومہ وغیرہ کی سند دراصل اس بات کی شہادت ہوتی ہے کہ حامل سند اس کام کی صلاحیت واہلیت رکھتا ہے، سو کوئی بغیر سند کے مذکورہ ذمہ داری کی صلاحیت واہلیت اگر رکھتا ہو تو ملازمت جائز ہے اور تنخواہ لینا بھی جائز ہے اگرچہ ملازمت حاصل کرنے کے لئے جعلی سند کے ذریعے باور کرایا ہو یا نقل ورشوت کے ذریعے حاصل کی ہوئی سند پیش کی ہو اس لئے کہ اصل مطلوب کام کی صلاحیت ہے، سند بذات خود مطلوب نہیں ہے۔

البتہ نقل، رشوت کے ذریعے سند حاصل کرنا بڑا گناہ ہے، اس لئے توبہ واستغفار ضروری ہے لیکن ملازمت اور تنخواہ کے جواز کا دارومدار سند پر نہیں ہے، استعداد اور صلاحیت پر ہے۔

لمافي العناية شرح الهداية: (۱۲/۲۵۳ طبع موقع الاسلام بیروت)

واذا شرط على الصانع ان يعمل بنفسه الخ. فليس له ان يستعمل غيره لان المعقود عليه العمل من محل بعينه فيستحق عينه كالمنفعة في محل بعينه كان استاجر دابة بعينها للحمل فانه ليس للمؤجران يسلم غيرها وفيه تأمل لانه ان خالفه الى خير بان استعمل من هو اصنع منه في ذلك الفن اوسلم دابة اقوى من ذلك كان ينبغي ان يجوز.

ولمافي بدائع الصنائع: (۴/۱۷۴ طبع سعید)

اما ركنها فالايجاب والقبول وذلك بلفظ دال عليها وهو لفظ الاجارة والاستئجار والاكتراء والاكراء فاذا وجد ذلك فقدتم الركن.

ولمافي البحر: (۸/۳ طبع سعید)

واما ركنها فهو الايجاب والقبول والارتباط بينهما واما شرط جوازها فثلاثة اشياء اجر معلوم وعين معلوم وبدل معلوم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی عفا اللہ عنہ

۱۴۲۹ھ   فتویٰ نمبر: ۲۰۳۵

﴿مکمل پنشن کی وصولی کے لیے رشوت دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے پاک فوج کی رجمنٹ آرڈیننس (سپلائی) میں ۲۸ سال خدمات انجام دی ہیں، میری ریٹائرمنٹ اور پنشن ملنے میں تقریبا دو، تین ماہ کا عرصہ رہ گیا ہے، میرے ریکارڈ میں کچھ کاغذات کے الٹ پلٹ ہو جانے کی وجہ سے میری پنشن سے ایک معتد بہ حصہ کاٹا جارہا ہے یعنی وہ رقم میری ہی ہے لیکن اب ان کاغذات کو بنوانے اور ریکارڈ کی درستگی کے لئے مجھ سے رشوت طلب کی جارہی ہے اگر رشوت نہ دی تو میرے کاغذات نہیں بنیں گے اور مجھ سے پنشن کی کچھ رقم کاٹ لی جائے گی۔ براہ کرم شریعت کی روشنی میں بتائیں کہ کیا مجھے اپنا حق وصول کرنے کے لئے رشوت دینا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں چونکہ اپنا حق وصول کرنے کے لئے رشوت دی جارہی ہے اس لئے رشوت دینا جائز ہے، البتہ رشوت لینے والے کے لئے یہ رقم حرام ہوگی اور اس پر اس رقم کو لوٹانا واجب ہوگا اور وہ سخت گنہگار ہوگا۔

لمافی الشامی: (۳۶۲/۵ مطلب فی الکلام علی الرشوۃ والهدیۃ، طبع سعید)

وفی الفتح: ثم الرشوۃ أربعۃ أقسام: منها ..... الرابع: ما یدفع لدفع الخوف من المدفوع الیہ علی نفسہ أو مالہ حلال للدافع حرام علی الآخذ، لأن دفع الضرر عن المسلم واجب ولا یجوز أخذ المال لیفعل الواجب اھ مافی الفتح ملخصا وفی القنیۃ: الرشوۃ یجب ردها ولا تملک۔

لمافی التنویر مع الدر: (۷۱/۵-۷۲، طبع سعید)

(وشعر الخنزیر) لنجاسۃ عینہ فیبطل بیعہ ابن کمال (و) ان (جاز الانتفاع بہ) لضرورۃ الخرز حتی لو لم یوجد بلا ثمن جاز الشراء للضرورۃ وکرہ البیع فلا یطلب ثمنہ.

وکذافی الشامی: (۷۲/۵، طبع سعید) وکذافی الدر مع الرد: (۲۲۳/۶-۲۲۴، طبع سعید)

واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ　　　الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۲۳۱۸　　　۱۹ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ

﴿من اعطی الرشوۃ لاداء الحج﴾

﴿حج پر جانے کے لیے رشوت دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ طریقۃ الحج فی بلادنا بالاقتراع ومن اعطی الرشوۃ یرسلونہ بغیر

القرعة فهل يجوز اعطاء الرشوة لاداء الحج ام ينتظر القرعة فاذا انتظر ولم يخرج حتى مات هل يأثم ؟ مستفتي: ضياء الدين التاجكستاني

﴿جواب﴾ اذا لم يمكن اداء الحج الا باعطاء الرشوة وعنده مال يكفي يعطي ويؤدي حج الفرض اما اذا كان الاداء في الاقتراع محتملا فلينتظر قرعته فاذا خرج فيها والا يلزمه الوصية اذا احس بالموت وان لم يوص يأثم والله اعلم.

لما في فتح القدير:(۲/۲۲۵،طبع رشيديه)

ثم الأثم في مثله على الآخذ لا المعطي على ما عرف من تقسيم الرشوة في كتاب القضاء، وكون المعصية منهم لا يترك الفرض لمعصية عاص.

ولما في البحر:(۲/۱۱۲،طبع سعيد)

وعلى تقديرهم الرشوة فالاثم في مثله على الآخذ لا معطي.

ولما في الدر مع الرد:(۲/۴۶۳-۴۶۴،طبع امداديه)

وهل مايؤخذ من المكس والخفارة عذر؟ قولان والمعتمد لا كما في القنية والمجتبى، وعليه فيحتسب في الفاضل عما لا بد منه القدرة على المكس ونحوه كما في مناسك الطرابلسي.

ولما في احكام القرآن:(۲/۸۲،طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامية)

ومن ههنا علم أن قولهم ان الطاعة اذا ادت الى معصية راجحة وجب تركها ليس على اطلاقه بل المراد من الطاعة فيه هي التي لم تكن من المقاصد الشرعية الواجبة او من شعائر الاسلام.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۸۰۵

﴿رشوت دیکر سند، ڈگری حاصل کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میں داؤد کالج کا طالب علم ہوں اور داؤد کالج بڑی یونیورسٹی سے ملحق ہے اور وہی یونیورسٹی ڈگری بھی دیتی ہے ہمارے کالج کے فائنل امتحانات فروری ۲۰۰۸ میں ہوئے تھے، اب ہمارا کالج موجودہ جماعتوں کو خود ڈگری دے رہا ہے اور جو پہلی جماعتیں تھیں انکی ڈگری مہران یونیورسٹی دے گی، میں امتحان کے چند پرچوں میں رہ گیا تھا اور میری جماعت والے پاس ہو چکے ہیں، اب میں درمیان میں رہ گیا ہوں ڈگری کیلئے مہران یونیورسٹی جاتا ہوں تو وہ داؤد کالج پر ذمہ داری ڈالتے ہیں اور ہمارے کالج والے کہتے ہیں کہ ہم صرف موجودہ جماعتوں کو ڈگری دیتے ہیں تو کیا ایسی صورت میں میرے لئے یہ جائز ہے کہ میں

کچھ دے دلا کر اپنی رکی ہوئی سند نکلوالوں یا دوبارہ سے چار سال داود کالج میں پڑھوں؟ جبکہ یہ سند وہ شعبہ جاری کریگا جو سند دیتا ہے اور اس میں ظاہر کریگا کہ وہ ان پرچوں میں پاس ہے۔

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر واقعی آپ کا حق بنتا ہے کہ آپکی سند جاری کی جائے اور متعلقہ افراد جاری نہیں کرتے تو بوجہ مجبوری آپ کچھ دیکر سند نکال سکتے ہیں شریعت میں اسکی گنجائش ہے، تاہم ان کیلئے اس کا لینا جائز نہیں ہے ان کے حق میں یہ رشوت ہوگا۔

البتہ قانونی طور پر اگر سند نکالنا آپکا حق نہیں بنتا تو پھر سند نکلوانے کیلئے آپکا کچھ دینا رشوت ہوگا اور سخت گناہ ہوگا۔

لمافی قوله تعالی:(سورة البقرة پاره ۲ ،آیت ۱۸۸)

ولا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل وتدلو بها الى الحكام لتأكلوا فريقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون...... الآية.

ولما فی اعلاء السنن:(۱۵/ ۶۳،طبع دار الکتب العلمیة)

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "لعنة الله على الراشي والمرتشي" رواه ابوداود واحمد والترمذي.

ولما فی الشامی:(۵/ ۳۶۲،طبع سعید)

وفي الفتح ثم الرشوة اربعة اقسام منها ماهو حرام على الآخذ والمعطي وهو الرشوة على تقليد القضاء والامارة. الثاني ارتشاء القاضي ليحكم وهو كذلك ولو القضاء بحق لانه واجب عليه. الثالث اخذ المال ليسوى امره عند السلطان دفعا للضرر أو جلبا للنفع وهو حرام على الآخذ فقط...... الرابع مايدفع لدفع الخوف من المدفوع اليه على نفسه اوماله حلال للدافع حرام على الآخذ لان دفع الضرر عن المسلم واجب ولا يجوز اخذ المال ليفعل الواجب.

ولما فيه ايضاً:(۵/ ۷۲،طبع سعید)

كما لو اضطر الى دفع رشوة لاحياء حقه جاز له الدفع وحرم على القابض اه.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمن سواتی

۱۶ جمادی الاولی ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۲۱۶۷

﴿مال کلیئر کروانے کیلئے افسران بالا کو رشوت دینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اپنا مال (بیرون ملک سے منگوانے اور بھجوانے میں) کلئیر کروانے کیلئے افسران بالا کو رشوت دینا جبکہ ملکی قوانین کے

مطابق نہ مال میں کوئی نقص ہو اور نہ دستاویزات میں قانون کی خلاف ورزی ہو اگر رشوت نہ دیجائے تو افسران مال کلئیر نہیں کرتے اور یہاں تک کہ اصل سرمایہ بھی ڈوبنے کا خطرہ ہوتا ہے، شریعت کی رو سے اس طرح رشوت دینا سبب گناہ ہے یا نہیں؟ کیا اس وبال میں دونوں برابر کے شریک ہونگے؟ مستفتی: رشید احمد صدیقی پی اینڈٹی سوسائٹی کورنگی کراچی

﴿جواب﴾ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: (الراشی والمرتشی فی النار: الحدیث: (کنز العمال: ۶/۴۵) البتہ ظالم کے ظلم سے بچنے کیلئے یا اپنا حق وصول کرنے کیلئے بشرطیکہ رشوت دیئے بغیر ظلم سے بچنا یا اپنا حق وصول کرنا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں رشوت دینے کی گنجائش ہے، لہٰذا افسران بالا آپ کا مال رشوت کے بغیر اگر کلیئر نہیں کرتے باوجودیکہ آپ کے مال میں کوئی نقص یا دستاویزات میں کوئی کمی بھی نہیں ہے تو مالی نقصان سے بچنے کیلئے رشوت دینے کی گنجائش ہے، آپ کے حق میں رشوت نہیں ہوگی، لینے والے ہی گنہگار ہونگے، ان کے حق میں رشوت ہے۔

لمافی الدر مع الرد: (۶/۴۲۳-۴۲۴ طبع سعید) لابأس بالرشوة اذا خاف علی دینه ـــ الخ.

وفی الشامیه: قوله (اذا خاف علی دینه) عبارة المجتبی لمن یخاف وفیه ایضا دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوة یعنی فی حق الدافع اه.

ولمافی الهندیة: (۴/۳۳۱ طبع رشیدیه)

أن یهدی الرجل الی رجل مالا بسبب أن ذلک الرجل خوفه فیهدی الیه مالا لیدفع الخوف عن نفسه أو یهدی الی السلطان مالا لیدفع ظلمه عن نفسه أو عن ماله ,وهذانوع لا یحل الأخذ لأحد ـــ الخ وهل یحل للمعطی الاعطاء عامة المشائخ علی انه یحل لانه یجعل ماله وقایة لنفسه أو یجعل بعض ماله وقایة للباقی...... الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ ‏ ‏ ‏ ‏ واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب کان اللہ لہ

۱۴ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ ‏ ‏ ‏ ‏ فتوی نمبر: ۴۴۲۴

﴿بحالتِ مجبوری رشوت دیکر واپڈا سے میٹر خریدنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں واپڈا کا ملازم ہوں میرے گاؤں والے اپنی ضرورت کے لئے بجلی کا میٹر میرے ذریعے منگواتے ہیں حکومت کی

طرف سے میٹراور چالیس گز تار ملتا ہے اور اسکی قیمت وصول کی جاتی ہے لیکن واپڈا کے افسران بجائے چالیس گز تار کے پندرہ گز تار دیتے ہیں اور قیمت چالیس گز تار کی ہی وصول کرتے ہیں ہم مجبوراً اتنی ہی تار لے سکتے ہیں گاؤں والوں کو اس ساری صورتحال کا علم ہے تو کیا میرے لئے یہ جائز ہے کہ میں گاؤں والوں کیلئے اسطرح کا معاملہ کروں یعنی میٹر اور پندرہ گز تار چالیس گز تار کی قیمت میں واپڈا سے خرید کر انکو دوں؟

مستفتی: حاجی عمر دراز

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ اپنے گاؤں والوں کی طرف سے وکیل ہیں گاؤں والوں کے علم میں اگر یہ بات ہے کہ آپ حکومت کی طرف سے باضابطہ منظور شدہ مقدار سے کم مقدار میں تار وصول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اسکے باوجود یہ لوگ آپ سے میٹر تار وغیرہ اس محکمہ سے لینے کو کہتے ہیں تو آپ کے لئے یہ معاملہ جائز ہے آپ پر گناہ نہیں ہے، البتہ باختیار افسران کے حق میں یہ رشوت ہے اور حرام ہے اور آپ چونکہ رشوت دیے بغیر اپنا حق وصول نہیں کر سکتے اس لئے رشوت دینے کا گناہ نہیں ہے۔

لما فی فتح القدیر:(۷/۲۷۵،طبع رشیدیه)

(قوله والوكيل الحر البالغ او المأذون مثلهما جاز)واطلق فى المأذون يشمل كلا من العبد والصبى المأذونين فى التجارة لاجتماع الشروط وهى ملك الموكل التصرف ولزوم الاحكام.

ولما فى الهداية:(ص ۱۹۱،طبع رحمانيه)

قال ولو وكله بشراء شيء بعينه فليس له ان يشتريه لنفسه لانه يؤدى الى تغرير الامر حيث اعتمد عليه.

ولما فى الدرالمختار:(۵/۷۲،طبع سعيد)

كما لو اضطر الى دفع مرشوة لاحياء حقه جاز له الدفع وحرم على القابض.

ولما فى الشامى:(۶/۴۲۳-۴۲۴،طبع سعيد)

(قوله واذا خاف على دينه)عبارة المجتبى لمن يخاف وفيه ايضاً دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعنى فى حق الدافع حرام للآخذ.

ولما فى الشامى:(۵/۳۶۲،طبع سعيد)

الرابع مايدفع لدفع الخوف من المدفوع اليه على نفسه اوماله حلال للدافع حرام للآخذ.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۳ صفر ۱۴۳۰ھ

فتوی نمبر: ۱۸۹۰

﴿پوزیشن لینے کیلئے رشوت دینا حرام ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہے مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک اسکول میں زید اور بکر پڑھتے ہیں، زید بہت قابل ترین لڑکا ہے جبکہ بکر بہت کمزور، مگر گورنمنٹ یعنی بورڈ کے امتحان میں بکر ممتحن کو پیسے دیکر پوزیشن لیتا ہے، جیسا کہ آج کل پاکستان میں سرعام ہورہا ہے، اسی طرح زید کا حق مارا جاتا ہے کہ باوجود قابل ہونے کے وہ پوزیشن نہ لے سکا تو کیا زید پیسے دیکر پوزیشن لے سکتا ہے یا نہیں؟ اور اسکی سند کی بنیاد پر ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بورڈ کے امتحان میں نقل کی جاتی ہے، حکومت کو اسکا علم بھی ہوتا ہے تو کیا باوجود علم کے نقل کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ زید واقعی قابل ہو تب بھی پوزیشن لینا اس کا کوئی یقینی حق نہیں بنتا، یقینی حق ہو کسی کا اور رشوت دیئے بغیر حاصل نہ ہوتا ہو تو رشوت دینے کی گنجائش ہوتی ہے، مجبوراً دینے والا شخص گنہگار نہ ہوگا، البتہ لینے والے کے حق میں رشوت اور حرام ہے۔

نقل یا رشوت کے ذریعہ ڈگری حاصل کرنا بڑا گناہ ہے، جھوٹ اور دھوکہ ہے، ملازمت کی صلاحیت نہ ہو، صرف ڈگری کی بنیاد پر ملازمت حاصل کی ہو تو ملازمت ناجائز اور حاصل ہونے والی آمدنی بھی حرام ہے، البتہ کام کی صلاحیت ہو اور سپردشدہ ذمہ داری بخوبی انجام دیتے ہو تو ملازمت سے حاصل ہونے والی آمدنی جائز اور حلال ہے۔

لما فی قوله تعالی:(سورة نساء آیت ۲۹)

﴿یاایها الذین آمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارة عن تراض منکم ـــ الایة﴾

لما فی قوله تعالی:(سورة البقرة آیت ۱۸۸) ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل ـــ الایة.

ولما فی سنن أبی داود:(۱۴۸/۲ برقم الحدیث ۳۵۸۰ طبع رحمانیه)

عن عبدالله بن عمرو قال لعن رسول الله صلی الله علیه وسلم ألراشی والمرتشی.

ولما فی کنز العمال:(۵-۲۵/۶ طبع رحمانیه) ألراشی والمرتشی فی النار.

ولما فی الشامی:(۳۶۲/۵ کتاب القضاء مطلب فی الکلام علی الرشوة والهدیة طبع سعید)

وفی الفتح: الرشوة أربعة أقسام: منها ما هو حرام علی الأخذ والمعطی وهو الرشوة علی تقلید القضاء والأمارة، الثانی ارتشاء القاضی لیحکم وهو کذلک وکذا فی البحر:(۱۹/۸، کتاب الاجارة فی وصح أخذ أجرة الحمام والحجام طبع سعید)

ولما في البحر:(۲۶۲/۱، كتاب القضاء، طبع سعيد)

ان الرشوة مايعطيه بشرط أن يعينه...... اذادفع الرشوة الى القاضي ليقضي له حرم من الجانبين سواء كان القاضي بحق أو بغير حق.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۱ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۷۹۶۲

﴿مجبوراً رشوت دیکر آفیسر حضرات سے سروس بک صحیح کرانے کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری سروس بک میں کچھ غلطی تھی جس کی وجہ سے میں تقریباً پچیس سال تک ہزار روپے تنخواہ کم لیتا رہا دوران ملازمت آفیسر حضرات کو بار بار صحیح کرنے کا کہا تھا لیکن بغیر رشوت کے نہیں کر رہے تھے تو میں نے بھی پرواہ نہیں کی، اب جب پنشن لینے کا وقت آیا تو اس غلطی کی رہ جانے کی وجہ سے پنشن پر خاصا فرق پڑ رہا ہے لیکن اب بھی آفیسر بغیر رشوت کے صحیح نہیں کر رہے ہیں تو کیا ایسی صورتحال میں میرے لئے رشوت دیکر سروس بک صحیح کرانا جائز ہے؟ نیز ان حضرات کو محکمہ کیطرف سے یہی کام سپرد ہے کہ وہ ملازمین کے سروس بک صحیح کریں؟ مستفتی حاجی عمردراز صاحب

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر آپ کی کوشش کے باوجود آفیسر حضرات آپ کی سروس بک صحیح نہیں کر رہے ہیں اور آپ کو سروس بک میں غلطی کی وجہ سے مالی نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے تو آپ کیلئے اس نقصان سے بچنے کیلئے انکو رشوت دیکر سروس بک صحیح کرانے کی گنجائش ہے، البتہ آفیسر حضرات کو اگر اسی کام کی حکومت کیطرف سے تنخواہ مل رہی ہو اور پھر بھی ملازمین سے اس کام پر پیسے لے رہے ہوں تو ان کیلئے یہ پیسے لینا ناجائز اور حرام ہے۔

لما في الشامي:(۷۲/۵، طبع سعيد)

كما لو اضطر الى دفع مرشوة لا حياء حقه جاز له الدفع وحرم على القابض.

ولما في الشامي:(۴۲۳/۶-۴۲۴، طبع سعيد)

(قوله ولذا خاف على دينه) عبارة المجتبى لمن يخاف وفيه ايضاً دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق نه ليس برشوة يعني في حق الدافع حرام للآخذ

ولما في الشامي:(۳۶۲/۵، طبع سعيد)

الرابع: مايدفع لدفع الخوف من المدفوع اليه على نفسه اوماله حلال للدافع حرام على الأخذ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۷ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۰۶

﴿ظلم سے بچنے کے لئے رشوت دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا پولیس والوں کو ان کے ناجائز مطالبے پر جبکہ وہ ظلم کر رہے ہوں پیسے دینا صحیح ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ رشوت دینے کے زمرے میں آئے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد نذیر کراچوی

﴿جواب﴾ پولیس والے اگر بغیر کسی جرم اور قانونی خلاف ورزی کے بلا وجہ پیسے بٹورنے کے لئے لوگوں کو پکڑ کر زور وزبردستی کرتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو مزید ظلم کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں ان کے ظلم سے بچنے کے لئے رشوت کی گنجائش ہے اور گناہ لینے والے پر ہوگا دینے والے پر نہیں ہوگا۔

لما فی الشامی:(۳۶۲/۵مطلب فی الکلام علی الرشوۃ والھدیۃ مطبع سعید)

ألرابع مایدفع لدفع الخوف من المدفوع الیه علی نفسه أوماله حلال للدافع حرام علی الآخذ،لأن دفع الضرر علی المسلم واجب ولایجوز أخذالمال لیفعل الواجب.

لما فی الدرمع الرد:(۴۲۳/۶فصل فی البیع مطبع سعید)

لابأس بالرشوۃ اذاخاف علی دینه.

(قوله اذاخاف علی دینه)عبارۃ المجتبیٰ لمن یخاف وفیه أیضاًدفع المال للسلطان الجائرلدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوۃ یعنی فی حق الدافع (قوله کان یعطی الشعراء)وقدروی للخطابی فی الغریب عن عکرمة مرسلاًقال أتی شاعرالنبی صلی الله علیه وسلم فقال یابلال اقطع لسانه عنی فأعطاہ أربعین درھماً.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد امین غفرلہ ولوالدیہ

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۱۹

کتاب القصاص والحدود والتعزیرات

اپنے اصول یا فروع کے قتل پر قصاص کا حکم

سوال اگر کوئی شخص اپنے والدین میں سے کسی کو قتل کردے تو کیا اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا؟ اور اگر والدین میں سے کوئی اپنی اولاد کو قتل کردے تو انکے بارے میں کیا حکم ہے کیا ان سے بھی قصاص لیا جائے گا؟ بینوا توجروا۔

جواب اولاد اگر والدین میں سے کسی کو قتل کردے تو اسے قصاصاً قتل کیا جائے گا لیکن والدین میں سے کسی نے اگر اپنی اولاد کو قتل کردیا تو اسکو قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۶/۵۳۴-۵۳۵ طبع سعید)

(والفرع بأصله وان علا لا بعكسه) خلافا لمالك فيما اذا ذبح ابنه ذبحا أى لا يقتص الأصول وان علوا مطلقا ولو اناثا من قبل الأم فى نفس أو أطراف بفروعهم وان سفلوا لقوله عليه الصلوة والسلام "لا يقاد الوالد بولده".

لمافی الهندية:(۶/۵۳۴ طبع رشيديه)

ويقتل الولد بالوالد والوالدة والجد وان علا والجدة وان علت من قبل الآباء اوالأمهات كذا فى فتاوى قاضيخان ولا يقتل الرجل بابنه والجد من قبل الرجال والنساء وان علا فى هذا بمنزلة الأب وكذا الوالدة والجدة من قبل الأب والأم قربت أو بعدت كذا فى الكافى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۷ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۹۸

اپنا حق حاصل کرنے میں دوسرے کے قتل کا حکم

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ اگر کسی شخص کے پلاٹ وغیرہ پر کچھ لوگ ناجائز قبضہ کرلیں اور حکومت یا پولیس وغیرہ کی مدد سے اپنے حق کی وصولیابی کی توقع نہ ہو اور وہ شخص خود اپنے حق کی حفاظت کیلئے لڑے یہاں تک کہ قابضین میں سے کسی کی موت واقع ہوجائے حالانکہ اسکا کسی کو مارنے کا ارادہ نہ ہو لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتا تو خود اسکی جان کا خطرہ ہو تو اس صورت میں اس شخص پر مقتول کا ضمان ہوگا یا نہیں؟ اور وہ شخص عنداللہ مجرم ہوگا یا نہیں؟

جواب ایسی صورت میں کوشش یہی ہونی چاہیے کہ کسی طرح اپنا حق وصول ہو اور کسی کی جان بھی ضائع نہ ہوا سکے باوجود غیر ارادی طور پر یا اپنے سے دفاع کے دوران ظالم کے قتل کی

نوبت آجائے تو عند اللہ آپکو کوئی گناہ نہ ہوگا نہ کوئی ضمان ادا کرنے کے آپ پابند ہونگے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۶/۵۴۷،طبع ایچ ایم سعید)

(کالمغصوب اذاقتل الغاصب)فانه یجب القود لقدرته علی دفعه بالاستغاثة بالمسلمین والقاضی.

وفی الشامیة:وقال فی المنح عن البحر:استقبله اللصوص ومعه مال لایساوی عشرة حل له ان یقاتلهم لقوله علیه السلام:"قاتل دون مالک"واسم المال یقع علی القلیل والکثیراه.سائحانی.....(قوله لقدرته علی دفعه الخ)انظر ماالظالم یقدر المسلون والقاضی کماهومشاهدفی زماننا والظاهرانه یجوزله قتله لعموم الحدیث ط.

ولما فی الهندیة:(۲/۱۷۵،طبع رشیدیه)

اذادخل دار رجل فعلم به صاحب الدار وعلم انه لایقدران یاخذ بیده له قتله سواء دخل علیه مکابرة اوغیرمکابرة وهویریدان یسرق ماله فقتله فلاقودعلیه ولادیة کذافی محیط السرخسی.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:احمد علی عفی عنہ

۲۶صفرالخیر۱۴۳۶ھ　　　فتویٰ نمبر:۲۴۵۳

﴿مقتول کے ورثاء میں سے کوئی بھی معاف کردے تو قصاص ساقط ہوجاتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر مقتول کے ورثاء میں سے کوئی ایک قاتل کو معاف کرے تو دوسرے ورثاء کو قصاص لینے کا حق باقی رہیگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مقتول کے ورثاء میں سے کوئی ایک بھی اگر قاتل کو معاف کردے تو قاتل قصاصاً قتل نہیں کیا جائیگا۔البتہ دیت لی جائیگی جو ورثاء میں ان کے حصوں کی بقدر تقسیم کی جائیگی۔

لما فی الهندیه:(۶/۲۰،طبع رشیدیه)

ومن عفا من ورثة المقتول عن القصاص رجل أو امرأة ام أو جدة أو من سواهن من النساء او کان المقتول امرأة فعفا زوجها عن القاتل فلا سبیل الی القصاص کذا فی السراج الوهاج ان صالح احد الشرکاء عن نصیبه علی عوضه او عفا سقط حق الباقین عن القصاص.

ولما فی البحر الرائق:(۸/۲۱۰،طبع سعید)

(فان صالح احد الاولیاء عن حظ علی عوض او عفا فلمن بقی حظه عن الدیة) لان کل واحد منهم تمکن عن التصرف فی نصیبه استیفاء واسقاط بالعفو والصلح لانه یتصرف فی خالص حقه فینفذ عفوه وصلحه فیسقط حقه من القصاص ومن ضرورته سقوط حق الباقین أیضاً فیه لانه لا یتجزء.

ولما فی فتاوی قاضی خان:(۳/۲۵۰،طبع قدیمی)

رجل قتل عمداً فعفا بعض عن القاتل ثم قتله باقی الورثة ان علموا ان عفوا

البعض يقطع القصاص يلزمهم القود.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوہاٹی

۲۲ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ　　　　فتویٰ نمبر:

﴿قاتل کو مقتول کے ورثاء کے علاوہ کوئی قتل کردے تو کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ ایک بندے نے دوسرے کو قتل کر دیا مقتول کے ورثاء نے قاتل کے خلاف عدالتی کاروائی شروع کر رکھی تھی کہ قاتل کو مقتول کے ورثاء کے علاوہ کسی اور نے قتل کر دیا تو اب مقتول کے ورثاء کے لیے کیا حکم ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ اب اولیاء مقتول کا حق قصاص ساقط ہو گیا ہے کیونکہ محل باقی نہیں رہا جیسے قاتل اپنی موت مر جائے تو قصاص ساقط ہو جاتا ہے ایسے ہی کوئی اجنبی آدمی اگر قاتل کو قتل کر دے تو بھی قصاص ساقط ہو جاتا ہے، البتہ اس اجنبی نے اگر قاتل کو عمداً ناحق قتل کیا ہے تو اولیاء قاتل کو حق قصاص ملے گا اور اگر ناحق خطاءً قتل کیا ہے تو اس اجنبی کے عاقلہ پر دیت واجب ہوگی۔

لما في التنوير والدر ۶/۵۴۰ طبع سعيد)

(ولو قتل القاتل اجنبي وجب القصاص عليه في)القتل (العمد)لانه محقون الدم بالنظر لقاتله كما مر (والدية على عاقلته)اى القاتل (في الخطاء)ولو قال ولي القتيل بعد القتل اى بعد قتل الاجنبي (كنت امرته بقتله ولا بينة له)على مقالته(لا يصدق)ويقتل الاجنبي درر بخلاف من حفر بئراً في دار رجل فمات فيها شخص فقال رب الدار كنت امرته بالحفر صدق مجتبى يعني لانه يملك استئنافه للحال فيصدق بخلاف الاول لفوات المحل بالقتل كما هو القاعدة وظاهره ان حق الولي يسقط راسا كما لو مات القاتل حتف انفه.

(ولما في الرد ۶/۵۴۰ طبع سعيد)

(قوله وظاهره)اى ظاهر قول المتن ولو قتل القاتل اجنبي وجب القصاص الخ ان ولي المقتول الاول يسقط حقه رأساً اى يسقط من الدية كما سقط من القصاص مثل لو مات القاتل بلا قتل احد.

(ولما في الفقه الاسلامي ۷/۵۶۸۸ طبع رشيدية)

اذا مات من عليه القصاص او قتل ظلما بغير حق او بحق بالردة او القصاص سقط القصاص، لان محله هو نفس القاتل، ولا يتصور بقاء الشيء في غير محله فقال الحنفية والمالكية اذا سقط القصاص بالموت لا تجب الدية في مال القاتل لان القصاص واجب عيناً

(ولما في البدائع الصنائع ۷/۲۴۶ طبع سعيد)

واما بيان ما يسقط القصاص بعد وجوبه فالمسقط له انواع، منها فوات محل القصاص

بان مات من علیه القصاص بآفة سماوية لانه لا يتصور بقاء الشيء في غير محله واذا سقط القصاص بالموت لا تجب الدية عندنا لان القصاص هو الواجب عيناً ......وكذا اذا قتل من عليه القصاص بغير حق او بحق الردة والقصاص بان قتل انساناً فقتل به قصاصا يسقط القصاص ولا يجب المال لما قلنا.

واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اکمی

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفی اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۳۷۵

۲۱ رجب المرجب ۱۴۳۲ھ

﴿قتل خطا میں کفارہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب! کچھ دنوں پہلے میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا رات کے دس بجے میں اپنی گاڑی میں جا رہا تھا اسی رات بارش کی وجہ سے آگے سے پل ٹوٹ گیا تھا اور ایک مزدور گرے ہوئے پل کی مٹی نکال کر اس کے قریب سو رہا تھا جبکہ مجھے ان سب کے بارے میں بالکل معلوم نہ تھا چونکہ میں اسکو صحیح راستہ سمجھ کر آگے کی طرف چلا جس سے اچانک میری گاڑی اسی گھڑے میں گر گئی اور میں زخمی ہوا اسی کے ساتھ وہ مزدور بھی گاڑی کے نیچے آیا جس سے وہ مر گیا بعد میں اسکے گھر والوں سے میں نے تین لاکھ روپے کی عوض صلح کی۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ از روئے شریعت میرے ذمے کفارہ لازم ہے یا نہیں؟

مستفتی: حمزہ خان ڈیفنس فیز ۲

﴿جواب﴾ جی ہاں، آپ پر کفارہ لازم ہے کفارہ میں ایک مسلمان غلام آزاد کیا جاتا ہے لیکن آج کل چونکہ غلام نہیں ہیں تو اسکا متبادل ساٹھ دن پے در پے روزے رکھنے ہیں اسطرح کہ درمیان میں ایک روزہ بھی اگر چھوٹ جائے تو از سر نو ساٹھ روزے رکھنے ہونگے۔

لما في حاشية الطحطاوي: (۲/۲۹۳، طبع رشيدية)

(قوله ضمن الراكب في طريق العامة ما وطئت دابته الخ) قال الحاكم الشهيد في الكافي و اذا سار الرجل على دابة اىّ الدوابّ كانت في طريق المسلمين فان وطئت انسانا بيد او رجل و هي تسير فقتلته فديته على عاقلة الراكب وذالك لأنه مستعمل للدابة من مكان الى مكان و هي مجبورة على هذا الفعل من جهته فصارت جنايتها بمنزلة جنايته غير أنه خاطئ فوجبت الديّة على عاقلته والكفارة لأنه قاتل حقيقة.

ولما في الهندية: (۶/۵۰ طبع رشيدية)

و على الراكب الكفارة في الوطء لا على السائق والقائد

ولما في التنوير مع الدر: (۶/۵۷۳ طبع سعيد)

(و كفارتهما) اى الخطاء و شبه العمد (عتق قن مومن فان عجز عنه صام شهرين ولاء

ولا اطعام فيه) قال الشامیؒ (قوله ولاء)أی متتابعين .

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: علی حیدر چارسدوی

۶ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۲۳۶

﴿رائج وزن کے مطابق سونے چاندی سے قتل خطاء کی دیت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ قتل خطاء کی دیت سونے کے اعتبار سے ایک ہزار دینار اور چاندی کے اعتبار سے دس ہزار درہم ہے۔ موجودہ زمانے میں سونا اور چاندی دینار اور دراہم کی صورت میں نہیں پائے جاتے ہیں ،لہٰذا اس صورت میں دیت میں کتنا سونا یا چاندی ادا کرنا ہوگا ،مزید یہ کہ دونوں کی قیمت میں بہت زیادہ تفاوت ہے ،تو ایسی صورت میں کس اعتبار سے دیت اداء کی جائے گی ،دراہم کے اعتبار سے یا دنانیر کے اعتبار سے؟　　مستفتی: مولانا نعمت اللہ صاحب سواتی

﴿جواب﴾ قتل خطاء کی دیت میں شریعت مطہرہ نے تین مقادیر متعین فرمائے ہیں۔ سو عدد اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار دراہم کسی بھی ایک نوع سے مقررہ مقدار میں قاتل کی برادری والوں پر لازم ہوتا ہے کہ وہ مقتول کے ورثاء کو دیں ،فریقین اگر آپس میں اختلاف کریں یعنی دیت کی ادائیگی میں کسی ایک نوع پر اتفاق نہ کرسکے تو قاضی اس کا فیصلہ کرے گا موجودہ دور میں تینوں نوع کی مالیت میں کافی فرق ہے لیکن مقادیر شریعت کی جانب سے مقرر ہوتی ہیں عقل کیلئے ان میں دخل کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

دراہم ودنانیر اس دور میں بیشک نہیں ہیں لیکن اوزان الحمدللہ محفوظ ہیں مقررہ مقدار میں سونا یا چاندی ادا کرنا بھی کافی ہوجاتا ہے ،ایک درہم ۱۵ء۳ ماشہ کے برابر ہوتا ہے اور ایک تولہ میں ۱۲ ماشہ ہوتے ہیں۔ اس حساب سے دس ہزار دراہم ۲۶۲۵ تولہ چاندی کے برابر ہیں۔ اور ایک دینار ۵ء۴ ماشہ کا ہوتا ہے ،اس حساب سے ایک ہزار دینار ۳۷۵ تولہ سونا کے برابر ہوئے ،جیسا کہ حضرت مفتی محمد شفیع نے اپنے رسالہ اوزان شرعیہ میں اس کی تحقیق فرمائی ہے ملاحظہ ہو اوزان شرعیہ صفحہ نمبر: ۲۳۔

لما فی الهندية:(۶/ ۲۹، طبع قديمی)

وكل دية وجبت بنفس القتل يقضى من ثلاثة أشياء في قول أبی حنيفة: من الابل والذهب والفضة كذا في شرح الطحاوی، .قال أبوحنيفة: من الابل مائة ومن العين ألف دينار ومن

الورق عشرة آلاف وللقاتل الخيار يؤدي أي نوع شاء كذا في محيط السرخسي.

ولما في حاشية الطحطاوي:(۴/۲۷۱، طبع رشيديه)

بخلاف الخطأ فان الخيار فيها للقاتل وكلام الدر يشير الى ان الواجب احد الثلاثة وبه صرح في شرح المجمع فيكون الخيار للقاتل في دفع أيها شاء .(قوله والدية في الخطأ الخ)والخيار في هذه الانواع للقاتل لانه هو الذي يجب عليه كما في كفارة اليمين وظاهر مذهب الاصحاب ان الكل اصول واليه رجع ابوبكر الرازي وكان قبل يفتي بان الاصل هو الابل وعليه لايجوز للعاقلة ولا للقاتل ان يؤدي الدراهم مع القدرة على الابل الابرضى ولي القاتل .وكذا في البحر(ج۸/۲۸ طبع سعيد)

ولما في فتح القدير:(ج۱۰/۲۰۰ طبع رشيدية

فان للقاتل الخيار في اداء الدية من أي نوع شاء من أنواع الدية لا من غير انواعها كما صرحوا به .

ولما في الشامي :(۶/۵۷۴ طبع سعيد)

وافاد أن كل الانواع اصول وعليه اصحابنا وان التعيين بالرضاء او القضاء وعليه عمل القضاة وقيل للقاتل ذكره القهستاني .

ولما في المبسوط للسرخسي :(ج۲۶/۶۱ طبع دار المعرفة بيروت

ان للقاضي أن يقضي بالدية من الدراهم او الدنانير مؤجلا في ثلاث سنين .

ولما في الدر المختار:(ج۶/۵۷۴ طبع سعيد)المقادير توقيفية .

ولما في البدائع :(ج۲/۲۰۸ طبع دار الكتب العلمية)اذ المقادير لا تعرف الا توقيفا.

الجواب صحیح مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عمران الحق غفرلہ

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ — فتویٰ نمبر:۳۱۶۶

﴿ کفارہ قتل خطاء اور کفارہ یمین میں تداخل جائز نہیں ہے ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کفارہ قتل خطاء میں تداخل ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح میں نے کسی اردو فتاویٰ میں دیکھا تھا کہ کفارۂ یمین میں تداخل جائز نہیں یہ بات کہاں تک درست ہے وضاحت بیان فرمائیں؟ مستفتی: محمد اسماعیل کوئٹہ

﴿جواب﴾ کفارات میں عبادت وعقوبت دونوں جہت ہیں، بعض میں عبادت کا پہلو غالب، عقوبت کا پہلو مغلوب ہوتا ہے اور بعض میں عقوبت کا پہلو غالب، عبادت کا پہلو مغلوب ہوتا ہے تداخل صرف ان کفاروں میں جائز ہے جن میں عقوبت کا پہلو غالب ہو، رمضان المبارک کے روزے بلاعذر قصداً کوئی توڑدے تو کفارہ واجب ہوتا ہے چونکہ اس کفارہ

میں عقوبت کا پہلو غالب ہے اس لئے زیادہ روزے توڑنے کی صورت میں بھی صرف ایک کفارہ کافی ہوگا، لیکن قتل خطاء، شبہ خطاء، ظہار اور قسم توڑنے کی وجہ سے جو کفارہ لازم ہوتا ہے اس میں عبادت کا پہلو غالب ہے اور ایسے کفاروں میں تداخل جائز نہیں ہے، کئی قسم توڑے ہوں تو ہر ایک قسم کے لئے مستقل کفارہ ادا کرنا لازم ہے اسی طرح قتل خطاء یا شبہ خطاء زیادہ کئے ہوں تو ہر ایک کے لئے مستقل کفارہ ضروری ہے۔

لما فی بدائع الصنائع:(۹۹/۵ طبع سعید کراچی)

فالكفارتان الواجبتان لا يخلو (اما) ان وجبتا بسببين من جنسين مختلفين واما ان وجبتا بسببين من جنس واحد فان وجبتا بسببين من جنسين مختلفين كالقتل والظهار فاعتق رقبة واحدة ينوي عنهما جميعا لا يجوز عن احداهما بلا خلاف بين اصحابنا وعند الشافعي رحمه الله تعالى يجوز وان وجبتا بسببين من جنس واحد كظهارين او قتلين يجوز عن احداهما عند اصحابنا الثلاثة رحمهم الله استحسانا وهو قول الشافعي رحمه الله تعالى والقياس ان لا يجوز وهو قول زفر رحمه الله.

ولما فی اصول السرخسی:(۲۷۲/۲ طبع:قدیمی)

وكان معنى العبادة في هذه الكفارات مرجحا على معنى العقوبة كما اشرنا اليه.

• ولما فی کشف الاسرار شرح اصول بزدوی:(۲۶۶/۲ طبع:قدیمی)

(قلنا بتداخل الكفارات في الفطر) حتى لو افطر مرارا في رمضان واحد من غير تكفير لم يلزمه الا كفارة واحدة — وعند الشافعي رحمه الله تعالى يجب لكل فطر كفارة على حدة كما اذا ظاهر مرارا او قتل انسانا خطأ لان التداخل من خصائص العقوبات المحضة وهذه ليست بعقوبة محضة بل هي عبادة فلا يمكن الحاقها بالمحض عقوبة، ونحن نقول لما اختصت هذه الكفارة من بين سائر الكفارات في اسقاطها بالشبهة لترجح معنى العقوبة فيها دل ذلك على ان السبيل الدرء فيها والتداخل من باب الدرء كما في الحدود.

وفيه ايضا ۲۵۱/۲ ـــــ

ولهذا تعددت الكفارة بتعدد الافعال مع اتحاد المحل ـــــ (وكذلك الكفارات) اي ومثل كفارة القتل وسائر الكفارات في ان جهة العبادة فيها راجحة.

ولما فی الدر المختار:(۷۱۲/۳، طبع، سعید)

وفي البحر عن الخلاصة والتجريد وتتعدد الكفارة لتعدد اليمين والمجلس والمجالس سواء

وفی تقریرات الرافعی علی الشامی:(۱۲/۳ طبع سعید)

لا يخفى ان كلا من المنية والبغية للزاهدي ومعلوم ان ما انفرد به لا يعول عليه فلا يعتمد على القول بالتداخل بل يعتمد على ما ذكره غيره من عدم التداخل، حتى يوجد تصحيح لخلافه ممن يعتمد عليه في نقله اه

وممـا يدل لتعددها ما ذكر في الفتح اول العدود لأن كفارة الافطار المغلب فيها جهة العقوبة حتى تداخلت، ولأن كفارة الأيمان المغلب فيها جهة العبادة اهـ فعلم ان التعدد هو ظاهر الرواية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ ۔ واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۵ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ ۔ فتوی نمبر: ۳۷۶۴

﴿ایک ولی کے معاف کرنے سے قصاص کا حق ساقط ہوجاتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک لڑکے نے اپنے چچازاد بھائی کو عمداً قتل کردیا اس کے بعد وہ فرار ہوگیا آٹھ سال بعد چچا اور اس کے دو بیٹوں نے اہل علاقہ کے سامنے قاتل کو معاف کردیا لیکن مقتول کا ایک بھائی اب بھی بدلہ لینے پر مصر ہے، عرض مسئلہ یہ ہے کہ جب ورثا میں سے چند قاتل کو معاف کردیں تو کیا پھر بھی کسی کو بدلہ لینے کی اجازت ہے؟

مستفتی: عرفان اللہ پشاور

﴿جواب﴾ جب مقتول کے اولیاء نے قاتل کو معاف کردیا تو قصاص کا حق ساقط ہوگیا اب دوبارہ مقتول کے اولیاء کو قصاص لینے کا حق نہیں ہے اسی طرح اگر ایک ولی بھی قاتل کو معاف کردے تو باقی تمام ورثاء کا حق قصاص ساقط ہوجاتا ہے، لہذا صورت مسؤلہ میں بھائی کو اب بدلہ لینے کا حق باقی نہ رہا۔

لما في احكام القرآن للجصاص: (۱/۲۱۲، طبع رشيديه)

وروى عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ العمد قود الا ان يعفو ولى المقتول

ولما في بدائع الصنائع: (۱/۲۸۳، طبع بيروت)

واما بيان ما يسقط القصاص بعد وجوبه فالمسقط له انواع ـ ومنها العفو ـ هذا اذا كان الولى واحداً فاما اذا كان اثنين او اكثر فعفا احدهما سقط القصاص عن القاتل لانه سقط نصيب العافى بالعفو فيسقط نصيب الاخر ضرورة انه لا يتجزأ اذا القصاص قصاص واحد فلا يتصور استيفاء بعضه دون بعض.

ولما في الهنديه: (۶/۲۰، باب السادس في الصلح والعفو، طبع رشيديه)

ومن عفا من ورثة المقتول عن القصاص رجل او امرأة او ام أو جدة أو من سواهن من النساء أو كان المقتول امرأة فعفا زوجها عن القاتل فلا سبيل الى القصاص كذا في السراج الوهاج.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ ۔ واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۱۲ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ ۔ فتوی نمبر: ۳۷۸۳

﴿دورے کی حالت میں اوپر رضائی ڈال کر سانس بند ہونے سے مرگیا تو۔۔۔؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص مرگی کی وجہ سے بے ہوش ہوکر زمین پر گر جاتا تھا اس کی بیوی۔ نے تنگ آکر بارادہ قتل تین چار بڑی رضائیاں اس پر ڈال دی تا کہ اسکا سانس بند ہوکر مرجائے اور مجھے اس سے چھٹکارا حاصل ہوجائے چنانچہ کچھ دیر کے بعد وہ شخص (زوج) رضائیوں کے تلے سانس گھٹنے کی وجہ سے مرگیا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ شریعت مطہرہ کی رو سے عورت پر کیا کفارہ لازم آئیگا، براہ کرم جواب عنایت فرمائیں۔

مستفتی: توحید احمد ضلع شانگلہ

﴿جواب﴾ اس ظالم بیوی نے اپنے شوہر کو قصداً قتل کر کے بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے قرآن کریم میں کسی بھی مومن کو قصداً قتل کرنے کی سزا ہمیشہ کیلئے جہنم کی آگ بتائی گئی ہے لیکن رضائیاں اوپر ڈالنے سے عموماً کوئی مرتا نہیں اس لئے اس کو قتل عمد کے درجہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کو شبہ عمد قرار دے رہے ہیں جس کا حکم یہ ہے کہ قاتل (زوجہ) پر کفارہ یعنی مسلسل دو مہینے کی روزے لازم ہوتے ہیں اور اس کے برادری کے لوگوں پر دیت ادا کرنا واجب ہوتا ہے، اور اپنے مورث کو اگر قتل کیا ہے جس طرح کی مذکورہ صورت میں ہے کہ بیوی نے اپنے شوہر کو قتل کیا تو مقتول کی وراثت میں قاتلہ (زوجہ) کو کچھ بھی حصہ نہیں ملتا، لہذا اب یہ عورت شوہر کی وراثت میں کچھ بھی حصہ نہیں لے سکتی۔

لمافی الدر: ۵۲۹/۶ و ۵۳۰ (طبع سعید)

(و) الثانی (شبه العمد) وهو أن یتعمد ضربه بغیر ماذکر أی بما لا یفرق لأجزاء ولو بحجر کبیر بن عنده خلافا لغیره وموجبه ألاثم والکفارة ودیة مغلظة علی العاقلة لاالقود لشبهه بالخطاء نظر الآلته الا أن یتکرر منه فللامام قتله سیاسة اختیار وهو أی شبه العمد

ولمافی فتاوی ابی اللیث السمرقندی: ۱۸۶۲/۴ (طبع مکتبه محمدیه)

(قال ابوحنیفه) القتل بالمثقل والخنق والتغریق والالقاء من شاهق الجبل لایوجب القصاص

ولمافی الدر مع الرد: ۵۲۳/۶ (طبع سعید)

وفی المجتبی: ضرب بسیف فی غمده فخرق السیف الغمد وقتله فلاقود عند ابی حنیفة (کالخنق والتغریق) ـــــــ وفی الشامیة: وهذا اذالم یقصد ضربه بالسیف لم یکن عمدا وان حصل القتل به

ولما فی الهندیہ ج ۶ / ص ۱ (سعید)

وموجبه علی القولین الاثم والکفارة وکفارته تحریر رقبة مؤمنة فان لم فصیام شهرین متتابعین ودية مغلظة علی العاقلة کذا فی الکافی

ولما فی السراجی: ص ۵ (طبع قدیمی)

المانع من الارث اربعة الرق والقتل اوکان أوناقصا والقتل الذی یتعلق به وجوب القصاص اوالکفارة واختلاف الدینین واختلاف الدارین

ولما فی الهدایة: ۴/ ۵۵۵ (طبع رحمانیة)

قال وموجب (أی شبه العمد) ذلک علی القولین والکفارة والدیة مغلظة علی العاقلة ویتعلق به حرمان المیراث.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فضل حق زیزاروی

۲۸ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۶۴

﴿چوری کی تلافی کیلئے وہی چیز یا اسکی قیمت واپس کرنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کچھ عرصہ قبل کسی آدمی نے ایک بکری چوری کی تھی اور اس کے ساتھ ایک اور ساتھی بھی شریک تھا، اب وہ دونوں اپنے اس فعل پر نادم ہیں اور اپنے اس جرم کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ شریعت مطہرہ میں ان کیلئے کیا حکم ہے؟ اور تلافئی جرم کا طریقہ کیا ہوگا؟ وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ چوری بڑا جرم ہے شرعی عدالت میں ثابت ہونے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے، بدقسمتی سے اس وقت شرعی عدالت نہیں ہے، لیکن قیامت کا دن تو آنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ کو اس غلطی کا احساس ہوگیا ہے جسکی تلافی کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ آپ بکری مالک کو واپس کردیں اور بکری اگر زندہ نہیں ہے تو اس جیسی بکری کی قیمت کسی طرح مالک کو دیدیں اور اپنا جرم ظاہر کرنا ضروری نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور آئندہ ایسا جرم نہ کرنے کا عزم کریں۔

لما فی الشامی: ۶/ ۱۵۳ (طبع ایچ ایم سعید)

وجوب رد عین المسروق علی صاحبه اذا کان قائما بعینه وجملة الکلام فیه ان المسروق فی ید السارق لایخلو اما ان کان علی حاله لم یتغیر واما ان احدث السارق فیه حدثا فان کان علی حاله رده علی المالک لما روی عن النبی ﷺ قال" من وجد

عين ماله فهو احق به" ـحتیٰ لو هلک في يده بنفسه ،أو استهلکه السارق يضمن،لان المانع من الضمان هو القطع،فاذاسقط القطع ،زال المانع فيضمن۔

لمافي الجوهرة النيرة:۲۲۲/۲(مير محمد كتب خانه)

(اذاقطع السارق والعين قائمة في يده ردت علىٰ صاحبها)وكذا اذا كان السارق قد باعهااو وهبها او تزوج عليها وهي قائمة في يدمن هي في يده فانها ترد الى صاحبها لانها على ملكه وتصرف السارق فيها باطل(وان كانت هالكة لم يضمنها)وكذا اذاكانت مستهلكة في المشهور لأنه لايجمع الضمان والقطع عندناوعند ابی حنيفة يضمن بالاستهلاك وقال الشافعي يضمن في الوجهين۔

لمافي الشامي:۱۱۰/۴(طبع ايچ ايم سعيد)

(وترد العين لو قائمة)وان باعها أو وهبها لبقائهاعلى ملک مالكها (ولافرق)في عدم الضمان(بين هلاك العين واستهلاكها في الظاهر) لكنه يفتى بأداء قيمتها ديانة بوسواء كان الاستهلاك (قبل القطع اوبعده)مجتبى،وفيه لواستهلكه المشترى منه أو الموهوب له فللمالك تضمينه(ولو قطع لبعض السرقات لم يضمن شيأ)وقالا يضمن مالم يقطع فيه ـقال في الفتح ولأن وجوب الضمان ينافی القطع لأنه يتملكه بأداء الضمان مستندا الى وقت الاخذ۔

الجواب صحيح :مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۶ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر:۳۹۱۲

﴿مرتد سے متعلق شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کے مرتد ہونے کی وجہ سے اس کے نکاح پر کیا اثر پڑتا ہے؟اور زندگی میں اس کے رشتہ دار واُحباب اور عام لوگ اس کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کریں،اسی طرح مرنے کے بعد بھی؟ مستفتی:ایک متعلم

﴿جواب﴾ مرتد کا نکاح طلاق دیئے بغیر فسخ ہو جاتا ہے،اور اسکی بیوی عدت گزارنے کے بعد کسی اور جگہ نکاح کرسکتی ہے۔اور اس کے رشتہ دار واحباب کو چاہیے کہ اس کو نصیحت کریں،اگر وہ نہیں مانتا اور اپنے ارتداد پر ڈٹا رہتا ہے،تو اس کے ساتھ قطع تعلق کریں۔دوستانہ تعلقات اسکے ساتھ قائم رکھنا جائز نہیں حرام ہے۔اور جب وہ مرجائے تو غسل اور کفن دیئے بغیر مسلمانوں کے قبرستان کے علاوہ کسی گڑھے میں ڈال کر دفن کیا جائے۔

لما في التنوير مع الدر:۱۹۲،۱۹۳/۴ طبع سعید

(وارتداد احدهما)أى الزوجين (فسخ)ــ(عاجل)بلا قضاء .وفي الشامي تحته:(قوله

بلا قضاء) اى بلا توقف على قضاء القاضى وكذا بلا توقف على مضى عدة فى المدخول بها كما فى البحر.

ولما فى التنوير: ۴/۲۵۲، ايضاً

أخبرت بارتداد زوجها فلها التزوج بآخر بعد العدة استحساناً.

ولما فى احكام القرآن للجصاص: ۴/۲۲۳، سورة هود طبع قديمى

قوله تعالى: "ولا تركنو الى الذين ظلموا فتمسكم النار" والركون الى الشىء هو السكون اليه بالأنس والمحبة فاقتضى ذالك النهى عن مجالسة الظالمين مؤانستهم والانصات اليهم وهو مثل قوله تعالىٰ: "فلاتقعد بعد الذكرى مع القوم الظالمين".

ولما فى تفسير للقرطبى: ۹/۱۲، سورة سود آيت ۱۱۳ طبع رشيديه

وانها دالة على هجران اهل الكفر والمعاصى من اهل البدع وغيرهم، فان صحبتهم كفر أو معصية، اذالصحبة لا تكون الا عن مودة.

ولما فى حلبى كبيرى: ص ۶۰۲ طبع: سهيل اكيڈمى

واما لو كان مرتدا يلقيه فى حفرة كالكلب دفعاً لاذى جيفة عن الناس من غير غسل ولا تكفين ولا يدفعه الى أهل الدين الذى انتقل اليه. "كذا فى الشامى ۲/۲۳۰"

ولما فى المرقاة المفاتيح: ۱/۲۸۶ طبع: رشيديه

وعن عمرؓ قال: "قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تجالسوا اهل القدر" اى لا توادوهم ولا تحابوهم فان المجالستونحو ها من المماشاة من علامات المحبة وامارات المودة، فالمعنى: لا تجالسو هم مجالسة تأنيس وتعظيم لهم لانهم اما ان يدعوكم الى بدعتهم بما زينه لهم شيطانهم من الحجج الموهمة والادلة المزخرفة التى تجلب من لم يتمكن فى العلوم والمعارف اليهم ببادى الرأى، واما ان يعود عليكم من نقصهم وسوء عملهم ما يؤثر فى قلوبكم واعمالكم اذ مجالسة الاغيار تجر الى غاية البوار ونهاية الخسار.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۸ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۶۶۴

﴿سرکار دو عالم ﷺ کی شان میں نازیبا الفاظ بولنے سے نکاح ختم ہو جاتا ہے﴾

﴿سوال﴾ جناب حضرت مفتی صاحب میں ندی محمد سلیم بحمداللہ عالمہ ہوں اور دیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، میری شادی کو گیارہ ماہ گزر چکے ہیں، اب میں اپنی مرضی سے اس ازدواجی رشتے کو مزید طول نہیں دینا چاہتی ہوں۔ میرے شوہر سخت مزاج تھے اور ان کا رویہ اور سلوک میرے ساتھ اچھا نہیں رہا، غصے میں کئی مرتبہ مجھے طلاق کی دھمکیاں دیتے رہتے اور اس طرح کی باتیں کہتے "جاؤ تم میری طرف سے آزاد ہو جیسے رہنا ہے رہو" اس روز کی چک چک

سے میں تنگ آ گیا ہوں آج تو اس قصے کو ختم کر دو اپنے گھر جاؤ آج ہی تمہیں فارغ کر دیتا ہوں'' اور ایک مرتبہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ الفاظ کہے ''اگر اس بار دوائیاں جو تم ڈاکٹر سے لائی ہو کھانے کے بعد بچہ نہ دیا تو تمہیں طلاق دے دوں گا'' وغیرہ۔ اگر چہ پہلی بات کے بعد رجوع ہو گیا تھا (جاؤ تم میری طرف سے آزاد ہو) اسکے علاوہ یوں کہنا ''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ قرآن، حدیث، نبی، خدا اور رسول سب بکواسیت ہے (نعوذ باللہ) مجھے تو کوئی فائدہ نہیں ہوا پریشانی ہی ملی کاروبار اور گھر کے مسائل کے لحاظ سے اور گالی بھی دی'' اور ''لعنت ہے تمہارے عالمہ ہونے پر''۔ ان سب کے علاوہ مارنا پیٹنا، گالی گلوچ، بدزبانی بدگمانی، برا سلوک اور گھر والوں کے سامنے میری آبروریزی بھی کرتے رہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ فتوی دیں کہ آیا میں ان باتوں کے بعد بھی سلمان فاروقی کی بیوی مانی جاؤں گی؟ اور شریعت میرے حق میں کیا فیصلہ کرتی ہے؟ جبکہ میں بذات خود اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہوں، عنایت ہوگی۔ مستفتیہ: ندی محمد سلیم

﴿جواب﴾ آپ کا شوہر سلمان فاروقی واقعی ایسا گستاخ اور منہ پھٹ اگر ہے کہ اپنے رب اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی نازیبا زبان استعمال کرتا ہے تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو گیا ہے، اور اب وہ آپکا شوہر بھی نہیں رہا، مذکورہ الفاظ کفریہ جملہ ہے، اس طرح بولنے والا ایماندار اور مسلمان شمار نہیں ہوتا، اور اس سے نکاح بھی فسخ ہو جاتا ہے۔ لہذا شرعاً اب آپ دونوں کا نکاح باقی نہ رہا، وہ اس طرح گستاخانہ الفاظ بولنے سے اگر انکار نہیں کرتا تو آپکی عدت اس روز سے شروع ہے جس روز اس نے یہ گندہ جملہ بولدیا تھا، اور اگر انکار کرتا ہے اور ثبوت کیلئے آپکے پاس گواہ نہیں ہے لیکن آپ نے واقعی خود ہی اس کو بولتے ہوئے سنا ہے تب بھی آپ کے لئے اسکے ساتھ بیوی کی طرح رہنا جائز نہیں ہے، کسی طرح اس شخص سے خلع وغیرہ کے ذریعہ خلاصی حاصل کریں اور عدت گزار کر دوسری جگہ کسی نیک وصالح سے شادی کرلیں۔

لما فی الهندية: ۲/۲۸۰،۲۸۸ طبع قدیمی کتب خانه

يكفر اذا وصف الله تعالى بما لا يليق به أو سخر باسم من أسمائه أو بامر من أوامره. اذا أنكر الرجل آية من القرآن أو تسخر بآية من القرآن وفي الخزانة أو عاب كفر كذا في التاتارخانيه.

ولما في شرح فقه الأكبر: ۲۷۸،۲۸۸ طبع: دار الكتب العلمية بيروت

من استخف بالقرآن أو بالمسجد أو بنحوه مما يعظم في الشرع كفر.

ولو قالت اللعنة ،أولعنة الله على الزوج العالم كفرت،أى لأنها لعنت نعت العلم واهانت الشريعة ومن قال لعالم :عويلم اولعلوى عليوى ،أو بصيغة التصغير فيهماللتحقير كماقيده بقوله قاصدابه الاستخفاف كفر.

ولمافى الهنديه :۲/۲۶۵،طبع سعيد

ولوقال لشعرالنبى ﷺ:شعيريكفر عندبعضهم وعندالمتأخرين لاالااذاقال بطريق الاهانة.

ولمافى التنويرمع الدر:۱۹۳/۳،۱۹۴ طبع سعيد كراچى

(وارتداداحدهما)اى الزوجين (فسخ)فلاينتقص عدد(عاجل)بلاقضاء وفى الشاميه تحت(قوله بلاقضاء)اى بلاتوقف

على قضاء القاضى وكذابلاتوقف على مضى مدة فى المدخول بها.

ولمافى التنويرمع الدر:۲/۲۵۲،طبع:سعيد

أخبرت بارتدادزوجهافلهاالتزوج بآخربعدالعدة استحساناً.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۱۴جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۳۷۸۷

﴿عورت مرتد ہو جائے تو قتل نہیں کیا جائے گا﴾

﴿سوال﴾ کیا کوئی عورت اگر (نعوذ باللہ) مرتد ہو جائے تو اسے قتل کیا جائے گا؟

﴿جواب﴾ عورت اگر (نعوذ باللہ) مرتد ہو جائے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے قید کیا جائے گا اور مارا جائے گا۔

لمافى التنويرمع الدر:(۴/۲۲۵،طبع سعيد)

(و)اعلم أن (كل مسلم ارتدفانه يقتل ان لم يتب الا) جماعة (المرأة والخنثى ،ومن اسلامه تبعا ،والصبى اذااسلم والمكره على الاسلام ومن ثبت اسلامه بشهادة رجلين ثم رجعا)

وفى الشامية:(قوله المرأة)يستثنى منهاالمرتدة بالسحركمامروهوالأصح كمافى البحرالرائق.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم:شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۷ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:۸۹

﴿کسی کے حکم پر قتل کرنے سے دیت واجب ہوگی؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص نے دوسرے کو حکم دیا کہ اس بندوق سے مجھے مارو، اس نے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گولی چلائی اور وہ مر گیا،

کیا اب اس شخص کو شرعاً قصاصاً قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ مستفتی: سید احمد

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں قاتل شخص (جس نے دوسرے کے حکم سے گولی چلائی) پر شرعاً قصاص نہیں، البتہ اس پر دیت آئے گی جو اس کے مال سے ادا کی جائے گی اور قتل کرنے والا شخص سخت گنہگار ہوگا اس پر توبہ اور استغفار بھی لازم ہے۔

لمافی التنویر مع الدر: (۱۰/۱۹۳، طبع امدادیہ)

(ولو قال اقتلني فقتله) بسيف (فلا قصاص وتجب الدية) في ماله في الصحيح، لان الاباحة لاتجري في النفس وسقط القود لشبهة الاذن، وكذا لو قال اقتل أخي أو ابني أو أبي فتلزم الدية استحساناً كما في البزازية عن الكفاية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۰ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۴۳۶

﴿بیوی کو حالت زنا میں دیکھ کر قتل کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ عین حالت زنا میں کسی کو دیکھ لے تو شوہر کے لیے قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہو تو دونوں کا یا کسی ایک کا؟ جواب دیکر ممنون فرمائیں۔ سائل: محمد حلیم بگرامی

﴿جواب﴾ اگر بیوی زنا پر راضی تھی تو دونوں کا قتل کرنا جائز ہے ورنہ صرف زانی کا قتل کرنا جائز ہے اور اس کا خون معاف ہے، قصاص لازم نہیں ہوگا، یہ اس صورت میں ہے کہ عین حالت زنا میں دیکھ لے اگر ابھی زنا میں مبتلا نہیں ہوئے تو ان کو ڈرا کر روکا جائے اگر باز نہ آئے تو ان کا قتل جائز ہے، عنداللہ ماخوذ نہیں ہوگا۔

لمافی التنویر مع الدر: (۶/۵۱۰، طبع ایچ ایم سعید کمپنی)

(دخل رجل بيته فرأى رجلا مع امرأته اوجاريته فقتله حل) له (ذلك (ولا قصاص) عليه.

وفي الشامية: (قوله حل له) قيده في الخانية بما اذا كان محصنا وبما اذا صاح فلم يمتنع عن الزنا وفي القيد الاول كلام فقد رده ابن وهبان بأن ذلك ليس من الحد بل من الامر بالمعروف والنهي عن المنكر قال في النهر وهو حسن فان هذا المنكر حيث تعين القتل طريقا في ازالته فلا معنى لاشتراط الاحصان فيه ولذا اطلقه البزازي اهـ.

ولما في الشامي: (۴/۶۲ طبع سعید)

لو رأى في منزله رجلا مع اهله اوجاره يفجر خاف ان اخذه يقهره فهو في سعة من قتله

ولو كانت مطاوعة له فقتلهما فهذا صريح في ان الفرق من حيث رؤية الزنا وعدمها فتأمل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم: عبدالوہاب عفا اللہ عنہ

۲۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ   فتویٰ نمبر: ۲۰۷

﴿بیوی کو حالت زنا میں دیکھ کر زانی کے ساتھ قتل کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کسی کے سامنے اسکا بیٹا قتل کیا جائے اور جواباً باپ قاتل کو قتل کر دے یا کسی کے سامنے اسکی بیوی سے زنا کیا جا رہا تھا کہ اس نے زانی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تو کیا اس طرح کرنے پر عنداللہ اسکا مؤاخذہ ہوگا یا نہیں؟

یہ تو معلوم ہے کہ ہمارے معاشرے میں ظالم بھی اپنے کو مظلوم دکھا کر ظلم کیلئے جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے عدالتی کاروائی الگ بات ہے لیکن اللہ کے ہاں یہ شخص مجرم ہوگا یا نہیں؟ ایک فتاوی میں ایسے شخص کے قتل کو جائز اور اس قتل پر عنداللہ عدم مؤاخذہ کا جواب دیا گیا ہے، ایک مولوی صاحب کو اس پر اشکال ہو رہا ہے کہ بظاہر یہ فتویٰ مسلم کی روایت باب اللعان: (۱/ ۴۸۸) سے معارض ہے۔   مستفتی: عرباض شمس

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں مقتول بیٹے کا ولی باپ قصاص لینے کا حق رکھتا ہے اگر چہ قصاص لینا شرعاً حکومت کا کام ہے، اس لئے مقتول کے اولیاء کو چاہیے تھا کہ وہ اسے قانونی راستے سے وصول کر لیتے لیکن چونکہ ارتکاب معصیت کے وقت باپ کو قاتل کے قتل کرنے کا حق حاصل تھا، اس لئے جب اس نے از خود اپنا حق قصاص وصول کر لیا ہے تو اس سے قصاص وصول ہو گیا اور شرعاً اس قاتل یعنی ولی پر قصاص یا دیت وغیرہ کچھ واجب نہ ہوگی بشرطیکہ عدالت میں وہ اپنا یہ حق ثابت کر دے۔

لما في مشكوٰة المصابيح: (ص ۳۰۶ طبع سعيد)

وعن سعيد ابن زيد أن رسول الله ﷺ قال من قتل دون دينه فهو شهيد ومن قتل دون دمه فهو شهيد ومن قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد رواه الترمذي)

ولما في مرقاة المفاتيح: (۷/ ۸۲-۸۲ طبع رشيديه)

وعن سعيد ابن زيد احد العشرة المبشرة أن رسول الله ﷺ قال: (من قتل) بصيغة المجهول (دون دينه) اى قدام دينه ..... (ومن قتل دون اهله) اى عند محافظة محارمه (فهو شهيد) قال ابن الملك وعامة العلماء: على ان الرجل اذا قصد ماله اودمه اواهله

فله دفع القاصد بالاحسن فان لم يمتنع الا بالمقاتلة فقتله فلا شئ عليه (رواه الترمذی وابوداؤد والنسائی)

ولما فی بدائع الصنائع: (۷/ ۲۳۶، طبع سعید)

وله ان يقتل بنفسه وبنائبه بأن يأمر غيره بالقتل لأن كل أحد لا يقدر على الاستيفاء بنفسه اما لضعف بدنه او لضعف قلبه او لقلة هدايته اليه فيحتاج الى الانابة الا أنه لابد من حضوره عند الاستيفاء لما ذكرنا فيما تقدم ثم اذا قتله المامور والآمر حاضر صار مستوفيا ولا ضمان عليه فأما اذا قتله والآمر غير حاضر وانكر ولى هذا القتيل الامر فانه يجب القصاص على القاتل ولا يعتبر تصديق الولى لان القتل عمدا سبب لوجوب القصاص فى الاصل.

ولما فی الهندية: (۶/ ۷، طبع رشیدیہ)

ويستحق القصاص من يستحق ميراثه على فرائض الله تعالى فيدخل فيه الزوج والزوجة..... وليس لهم ولا لاحدهم ان يؤكل باستيفاء القصاص كذا فى فتاوى قاضى خان ---- واذا قتل الرجل عمدا وله ولى واحد فله أن يقتله قصاصا قضى القاضى أو لم يقض..... الخ وهكذا فى المبسوط للسرخسى: (۲۶/ ۱۲۲، طبع دارالکتب العلمیة)

اسی طرح شوہر کے سامنے اگر واقعۃً اسکی بیوی سے زنا کیا جارہا ہو تو شوہر کو دیانۃً یہ حق حاصل ہے کہ زانی کو قتل کر دے اور اسکی بیوی بھی اگر زنا کرنے پر راضی تھی تو اس صورت میں شوہر کے لئے دونوں کا قتل کرنا جائز ہے کیونکہ ارتکاب معصیت کے دوران شوہر کو یہ حق حاصل ہے۔

البتہ اگر معاملہ عدالت تک جائے تو قاتل کو ساری حقیقت شرعی گواہوں سے ثابت کرنی ہوگی ورنہ عدالت قاتل کو سزا بھی دے سکتی ہے لیکن عنداللہ یہ شخص قتل کا مجرم نہ ہوگا۔

ولما فی سنن ابن ماجة: (ص ۱۹۰، طبع قدیمی)

"قال فذكر ذلك للنبى ﷺ فقال كفى بالسيف شاهدا ثم قال لا انى اخاف ان يتتابع فى ذلك السكران والغيران.

علامہ نوویؒ "صحیح مسلم" کے حاشیہ (۱/ ۴۸۸، طبع قدیمی) میں باب اللعان کی پہلی حدیث کے تحت بیان فرماتے ہیں:

"وأما بينه وبين الله فان كان صادقا فلا شئ عليه".

کہ اس طرح کرنے میں اللہ کے ہاں ایسے شخص کا مواخذہ نہیں ہوگا، یہی مضمون تکملہ فتح الملہم: (۱/ ۲۵۷، طبع دارالعلوم کراچی) پر بھی ملاحظہ ہوں:

واما بينه وبين الله فيسع له قتل الرجل ان كان ثيبا وعلم أنه نال منها ما يوجب الغسل صرح به الحافظ والنووى والشامى.

علامہ شامیؒ اس مسئلے پر طویل بحث فرماتے ہیں کہ کوئی شخص بیوی سے زنا کرتے ہوئے کسی کو دیکھ لے تو اس کے لئے گنجائش ہے کہ اس کو ماردے عنداللہ اس کا مواخذہ نہ ہوگا۔

لما فی التنویر مع الدر:(۶۲/۴-۶۳ طبع سعید)

(ویکون)التعزیر(بالقتل کمن)وجد رجلا مع امرأة لاتحل له.

وفی الشامیة:(قوله مع امرأة)ظاهره ان المراد الخلوة بها وان لم یر منه لعلا لبیحا کما یدل علیه مایأتی عن منیة المفتی کماتعرفه.....(قوله بمافی البزازیة وغیرها)ای کالخانیة،ففیها:لورأی رجلا یزنی بامرأته اوامرأة آخر وهو محصن فصاح به فلم یهرب ولم یمتنع عن الزنیٰ حل له قتله ولاقصاص علیه اه.— قلت:وقدظهرلی فی التوفیق وجه آخر،وهوان الشرط المذکورانماهوفیمااذاوجد رجلا مع امرأة لاتحل له قبل ان یزنی بهافهذالایحل قتله اذاعلم انه ینزجر بغیر القتل سواء کانت اجنبیة عن الواجداوزوجة له اومحرما منه.أمااذاوجده یزنی بهافله قتله مطلقا.

علامہ تمر تاشیؒ اسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ارتکاب معصیت کے وقت دیکھنے والے کے لئے ملوث شخص کا قتل کرنا جائز ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(۶۳/۴،طبع سعید)

الاصل ان کل شخص رأی مسلما یزنی یحل له ان یقتله.

وفی الشامیة:(قوله والاعونة)کأنه جمع معین اوعوان بمعناه والمراد به الساعی الی الحکام بالافساد— وفی رسالة أحکام السیاسة عن جمع النسفی:سئل شیخ الاسلام عن قتل الاعونة والظلمة والسعاة فی ایام الفترة:قال یباح قتلهم لأنهم ساعون فی الارض بالفساد— قال سألنا الشیخ أباشجاع عنه،فقال:یباح قتله ویثاب قاتله اه.

یہی مضمون فتاویٰ عالمگیریہ، بحر الرائق، الفقہ الاسلامی میں مذکور ہے کہ معصیت کے وقت دیکھنے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ مرتکب کو قتل کردے۔

ولمافی العالمکیریة:(۱۶۷/۲،طبع رشیدیه)

قالواالکل مسلم اقامة التعزیرحال مباشرة المعصیة ولمابعدالمباشرة فلیس ذلک لغیرالحاکم.

ولمافی البحرالرائق:(۴۱/۵-۴۲،باب التعزیر،طبع سعید)

وقدذکرواالتعزیربالقتل قال فی التبیین وسئل الهندوانی عن رجل— وذکربقیة العبارة کعبارة الشامیة والهندیة.....الی قوله ولم یذکرالمصنف من یقیمه قالواالکل مسلم اقامته حال مباشرة المعصیة وأمابعدالفراغ منهافلیس ذلک لغیر الحاکم.....الخ.

ولمافی الفقه الاسلامی وادلته:(۵۶۱۶/۷-۵۶۱۷،طبع رشیدیه)

ویری الشافعیة انه یمکن انقسام القتل الی الاحکام الخمسة:واجب وحرام ومکروه

ومندوب ومباح فالقتل الواجب:هوقتل المرتداذالم يتب،والحربي اذالم يسلم أولم يعط الجزية..... والمباح:هوقتل المقتص منه اوقتل الامام الأسير،لانه مخيرفي قتله حسبمايرى من المصلحة،ومنه القتل دفاعاعن النفس ضمن ضوابط الدفاع الشرعي،وعدالحنفية ما يأتي من القتل المباح ،فقالوا:لودخل رجل بيته فرأى رجلامع امرأته اومحرمه يزني بهافقتله ،حل له ذلك ولاقصاص عليه،وهورأى الحنابلة والشافعية والمالكية ايضاواذاكان الزنى طواعية باختيارمنهماكان له عندالحنفية والحنابلة قتلهما جميعا.....الخ.

علامہ شامیؒ اس مسئلے پر تفصیلی بحث فرمانے کے بعد آخر میں فیصلہ بیان فرماتے ہیں کہ شوہر کے لئے عین حالت زنا میں انکا قتل کرنا دیانۃً جائز ہے یعنی عنداللہ اس قتل پر اس کا مواخذہ نہیں ہوگا، البتہ معاملہ عدالت جانے کی صورت میں بغیر شرعی گواہوں کے دنیاوی سزا سے خلاصی نہ ہوگی بلکہ شرعی گواہوں کے ذریعے ساری حقیقت ثابت کرنی ہوگی لیکن یہ تو انتظامی مجبوری ہے، اس لئے کہ ظالم بھی اپنے کو مظلوم ظاہر کرسکتا ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے۔

"وحاصله انه يحل ديانة لاقضاء فلايصدقه القاضي الابينة"(الشامي:۲/۶۴،طبع سعيد)

مولوی صاحب کا اشکال کہ مذکورہ حکم اور باب اللعان میں تعارض ہے اسکا جواب یہ ہے کہ مسلم کی حدیث (۱/۴۸۸، باب اللعان، طبع قدیمی) میں جو قصہ مذکور ہے وہ اجمالی ہے، تفصیلی قصہ سنن ابن ماجہ کی روایت میں موجود ہے جس میں آپ ﷺ کے یہ الفاظ بھی مذکور ہیں کہ

" قال فذكرذلك للنبي صلى الله عليه وسلم فقال كفىٰ بالسيف شاهداً ثم قال:لااني أخاف ان يتتابع في ذلك السكران والغيران "(سنن ابن ماجة ص۱۹۰،طبع قديمي)

لمافي صحيح المسلم:(۱/۴۸۸،كتاب اللعان،طبع قديمي)

عن ابن شهاب ان سهل بن سعدالساعدي أخبره أن عويمرالعجلاني جاء الى عاصم بن عدي الانصاري فقال له ارأيت ياعاصم لوان رجلاوجدمع امرأته رجلاأيقتله فتقتلونه ام كيف يفعل فسئل لي عن ذالك ياعاصم رسول الله صلى الله عليه وسلم فسال عاصم رسول الله صلى الله عليه وسلم فكره رسول الله ﷺ المسائل وعابهاحتى كبرعلى عاصم ماسمع من رسول الله صلى الله عليه وسلم فلمارجع عاصم الى اهله جاء ه عويمرفقال ياعاصم ماذاقال لك رسول الله ﷺ قال عاصم لعويمرلم تأتني بخيرقدكره رسول الله ﷺ المسئلة التي سألته عنهاقال عويمروالله لا انتهي حتى أسأله عنهافاقبل عويمرحتى اتى رسول الله ﷺ وسط الناس فقال يا رسول الله أرأيت رجلاوجدمع امرأته رجلاأيقتله أتقتلونه ام كيف يفعل فقال رسول الله ﷺ قدنزل فيك وفي صاحبتك فاذهب فأت بهاقال سهل فتلاعناوأنامع الناس

عند رسول الله ﷺ فلما فرغا قال عويمر كذبت عليها يا رسول الله ان أمسكتها فطلقها ثلاثا قبل ان يأمره رسول الله ﷺ ......الخ.

ولما فی شرح النووی علی مسلم(۱/۴۸۸، کتاب اللعان مطبع قدیمی)

"قوله أيقتله فتقتلونه" معناه اذا وجد رجلا مع امرأته وتحقق انه زنى بها فان قتله قتلتموه وان تركه صبر على عظيم فكيف طريقه وقد اختلف العلماء فيمن قتل رجلا وزعم انه وجده قد زنى بامرأته فقال جمهورهم: لا يقبل قوله بل يلزمه القصاص الا ان تقوم بذلك بينة او يعترف به ورثة القتيل والبينة أربعة من عدول الرجال يشهدون على نفس الزنا ويكون القتيل محصنا وأما فيما بينه وبين الله تعالى فان كان صادقا فلا شئ عليه......الخ.

اس سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاص اس حالت میں دیانۃً "کفیٰ بالسیف" یعنی قتل کا حکم ہے لیکن فساد عام ہونے کا قوی اندیشہ تھا کہ لوگ ناحق قتل کردیا کریں گے اور پھر خلاصی کے لئے جھوٹا عذر پیش کریں گے کہ مقتول کو ارتکاب معصیت میں دیکھا گیا تھا، اس لئے قاضی کو تحقیق کا حق حاصل ہے، لہٰذا مذکورہ حکم اور باب اللعان کی حدیث میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ حدیث باب اللعان قضاء اور عدالتی کاروائی پر محمول ہے کہ قاضی کے لئے تحقیق کا حق محفوظ ہے قاتل مقتول کا جرم ثابت نہ کرسکا تو قاضی قصاصاً قتل بھی کرسکتا ہے۔

البتہ دیانۃً یعنی اللہ کے ہاں یہ شخص مجرم نہیں ہوگا دونوں کے اعتبارات مختلف ہیں کہ حدیث اللعان قضاء پر جبکہ فقہاء کرام کی عبارات اللہ تعالیٰ اور بندے کے مابین معاملے پر محمول ہیں جسکی وجہ سے دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، لہٰذا فتویٰ صحیح دیا گیا ہے امید ہے کہ اب مولوی صاحب کو اشکال نہیں رہیگا۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:

﴿حد کے نفاذ سے قبل توبہ کرنے سے حد ساقط نہیں ہوسکتی﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی پر قاضی نے حد نافذ کرنے کا فیصلہ سنایا ہے، اب حد لگنے سے پہلے پہلے وہ آدمی سچی توبہ کرلیتا ہے تو کیا اسکی حد ساقط ہوجائے گی؟

﴿جواب﴾ جب قاضی کے پاس حد ثابت ہوگئی اور قاضی نے حد نافذ کرنے کا فیصلہ سنادیا تو اب دنیا میں حد ساقط نہیں ہوسکتی اگر سچی توبہ کرلی ہے تو امید ہے کہ آخرت میں اس سے

دوبارہ مؤاخذہ نہیں ہوگا لیکن دنیاوی سزا ساقط نہ ہوگی۔

لما فی الدر مع الرد:(۴/۴،طبع سعید)

وأجمعوا أنها لاتسقط الحد فی الدنيا وفی الشامية:(قوله وأجمعوا الخ)الظاهر ان المراد أنها لاتسقط الحد الثابت عند الحاكم بعد الرفع اليه،اما قبله فيسقط الحد بالتوبة حتى فی قطاع الطريق سواء كان قبل جنايتهم على نفس أو عضو أو مال أو كان بعد شئی من ذلك كما سيأتی فی بابه،وبه صرح فی البحر هنا خلافا لما فی النهر،نعم يبقى عليهم حق العبد من القصاص ان قتلوا والضمان ان أخذوا المال،وقول البحر:والقطع ان اخذوا المال سبق قلم،وصوابه والضمان.والحاصل أن بقاء حق العبد لاينافی سقوط الحد،وكأنه فی النهر توهم أن الباقی هو الحد وليس كذلك فافهم،وفی البحر عن الظهيرية:رجل أتى بفاحشة ثم تاب وأناب الى الله تعالى فانه لايعلم القاضی بفاحشة لاقامة الحد عليه لأن الستر مندوب اليه اھ وفی شرح الاشباه للبيرى عن الجوهر:رجل شرب الخمر وزنی ثم تاب ولم يحد فی الدنيا هل يحد له فی الأخرة؟قال:الحدود حقوق الله تعالى الا أنه تعلق بها حق الناس وهو الانزجار،فاذا تاب توبة نصوحا أرجو أن لا يحد فی الاخرة فانه لايكون اكثر من الكفر والردة وانه يزول بالاسلام والتوبة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم:شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:

﴿محصن خلوت صحیحہ سے نہیں ہوتا اس کے لئے جماع شرط ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص صرف خلوۃ صحیحہ کرلیں جماع نہ کرے اور اس کے بعد زنا کرے تو اس آدمی کی کیا سزا ہوگی؟صرف خلوۃ صحیحہ سے آدمی محصن بن جاتا ہے یا نہیں؟یا جماع ضروری ہے محصن بننے کے لیے؟

﴿جواب﴾ محصن بننے کے لیے صرف خلوت صحیحہ کافی نہیں ہے بلکہ جماع شرط ہے،لہذا اگر کوئی شخص خلوۃ صحیحہ کے بعد زنا کا ارتکاب کرے تو اس کو رجم نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کا زنا چار گواہوں سے اگر ثابت ہوجائے تو شرعی قانون کی رو سے حاکم وقت اس کو ۱۰۰/سو کوڑے لگائے گا۔

لما فی قوله تعالى:(سورة النور:الاية ۲)﴿الزانية والزانی فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة﴾

ولما فی تفسير ابن كثير:(۵۰۱/۴،طبع رشيديه)

هذه الاية الكريمة فيها حكم الزانی فی الحد،وللعلماء فيه تفصيل فان الزانی لايخلو اما ان يكون بكراً،وهو الذی لم يتزوج او محصنا وهو الذی قد وطی فی نكاح صحيح وهو حر بالغ عاقل،فاما ان كان بكراً لم يتزوج فان حده جلد مائة كما فی الاية۔فاما ان

كان محصنا وهو الذى قد وطى فى نكاح صحيح وهو حر عاقل بالغ فانه يرجم

ولما فى تفسير المظهرى :(۲۱۷/۶ طبع رشيديه)

اجمع علماء الامة على ان الزانية والزانى اذا كانا حرين عاقلين بالغين غير محصنين فحدهما ان يجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة بحكم هذه الاية

وفيه ايضا

ذكر العلماء من شرائط احصان الرجم الحرية والعقل والبلوغ وان يكون قد تزوج تزويجاً صحيحاً ودخل بالزوجة وهذه الشروط الخمسة مجمع عليها للرجم

ولما فى صحيح البخارى :(۲/۳۲۲)

عن ابن عباس رضى الله عنهما قال قال عمر :لقد خشيت ان يطول بالناس زمان حتى يقول قائل:لانجد الرجم فى كتاب الله فيضلو بترك فريضة الله الا وان الرجم حق على من زنى وقد احصن،اذا قامت البينة،او كان الحمل اوالاعتراف

ولما فى تنوير الابصار مع الدر:(۱۱۹/۳ طبع سعيد)

والخلوة لاتكون كالوطى فى حق بقية الاحكام كالغسل والاحصان وحرمة البنات حلها للاول والرجعة والميراث۔وفى الشامية (قوله والاحصان) فلو زنى بعد الخلوة الصحيحة لايلزم الرجم لفقد شرط الاحصان وهو الوطء۔وفى البحر ولم يقيموها مقام الوطء فى حق الاحصان ان تصادقا على عدم الدخول۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفااللہ عنہ

۶ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر: ۳۷۵۹

﴿نیند کی حالت میں بچے کا ماں کے پہلو میں آکر مرجانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام کہ اگر بچہ نیند کی حالت میں ماں کے پہلو میں دب کر مر جائے تو ماں پر کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟ مستفتی: حبیب الوہاب

﴿جواب﴾ نیند کی حالت میں بچہ ماں کے پہلو کے نیچے آکر اگر مرجائے تو یہ قتل جاری مجری خطاً ہے جس کا حکم یہ ہے کہ ماں پر کفارہ لازم ہے یعنی مسلسل ساٹھ روزے رکھے اور عاقلہ یعنی عورت کی برادری والوں پر دیت واجب ہوجاتی ہے،لہٰذا مذکورہ صورت میں ماں کفارہ ادا کریگی اور شرعی عدالت نہ ہونے کیوجہ سے نفاذ عاقلہ پر مشکل ہے،اس لئے دیت بھی اس عورت پر واجب ہے، بچے کا والد چاہے تو معاف کردے یہ بھی یاد رکھیں کہ اس بچے نے اپنی ملکیت میں اگر مال چھوڑا ہے تو اسکی ماں کو بطور میراث حصہ نہیں ملے گا۔

لمافی المظهری:(پاره ۵،سورة النساء،طبع رشیدیه)

ومن قتل مؤمنا خطأ فتحریر رقبة مؤمنة ودیة مسلمة الی اهله الا ان یصدقوا ـــ الأیة. یعنی ان یعفوا ای الورثة او المقتول بعد الجرح قبل ان یموت سمی الله سبحانه العفو صدقة للحث علیه.

ولمافی التنویر مع الدر:(۵۳۱/۶،طبع سعید)

(و) الرابع (ماجری مجراه) مجری الخطأ (کنائم انقلب علی رجل فقتله) لانه معذور کالمخطئ (وموجبه) ای موجب هذا النوع من الفعل وهو الخطأ وماجری مجراه (الکفارة والدیة علی العاقلة)

ولمافی البدائع:(۲۷۱/۷،طبع سعید)

النائم ینقلب علی انسان فیقتله فهذا القتل فی معنی القتل الخطأ من کل وجه لوجوده لا عن قصد لانه مات بثقله فترتب علیه احکامه من وجوب الکفارة والدیة وحرمان المیراث والوصیة لانه اذا کان فی معناه من کل وجه کان ورود الشرع بهذا الاحکام هناك ورودا ههنا دلالة.

ولمافی الدر مع الرد:(۶۴۷/۶،طبع سعید)

قلت: وحیث لاقبیلة ولاتناصر فالدیة فی ماله أو بیت المال ـــــ وفی الشامیة:(قوله فالدیة فی ماله) ای عند عدم وجود بیت المال أو عدم انتظامه کما قدمناه.

ولمافی فقه الاسلامی:(۵۷۳۲/۷،طبع رشیدیه)

وبما ان نظام العشیرة قد زال، وبیت المال قد تغیر نظامه واختلف النظام الاجتماعی عما کان علیه فی زمن العرب، وفقدت عصبیة القبیلة بعضهم لبعض وصار کل امرئ متعمدا علی نفسه دون قبیلته کما فی النظام الحاضر فان دیة قتل الخطأ أو شبه العمد اصبحت فی زماننا هذا واجبة فی مال الجانی وحده.

والله اعلم: حبیب الرحمٰن سواتی　　الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۱۹۶۱　　۳ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

﴿مالی جرمانہ لینا شرعاً جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے علاقہ میں یہ قانون ہے کہ اگر کوئی شخص کسی حکم کی خلاف ورزی کرے تو اس سے مالی جرمانہ وصول کیا جاتا ہے، بسا اوقات نقد پیسے لئے جاتے ہیں اور کبھی گائے بکری وغیرہ لیکر جرمانہ وصول کرنے والے کھا لیتے ہیں یا فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے استعمال میں لے آتے ہیں، کیا ازروئے شرع مالی جرمانہ لینا جائز ہے جرمانہ لینے والوں کا کہنا ہے کہ یہ سب جرائم کو ختم کرنے کے لئے کیا جاتا ہے کیا جرائم کو ختم کرنے کے لئے اس طرح مالی جرمانہ لینا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ کسی بھی مسلمان کا مال اس کی رضامندی اور خوشدلی کے بغیر لینے اور استعمال

کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ بصورت مسئولہ میں مالی جرمانہ لینا دوسرے کا مال بلا سبب شرعی کے استعمال کرنا ہے جو کہ جائز نہیں، جرائم کے سد باب کے لئے کوئی طریقہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے مثلاً دعوت وتذکیر وغیرہ۔

لمافی مشکوٰۃ المصابیح:(ص ۲۵۵، طبع سعید)

عن ابی حرۃ الرقاشی عن عمه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفسه منه رواه البیهقی فی شعب الایمان.

ولمافی التنویر مع الدر:(۶۱/۴، طبع سعید)

(لا باخذ مال فی المذهب) بحر وفیه عن البزازیة: وقیل یجوز، ومعناه ان یمسکه مدة لینزجر ثم یعیده له۔۔۔ وفی المجتبی انه کان فی ابتداء الاسلام ثم نسخ.

ولمافی البحر الرائق:(۴۱/۵، طبع سعید) والحاصل ان المذهب عدم التعزیر باخذ المال.

ولمافی شرح المجلة للاتاسی:(۲۶۴/۱، المادة ۹۷، طبع رشیدیه)

لا یجوز لاحد ان یاخذ مال احد بلا سبب شرعی ای لا یحل فی کل الاحوال عمدا او خطأ او نسیانا جدا او لعبا ان یاخذ أحد مال احد بوجه لم یشرعه الله تعالیٰ ولم یبحه لان حقوق العباد محترمة لا تسقط بعذر الخطاء والنسیان والهزل وغیره.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبد الوہاب

۱۸ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۰۳

﴿فیس میں تاخیر کرنے کیوجہ سے جرمانہ وصول کرنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سائل اپنا ایک سکول چلاتا ہے۔ اس مہینے سے سکول میں ایک قانون لاگو کیا گیا ہے کہ جو بچہ مہینے کی ۱۵ تاریخ تک فیس جمع نہیں کرائیگا اس سے ۱۰۰ روپے بطور جرمانہ وصول کیا جائگا۔ اسپر بعض والدین نے اعتراض کیا کہ یہ جرمانہ سود کے زمرے میں آتا ہے آپ سے درخواست ہے کہ اسلامی شریعت کی روشنی میں اسکا تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔ مستفتی: سید شاہ نسیم اختر

﴿جواب﴾ مقررہ تاریخ تک فیس وصول کرنا آپکا حق ہے، والدین کا فرض بنتا ہے کہ وہ بلا تاخیر فیس جمع کریں بلا وجہ تاخیر سے جمع کرنے کی صورت میں وہ گنہگار ہوں گے تاہم اس تاخیر کی وجہ سے ان سے مالی جرمانہ وصول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اگر وصول کیا ہے تو واپس کرنا ضروری ہے۔

لما فی البحر ۵/ ۴۱ طبع ایچ ایم سعید

وقد قیل روی عن ابی یوسف ان التعزیر من السلطان باخذ المال جائز کذا فی الظهیریة وفی الخلاصة سمعت عن ثقة ان التعزیر باخذ المال ان رأی القاضی ذلک او الوالی جاز .ومن جملة ذلک رجل لا یحضر الجماعة یجوز تعزیره باخذ المال والماد فی البزازیة ان معنی التعزیر باخذ المال علی القول به امساک شئی من ماله عنه مدة لینزجر ثم یعیده الحاکم الیه لاان یأخذه الحاکم لنفسه اولبیت المال کما یتوهمه الظلمة اذلا یجوز لاحد من المسلمین اخذ مال احد بغیر سبب شرعی.

ولما فی الهندیة ج۲/ ۱۶۷ مکتبة رشیدیة

وعند ابی یوسف رحمه الله تعالی یجوز التعزیر للسلطان باخذ المال وعندهما وباقی الائمة الثلاثة لایجوز

ولما فی ردالمحتار ج۴/ ۶۱ طبع ایچ ایم سعید

وعن ابی یوسف یجوز التعزیر للسلطان باخذ المال وعندهما وباقی الائمة لایجوز ومثله فی المعراج وظاهره ان ذلک روایة ضعیفة عن ابی یوسف قال فی الشرنبلالیة ولا یفتی بهذا لما فیه من تسلیط الظلمة علی اخذ مال الناس فیأکلونه ومثله فی شرح الوهبانیة عن ابن وهبان.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۴ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ | فتویٰ نمبر: ۳۸۶۶

﴿بطور ضمانت لی گئی رقم میں تصرف کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک سیاسی جماعت کا کارکن علاقہ والوں کے پاس ووٹ مانگنے آیا تو علاقہ کے مکینوں نے کہا کہ ہم ووٹ اس شرط پر دینگے کہ آپ ہمارے لیے روڈ تعمیر کروائیں اور عدم اطمینان کی وجہ سے ۷ لاکھ روپے ہمارے پاس بطور ضمانت کے رکھوائیں۔

لہذا معاہدہ کے مطابق عمل ہونے کے بعد مذکورہ پارٹی کا شخص جب الیکشن میں کامیاب ہوا تو اس نے روڈ بنوانے کی شرط پوری نہ کی اور بعد میں استعفیٰ دے دیا لیکن علاقہ مکینوں نے اسکی رکھوائی ہوئی رقم اسے واپس نہیں کی، اب پوچھنا یہ ہے کہ آیا ان ۷ لاکھ روپوں کا استعمال علاقہ مکینوں کے لیے درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت شہادت اور گواہی کی سی ہے، لہٰذا ہر ایک شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ووٹ کو ایسے شخص کے حق میں استعمال کرے جو کہ اسکی اہلیت

رکھا ہوا اور ووٹ چونکہ کسی کے حق میں شہادت اور سفارش ہے، کوئی مال نہیں جسکے عوض پیسے لیے جائیں اور نہ ہی اس کو بیچا جا سکتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ سیاسی پارٹی کے کارکن نے ووٹ دیے جانے پر سڑک تعمیر کرنے کا وعدہ کیا تھا اور ضمانت کے طور پر ۷ لاکھ روپے بھی رکھوائے تھے، اب اقتدار میں آنے کے بعد اگر اسے اتنا وقت ملا تھا جس میں وہ روڈ کی تعمیر پر قادر تھا اور حکومت کی جانب سے اسے فنڈ بھی ملا تھا لیکن وہ سارا خود کھا گیا تو ایسی صورت میں وعدہ خلافی اور لوگوں کا حق کھانے کا گناہ اور وبال تو اس شخص پر ہی ہوگا۔

البتہ علاقہ والوں کے پاس اسکی رکھوائی گئی رقم کو علاقہ والے اسی روڈ (سڑک) کی تعمیر پر اس فنڈ کے بقدر استعمال کر سکتے ہیں، یہ اس صورت میں ہے جبکہ اس بات کا یقین ہو کہ مذکورہ شخص نے فنڈ کو اپنے ذاتی استعمال میں لایا ہو یعنی اسے کھا لیا ہو لیکن اگر گورنمنٹ کی طرف سے اسے مذکورہ سڑک کی تعمیر کے لیے فنڈ نہیں ملا تو ایسی صورت میں ان ۷ لاکھ روپوں کا استعمال علاقہ والوں کے لئے جائز نہیں بلکہ ان پر لازم ہے کہ یہ رقم اس شخص کو واپس لوٹا دیں۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة الحج،آیت ۳)﴿فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور﴾

ولمافی قوله تعالیٰ:(سورة النساء،آیت ۵۸)﴿ان الله یامرکم ان تؤدوا الامٰنٰت الی اهلها﴾

ولمافی مشکوٰة المصابیح:(ص ۲۵۵،طبع سعید)

عن ابی حرة الرقاشی عن عمه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الالاتظلموا الالایحل مال امرء مسلم الابطیب نفسه منه.

ولمافی الشامی:(۶/۵۰۱،طبع ایچ ایم سعید)

(قوله وقیل اذاایس)کذاعبرفی المنح:وظاهره انه من غیرجنس حقه والافلومن جنسه فله اخذقدرحقه منه بلاکلام ولاوجه لحکایته بقیل.

ولمافی التنویرمع الدر:(۴/۶۱،طبع سعید)

(لاباخذمال فی المذهب)بحروفیه عن البزازیة:وقیل یجوز ومعناه ان یمسکه مدة لینزجرثم یعیده له...... وفی المجتبی انه کان فی ابتداء الاسلام ثم نسخ.

وفی الشامیة:(قوله لاباخذمال فی المذهب)قال فی الفتح:وعن ابی یوسف یجوز التعزیرللسلطان باخذالمال.وعندهماوباقی الائمة لایجوزاه.ومثله فی المعراج، وظاهره ان ذلک روایة ضعیفة عن ابی یوسف،قال فی الشرنبلالیة:ولایفتی بهذالمافیه من تسلیط الظلمة علیٰ اخذمال الناس فیاکلونه اه.ومثله فی شرح الوهبانیة عن ابن

وهبان(قوله وفيه الخ)اى فى البحر،حيث قال:وافادفى البزازية ان معنى التعزيرباخذالمال على القول بى امساك شىء من ماله عنه مدة لينزجرثم يعيده الحاكم اليه لا أن يأخذه الحاكم لنفسه اولبيت المال كمايتوهم الظلمة، اذلايجوزلاحدمن المسلمين اخذمال احدبغيرسبب شرعى.

ولمافى البحرالرائق:(۵/۴۱،طبع سعيد)والحاصل ان المذهب عدم التعزيرباخذالمال.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفااللہ عنہ

۱۵شعبان ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۷۵۵

﴿مالی جرمانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ مالی جرمانہ کرنا جائز ہے؟ مثلاً استاد شاگرد سے کہتا ہے کہ اگر تم نے نماز نہ پڑھی یا سبق نہ یاد کیا یا اور کوئی شرارت کی تو ۵۰ روپے جرمانہ ادا کرنا ہوگا اگر جائز ہے تو اس رقم کا مصرف کیا ہوگا؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ جرمانہ مالی شرعاً درست نہیں، اگر زجر و تنبیہ کے واسطے جرمانہ لیا ہے تو بعد میں واپس کردے کسی اور مصرف میں اس رقم کو خرچ کرنا جائز نہیں، ہاں اگر مجرم اپنی خوشی سے بلا جبر و اکراہ اس رقم کو کسی مصرف میں صرف کردے تو جائز ہے مگر یہ ضروری ہے کہ اسے علم ہو کہ وہ اس رقم کا مالک ہے اور اس کو تصرف کا صحیح موقع دیا جائے پھر چاہے تو خود رکھے یا کسی مصرف میں صرف کردے۔

لمافى التنويرمع الدر:(۴/۶۱،طبع سعيد)

(لا باخذمال فى المذهب) بحروفيه عن البزازية :وقيل يجوز، ومعناه أن يمسكه مدة لينزجرثم يعيده له،فان أيس من توبته صرفه الى مايرى وفى المجتبى أنه كان فى ابتداء الاسلام ثم نسخ.

وفى الشامية:(قوله لا باخذمال فى المذهب)قال فى الفتح: وعن أبى يوسف يجوز التعزيرللسلطان بأخذالمال وعندهماوباقى الائمة لا يجوزاه.ومثله فى المعراج، وظاهره أن ذلك رواية ضعيفة عن أبى يوسف،قال فى الشرنبلالية:ولايفتى بهذا لما فيه من تسليط الظلمة على أخذمال الناس فياكلونه اه.ومثله فى شرح الوهبانية عن ابن وهبان(قوله وفيه الخ)أى فى البحر،حيث قال:وأفادفى البزازية أن معنى التعزير بأخذالمال على القول به امساك شئى من ماله عنه مدة لينزجرثم يعيده الحاكم اليه، لاأن يأخذه الحاكم لنفسه أولبيت المال كمايتوهمه الظلمة ، اذلايجوز لاحدمن المسلمين أخذمال احدبغيرسبب شرعى. وفى المجتبى لم يذكر كيفية الأخذ وأرى أن يأخذها فيمسكها،فان أيس من توبته يصرفهاالى مايرى وفى شرح

الآثار التعزیر بالمال کان فی ابتداء الاسلام ثم نسخ اھ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۸۷

﴿مالی جرمانہ لینا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک لڑکی پر سسرال والوں نے بہت مظالم ڈھائے، اسکو مارا پیٹا حتیٰ کہ زہر تک دینے کی کوشش کی، اب اس لڑکی کو والدین کے گھر بھیج دیا، نہ ہی لیکر جاتے ہیں اور نہ طلاق دیتے ہیں، جب طلاق کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم لیکر جائیں گے لیکن پھر بھی لیکر نہیں جاتے، اب اس لڑکی کے گھر والے لڑکے والوں پر عدالت میں ہرجانہ کا مقدمہ درج کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ لڑکی پر مذکورہ مظالم کا مالی جرمانہ لینا چاہتے ہیں آیا شرعا یہ جرمانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں لڑکی والوں کو چاہیے کہ کسی مسلمان عدالت میں مقدمہ درج کر کے لڑکی کو طلاق دلوادیں لیکن مظالم کے بدلے مالی جرمانہ وصول کرنا جائز نہیں ہے اور نہ اس کیلئے مقدمہ درج کرنا جائز ہے، البتہ عورت کا حق مہر شوہر کے ذمہ باقی ہو تو اس کے حصول کے لئے عدالت میں مقدمہ درج کر کے اسے حاصل کر سکتے ہیں۔

لما فی التنویر مع الدر: (۴/۶۱-۶۲ طبع سعید)

(لا بأخذ مال فی المذهب) بحر وفیه عن البزازیة: وقیل یجوز ومعناه أن یمسکه مدة لینزجر ثم یعیده له، فان أیس من توبته صرفه الیٰ ما یریٰ اھ وفی ردالمحتار: قوله: (لا بأخذ مال فی المذهب) قال فی الفتح: وعن ابی یوسف یجوز التعزیر للسلطان بأخذ المال، وعندهما وباقی الائمة: لا یجوز اھ. ومثله فی المعراج، وظاهره ان ذلک روایة ضعیفة عن أبی یوسف...... والحاصل ان المذهب عدم التعزیر بأخذ المال.

ولما فی البحر: (۵/۴۱، طبع سعید)

ولم یذکر محمد التعزیر بأخذ المال وقد قیل روی عن أبی یوسف أن التعزیر من السلطان بأخذ المال جائز کذا فی الظهیریة ــ والحاصل أن المذهب عدم التعزیر بأخذ المال.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: خلیل اللہ دیروی عفا اللہ عنہ

۲۸ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۶۴۳

﴿مالی جرمانہ وصول کرنا حرام ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات مفتیان کریم اس مسئلہ کے بارے میں، کہ ایک لڑکی کسی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے، تو پھر بعد میں لڑکی کے گھرانے والے لڑکے والوں سے شرم مانگتے ہیں، یعنی (مالی جرمانہ) تو کیا شریعت کی رو سے یہ شرم مانگنا اور لینا جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح جو سونا وہ لڑکی اپنے والد کے گھر سے لے جاتی ہے، تو کیا گھر والوں کیلئے اسکا لینا کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ کنواری عاقلہ بالغہ لڑکی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر خود کسی شخص سے اگر نکاح کرلے تو یہ نکاح علماء احناف کے نزدیک اگرچہ صحیح اور معتبر ہے، لیکن بلاشبہ گناہ ہے، اور اسکا شوہر بھی لڑکی کے ساتھ اس جرم میں شریک ہے، لیکن ہمارے معاشرہ میں بعض نا سمجھ ایسے بھی ہیں کہ مناسب رشتہ آنے کے باوجود بلاوجہ رشتہ نہیں دیتے، اور یہی دراصل اس فساد کی بڑی وجہ ہے، جیسا کے حدیث میں ہے:

"اذاخطب اليكم من ترضون دينه وخلقه فزوجوه أن لا تفعلوه تكن فتنةفى الارض وفساد عريض" (رواه الترمذى)

ترجمہ: آپ ﷺ کا ارشاد ہے، کہ جب بھی کسی لڑکی کیلئے ایسے لڑکے کا خطبہ آجائے جسکا دین اور اخلاق آپ لوگوں کو پسند ہو تو اس کو قبول کرلو، اور اپنی بیٹی کی شادی اس سے کراؤ، ورنہ بعد میں نہ قبول کرنے کیوجہ سے بہت سارے فسادات پیدا ہونگے۔ بہر حال غلطی والدین کی ہو یا لڑکی، لڑکے کی زیادتی ہو مالی جرمانہ وصول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ہاں لڑکی اپنی ذاتی اشیاء کے علاوہ گھر والوں کا سونا وغیرہ ساتھ لیکر چلی جائے تو اسکا وصول کرنا بلاشبہ جائز ہے، اور گھر والوں کا حق ہے۔

ولما فى مشكوة المصابيح :(ص،٢٧٠،باب الولى فى النكاح) طبع سعيد

عن عائشةرضى الله عنها قال أيما امرأة نكحت بغير اذن وليها فنكاحهاباطل فنكاحها باطل فنكاحها باطل فان دخل بها فلها المهر بمااستحل من فرجها فان اشتجروا فاالسلطان ولى من لا ولىّ له.

(رواه احمد والترمزى وأبوداؤد وابن ماجه والدارمى).

وفيه أيضا :(ص،٢٦٧كتاب النكاح) طبع سعيد

عن أبى هريرة رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذاخطب اليكم من ترضون دينه وخلقه فزوّجوه ان لا تفعلوه تكن فتنة فى الارض وفساد عريض

ولما في حاشية المشكوة:(ص۲۶۷) طبع سعيد

قوله أن لا تفعلوا أي ان لم تزوّجوا من هذه صفته ورغبتم في مجرد الحسب والمال بوجهان الطغيان والفساد ولبقي أكثر النساء بلا زوج والرجال بلا زوجة فيكثر الزنا وتقع الفتنة وهذا أوجه.(لمعات)

ولما في تنوير مع الدر:(۶۱/۴)طبع سعيد

(لا بأخذ مال في المذهب)بحر.وفيه عن البزازية:وقيل يجوز ومعناه أن يمسكه مدة لينزجر ثم يعيده له فان أيس من توبته صرّفه الى ما يرى.وفي المجتبى أنه كان في ابتداء الاسلام ثم نسخ.

ولما في الشامي:(۶۱/۴مطلب في التعزير بأخذ المال)طبع سعيد

(قوله لا بأخذ مال في المذهب)قال في الفتح:وعن أبي يوسف يجوز في التعزير للسلطان بأخذ المال.وعندهما وباقي الأئمة لا يجوز ومثله في المعراج.وظاهره أن ذالك رواية ضعيفة عن أبي يوسف.قال في الشرنبلالية ولا يفتى بهذا لما فيه من تسليط الظلمة على أخذ مال الناس فيأكلونه.(قوله

وفيه الخ)اي في البحر حيث قال وأفاد في البزازية أن معنى التعزير بأخذ المال على القول به امساك شيئ من ماله عنه

مدة لينزجر ثمّ يعيده الحاكم اليه.لا أن يأخذه الحاكم لنفسه أو لبيت المال كما يتوهمه الظلمة.اذلا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعيّ ـــ والحاصل أن المذهب عدم التعزير بأخذ المال الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۲۶ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۰۹

﴿تعزیر بالمال جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں جب دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا ہو تو کچھ لوگ ان کے درمیان صلح کرتے ہیں ان میں ایک حکم ہوتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ دونوں فریق سے صلح سے پہلے بطور ضمانت نقد رقم یا کوئی اور چیز لیتے ہیں تاکہ وہ فیصلے سے انکار نہ کرے۔ اب یہ معلوم کرنا ہے کہ اگر فریقین میں سے کوئی فیصلے سے انکار کرے تو اس صورت میں ان سے لی گئی ضمانت ضبط کرنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ کسی بھی مسلمان کا مال اس کی رضامندی اور خوشدلی کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں۔ مذکورہ صورت میں بطور ضمانت لی گئی رقم یا چیز کو ضبط کرنا یا استعمال کرنا بلا سبب شرعی

استعمال کرنا ہے۔ جو کہ جائز نہیں۔ البتہ مصلحت کی خاطر ایک مدت تک اس کو اپنے پاس روکنے کی گنجائش ہے۔ لیکن دوبارہ لوٹانا ضروری ہے۔

لما فی المشکوٰۃ المصابیح ص۲۵۵

عن ابی حرۃ الرقاشی عن عمہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم الا لا تظلموا الا لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منہ۔

ولما فی التنویر مع الدر ۴/۶۱ طبع سعید

(لا باخذ مال فی المذهب) بحر وفیه عن البزازیة: وقیل یجوز: معناه ان یمسکه مدة لینزجر ثم یعیده له..... وفی المجتبی انه کان فی ابتداء الاسلام ثم نسخ۔

ولما فی البحر الرائق ۵/۴۱ طبع سعید) والحاصل ان المذهب عدم التعزیر باخذ المال۔

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته ۷/۵۵۹۶ طبع رشیدیة۔

ومعنی التعزیر باخذالمال علی القول عند من یجیزه، هو امساك الشئی من مال الجانی عنه. لیزجر عما اقترفه ثم یعید الحاکم الیه، لا ان یاخذ الحاکم بنفسه، او لبیت المال کما یتوهم الظلمة اذ لا یجوز لاحد من المسلمین اخذ مال احد بغیر سبب شرعی۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: شفقت اللہ

۱۰ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ   فتوی نمبر: ۴۱۳۵

﴿ گاڑی کے نیچے کچل کر ہلاک ہونے کی صورت میں ڈرائیور پر ضمان ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص گاڑی چلا رہا تھا کہ گاڑی کے پچھلے ٹائر کے نیچے ایک بچی اچانک آکر ہلاک ہوگئی، ڈرائیور کی کوئی غلطی نہیں تھی، ایک مولوی صاحب نے بتایا کہ آپ چار مہینے روزے رکھیں اس نے روزے رکھنا شروع کر دیئے ہیں، تقریباً ساڑھے تین ماہ ہوگئے ہیں ابھی ۱۵ دن باقی ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ آیا اس شخص پر دیت واجب ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو شریعت میں اس کیلئے کیا حکم ہے؟ کیا روزے رکھنے کا حکم صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں حقیقت حال واقعی ایسے ہی ہو جیسے ڈرائیور نے بیان کی کہ بچی اچانک لگی ہے اور اسکی غلطی بھی نہیں تھی، مزید یہ کہ اس نے اسکو بچانے کی پوری کوشش کی تھی، نشہ میں بھی نہیں تھا رفتار بھی حد سے زیادہ نہیں تھی بلکہ معتدل تھی، مکمل حاضر دماغی سے گاڑی چلا رہا تھا پھر اگر کوئی اس طرح کا حادثہ پیش آتا ہے تو اس صورت میں ڈرائیور پر کوئی ضمان نہیں ہوگا لیکن اگر اس کی طرف سے کسی قسم کی بے احتیاطی پائی گئی یا ٹریفک قوانین میں سے کوئی ضابطہ

توڑا اور کسی انسان کو ہلاک کر دیا تو بلاشبہ ڈرائیور پر ضمان ہوگا۔ چار مہینے روزے رکھنے کا حکم مولانا صاحب نے معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت دیا۔

لما في الهداية مع فتح القدير:(۲۶۱/۱۰طبع رشيديه)

ومن سار على الدابة في الطريق فضربها رجل أو نخسها فنفحت رجلا أو ضربته بيدها فصدمته فقتلته كان ذلك على الناخس دون الراكب هو المروي عن عمرو ابن مسعودؓ ولأن الراكب والمركب مدفوعان بدفع الناخس فاضيف فعل الدابة اليه كأنه فعله بيده ولأن الناخس متعد في تسببه والراكب في فعله غير متعد فيرجح جانبه في التعريم المتعدي حتى لو كان واقفادابته على الطريق يكون الضمان على الراكب والناخس نصفين لأنه معد في الايقاف أيضاقال (وإن نفحت الناخس كان دمه هدرًا) لأنه بمنزلة الجاني على نفسه.

ولما في مجمع الضمانات (ص۲۳۳،الفصل في جناية البهيمة،طبع بيروت)

ومن سار على الدابة في الطريق فضربها رجل أو نخسها فنفحت رجلا أو ضربته بيدها أو نفرت فصرمته فقتلته كان الضمان على الناخس دون الراكب والواقف في ملكه والذي يسير في ذلك سواء.

ولما في بدائع الصنائع:(۲۸۲/۷طبع سعيد)

فإن نفحت الدابة الناخس أو الضارب فقتلته فدمه هدر لأنه هلك من جناية نفسه وجناية الانسان على نفسه هدر.

ولما في بحوث في قضايا فقهية معاصرة:(۳۱۶/۱طبع:دار العلوم كراچي)

والذي يظهر في هذه الصورة والله سبحانه اعلم أن الرجل الذي قفز أمام السيارة ان قفز بقرب منها بحيث لا يمكن للسيارة في سيرها المعتاد في مثل ذلك المكان أن تتوقف بالفرملة وكان قفزه فجأة لا يتوقع مسبقا لدى السائق متبصر محتاط فان هلاكه أو ضرره في مثل هذه الصورة لا ينسب الى سائق السيارة ولا يقال انه باشر الاتلاف فلا يضمن السائق ويصير القافز مسببا لهلاك نفسه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: طاہر زمان راولپنڈی

۲۲ صفر المظفر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۸۹۵

﴿عام رفتار سے تیز چلانے کی صورت میں حادثہ کا تاوان لازم ہوگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں ایک مرتبہ سڑک خالی ہونے کی وجہ سے میں موٹر سائیکل تیز چلا رہا تھا کہ اچانک کوئی جانور سڑک کے کنارہ سے بہت تیز دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے ٹکرا کر گر گیا میں نے موٹر سائیکل روک کر دیکھا تو وہ ایک بکری تھی، چونکہ دشمن اور چوروں کا خطرہ تھا تو میں نے اس کی پرواہ کئے بغیر آگے چل دیا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ مجھ

پر اس کا کوئی ضمان آیگا یا نہیں؟ حالانکہ میرے خیال سے اس میں میری کوئی غلطی نہیں تھی اور نہ ہی اس بکری کے مالک کا مجھے کوئی علم ہے، برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: عبدالوحید

﴿جواب﴾ موٹر سائیکل کی عام رفتار سے آپ اگر تیز چلا رہے تھے جسکی وجہ سے مناسب موقع پر آپ گاڑی نہ روک سکے تو یہ تعدی کی صورت ہے آپ کی غلطی تھی، اس لئے آپ پر ضمان واجب ہے، اس علاقہ میں معلوم کرنے سے مالک کا پتہ چل جائیگا اور کوشش کے باوجود وہ معلوم نہ ہو سکے تو اس کی طرف سے صدقہ کرنا واجب ہے۔

لما فی بحوث فی قضایا فقهیه معاصره:(۱۲/۱ طبع دار العلوم کراتشی)

فالاصل ان سائق السيارة ضامن لكل ضرر ينشأ من عجلاتها ،أومن مقدمتها أو من خلفها ،أو من احد جانبها ،لان السيارة آلة محضة فی يد السائق ــ فان كان سائق السيارة متعديا فی سيره مثل ان يسوق السيارة بسرعة غير معتادة فی مثل ذالك المكان ،أو لم يلتزم بخطه فی الشارع ــ فلا خفاء فی كونه ضامنا لان الضرر انما نشأ بتعديه ،والمتعدی ضامن فی كل حال.

لما فی الفقه الحنفی فی ثوبه الجديد:(۲/۷۰۳ طبع دار القلم بيروت)

ضمن راكب الدابة فی الطريق ما وطئت دابته وما أصابت بيد ها أو رجلها أو رأسها أوعضت بفمها ،لأن المرور فی طريق المسلمين مباح مقيد بشرط السلامة فيما يمكن الاحتراز عنه والاحتراز عن وطئ الدابة وماتصيب بيدها أو رجلها أو رأسها أو تعض بفمها ممكن.

لما فی الهداية:(۲/۶۰۱ طبع رحمانيه لاهور)

الراكب ضامن لما أو طأت الدابة مااصابت بيد ها أورجلها أو رأسها أو كدمت أو خبطت.

لما فی الهداية:(۲/۶۰۲ طبع رحمانيه لاهور)

ومن قاد قطارا فهو ضامن لما أوطأفان وطئى بعير انسانا ضمن به الدية على العاقلة.

واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۱۶۴ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ

﴿کسی کے مارنے یا ہنکانے سے جانور گر کر ہلاک ہو جائے تو ضمان واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کا جانور کسی دوسرے آدمی کے کھیت میں چر رہا تھا کھیت کے مالک نے جانور کو نکالنے کے بعد اس کو پتھروں سے مار کر بھگاتا رہا یہاں تک جانور بھاگنے کے دوران ایک بلند جگہ سے گر کر مر گیا۔ اب

پوچھنا یہ ہے کہ کھیت کے مالک پر جانور کا تاوان لازم آئیگا یا کہ نہیں؟ براہ کرم فقہ حنفی کی روشنی میں تسلی بخش جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ مستفتی: زبیر احمد سواتی

﴿جواب﴾ کھیت کے مالک نے جانور کو کھیت سے نکالنے کے بعد مزید بھی اس کو اگر ہنکایا یا مار کر اس کو پیچھے سے بھی بھگاتا رہا جیسا کی صورت مسئلہ میں اسکا ذکر ہے تو اس صورت میں کھیت کے مالک پر جانور کا تاوان اداء کرنا لازم ہے، ہاں اس نے صرف کھیت سے جانور کو نکال کر چھوڑ دیا تھا مزید پیچھا نہیں کیا پھر وہ جانور از خود بھاگتے ہوئے گر کر ہلاک ہو گیا ہو تو ایسی صورت میں اس شخص پر کوئی تاوان لازم نہیں آتا۔

لمافی الشامی:۶/۲۱۲(طبع سعید)

وجدفی زرعه دابة فأخرجهافهلكت فالمختار ان ساقهابعد الاخراج يضمن والالا،

ولمافی الهندية:۶/۵۳(رشيديه)

وان كان ثور لأهل قريته وأخرجه من زرعه ولم يزد على ذالك لايضمن اذاضاع الثور وان ساقه بعد ماأخرجه من زرعه ضمن كذافى الذخيرة،

ولمافی البزازية:۲/۵۱۸(طبع قديمى كتب خانه)

وان أخرجهاصاحب الزرع فاكلهاذئب فى المنتقى أنه لايضمن وفى فتاوى المختار ان ساقهابعدالاخراج يضمن والالا،

ولمافی المحيط البرهانى:ج۲۰/۲۲۲(طبع ادارة القرآن)

ومن وجد دابة انسان فى زرعه فأخرجهامن زرعه ــــ وقال بعضهم ان أخرجهاولم يسقهافلاضمان وان ساقهابعد ماأخرجهافهو ضامن،

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: فضل حق زیزاروی

۹ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ فتوی نمبر ۴۰۳۹

﴿ظالم سے مالی جرمانہ وصول کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ (۱) کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل اسلامی حکومت سے تو ہم محروم ہیں اور موجودہ انگریزی قانون سے بھی کوئی مظلوم انصاف کی توقع نہیں رکھ سکتا، شکایت کرنے سے مزید پریشانیوں کا سامنا ہو جاتا ہے، ہمارے علاقہ میں اگر کوئی ظالم کسی کی عزت لوٹتا ہے مثلاً کسی خاتون پر زبردستی ہاتھ ڈالتا ہے یا کسی امرد لڑکے سے غلط حرکت کرتا ہے جس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں تو مظلوم بدلہ لینے کے لئے بڑے نقصان کے لئے تیار

ہو جاتا ہے اور بسا اوقات ظالم یا اس کی برادری کو جان سے مار دیتا ہے اور پھر نہ ختم ہونے والی لڑائی شروع ہو جاتی ہے، ایسا واقعہ پیش آئے تو علاقہ کی بااثر شخصیات ظالم سے جرمانہ کے طور پر کچھ رقم لیکر مظلوم کو دیتے ہیں کیونکہ مظلوم اس سے کم پر راضی نہیں ہوتا، کیا مالی طور پر اس کا یہ جرمانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اور اگر مذکورہ رقم کو جرمانہ نہ کہیں بلکہ صلح علی المال کا درجہ دیں اور صلح اس لئے کہ ظالم اس حرکت کے بعد اپنی جان کے خوف سے مال دینے پر بخوشی راضی ہو جاتا ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب مجرم مال دے کر صلح کرنے پر راضی ہو اور صلح نہ ہونے کی صورت میں خون ریزی کا خطرہ ہو تو مظلوم اگر مال لیکر صلح کرے، کیا شرعاً یہ اس کیلئے جائز ہوگا؟

﴿جواب﴾ (۱) مذکورہ صورت میں ظالم سے مالی جرمانہ وصول کرنا تو جائز نہیں ہے، البتہ اگر مقصود برائی کو ختم کرنا ہی ہو تو اسکی متبادل صورت یہ ہو سکتی ہے کہ علاقے والے سب افراد مل کر آپس میں یہ معاہدہ کریں کہ ہم میں سے جو شخص بھی یہ برائی کرے گا اس کے ذمہ لازم ہے کہ اتنی رقم مثلاً ۵۰۰۰۰ روپے بیت المال میں صدقہ کرے گا یا فلاں رفاہی کام میں خرچ کرے گا تو ایسا کرنے کی گنجائش ہے لیکن ایسی صورت میں بھی ان لوگوں سے رقم لینا جائز نہ ہوگا جو معاہدہ میں شریک نہ ہوں کیونکہ بغیر کسی کی رضا مندی کے اس کا مال لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

(۲) اگر مذکورہ رقم کو جرمانہ کی بجائے ایسا مال قرار دیں جو مظلوم صلح کی وجہ سے وصول کر رہا ہو تو پھر بھی اس کے لئے یہ رقم لینا جائز نہ ہوگا، اس لئے کہ جس جرم کے بدلہ میں مال لیکر صلح کی جا رہی ہو اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بندہ کا حق ہو حق اللہ نہ ہو کیونکہ حق اللہ میں مال کے بدلہ صلح کرنا جائز نہیں ہے، مثلاً کسی نے شراب پی یا کسی نے زنا کیا یا پاک دامن عورت پر تہمت لگائی وغیرہ تو اس میں مال لیکر صلح کرنا جائز نہیں ہے خواہ فریقین خود صلح کریں یا کوئی جرگہ اور پنچائت ان میں صلح کروائے، البتہ قصاص یا کسی عضو کو یا کسی کا مال یا قیمتی چیز کو تلف کرنے کی صورت میں قاتل یا مجرم سے مال لیکر صلح کی جا سکتی ہے کیونکہ یہ حق العبد ہے۔

لما فی قوله تعالى (سورة النساء آیت ۲۸) ﴿یاایها الذین امنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل﴾

ولما فی الشامی: (۶۱/۴ طبع سعید)

(قوله لا باخذ مال فی المذهب) وقال فی الفتح: وعن ابی یوسف یجوز التعزیر للسلطان

باخذ المال وعندهما وباقی الائمة لا یجوزاه.ومثله فی المعراج،وظاهره ان ذلک روایة ضعیفة عن ابی یوسف ،قال فی الشرنبلالیة:ولا یفتی بهذا لما فیه من تسلیط الظلمة علی اخذ مال الناس فیأکلونه اه.ومثله فی شرح الوهبانیة عن ابن وهبان.

ولما فی البدائع:(۶/۳۸،طبع سعید)

ان یکون حق العبدلا حق الله عزوجل—وفیه:والصلح عن حقوق الله عزوجل باطل ویجب علیه رد ما اخذ لانه اخذه بغیر حق (ماخذه التبویب)

ولما فی فقه الاسلامی وادلته:(۷/۵۵۹۶،طبع رشیدیه)

ومعنی التعزیر باخذ المال علی القول عند من یجیزه :هو امساک شیء من مال الجانی عنه لینزجر عما اقترفه ثم یعید الحاکم الیه ،لاان یاخذه الحاکم بنفسه ،او لبیت المال کما یتوهم الظلمة ،اذلا یجوز لاحد من المسلمین اخذ مال احد بغیر سبب شرعی.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری

۱۳ رجب ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۶۳۴

﴿یضمن المجنون ما اتلف﴾

﴿مجنون اگر کوئی چیز ضائع کردے تو اس سے تاوان لیا جائے گا﴾

﴿سوال﴾مجنون اتلف مال أحد هل یجوز لصاحب الحق ان یضمن المجنون؟

﴿جواب﴾نعم لصاحب الحق حق المطالبة من المجنون فان المجنون یطالب بافعاله الجنائیة وان کان لایطالب باداء العبادات فیضمن المجنون ما اتلف.

لما فی الهدایة:(۲/۳۵۲،طبع رحمانیه)

وان اتلفا(یعنی الصبی والمجنون)شیئا لزمهما ضمانه احیاء لحق المتلف علیه،وهذا لان کون الاتلاف موجبا لایتوقف علی القصد.

ولما فی نور الانوار:(ص ۲۹۲،طبع امدادیه)

والجنون (ثم قال) وهو آفة تحل بالدماغ بعثت ببعث علی افعال خلاف مقتضی العقل من غیر ضعف فی اعضائه وتسقط به العبادات المحتملة للسقوط لا ضمان المتلفات ونفقة الاقارب والدیة کما فی الصبی بعینه.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: محمد غفر لہ ولوالدیہ

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۲۱۹

﴿بچے پر ضمان آنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بلوغ سے قبل زید لوگوں

کی چیزیں بلا اجازت استعمال کرتا تھا اور کھاتا تھا مثلاً باغ کے پھل وغیرہ اور قبل البلوغ بچہ چونکہ غیر مکلف ہوتا ہے تو آیا بعد البلوغ اس کا ضمان اداء کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ بچے کا مواخذہ اقوال میں اگر چہ نہیں ہوتا لیکن افعال میں اسکا بھی مواخذہ ہوتا ہے، لہذا بچہ کسی کی کوئی چیز اگر تلف اور ضائع کردے تو اب اس بچے کی ملکیت میں اگر مال موجود ہے تو بطور خطاب وضعی کے تاوان اداء کرنا ضروری ہے، چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک مسئلہ کے جواب میں فرماتے ہیں "یعنی اتلاف کے وقت اگر اس صبی کی ملکیت میں کچھ مال ہو تو اس میں سے اس متلف کا ضمان دینا ولی پر واجب تھا اگر ولی نہ دیتا اور اسی حالت میں وہ بالغ ہو جاتا اور وہ مال بھی جس سے ضمان کا تعلق ہو گیا تھا باقی رہتا تو اس پر بعد بالغ ہونے کی ضمان کا اداء کرنا واجب ہوتا "لتعلق حق الغیر بمالہ" اور اداء نہ کرنے سے عاصی، اور اگر اس وقت مال نہ تھا یا قبل البلوغ ہلاک ہو گیا تو اس کے ذمہ اس متلف کا کوئی مواخذہ نہیں۔ "لعدم خطاب التکلیف لعدم البلوغ وعدم خطاب الوضع لعدم تعلقہ بمحلہ ای المال فقط" اور ولی پر ضمان نہیں آتا البتہ بچے پر ضمان آنے کی صورت میں بچے کے مال سے اداء کرنا اسکی ذمہ داری ہے۔

لما فی الشامی:(۶/ ۱۴۶ طبع: سعید)

وان اتلفوا هؤلاء المحجورين سوله عقلو او لا درر(شيا) متوما من مال او نفس ضمنوا اذ لا حجر فى الفعلى لكن ضمان العبد بعد العتق على ما مر وفى الاشباه الصبى المحجور مؤاخذ بأفعاله فيضمن ما اتلفه من المال واذا قتل فالدية على عاقلته الا فى مسائل لو اتلف ما اقترضه وما اودعه عنده بلا اذن وليه وما اعير له وما بيع منه بلا اذن (قوله مؤاخذ بافعاله) هذا من باب خطاب الوضع وهو لا يتوقف على التكليف لان الخطاب نوعان خطاب وضع وخطاب تكليف كما فى جمع الجوامع (قوله الا فى مسائل) هو استثناء من قوله (فيضمن) اى فلا يضمن فى هذه لانه مسلط من المالك كما افاده فى الاشباه اه

وفى كشاف اصطلاحات الفنون:(۲/ ۷۴۶ طبع: سہیل اکیڈمی لاہور)

فان الخطاب نوعان تكليفى وهو المتعلق بافعال المكلفين با الاقتضاء والتخيير، ووضعى وهو الخطاب باختصاص شىء بشىء، وذالك ثلاثة اقسام (۱) سببى كالخطاب بان هذا سبب لذالك كالدلوك للصلوة (۲) وشرطى كالخطاب بان هذا سبب لذالك كالطهارة للصلوة، (۳) ومانعى اى هذا مانع لذالك كالنجاسة للصلوة.

ولما فى البحر الرائق:(۸/ ۷۹۰ طبع: قدیمی)

(وان اتلفوا شيأ ضمنوا) لانهم غير محجور عليهم فى الافعال اذ لا يمكن ان يجعل القتل

غير القتل والقطع غير القطع فاعتبر في حله فثبت عليه موجبه لتحقق السبب ووجود اهلية الوجوب وهي الذمة لان الانسان يولد وله ذمة صالحة لوجوب الحق الا انه لا يطالب بالاداء الا عند القدرة كالمعسر لا يطالب بالدين الا اذا ايسر وكالنائم لا يطالب بالاداء اذا استيقظ كذا قاله الشارح فظاهره ان البلوغ يتاخر الى البلوغ والعتق وفي الحدادي يضمن كما يضمن الحر البالغ العاقل وظاهره انه يضمن في الحال ويؤيده ما قال في العناية:جنين يوم لو انقلب على قارورة انسان فكسرها يجب عليه الضمان في الحال فلو ان الصبي او العبد استهلكوا مالا ضمنوا المال في الحال.

ولما في الهندية:(۵ / ۱۹ سطبع: قديمى)

ولا توجب هذه المعاني الثلاثه الحجر في الافعال حتى ان ابن يوم لو انقلب على قارورة انسان فكسرها وجب عليه الضمان في الحال.

ولما في شرح المجله:(۲ / ۵۱۹ سطبع:رشيديه)

المحجورون الذين ذكروا في المواد السابقة وان يعتبر تصرفهم القولي ولكن يضمنون حالا الضرر والخسارة الذين تلف

مال الغير وان كان غير مميز.لما علم انه لا حجر في افعال الجوارح ،لان الاعتبار الفعل لا يتوقف على القصد فان النائم ولو ابن يوم اذا انقلب على انسان او قارورة فاتلفها ضمن وان عدم القصد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: شاهد خان سواتی

۱۵ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر ۳۰۸۲

﴿گاڑی کے پیچھے لٹک کر ہلاک ہونے والے کا ضمان نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں ایک بچہ ٹریکٹر ٹرالی کے پیچھے چڑھ گیا، ڈرائیور کو اس بات کا علم نہ تھا، بچہ ٹرالی سے گر کر ہلاک ہوگیا، پوچھنا یہ ہے کہ اس ڈرائیور کے ذمہ دیت دینا لازم ہے یا نہیں؟ اگر لازم ہے تو دیت کی مقدار کیا ہوگی؟

مستفتی: ہفتہ خان ڈی۔ایچ۔اے کراچی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں ڈرائیور کا کوئی قصور نہیں ہے، بچہ اپنی نادانی سے گر کر ہلاک ہوا ہے، اس لئے ڈرائیور پر کوئی ضمان نہیں ہے اور نہ ہی کوئی تاوان ادا کرنا ضروری ہے۔

لما في الهداية:(۴/ ۶۰۲ سطبع رحمانيه)

والسائق ضمن لما أصابت بيدها اورجلها والقائد ضمن لما اصابت بيدهادون رجلها المراد النفحة..... وجهه ان النفحة بمرا ى عين السائق فيمكنه الاحتراز عنه وغائب

عن بصر القائد فلا یمکنه التحرز عنه.

ولما فی التنویر مع الدر:(۶/۶۰۳،طبع سعید)

(لا)یضمن الراکب(مانفحت برجلها)اوذنبها سائرة خلافا للشافعی.

ولما فی البحر:(۸/۳۵۶،طبع سعید)

ضمن الراکب ماوطأت دابته بیدورجل اورأس اوکدمت اوخبطت اوصدمت لامانفحت برجل اوذنب الااذاأوقفها فی الطریق.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:عبدالحکیم کشمیری

۱۵ربیع الاول ۱۴۲۹ھ   فتویٰ نمبر:۱۲۱۹

﴿لاضمان علی من اتلف خمر مسلم﴾

﴿مسلمان کی شراب ضائع کرنے سے تاوان نہیں آتا﴾

﴿سوال﴾رجل دخل دکان أحدواتلف الخمر کلهاوعلم صاحب الدکان بالمتلف وطلب منه الضمان هل یجب علیه اداء الضمان شرعاًفانه فعل ذلک لدفع شرها؟

﴿جواب﴾لایجب الضمان علی من اتلف خمر مسلم،فان الخمر لیست بمال متقوم فی حق المسلم.

لمافی مجمع الضمانات:(ص۲۳۹،طبع بیروت)

نقلاعن الاشباه اتلاف خمر مسلم لایوجب الضمان ولوکان المتلف ذمیا.

ولمافی الهدایة:(۴/۳۸۲،طبع رحمانیه)

اذااتلف المسلم خمرالذمی اوخنزیره ضمن فان اتلفهماالمسلم لم یضمن.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم:محمد غفرلہ ولوالدیہ

۲ربیع الاول ۱۴۳۰ھ   فتویٰ نمبر:۱۹۸۷

﴿کتاب الرھن﴾

﴿رھن کا ایک مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کا دوسرے پر سات لاکھ قرض تھا۔ قرض اداء کرنے کے لیے نقد روپے نہیں ہیں تو وہ اس طرح عقد رہن کر لیتا ہے کہ میری یہ زمین جسکی قیمت سات لاکھ روپے ہے یہ اپنے قبضے میں رکھو اور اگر چار سال تک میں پیسے نہ دے سکا تو آپکو میری زمین فروخت کرنے کی اجازت ہے جتنے میں فروخت ہو۔ تو کیا چار سال گزرنے کے بعد یہ شخص زمین بیچ سکتا ہے؟ اور اضافی رقم اسکی ہوگی یا مالک کو واپس کرنا ضروری ہوگا؟

مستفتی: مولانا حبیب الوھاب سواتی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں یہ شخص چار سال کی مدت گزرنے پر راہن سے اپنے قرضے کا مطالبہ کرے اگر اس نے اداء نہ کیا تو یہ شخص زمین بیچ کر اپنا قرضہ وصول کرلے۔ اور زائد رقم راہن کو واپس کر دے۔ اس لیے کہ یہ شخص مرتہن ہونے کے ساتھ ساتھ وکیل بھی ہے۔ اور ایسی صورت میں مؤکل کے معزول کرنے سے بھی وہ معزول نہیں ہوتا۔ اس لیے مرتہن کو مرہونہ چیز بیچنے کا اختیار رہتا ہے۔

لما فی الهداية:(۵۲۲/۴ طبع رحمانيه)

وليس للمرتهن ان ينتفع بالرهن لا باستخدام ولا سكنى ......لان له حق الحبس دون الانتفاع ،وليس له أن يبيع الا بتسليط من الراهن۔

ولما فی البناية:(۲۳۲/۱۵ طبع:حقانية)

(وليس له أن يبيع)أي وليس للمرتهن أن يبيع الرهن،(الابتسليط من الراهن)لان الرهن لا يقتضي البيع فلا يثبت له بدون الوكالة.

ولما فی الشامی:(۵۰۳/۶ طبع:سعيد كراچی)

(فان وكل)الراهن(المرتهن أو)وكل(العدل أو غيرهما ببيعه عند حلول الاجل صح)توكيله.

(قوله عند حلول الاجل)أو مطلقاكما فی القهستاني والدر المنتقى۔

ولما فی الشامی:(۵۰۹/۵ طبع:ايضا)

وحاصله أنه يصير وكيلاً بالفاظ الوكالة.....لكن صرح في البدائع أن افعل كذا أو أذنت لک أن تفعل كذا كذا توكيل.

ولمافی الشامی:(۵۰۲،۵۰۳/۶ طبع:ايضا)

(فان شرطت)الوكالة (فی عقد الرهن لم ينعزل بعزله)......للزومها بلزوم العقد ،فهی

تخلف الوكالة المفردة من وجوه أحدها هذا.

(قوله للزومها بلزوم العقد)لانها لما شرطت في ضمن عقد الرهن صارت وصفاً من أوصافه وحقاًمن حقوقه ،الا ترى أن عقد الوكالة لزيادة الوثيقة فيلزم بلزوم اصله.

ولما في فتح القدير:(۱۰/۱۶۷،طبع رشيديه)

اذا باع المرتهن الرهن باذن الراهن يرد ماذاد على الدين من ثمنه الى الراهن.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: تنویر الرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۲۴ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۶۰۴

﴿مرہونہ چیز کو بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میں نے کسی آدمی سے قرض لیا اور اپنی گھڑی رہن میں رکھ دی پھر اس شخص سے وہ گھڑی لیکر بیچ دی، میرا اس گھڑی کو بیچنا درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ رہن سے راہن کی ملکیت زائل نہیں ہوتی لیکن مرتہن کے حقوق متعلق ہوتے ہیں اگر راہن اس گھڑی کو فروخت کرتا ہے تو وہ مرتہن کی اجازت پر موقوف رہے گی اگر مرتہن اجازت دے تو بیع نافذ ہوجائے گی، یا مرتہن کا قرضہ ادا کیا جائے تا کہ مرہونہ چیز پر اس کا حق نہ رہے۔

لما في شرح المجلة:(۲/۱۸۹،طبع رشيديه كوئته)

لوباع الراهن الرهن بدون رضى المرتهن لاينفذالبيع ولايطرأخلل على حق حبس المرتهن ولكن اذاوفى الراهن الدين اواجازالمرتهن البيع يكون ذلك البيع نافذا.

وكذافي الهندية:(۵/۴۶۲،طبع رشيديه)

ولمافي تنويرالابصار:(۶/۵۰۸،طبع سعيد)

(توقف بيع الراهن رهنه على اجازة مرتهنه اوقضاء دينه فان وجد احدهما نفذ و صار ثمنه رهناوان لم يجز وفسخ)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: عبدالستار عفااللہ عنہ

۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر:

﴿کیا مرتہن راہن کی اجازت سے مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ قاضی الطاف حسین کا مکان نمبر 286 سوکھیہ گوٹھ میں واقع ہے، آپ نے ایک کمرہ گروی ضمانت دیکر 25000 روپے محمد عبدالعزیز سے لئے، اس کمرہ کا ماہانہ کرایہ 1000 روپے ہے جو قاضی الطاف حسین ہر ماہ کی 15 تاریخ کو محمد عبد

العزیز کو ادا کریگا جب تک پچیس ہزار روپے واپس نہیں کرسکتا اس وقت تک ہزار روپے ماہانہ کرایہ بھائی محمد عبدالعزیز لیتا رہے گا اور جب 25000 روپے وصول کریں تو اسی دن سے یہ لین دین ختم ہو جائیگا، پوچھنا یہ ہے کہ اس طرح لین دین کرنا کیا جائز ہے؟ مستفتی: الطاف حسین

﴿جواب﴾ آج کل معاشرے میں ایسے عقود نے جنم لیا ہے جو شریعت کی رو سے ناجائز ہیں، ان میں ایک قسم یہ بھی ہے جن کا ذکر سائل نے کیا ہے کہ قرض لینے والا اپنے کسی مکان یا کمرے کو قرض دینے والے کے پاس بطور رہن (ضمانت) کے رکھتا ہے اور وہ شخص دوسرے کو کرایہ پر دے دیتا ہے کرایہ وصول کرتا رہتا ہے اور قرض کی رقم بدستور قرض خواہ کے ذمہ ہوتی ہے جب تک وہ مکمل قرض کو واپس نہیں کرسکتا، اس وقت تک قرض دینے والا مکان سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔

شریعت کی رو سے لین دین کا یہ طریقہ غلط اور ناجائز ہے کیونکہ رہن میں رکھی جانی والی چیز ایک ضمانت کی حیثیت رکھتی ہے جو رکھنے کے بعد بھی اصل مالک کی ملکیت میں ہوتی ہے، اسی کو مرہونہ چیز سے نفع اٹھانے کا حق حاصل ہے اور مرتہن جس کے پاس مرہونہ چیز رکھی جاتی ہے کو نفع اٹھانے کا حق حاصل نہیں ہے کیونکہ قرض کے بدلے بلاعوض نفع اٹھانے سے احادیث میں ممانعت آئی ہے: کل قرض جر منفعة فهو ربا. مصنف ابن أبي شيبة: (۴/ ۳۲۸، طبع بیروت)

لہٰذا عبدالعزیز صاحب نے جتنا کرایہ وصول کیا ہے اس کو چاہیے کہ مالک مکان کو واپس کردیں یا پھر جتنا کرایہ وصول کیا ہے اور وصول کر رہا ہے اس کو قرض خواہ کی طرف سے قرض میں شمار کرتا جائے یہاں تک کہ مکمل قرض وصول کرلیں ورنہ سود کھانے والا متصور ہوگا۔

لما في اعلاء السنن: (۱۸/ ۶۴، طبع دار الكتب العلمية بيروت لبنان)

قال العبد الضعيف قال الموفق في المغني لا ينتفع المرتهن من الرهن بشيء أي ما لا يحتاج إلى مؤنة كالدار، والمتاع ونحوه فلا يجوز للمرتهن الانتفاع به بغير إذن الراهن بحال لا نعلم في هذا خلافا لأن الرهن ملك الراهن فكذلك نماؤه ومنافعه فليس لغيره أخذها بغير إذنه فإن أذن الراهن للمرتهن في الانتفاع بغير عوض وكان دين الرهن من قرض لم يجز، لأنه قرض يجر منفعة وذلك حرام.

لما في الشامي: (۶/ ۴۸۲، طبع ايچ ايم سعيد)

(قوله وقيل لا يحل للمرتهن) قال في المنح وعن عبد الله محمد بن أسلم السمرقندي وكان من كبار علماء سمرقند أنه لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن، لأنه أذن له في الربا لأنه يستوفي دينه كاملا فتبقى له المنفعة فضلا

فهو كون ربا، وهذا امر عظيم قال ط قلت والغالب من احوال الناس انهم يريدون عند الدفع الانتفاع، ولولاه لما اعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط، لان المعروف كالمشروط وهو مما يعين المنع اھ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رشید عالم مروت

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۷۰۸

﴿رہن سے نفع کی ایک خاص صورت کا بیان﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے علاقہ میں یہ رواج ہے کہ لوگ جب کسی سے قرض لینے کی وجہ سے اپنی زمین اس کے پاس رہن رکھتے ہیں تو مرتہن یہ کرتا ہے کہ اس زمین کو زراعت کے لیے ثلث یا ربع کی بنیاد پر آباد کر لیتا ہے اور جب فصل حاصل ہوتی ہے تو متعینہ حصہ راہن کو دے دیتا ہے شرعاً مرتہن کا اس زمین سے انتفاع بعقد زراعت کیسا ہے قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟ مستفتی: عبدالحق اکی

﴿جواب﴾ رہن سے متعلق اصل حکم یہ ہے کہ مرتہن اس چیز سے کوئی نفع حاصل نہ کرے اس لیے کہ یہ قرض کی بنیاد پر نفع حاصل کرنا ہوگا جس کو آپ علیہ السلام نے منع فرمایا لیکن مذکورہ صورت میں مرتہن اپنی محنت کا حصہ اس زمین کی آمد سے لے رہا ہے جس کی گنجائش معلوم ہو رہی ہے جب کہ اس علاقہ میں مزارعت پر زمین لینا دینا عام ہو اور مرتہن رائج نسبت سے زیادہ محنتانہ نہ لیتا ہو البتہ زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ مرتہن وراھن باہمی رضامندی یہ زمین کسی تیسرے شخص کو مزارعت پر دیں جس کی آمد راھن اور تیسرے شخص کے درمیان تقسیم ہو مرتہن صرف قبضہ رکھے اس زمین سے کچھ نفع حاصل نہ کرے.

(لما في مصنف ابن ابي شيبه ۵/۸۰ مكتبه امداديه)

عن الحكم عن ابراهيم قال كل قرض جر منفعة فهو ربا

(ولما في التنوير والدر ۶/۴۸۲ طبع سعيد)

(لا انتفاع به مطلقا) لا باستخدام ولا سكنى ولا لبس ولا اجارة ولا اعارة سواء كان مرتهن او راهن (الا باذن) كل للاخر وقيل لا يحل للمرتهن لانه ربا

(ولما في الرد المحتار ۶/۴۸۲ طبع سعيد)

(قوله وقيل لا يحل للمرتهن) قال في المنح وعن عبدالله محمد بن اسلم السمرقندي وكان من كبار علماء سمرقند انه لا يحل له ان ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه وان

اذن لـه الـراهـن لانـه اذن لـه فـي الربا لانه يستوفي دينه كاملا فتبقي له المنفعة فضلا فيكون ربـا .وبـعـد اسطـر قـال. قلت والغالـب من احوال الناس انهم انما يريدون عند الـدفـع الانتفاع ولو لاه لما اعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط لان المعروف كالمشروط وهـا مما يعين المنع والله اعلم

(ولما في التبيين الحقائق ۱۲۷/۷ طبع سعيد)

قـال رحـمـه الـلـه :(ولا يـنـتـفـع الـمـرتـهـن بـالـرهـن استخداما ولا سكنى ولبسا واجارة واعـارة)لان الـرهـن يـقـتـضـي الـحـبـس الـي ان يستوفي دينه دون الانتفاع فلا يجوز له الانتفاع الا بتسليط منه وان فعل كان متعديا ولا يبطل الرهن بالتعدي.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٹکی

۲۱ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر:

﴿مرتہن گروی چیز سے استفادہ نہیں کرسکتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گھر کے متصل پشت پر ایک آدمی کی زمین ہے وہ اسکو دوسرے آدمی کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہے جبکہ حق شفعہ میرا ہے، نیز دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کی صورت میں مجھے بہت ساری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اس لیے میرا مطالبہ یہ ہے کہ واقعتاً فروخت کرنا ہے تو میرے ہاتھوں فروخت کرلیں لیکن وہ انکار کررہے ہیں۔

البتہ ان کو پیسوں کی ضرورت تھی تو میں نے ان کو پچیس ہزار روپے دے دیئے اور زمین ان سے گروی رکھ دی، اب جو منافع آتے ہیں تو میں اس کو اپنے استعمال میں لاتا ہوں، اس زمین سے تقریباً چودہ من گندم حاصل ہوجاتی ہے تو میں اپنے آپ کو گناہ سے بچانے کے لیے دو من گندم ان کو دیتا ہوں، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس طرح معاملہ کرنا اور زمین کے منافع سے استفادہ کرنا شرعاً میرے لیے جائز ہے؟ مستفتی: حبیب الرحمٰن باجوڑ

﴿جواب﴾ آپ کے لئے اس زمین سے منافع حاصل کرنا خواہ مالک کی اجازت سے ہو جائز نہیں ہے، زمین سے حاصل شدہ چودہ من گندم میں سے صرف دو من گندم مالک کو دینے سے بھی آپکی خلاصی نہیں ہوسکتی، البتہ آپکے علاقہ میں ایسی زمین کا کرایہ صرف دو من گندم ہی عام اگر رائج ہے تو گنجائش معلوم ہورہی ہے۔

بہتر یہ ہے کہ آپ زمین بے شک قبضے میں رکھیں لیکن کاشت کے لیے کسی دوسرے کو دیں اور حاصل شدہ غلہ مالک اور مزارع علاقہ میں رائج ترتیب کے مطابق تقسیم کرتے رہیں، آپ غلہ میں سے کوئی حصہ نہ لیں۔

ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ زمین کا معاملہ ختم کردیں اور زمین کا کرایہ طے کرلیں اور کئی سالوں کا کرایہ ایک ساتھ انکو دیدیں اس طرح وہ اس رقم سے اپنی ضرورت پوری کرلیگا اور زمین بھی واپس اپنے قبضے میں لے لے گا۔

لما فی الشامی:(۲۸۲/٦،طبع سعید)

(قوله وقيل لا يحل للمرتهن) قال فى المنح:وعن عبدالله محمدبن اسلم السمرقندى وكان من كبار علماء سمرقندانه لايحل له ان ينتفع منه بوجه من الوجوه وان اذن له الراهن،لانه اذن له فى الربالانه يستوفى دينه كاملافيبقى له المنفعة فضلافيكون ربا،وهذاامرعظيم.

قلت:وهذامخالف لعامة المعتبرات من أنه يحل بالاذن الا انه يحل على الديانة،ومافى المعتبرات على الحكم ثم رأيت فى جواهرالفتاوى:اذا كان مشروطا صار قرضافيه منفعة وهورباوالا فلابأس اه..... بان ماكان ربالايظهرفيه فرق بين الديانة والقضاء على انه لا حاجة الى التوفيق بعدان الفتوى على ماتقدم:اى من أنه يباح.

ولما فى الهداية:(۵۲۳/۴،طبع رحمانيه)

وليس للمرتهن ان ينتفع بالرهن لا باستخدام ولا سكنى ولا لبس الاان يأذن له المالك لان له حق الحبس دون الانتفاع.

ولما فى البحرالرائق:(۲۳۸/۸،طبع سعيد)

(ولا ينتفع المرتهن بالرهن استخداماوسكنى ولبساواجارة واعارة)لان الرهن يقتضى الحبس الى انه يستوفى دينه دون الانتفاع فلايجوزالانتفاع الابتسليط منه وان فعل كان متعديا ولايبطل الرهن بالتعدى قال فى المبسوط وليس للمرتهن ان ينتفع بالمرهون الاباذن الراهن فاذااذن له جازان يفعل مااذن له فيه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد وارث خان

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۳۶۹

﴿گروی زمین سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ زمین گروی رکھ کر موسم موسم کے فصل حاصل کیے جاتے ہیں، مزید یہ کہ مرمت وغیرہ پر توجہ بھی نہیں دی جاتی ہے، ہلاکت کی صورت میں نقصان ماننے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہوتا،

گھر وغیرہ ہو تو خود مرتہن اس میں سکونت اختیار کر لیتا ہے یا کرایہ وصول کر لیتا ہے، علاقہ کا عرف یہی چلا آرہا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ بالا تصرفات از روئے شرع کیا حکم رکھتے ہیں؟

﴿جواب﴾ مرتہن کے لئے گروی چیز کو ذاتی استعمال میں لانا، اس سے نفع حاصل کرنا، ہرگز جائز نہیں ہے، زمین ہو خواہ گھر اپنے قرض کی وصولی تک صرف قبضہ میں رکھ سکتا ہے، استعمال میں لانے کی صورت میں گناہ کے علاوہ نقصان وغیرہ کی تلافی بھی اسی کے ذمہ ہے اگر چہ اس کا عرف چلا آرہا ہے، عرف کیوجہ سے شریعت کے اس طرح واضح حکم میں تبدیلی نہیں آتی۔

لمافی التنویر مع الدر:(۴۷۷/۶ تا ۴۸۷، طبع سعید)

(هو)لغة:حبس الشیئ،وشرعا(حبس شیئ مالی)ای جعله محبوسا۔۔۔(بحق یمکن استیفاء منه کالدین حقیقة اوحکما)۔۔۔(وهو مضمون اذاهلک بالأقل من قیمته ومن الدین)۔۔۔(لاانتفاع به مطلقا)لاباالاستخدام،ولاسکنیٰ ولالبس ولااجارة ولااعارة۔۔۔(ویجب)علی المرتهن(أن یحفظه بنفسه وعیاله)کمافی الودیعة۔۔۔(وأجرة بیت حفظه وحافظه)ومأوی الغنم(علی المرتهن وأجرة راعیه)لوحیوانا۔۔۔والأصل فیه ان کل مایحتاج الیه لمصلحة الرهن بنفسه وتبقیته فعلی الراهن لأنه ملکه،وکل ماکان لحفظه فعلی المرتهن لأن حبسه له.

ولمافی الشامی:(۴۷۷/۶،طبع سعید)هومشروع لقوله تعالیٰ-فرهان مقبوضة-

ولمافی الشامی:(۴۸۲/۶،طبع سعید)

(قوله وقیل لایحل للمرتهن)قال فی المنح:وعن عبدالله محمدبن اسلم السمرقندی وکان من کبار علماء سمرقند انه لایحل له أن ینتفع بشیئ منه بوجه من الوجوه وان اذن له الراهن ،لانه أذن له فی الربالأنه یستوفی دینه کاملافتبقی له المنفعة فضلافیکون ربا،وهذاأمر عظیم قلت :وهذا مخالف لعامة المعتبرات من انه یحل بالاذن الاان یحمل علی الدیانة ۔۔۔ قال ط:قلت والغالب من احوال الناس أنهم انمایریدون عندالدفع الانتفاع،ولولاه لما اعطاه الدراهم وهذابمنزلة الشرط،لان المعروف کالمشروط وهومایعین المنع......اه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۲ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ

فتویٰ نمبر:۱۵۴۲

﴿زیورات گروی رکھ کر قرض لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارا سونے کا کاروبار ہے، بعض اوقات کوئی قریبی دوست ہم سے کچھ پیسے لیکر جاتا ہے اور اس کے بدلے میں اپنے

زیورات رکھوا دیتا ہے، اس شرط پر کہ جب میں پیسے واپس کروں گا تو اپنے زیورات لے کر جاؤں گا، چونکہ مجبوری اور تعلقات کی وجہ سے ہم منع بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ شرعاً یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟ اگر درست ہے تو اگر خدانخواستہ کسی وقت اس کے زیورات گم ہو گئے تو کیا اس کا ضمان بھرنا لازمی ہوگا؟

مستفتی: بھائی شفیق الرحمٰن

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملے کو شریعت کی اصطلاح میں ''رھن'' کہا جاتا ہے اور یہ جائز ہے البتہ ضائع یا گم ہو جانے کی صورت میں تاوان آپ کے ذمہ ہوگا یعنی وہ زیورات مالیت میں آپ کے پیسوں کے برابر اگر تھے تو اس کے زیورات ضائع ہو گئے اور آپ کو قرض کی واپسی کے مطالبہ کا حق حاصل نہیں رہے گا اور اگر مالیت میں زیادہ تھے تو زائد تاوان آپ کے ذمے ہوگا اور مالیت میں زیورات قرضہ سے اگر کم تھے تو زائد رقم کا آپ مطالبہ کر سکیں گے۔

لما فی الفقہ الحنفی فی ثوبہ الجدید:(۲/۱۱۲،دار القلم دمشق)

وصح الرھن بالدین ولو موعودا بأن رھن لیقرضہ کذا کألف مثلا فلو دفع بہ بعض ما وعدہ بہ او امتنع عن دفع الباقی لایجبر علیہ فالرھن بالدین الموعود مقبوض علی سوم الرھن، والجدیر بالذکر أن الرھن الموعود لایلزم الوفاء بہ۔ فاذا ھلک ھذا الرھن فی ید المرتھن کان مضمونا علیہ بما وعد من الدین۔

ولما فی الھدایۃ:(۲/۵۱۰،۵۱۱،طبع رحمانیہ لاھور)

ولا یصح الرھن الا بدین مضمون لان حکمہ ثبوت ید الاستیفاء والاستیفاء یتلو الوجوب ...وھو مضمون بالاقل من قیمتہ ومن الدین فاذا ھلک فی ید المرتھن وقیمتہ والدین سواء صار المرتھن مستوفیا لدینہ وان کانت قیمۃ الرھن اکثر فالفضل امانۃ۔ فان کانت اقل سقط من الدین بقدرہ رجع المرتھن بالفضل لان الاستیفاء بقدر المالیۃ۔

ولما فی البزازیۃ علی الھندیۃ:(۶/۵۵،طبع رشیدیہ)

قال للبائع امسک ھذا الثوب حتیٰ اعطیک الثمن فھو عندنا رھن ولو قال امسکہ بمالک حتی اعطیک کان رھنا بلاخلاف لان الامساک بالمال تفسیر الرھن۔

ولما فی التنویر مع الدر:(۶/۴۹۷،طبع سعید کراچی)

(وان قال)المشتری (لبائعہ)وقد اعطاہ شیئا غیر مبیعہ (امسک ھذا حتی اعطیک الثمن فھو رھن)لتلفظہ بما یفید الرھن، والعبرۃ للمعانی ...وفی الشامیۃ بخلاف ما اذا قال امسکہ بدینک او بمالک، لانہ لما قابلہ بالدین فقد عین جھۃ الرھن، قلنا لما مدہ الی وقت الاعطاء علم ان مرادہ الرھن۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۱۵ جمادی الثانیہ ۱۴۲۵ھ

فتویٰ نمبر: ۲۱۸۷

﴿اشیاءِ منقولہ کے رہن کا طریقہ وحکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے ایک گاڑی شوروم والے سے قسطوں پر لی اور گارنٹی مانگنے پر اسی گاڑی کے کاغذات بطور رہن کے شوروم والے کے پاس رکھوادیئے جبکہ گاڑی راہن (زید) کے قبضے میں ہے اور ان دونوں کے درمیان یہ بات بھی طے ہوچکی ہے کہ اگر گاڑی والے نے قسطیں وقت پر جمع نہ کروائیں تو شوروم والے کو گاڑی بیچ کر اپنا قرضہ وصول کرنے کا اختیار ہوگا، آیا یہ معاملہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو درست صورت بتائیں، نیز یہ بھی بتلائیں کہ زید گاڑی آگے بیچ سکتا ہے یا نہیں؟

مستفتی: اسلام علی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں مذکورہ معاملہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ فقط کاغذات پر قبضہ گاڑی پر قبضہ نہیں ہے۔ البتہ اس کی درست صورت ایک یہ ہوسکتی ہے کہ گاڑی کا قسطوں پر سودا کرنے خریدار گاڑی اور کاغذات پر ایک بار قبضہ کرے پھر دوبارہ شوروم والے کے پاس گاڑی کاغذات سمیت بطور رہن رکھیں تو یہ رہن صحیح ہوگا، اب شوروم والا اگر چاہے تو زید کو تبرعاً گاڑی استعمال کے لئے دے سکتا ہے اور مقررہ وقت پر رقم نہ ملنے کی صورت میں شوروم والے کو چاہیے کہ عدالت میں رجوع کرے، قاضی معاملے کی تحقیق کرکے زید کو رقم ادا کرنے کا حکم کرے گا، ادا نہ کرسکے تو گاڑی بیچنے کا حکم دے گا اگر زید انکار کرے تو قاضی خود گاڑی فروخت کرکے باقی رقم زید کو دے گا اور گاڑی جب تک رہن میں ہے، اسکی بیع مرتہن کی اجازت پر موقوف ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲۱۷/۶، طبع سعید)

ولو كان ذلك الشيء الذي قال له أمسكه هو(المبيع)الذي اشتراه بعينه لو(بعد قبضه) لأنه حينئذ يصلح أن يكون رهنا بثمنه(ولو قبله لا)يكون رهنا،لأنه محبوس بالثمن كما مر.

وفي الشامية:(قوله لأنه حينئذ يصلح)اى لتعين ملكه فيه حتى لو هلك يهلك على المشتري ولا ينفسخ العقد(قوله لأنه محبوس بالثمن)اى ضمانه يخالف ضمان الرهن فلا يكون مضمونا بضمانين مختلفين لاستحالة اجتماعهما حتى لو أمسك المبيع حتى أعطيك الثمن قبل القبض فهلك انفسخ البيع زيلعي.

ولمافي التنوير مع الدر:(۱۵۰/۶ طبع سعید)

(و) القاضي يحبس الحر المديون ليبيع ماله لدينه وقضى دراهم دينه من دراهمه—

(۱)(يبيع القاضي (عرضه ولا عقاره)للدين(خلافا لهما)به)اى بقولهما ببيعهما للدين (يفتى)

ولمافي القدوري:(ص۲، طبع رشیدیه)

وإن باع الراهن بغير إذن المرتهن فالبيع موقوف فإن أجازه المرتهن جاز وإن قضاه

الراهن دينه جاز أيضا.

ولما فى الهداية:(۴/۱۴۲،طبع رحمانيه)

واذاثبت الحق عندالقاضى وطلب صاحب الحق غريمه لم يعجل بحبسه.... الخ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: نثار احمد غفرلہ ولوالدیہ

۲۹صفر الخیر۱۴۳۲ھ فتوی نمبر:۳۰۶۲

﴿رہن میں مرہونہ چیز کے مالک بننے کی شرط لگانے سے معاملہ فاسد ہو جاتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرے ایک جاننے والے کو پانچ ہزار روپے کی ضرورت پیش آئی،اس نے مجھ سے اس رقم کا مطالبہ کیا،میں نے اس کا ذاتی موبائل فون رکھ کر اس سے کہا کہ میں پانچ ہزار روپے تمہیں اس شرط پر دیتا ہوں کہ اگر فلاں تاریخ تک تم نے مجھے میرے پیسے واپس نہ کیے تو تمہارا یہ موبائل میرا ہو جائیگا،پوچھنا یہ ہے کہ اس شخص کے مقررہ دن تک پیسے ادا نہ کرنے کی صورت میں میرا اس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ صورت مسؤلہ میں آپ کے جاننے والے کا آپ کے پاس موبائل فون رکھنا گروی ہے اور جس کے پاس گروی رکھی جاتی ہے اس کو شرعاً اس وقت تک گروی پر قبضہ کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے جب تک کہ وہ اپنا قرض یا دین وصول نہ کرلے شرعاً اس کو مالک بننے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔

سوال میں ذکر کردہ صورت کے بارے میں فقہاء کرام کی عبارات میں صراحت ملتی ہے کہ اس طرح کے معاملات زمانہ جاہلیت میں ہوتے تھے اور اسلام نے اس قسم کے معاملات سے منع کیا ہے اور شرعی اعتبار سے چونکہ یہ معاملہ فاسد ہے،لہٰذا آپ کو چاہیئے کہ جلد از جلد اس معاملہ کو ختم کریں اور اپنے قرض کی وصولی پر موبائل اس کے مالک کو واپس لوٹادیں۔

لما فى الهداية:(۴/۶۲،رحمانيه)

الكتابة والاجارة والرهن بمنزلة البيع تبطل بشروط الفاسدة.

ولما فى المبسوط:(الجزء۲۱/ص۶۶،طبع دارالمعرفةبيروت)

لايغلق الرهن فان احدامن اهل اللغة لايفهم منه هذا اللفظ بقى الضمان على المرتهن وذكر الكرخى ان اهل العلم من السلف رحمهم الله كطاوس وابراهيم وغيرهما اتفقوا: ان المرادلايحبس الرهن عندالمرتهن احتباسالايمكن فكاكه بان يصير مملوكا......

والدليل عليه ما روى عن الزهرى قال:كانوافى الجاهلية يرتهنون ويشترطون على

الراهن ان لم يقض الدين الى وقت كذا فالرهن مملوك للمرتهن فابطل رسول الله ﷺ ذلک بقوله لا يغلق الرهن وسئل عن سعيد بن المسيب عن معنى هذا اللفظ فقيل اهو قول الرجل ان لم يات بالدين الى وقت كذا فالرهن بيع لي في الدين فقال نعم. هكذا ايضاً في الكفاية على شرح الهداية:(۱۰/۳۸،طبع رشيديه) وايضا في مجمع الانهر:(۴/۲۴۲،طبع المنار) وهكذا ايضا في بداية المجتهد:(ص ۵۲۶،طبع رشيديه) ولما في بدائع الصنائع:(۶/۱۲۱،طبع ايچ ايم سعيد)

(وجه)قولهما ان جعل الرهن بالدين حال قيامه من اعمال الجاهلية جاء الاسلام وابطله الخ.

ولما في التنوير مع الدر:(۶/۵۲۶،طبع سعيد)

(كل حكم)عرف (في الرهن الصحيح فهو الحكم في الرهن الفاسد) كما في العمادية، قال:وذكر الكرخي ان المقبوض بحكم الرهن الفاسد يتعلق به الضمان وفيها أيضا (وفي كل موضع كان الرهن مالا والمقابل به مضمونا الا انه فقد بعض شرائط الجواز) كرهن المشاع(ينعقد الرهن)لوجود شرط الانعقاد ولكن (بصفة الفساد) كالفاسد من البيوع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۲۰ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۲۳

﴿اگر رھن کو تیسرا آدمی حلاک کرے تو کیا حکم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک آدمی نے دوسرے سے دس ہزار قرض لیا، اور اپنی سائیکل بطور رھن دائن کے پاس رکھی بعد میں کسی آدمی نے سائیکل کو خراب کر دیا، تو اب راھن کی سائیکل کا کون ذمہ دار ہے مرتھن یا تیسرا آدمی جس نے سائیکل خراب کی ہے، اگر سائیکل کی قیمت میں کمی آگئی ہو تو کیا دین پر اثر پڑے گا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مرتھن کو چاہیے کہ اس تیسرے آدمی سے ضمان لے اور ضمان میں حلاک اور خراب کرنے والے دن کا اعتبار ہوگا پھر یہ قیمت اس مرھونہ چیز کی جگہ رھن ہوگی،

البتہ اگر اس مرھونہ چیز کی قیمت میں فرق آگیا ہو، مثلاً جب رھن رکھی تھی اس وقت سائیکل کی قیمت سات ہزار تھی اور اب ہلاک یا خراب ہونے والے دن پانچ ہزار قیمت ہے، تو مرتھن پانچ ہزار کا ضمان لیگا اور اپنے پاس رھن کے طور پر رکھ لے گا اور دو ہزار کا نقصان دین سے پورا کیا جائیگا، کیونکہ رھن مرتھن کے پاس جو مضمون ہوتا ہے وہ اسی قیمت کے ساتھ مضمون ہوتا ہے، جو اس کے قبضہ والے دن ہوتی ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۶/۵۱۰،طبع: سعید)

(او)الرهن(ان اتلفه اجنبی)ای غیر الراهن(فالمرتهن یضمنه)أی المتلف (قیمته یو م هلک وتکو ن)القیمة (رهنا عنده)لما مر

ولما فی الرد المحتار:(۶/۵۱۰،طبع:سعید)

(قوله فالمرتهن یضمنه)اشار الی ان المرتهن الخصم فی تضمینه کما فی الهدایة (قوله قیمته یو م هلک)فلو کانت قیمته یوم خمس مائة وقد کا نت یو م الرهن الفاً کالدین ضمن خمسمائة وصا رت رهنا و سقط من الدین خمسما ئة کانها هلکت بآفة

ولما فی البحر الرائق:(۸/۲۶۷،طبع: سعید

وان اتلفه اجنبی فالمر تهن یضمنه قیمته وتکو ن (رهنا عنده)یعنی ان المر تهن هو الخصم فی تضمینه قیمته فتکو ن رهنا عنده لا نه احق بعین الر هن حا ل قیا مه فکذا فی استر دادما قا م مقا مه والواجب فی هذا المستهلک قیمته یو م هلک با ستهلا که بخلاف ضما ن المر تهن وقد تقدم بیا نه حتی لو کانت قیمته یو م الاستهلاك خمسمائة ویو م الارتها ن الفاغرم خمسما ئة وکانت رهناوسقط من الدین خمسمائة لان المعتبر فی ضما ن المر تهن الرهن یوم قبضه

ولما فی تبیین الحقائق:(۷/۱۸۶ طبع: سعید)

قال رحمه الله تعالی (وان اتلفه اجنبی فالمر تهن یضمنه قیمته ویکو ن رهنا عنده)ای المر تهن هو الخصم فی تضمینه قیمته ثم تکو ن القیمة رهنا عنده لانه احق بعین الرهن حال قیامه ،فکذا فی استر داد ما قام مقا مه ،والواجب فی هذاالمستهلک وقیمته یو م هلک باستهلا که بخلاف ضمانه علی المرتهن فانه یعتبر قیمته یوم القبض حتی لو کا نت قیمته یو م الا ستهلاك خمسمائةویوم الارتها ن الفاغرم خمسمائة وکانت رهنا وسقط من الدین خمسمائة لان المعتبر فی ضما ن الرهن یوم قبضه لانه دخل به فی ضما نه لانه قبض استیفاء الا انه یتقرر عند الهلاك

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاءالحق المکی

۲۷ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۷۳

﴿كتاب الشفعة﴾

﴿حق شفعہ کی شرائط﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ اگر والدین اپنی زمین فروخت کریں تو اولاد کو حق شفعہ حاصل ہوگا یا نہیں؟ نیز حق شفعہ کب حاصل ہوتا ہے؟ اور اس کی شرائط کیا ہیں؟ مستفتی: خالد

﴿جواب﴾ حق شفعہ محض قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ حق اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو بائع کے ساتھ نفس مبیع یا حق مبیع مثلاً راستہ اور پانی وغیرہ میں شریک ہو یا اس کی ملک کا بائع کی ملکیت (مبیع) کے ساتھ اتصال ہو، حق شفعہ کی اہم شرائط درج ذیل ہیں:

(۱) شفیع وہی قیمت ادا کرنے پر راضی ہو جس میں مالک نے اپنی جائداد فروخت کی ہو۔ (۲) حق شفعہ غیر منقولہ جائداد میں حاصل ہوتا ہے۔ (۳) جس جائداد پر شفعہ کیا جارہا ہو وہ بائع کی ملک ہو۔ (۴) بائع نے شفیع کے علاوہ وہ جائداد کسی اور کو مالی معاوضہ کے عوض فروخت کی ہو۔ (۵) بائع کا حق اور ملکیت کلی طور پر مبیع سے زائل ہو۔ (۶) جس ملک کے ذریعے شفیع حق شفعہ دائر کرے وہ بیع کے وقت شفیع کی ملک ہو۔ (۷) بیع پر شفیع راضی بھی نہ ہو۔ (۸) بیع کا علم ہوتے ہی شفیع نے شفعہ کا مطالبہ کیا ہو اور قاضی کے فیصلہ تک مطالبہ پر قائم ہو۔

لما في التنوير مع الدر: (۲۱۶/۶، طبع ایچ ایم سعید)

(هي تمليك البقعة جبرا على المشتري بما قام عليه) بمثله لو مثليا والا بقيمته (وسببها اتصال ملك الشفيع بالمشتري) بشركة او جوار (وشرطها ان يكون المحل عقارا)

وفي الشامية: (قوله بشركة او جوار) متعلق باتصال وشمل الشركة في البقعة والشركة في الحقوق۔۔۔ (قوله وشرطها الخ) المراد بالعقار هنا غير المنقول۔۔۔ ويشترط كونه مملوكا۔۔۔ وكون العقد معاوضة، وزوال ملك البائع عن المبيع فلا شفعة في البيع بخيار، وزوال حق البائع فلا شفعة في شراء فاسد، وملك الشفيع لما يشفع به وقت الشراء، وعدم الرضاء من الشفيع بالبيع ولو دلالة.

ولما في التنوير مع الدر: (۲۲۲/۶-۲۲۵-۲۲۶، طبع سعيد)

(ويطلبها الشفيع في مجلس علمه بالبيع) وان امتد المجلس كالمخيرة هو الاصح درر وعليه المتون، خلافا لما في جواهر الفتاوى انه على الفور وعليه الفتوى۔۔۔ (ثم) يشهد (على البائع لو) العقار (في يده او على المشتري وان) لم يكن ذا يد لانه مالك او عند العقار۔۔۔ ثم بعد هذين الطلبين يطلب عند قاض۔۔۔ (وهو) يسمى (طلب تمليك وخصومة و) بتاخيره مطلقا) بعذر وبغيره شهرا او اكثر (لا تبطل الشفعة) حتى يسقطها

بلسانه(به يفتي) وهو ظاهر المذهب، وقيل يفتي بقول محمد ان اخره شهراً بلا عذر بطلت كذا في الملتقى، يعني دفعاً للضرر (قوله يعني دفعاً للضرر) بيان لوجه الفتوى بقول محمد قال في شرح المجمع: وفي جامع الخاني: الفتوى اليوم على قول محمد لتغير احوال الناس في قصد الاضرار اه، وبه ظهر ان الفتاء هم بخلاف ظاهر الرواية لتغير الزمان فلا يرجح ظاهر الرواية عليه وان كان مصححا ايضاً كما مر في الغصب في مسئلة صبغ الثوب بالسواد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ   فتوی نمبر: ۲۶۳۶

﴿شفیع مشتری سے تعمیر وغیرہ اکھاڑنے کا مطالبہ کرسکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ ایک آدمی نے اپنی زمین بیچی اور مشتری نے زمین میں تعمیر کر لی، درخت اور کھیتی بھی لگا دی، اس کے بعد ایک آدمی نے شفعہ کا دعوی کر دیا تو اب مشتری کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟ شفیع اس سے تعمیر اور کھیتی وغیرہ کے اکھاڑنے کا مطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں؟   مستفتی: مدثر فاروق

﴿جواب﴾ شفیع کو اس سودا کا اگر علم تھا اس کے باوجود دعوی کرنے میں اس نے تاخیر کی تو اس کا حق شفعہ باطل ہوگیا، اب جج اگرچہ اس کے حق میں فیصلہ کردے شریعت کی رو سے اس کا کوئی حق نہیں بنتا، البتہ شفیع کو بعد میں اگر سودا کا علم ہوا ہے اور جج نے بھی اس کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے تو ایسی صورت میں وہ مشتری سے مطالبہ کرسکتا ہے کہ تعمیر اور درخت وغیرہ اکھاڑلو اور زمین میرے حوالے کرو البتہ تعمیر اور درخت اکھاڑنے سے زمین کو اگر نقصان پہنچتا ہو تو شفیع کو اختیار ہے چاہے تو زمین کو اس کی قیمت اور تعمیر و درخت کو کھڑے ہوئے ہونے کی حالت میں جو ان کی قیمت بنتی ہے اس کے حساب سے لے لے اور چاہے تو مشتری کو تعمیر و درخت اکھاڑنے پر مجبور کر دے، اور زمین کا نقصان قبول کرلے، البتہ اگر مشتری نے زمین میں کھیتی لگادی ہے تو اس صورت میں کھیتی تیار ہونے تک شفیع کو انتظار کرنا پڑیگا، مشتری کو کھیتی اکھاڑنے پر مجبور نہیں کیا جائیگا، اور فصل تیار ہونے تک جو اضافی مدت درکار ہوگی، مشتری سے اسکا کوئی تاوان یا اجرت نہیں لی جائیگی۔

لما في التنوير والدر: (۶/۲۲۴، طبع: سعید)

(ويطلبها الشفيع في مجلس علمه) من مشتر او رسوله او عدل او عدد (بالبيع) وان امتد المجلس كالمخيرة هو الاصح......(وهذا) الطلب لا بد منه حتى لو تمكن ولو

بکتاب او رسول ولم یشھد بطلت شفعتہ (وان لم یتمکن) منہ (لا) تبطل

ولما فی التنویر والدر:(۲۲۲/۶ طبع: سعید)

(و) بما خذ الشفیع (بالثمن وقیمۃ البناء والغرس) مستحق القلع کما مر فی الغصب (لو بنی المشتری او غرس او کلف) الشفیع (المشتری قلعھا) الا اذا کان فی القلع نقصان الارض فان الشفیع لہ ان یاخذھا مع قیمۃ البناء والغرس مقلوعۃ غیر ثابتۃ قھستانی

ولما فی الھندیۃ:(۲۲۳/۵ طبع:قدیمی کتب خانہ)

ان بنی المشتری او غرس او زرع ثم حضر الشفیع یقضی لہ بالشفعۃ ویجبر المشتری علی قلع البناء والغرس فی تسلیم الساحۃ الی الشفیع الا اذا کان فی القلع نقصان بالارض فللشفیع الخیار ان شاء اخذ الارض بالثمن والبناء والغرس بقیمتہ مقلوعاً وان شاء اجبر المشتری علی القلع وھذا جواب ظاھر الروایۃ واجمعوا ان المشتری لو زرع فی الارض ثم حضر الشفیع انہ لا یجبر المشتری علی قلعہ ولکن ینتظر ادراک الزرع ثم یقضی لہ بالشفعۃ فیاخذ الارض بجمیع الثمن کذا فی البدائع ،ثم اذا ترک الارض فی ید المشتری یترک بغیر اجر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٰنکی

۲۷ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۲۹۶

﴿دھوکہ دہی سے حق شفعہ ساقط نہیں ہوتا﴾

﴿سوال﴾ ہمارے گھر کے متصل ایک گھر فروخت ہو رہا تھا، ہم اسکو لینا چاہتے تھے لیکن بائع نے کسی اور کو فروخت کر دیا اور لینے والے نے یہ ظاہر کر دیا کہ میں اس میں مدرسہ بنانا چاہتا ہوں اور اس نے ایک سال تک اس میں حفظ و ناظرہ کی کلاس بھی لگائی، ہم مدرسہ بنانے پر خوش ہوئے اور اس وجہ سے شفعہ نہیں کیا لیکن ایک سال بعد اس نے مدرسہ ختم کیا اور خود اس میں رہائش اختیار کی، مدرسہ صرف دکھلانے کیلئے قائم کیا تھا کہ شفعہ کرنے والوں کو مدرسہ پسند ہے، اس وجہ سے شفعہ نہیں کریں گے اور ہم نے اس وقت صرف اسی وجہ سے شفعہ کیا بھی نہیں لیکن مشتری نے دھوکہ دہی سے کام لیا تو کیا ہم کو اب حق شفعہ حاصل ہے یا نہیں؟ مستفتی رضوان اللہ

﴿جواب﴾ شریعت نے پڑوسی کو شفعہ کا حق اس لئے دیا ہے تاکہ اسے اپنے پسند کے مطابق پڑوسی ملے اور ایذا اور ساں پڑوسی سے واسطہ نہ پڑے مذکورہ صورت میں خریدار نے شروع میں یہ دکھایا کہ وہ خود رہائش پذیر نہیں ہوگا، مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہے اور آپ نے اسی بنیاد پر شفعہ کا دعوی نہیں کیا کہ آپ کے پڑوس میں دینی ادارہ قائم ہوگا لیکن بعد میں وہ شخص خود آپ کا پڑوسی

بننے کی کوشش کرتا ہے، آپ اس کے پڑوسی ہونے پر راضی نہیں ہیں، اس لئے آپ کا حق شفعہ باقی ہے، آپ شفعہ کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

لما فی البحر الرائق:(۱۴۲/۸،طبع سعید)

(وان قیل لہ ان المشتری فلان فسلم ثم ظہر انہ غیرہ فلہ الشفعۃ)لتفاوت الناس فی الاخلاق فمنہم من یرغب فی معاشرتہ ومنہم من یجتنب مخافۃ شرہ فالتسلیم فی حق البعض لایکون فی حق غیرہ---قال محمدؒ فی الجامع الصغیر ولوقال الشفیع سلمت الشفعۃ فی ہذہ الدار ان کنت اشتریتہا لنفسک وقد اشتراہالغیرہ فہذا لیس بتسلیم وذلک لان الشفیع علق التسلیم بشرط وصح ہذا التعلیق۔

ولما فی بدائع الصنائع:(۲۰/۵،طبع سعید)

ولواخبران المشتری زیدفسلم ثم تبین انہ عمروفہوعلی شفعتہ لان التسلیم للامن عن الضرروالامن عن ضررزیدلایدل علی الامن عن ضررعمرولتفاوت الناس فی الجوار۔

ولما فی الہندیۃ:(۱۸۴/۵،طبع رشیدیہ)

واذا قیل لہ ان المشتری فلان فسلم ثم علم انہ غیرہ فلہ الشفعۃ۔

ولما فی فقہ الاسلامی وادلتہ:(۴۹۲۱/۶،طبع رشیدیہ)

لکن یشترط لسقوط ہذاالحق ان لا یکون ہناک تدلیس اوخدیعۃ للشفیع لاسقاط الشفعۃ من طریق المشتری ،اوالثمن ،اوقدر المبیع فاذااخبران المشتری فلان---فسلم الشفعۃای اعرض عنہاثم تبین الحقیقۃوالواقع، بقی حقہ، وکان لہ الشفعۃ ؛لانہ انماترکہالغرض بان خلافہ ولم یترکہ رغبۃ عنہ۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:فرمان اللہ غفرہ اللہ

کیم جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر:۹۳۳

﴿وقف شدہ زمین پر شفعہ کا دعویٰ کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنی ایک زمین یہاں مقامی مدرسہ کے لئے وقف کردی لیکن میرے ایک پڑوسی نے اس پر شفعہ کا دعویٰ کیا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ وقف شدہ زمین پر کسی کو شفعہ کا حق حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ حق شفعہ کے ثبوت کے لئے مالی معاوضہ کا ہونا بنیادی شرائط میں سے ہے اور وقف میں یہ حقیقت مفقود ہوتی ہے اس میں واقف کا اصل مقصد اللہ کی رضامندی اور خوشنودی ہوتی ہے، لہٰذا مسجد یا مدرسہ کے لئے وقف شدہ زمین میں کسی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں۔

لما فی تنقیح الحامدیۃ:(۱۸۲/۲،طبع حقانیہ)

وفی التجرید لاشفعۃ فی الوقف ولا بجوارہ شرح المجمع لابن ملک من الشفعۃ ومثلہ فی التنویر.

ولما فی تنویر الابصار:(۲۱۲/۶،طبع سعید)

(هی تملیک البقعة جبرا علی المشتری بما قام علیه..... ولا شفعة فی الوقف ولا بجوارہ)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:اسرارعزیز عفی عنہ

ارجب المرجب ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۱۰۶۱

﴿شفعہ کا حق غیر مسلم کو بھی حاصل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے محلہ میں ایک شخص نے اپنا مکان فروخت کردیا،اس کے پڑوس میں غیر مسلم عیسائی کا مکان ہے اس نے مکان پر شفعہ کا دعویٰ کردیا،سوال یہ ہے کہ کیا غیر مسلم کو حق شفعہ حاصل ہے یا یہ صرف مسلمان پڑوسی کا حق ہے؟ مستفتی:جمیل احمد

﴿جواب﴾ حق شفعہ جس طرح ایک مسلمان پڑوسی کو حاصل ہے،اسی طرح غیر مسلم کو بھی قرب وجوار میں ہونے کی وجہ سے برابر یہ حق حاصل ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں اس عیسائی شخص کا شفعہ کا دعویٰ کرنا درست ہے۔

لما فی بدائع الصنائع:(۱۶/۵،طبع سعید)

واما اسلام الشفیع فلیس بشرط لوجوب الشفعة فتجب لاهل الذمة فیما بینهم وللذمی علی المسلم لان هذا حق التملک علی المشتری بمنزلة الشراء منه والکافر والمسلم فی ذلک سواء لانه من الامور الدنیویة وروی عن شریح انه قضی بالشفعة لذمی علی مسلم فکتب الی سیدنا عمرؓ فاجازہ وکان ذلک بمحضر الصحابةؓ فیکون ذلک اجماعا.

ولما فی قاضیخان علی هامش الهندیة:(۵۳۶/۳،طبع رشیدیہ)

والمسلم والکافر والکبیر والصغیر والذکر والانثی فی الشفعة لهم وعلیهم سواء.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالرزاق غفرلہ

۱۷رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۷۲۴

﴿زمین کے بدلے زمین خریدے تو شفیع پر زمین کی قیمت لازم ہوگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص زمین کے بدلے زمین خریدے اور کوئی اس پر شفعہ کرے تو شفیع کے ذمہ زمین کی قیمت لازم ہوگی یا وہ بھی بدلے میں زمین دے گا؟

مستفتی:وقار احمد مردان

﴿جواب﴾ زمین چونکہ ذوات القیم میں سے ہے لہذا صورت مسؤلہ میں شفیع کے ذمہ زمین

کی قیمت اداء کرنا لازم ہوگا۔

لما فی جوهرة النيرة: (۱/ ۳۶۴)

قوله واذا باع عقاراً بعقار اخذ الشفيع كل واحد منهما بقيمة الاخر هذا اذا كان شفيعا لهما جميعا اما اذا كان شفيعا لواحد منهما اخذه بقيمة الاخر.

ولما فی التنوير الابصار مع الدر: (۶/ ۲۳۱، طبع سعيد)

وفى الشراء بمثلى ياخذ بمثله وفى القيمى بالقيمة ففى بيع عقار بعقار ياخذ الشفيع كلا من العقارين بقيمة الاخر.

ولما فی الهداية: (۴/ ۴۲۰، كتاب الشفعة)

وان باع عقار بعقار اخذ الشفيع كل واحد منهمابقيمة الاخر لانه بدله وهو من ذوات القيم فيأخذه بقيمته.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۲۰ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۸۰۰

﴿زمین کے بدلے زمین کی بیع میں بھی حق شفعہ ثابت ہوتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر زمین کا تبادلہ زمین کے ساتھ کیا جائے تو کیا اس صورت میں بھی شفیع کو شفعہ کا حق حاصل ہوگا جس طرح فروخت کرنے میں حاصل ہوتا ہے یا کہ نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ زمین کے بدلے زمین لینا بھی بیع ہے۔ ایسے معاملہ میں ہر دونوں عوض ثمن اور مبیع قرار دیئے جا سکتے ہیں، سودا کی ایسی صورت اختیار کرنے سے شفیع کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ البتہ تبادلہ میں جس زمین کی بات ہوئی ہے اسکی مارکیٹ میں جو بھی قیمت بنتی ہے اتنی رقم شفیع کو اداء کرنا ہوگا۔

لما فی التنوير مع الدر (۶/ ۲۳۱، طبع سعيد)

(ففى بيع عقار بعقار ياخذ) الشفيع (كلا) من العقارين (بقيمة الآخر)

ولما فی الهداية (۴/ ۴۰۰، طبع رحمانية)

وان باع عقارا بعقار اخذ الشفيع كل واحد منهمابقيمة الآخر لانه بدله وهومن ذوات القيم فيأخذه بقيمته وكذافى البناية (۱۲/ ۶۰، طبع حقانية)

الجواب صحیح مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد روغانی

۱۰ جمادالاولی ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر ۴۱۳۰

﴿حق شفعہ کے بدلے عوض لینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شفعہ کا حق دار مشتری سے شفعہ کا عوض لیکر دستبردار ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: عالم زیب صاحب چارسدوی

﴿جواب﴾ شفعہ ایک مجرد حق ہے، جس کو شریعت نے شفیع کے دفع مضرت کے لئے جائز قرار دیا ہے، اب اگر شفیع اس حق شفعہ کے بدلے عوض لیکر نفع حاصل کرنا چاہے تو یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ رشوت ہے اور رشوت حرام ہے، کسی نے غلطی سے اگر عوض لیا ہو تو واپس کر دینا ضروری ہے اور شرعاً اس کا حق شفعہ بھی باقی نہ رہا۔

لما فی التنویر مع الدر: (۹/ ۳۵۱، طبع امدادیه)

(و) یبطلها (صلحه منها علی عوض) ای غیر المشفوع لما یاتی (وعلیه رده) لانه رشوة.

وفی الشامیة: (قوله ویبطلها صلحه منها علی عوض الخ) لانها لیست بحق متقرر فی المحل بل مجرد حق التملک فلا یصح الاعتیاض عنه ولا یتعلق..... ویصح الاسقاط عدایة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عزیز الرحمٰن چارسدوی

۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۴۳۵

﴿شفعہ سے بچنے کے لئے حیلہ کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ایک مکان بیچا، جس کی اصل قیمت متعاقدین کے درمیان بارہ (1200000) لاکھ روپیہ طے ہوئی لیکن شفعہ سے بچنے کے لئے انھوں نے حیلہ یہ اختیار کیا کہ بائع نے مشتری سے اصل قیمت کے ساتھ موبائل بھی لیا اور اس موبائل کی قیمت تین (300000) لاکھ روپیہ مقرر ہوئی گویا کہ یہ ظاہر کیا کہ مکان پندرہ (1500000) لاکھ روپیہ میں فروخت ہوا ہے جبکہ یہ بات واضح ہے کہ موبائل کی قیمت تین (300000) لاکھ روپیہ نہیں ہوسکتی۔

اب شفعہ کے بعد شفیع کے حق میں فیصلہ ہو جانے کی صورت میں کیا شفیع کو پورے پندرہ لاکھ روپے ادا کرنے ہونگے یا صرف اصل قیمت ادا کرے گا؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ شفعہ سے بچنے کیلئے حیلہ کرنا حنفیہ کے نزدیک جائز تو ہے مگر دو شرائط کے ساتھ: (۱) پڑوسی کو مبیع کی ضرورت نہ ہو۔ (۲) حیلہ ثبوت شفعہ سے پہلے کیا گیا ہو، ثبوت شفعہ کے

بعد حیلہ کرنا مکروہ ہے، چنانچہ صورت مسئولہ میں اگر پڑوسی کو مکان کی ضرورت نہیں ہے اور حیلہ بھی ثبوت شفعہ سے پہلے کیا گیا ہے تو شفیع کے حق میں فیصلہ ہو جانے کی صورت میں شفیع کو مکان کی طے شدہ قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

لما فی المبسوط :(۱۲/۱۲۱،طبع دار المعرفة بیروت)

(وھذا نوع حیلة) لتقلیل رغبة الشفیع فی الأخذ لسبب کثرة الثمن ومن ذلک ان یشتری الدار بالفین ثم یعطیه بها خمسین دینارا او یعطیه الف درھم وثوبا لا یساوی الألف فلا یتمکن الشفیع من أخذها الا بألفین وقل ما یرغب فی ذلک اذا کان ثمنها ألف درھم. والاشتغال بھذه الحیل لابطال حق الشفیع لا بأس به اما قبل وجوب الشفعة فلا اشکال فیه وکذلک بعد الوجوب اذا لم یکن قصد المشتری الأجزاء به وانما کان قصده الدفع عن ملک نفسه وقیل ھذا قول أبی یوسف فاما عند محمد یکره ذلک.

ولما فی التنویر مع الدر :(۶/۲۴۶،طبع سعید)

(تکره الحیلة لاسقاط الشفعة بعد ثبوتها وفاقا)... واما الحیلة لدفع ثبوتها ابتداء فعند أبی یوسف لا تکره ،وعند محمد تکره ،ویفتی بقول أبی یوسف فی الشفعة قنیه فی السراجیة بما اذا کان الجار غیر محتاج الیه ،واستحسنه محشی الاشباه.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :محمد کاشف عزیز

۱۱ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر :۲۲۸۲

﴿شفعہ میں شفیع پر وہی قیمت لازم ہوتی ہے جس پر پہلے سودا ہو چکا ہو﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کہ بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک کنال زمین کی قیمت عام طور پر ایک لاکھ روپے ہے، ہمارے گاؤں والے علاقہ غیر سے آنے والوں کو زمین نہیں بیچتے جس کی وجہ سے وہ لوگ مجبوراً زیادہ قیمت پر خرید لیتے ہیں، اب حال ہی میں میری زمین کے بالکل متصل زمین علاقہ غیر والے کو بیچی جارہی تھی کہ میں نے ان پر شفعہ کیا۔

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ میں اس زمین کو اسی قیمت سے خریدوں جو مشتری اور بائع نے باہمی رضامندی سے مقرر کی تھی یا جو عام قیمت ہے وہ ادا کروں (نوٹ) گاؤں والوں کے درمیان کوئی ایسا معاہدہ بھی نہیں ہوا ہے کہ ہم زمینیں علاقہ غیر والوں کو نہیں بیچیں گے۔ مستفتی شاہ فیصل

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ شریعت نے بائع اور مشتری کو باہمی رضامندی سے قیمت طے کرنے کا اختیار دیا ہے، سودا ہونے کے بعد خریدار اسی قیمت کا پابند ہے اور زمین کے سودا میں

شریعت میں اصل مشتری کے بجائے شفیع کو زمین وصول کرنے میں زیادہ حقدار قرار دیا ہے لیکن شفیع وہی قیمت ادا کرنے کا پابند ہوگا جو بائع اور مشتری میں طے پائی تھی۔

لما فی التنویر مع الدر:(۹/۳۱۶،طبع امدادیہ)

وشرعاً:(تملیک البقعة جبرا علی المشتری بما قام علیه) بمثله لو مثلیا،والا فبقیمته.

ولما فی البحر الرائق:(۸/۱۲۵،طبع سعید)

(هی تملک البقعة جبرا علی المشتری بما قام علیه)هذا فی الشرع.

ولما فی فقه الحنفی:(۲/۷۷،طبع دار الکلم الطیب بیروت)

والشفعة واجبة فی العقار اذا ملک بعوض هو مال،لأنها تملک بمثل ما تملک به المشتری.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:سلمان احمد

۱۲صفر الخیر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۱۸۹۱

﴿شفعہ کرنے والے کئی ہوں تو ہر ایک مستحق ہوگا﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب!میری زمین کے ساتھ میرے چچا زاد بھائی عبدالرحمٰن اور اسکی بہن کی زمین ملی ہوئی ہے،میں اپنی زمین عبدالرحمٰن کی بہن کو بیچنا چاہتا ہوں لیکن عبدالرحمٰن کا کہنا ہے کہ اگر تم نے اپنی زمین میری بہن کو فروخت کی تو میں جرگہ میں شفعہ کا دعوی دائر کروں گا جبکہ اس کی بہن کا بھی یہی کہنا ہے،اب وہ زمین میں نے عبدالرحمٰن کی بہن کو بیچ دی ہے اور اس نے شفعہ بھی دائر کر دیا ہے،پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس کا شفعہ کا دعوی دائر کرنا درست ہے؟

﴿جواب﴾ عبدالرحمٰن اور اسکی بہن دونوں آپکی زمین میں شرعاً اگر شفعہ کے حقدار ہیں اور اب آپ کے بیچنے کے بعد دونوں نے شفعہ کا مطالبہ بھی کر لیا ہے تو یہ زمین عبدالرحمٰن اور اسکی بہن کے درمیان برابر تقسیم ہوگی اور ہر ایک کے ذمہ زمین کی آدھی قیمت ادا کرنا لازم ہوگی۔

لما فی الفقه الاسلامی:(۶/۹۰۰،طبع رشیدیه)

وان کان الشفعاء من مرتبة واحدة کالشرکاء فی المبیع،قسم العقار المشفوع فیه بین الطالبین جمیعا بالتساوی بحسب عدد الرؤس لا بمقدار الملک أو السهام عند الحنفیة ، لاستواء هم فی سبب استحقاق الشفعة وهو الاتصال بالشرکة أو الجوار،أی لأنهم متساوون فی أصل الملک.

ولما فی الشامی:(۹/۳۲۰،طبع امدادیه)

(قوله بقدر رؤس الشفعاء)لاستواء هم فی استحقاق الکل لوجود علته فیجب الاستواء فی الحکم،وشمل ما لو کان المشتری أحدهم وطلب معهم فیحسب واحدا منهم ویقسم

المبیع ببنهم كمافی الوهبانیۃ وشروحها.

ولمافی الهندیۃ:(۱۷۸/۵،طبع رشیدیه)

(الباب السادس فی الدار اذا بیعت ولها شفعاء) ولوأن رجلا اشتری دارا وهو شفیعها ثم جاء شفیع مثله ،قضی القاضی بنصفها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۲۸

﴿باب احیاء الموات﴾

﴿غیر آباد زمین کو آباد کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں بعض لوگوں کی ذاتی زمین کے ساتھ ملی ہوئی، ایک زمین غیر آباد ہوتی ہے جس میں لوگ پودے وغیرہ لگا کر تصرّف کرتے ہیں اور یہ عرصہ دراز سے رواج ہے، یہ غیر آباد زمین عوام کی سمجھی جاتی ہے اور حکومتِ پاکستان کی باضابطہ قانونی تحویل میں بھی نہیں ہے اگرچہ یہ زمین عوام کی سمجھی جاتی ہے لیکن اس سے عوام کو خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا الا یہ کہ کوئی اس کو آباد کرے، اس کو آباد کرنے سے عوام کو کوئی نقصان بھی نہیں ہوتا، اس لئے آج تک کسی جرگہ نے اس کام کے خلاف فیصلہ نہیں کیا ہے۔ براہِ کرم بتادیا جائے کہ کیا ایسی صورت میں مذکورہ زمین میں تصرّف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ غیر آباد زمین میں اگر کوئی تصرف کرے حکومتِ وقت کی اجازت سے تو جائز ہے مثلاً پودا وغیرہ کسی نے لگایا یا اور کسی طرح سے اُس کو آباد کیا تو حکومت کی اجازت سے ایسا کرنا جائز ہوگا، حکومت منع کرے تو جائز نہ ہوگا۔

لمافی تنویر الابصار:(۱۰/۳-۴،طبع امدادیه)

(اذا احیا مسلم اوذمی ارضا غیر منتفع بها ولیست بمملوكة لمسلم ولاذمی لایسمع بها صوته ملكها عند ابی یوسف ان اذن له الامام فی ذلك)

ولمافی بدائع الصنائع:(۱۹۲/۶،طبع سعید)

فالارض الموات هی ارض خارج البلد لم تكن ملكا لاحد ولا حقاله خاصا فلا یكون داخل البلد مواتا اصلا وبعدا سطر قال وهل یشترط ان یكون بعیدا من العمران شرطه الطحاوی انه قال وما قرب من العامر فلیس بموات وكذاروی عن ابی یوسف ان ارض الموات بقعة لو وقف علیٰ ادناها من العامر رجل ،فنادیٰ باعلیٰ صوته لم یسمعه من العامر وفی ظاهر الروایة لان الموات اسم لما لاینتفع به فاذالم یكن ملكا لاحد

ولا حتا خاصا لم یکن منتفعا به کان بعیدا عن البلدۃ او قریبا منہا۔

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفا اللہ عنہ

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۱۹۴

﴿لا یجوز احیاء ارض فیہا حاجۃ المسلمین﴾

﴿سوال﴾ کان مرعا لنا فاخذہ رجل باعطاء الرشوۃ للرؤساء وقد ضاق علینا الامر فہل یجوز لنا ان نرعی فیہا دوابنا بدون اذنہم او جبرا وفیہا ذرعہم ؟

﴿جواب﴾ الاحیاء انما یکون فی الاراضی التی لا ینتفع بہا للذا لا یجوز احیاء ارض فیہا حاجۃ المسلمین ولا یملکہا بہذہ الطریقۃ فیجوز لکم الانتفاع بہذہ المرعی وما ذرعوا فیہا حقہم فان رضوا باخذ ما انفقوا فی الذرع فالذرع لکم والا فلکم قلع ذرعہم والمقلوع لہم.

لما فی الهدایۃ: (۴/۳۸۴ طبع رحمانیہ)

ولا یجوز احیاء ما قرب من العامر ویترک مرعی لاہل القریۃ ومطرحا لحصائدہم.

ولما فی شرح المجلۃ: (۱/۳۶-۲۷ طبع ماجدیہ)

فی المادۃ ۱۹: لا ضرر ولا ضرار...... وکذا فی المادۃ ۲۰: الضرر یزال.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد غفرلہ ولوالدیہ

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۲۲۱۷

﴿غیر آباد زمین کے ارد گرد پتھر رکھنے سے ملکیت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے علاقہ میں لوگ غیر آباد زمین کو اپنی ملکیت میں لانے کے لئے اسکے ارد گرد پتھر رکھدیتے ہیں اور پھر کئی سالوں تک وہ جگہ ویسی ہی رہتی ہے نہ خود تعمیر کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو اجازت دیتے ہیں، کیا صرف پتھر وغیرہ رکھنے سے ملکیت ثابت ہوجاتی ہے؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے کے لئے حکومت کی اجازت ضروری ہے یا حکومت کی اجازت کے بغیر بھی ملکیت ثابت ہوگی؟

﴿جواب﴾ غیر آباد زمین کو آباد کرنے کے لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک حکومت کی اجازت ضروری ہے لیکن صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک حکومت کی اجازت شرط نہیں اگر چہ اس

مسئلہ میں راجح قول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے تاہم جہاں امام نہ ہو اور غریب کے لئے اپنا حق وصول کرنا مشکل ہو تو وہاں صاحبین کے مذہب پر فتویٰ دیا جاتا ہے اور ظاہر حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے لیکن صرف بطور علامت پتھر وغیرہ رکھنے سے ملکیت ثابت نہ ہوگی۔

ملکیت میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس زمین کو قابل کاشت بنائے یا پھر اس پر کوئی تعمیر وغیرہ کردے اور قبضہ کی حیثیت تین سال تک رہتی ہے یعنی تین سال کے گزرنے کے باوجود وہ آباد نہ کرے تو حکومت والے یہ زمین کسی دوسرے کو بھی دے سکتے ہیں۔

لما فی جامع الترمذی:(۱/۱۹۹-۱۶۷،طبع فاروقی ملتان)

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من احیا ارضا میتة فهی له.

ولما فی الدر المختار:(۶/۴۳۳،طبع سعید)

وقول الامام هو المختار، وتبعه فی الخانیة حیث قدمه کعادته وبه اخذ الطحاوی وعلیه المتون.

ولما فی تبیین الحقائق:(۷/۶،طبع سعید)

قال رحمه الله (ومن احیاه باذن الامام ملکه) وهذا عند ابی حنیفة رحمه الله وقالا یملکه من احیاه ولا یشترط فیه اذن الامام لقوله علیه السلام من عمر ارضا لیست لاحد فهو احق بها رواه احمد والبخاری وقال علیه السلام من احیا ارضا میتة فهی له رواه احمد والترمذی وصححه ولانه مباح سبقت یده الیه فکان احق به الخ

ولما فی الهندیة:(۵/۳۸۹،طبع رشیدیه)

والملک فی الموات یثبت بالاحیاء باذن الامام عند ابی حنیفة رحمه الله وعند ابی یوسف ومحمد رحمهما الله یثبت بنفس الاحیاء— ومن احیا ارضا میتة بغیر اذن الامام لا یملکها عند ابی حنیفة وقالا صاحباه یملکها.

ولما فی التنویر مع الدر:(۶/۴۳۳،طبع سعید)

(ومن أحیا ارضا— ومن حجر ارضا) ای منع غیره منها (بوضع علامة من حجر او غیره ثم اهملها ثلاث سنین دفعت الی غیره وقبلها هو احق بها وان لم یملکها) لانه انما یملکها بالاحیاء والتعمیر لا بمجرد التحجیر.

ولما فی الهندیة:(۲/۳۸۶،طبع رشیدیه)

ومن حجر ارضا لا یملکها لانه لیس باحیاء فی الصحیح لان الاحیاء جعلها صالحة للزراعة والتحجیر بوضع علامة من حجر او بحصاد ما فیها من الحشیش والشوک وتنقیة عشبها وجعله حولها او باحراق ما فیها من الشوک وکل ذلک لا یفید الملک لکنه هو اولیٰ بها فلا تؤخذ الی ثلاث سنین وهذا من طریق الدیانة واما فی الحکم فاذا احیاها غیره قبل مضیها ملکها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: عبدالوہاب لقمانی عفا اللہ عنہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۶۴۱

﴿کتاب الصید والذبائح والاضحیۃ والعقیقۃ﴾

﴿کیا عید کے دنوں میں شکار کرنا جائز نہیں ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام درجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ عید کے دنو ں میں ہماری چھٹیاں ہوتی ہیں۔ان دنوں میں ہم پرندوں اور مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں۔ہمارے علاقے کے بعض لوگوں کا کہنا ہے۔کہ عید کے دنوں میں شکار کرنا جائز نہیں۔اسلئے کہ اُن کی بھی عید ہوتی ہے۔آپ حضرات شریعت کی روسے جواب دیکر ممنون فرمائیں کہ ان لوگوں کا کہنا کہاں تک درست ہے؟ مستفتی: شریف اللہ خان سواتی

﴿جواب﴾ شکار کرنا ضرورت کی غرض سے ہر وقت جائز ہے۔ ہاں حالت احرام میں اسی طرح حرم میں شکار کی ممانعت ہے۔لیکن مچھلی کا شکار حالت احرام میں بھی جائز ہے۔لہذا یہ غلط سوچ ہے کہ عید کے دنوں میں شکار منع ہے۔

لما في تفسير المظهري:(۵/۳طبع رشيدیہ)

تحت قوله غير محلي الصيد،يحتمل المصدر والمفعو ل (وبعد اسطر)ويرد عليه ان حل الانعام غير متقيد بحالة الاحرام،حالة الامتناع عن الصيدبل حلا ل في جميع الاحوال، وكذا في تفسير روح المعا ني مع تغيير يسير،على صلح(۳۰۶) ولقوله تعالیٰ واذا حللتم فاصطادوا،

ولما في المحيط:(۲۲۲/۸،طبع ادارة القرآن)

وهذا الفصل لبيان الشرائط في الصائد، فنقول :ينبغي أن يكون الصائد من اهل الذكاة:(وبعد اسطر) ويشترط مع ذلك ان لايكون محرماوان لايكون في الحرم.

ولما في التنوير مع الدر:(۲۶۱/۶،۲۶۲،طبع سعيد)

(هومباح) بخمسة عشرشرطا مبسوطة في العناية وسنقره في اثناء المسائل(الا) لمحرم في غير الحرم(قوله في غيرالحرم، الاولیٰ ان يقول او في الحرم ليشمل الصورالثلاث وهي ضد المحرم في الحل أو الحرم أو الحلال في الحرم.أيضا وحيث كان الاصطيا د نوعا منها دل على اباحة اتخاذه حرفة ولا سيما مع اطلاق الأدلة.

ولما في تفسير المظهري:(۱۸۵/۳،طبع رشيديہ)

أحل لكم صيد البحر أي الاصطياد من البحر وأيضا على صلح (۱۸۶) وحرم عليكم صيد البر ما دمتم حر ما قبل معنى الاية حرم صيد البر مطلقاعلى المحرم وان اصطاده حلال من غيرامر المحرم

ولما فی الدر:(۶/۴۳۲طبع سعید کتاب الحظر)

والمباح ماأجیز للمکلفین فعله وترکه بلا استحقاق ثواب وعقاب.

ولما فی النسائی:(۲۰۰:طبع قدیمی)

عن عبد الله بن عمروأن رسول الله ﷺ قال مامن انسان قتل عصفورافما فوقها بغیر حقها الاساله الله عزوجل عنها، قیل یارسول الله وماحقها قال یذبحها فیاکلها ولایقطع راسها یرمی بها،

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن صاحب عفااللہ عنہ　　　واللہ أعلم بالصواب: عمران الحق سواتی

۸صفر۱۴۳۵ھ　　　فتویٰ نمبر:۳۸۷۷

﴿سدھائے ہوئے کتے کے شکار کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں ''امام فخر الدین رازی'' لکھتے ہیں فقہ مالکی کے سوا دیگر تینوں فقہی مذاہب کی رو سے کتا نجس ہے۔ لیکن کتا معلم ہو، یعنی اسے شکار کرنے اور بکریوں کی رکھوالی کرنے کی تعلیم وتربیت دی گئی ہو تو اس کے احکام بدل جائیں گے؟ کیا علم حاصل کرنے کے بعد کتے کی ہیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ برائے کرم تفصیل سے بتائیں کہ اگر یہ ٹھیک ہے تو کیا اس کتے کے منہ میں پکڑے شکار کو کھانا حلال ہوگا؟ کیا یہ معلم کتا نجاست سے نجات حاصل کر لیتا ہے مزید یہ کہ کیا معلم کتا برتن یا پانی میں منہ ڈال دے تو اس کے لعاب کی وجہ سے برتن یا پانی ناپاک ہو جائیگا؟　　　مستفتی: نصیر احمد برخوداریہ

﴿جواب﴾ کتا تربیت یافتہ ہو یا غیر تربیت یافتہ اس کا لعاب بلا شبہ نجس ہے۔ تربیت وتعلیم کی وجہ سے لعاب کی نجاست کا حکم نہیں بدلتا تعلیم وتربیت کی وجہ سے کتے کے حکم میں صرف اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ وہ اگر شکار پر بسم اللہ کے ساتھ چھوڑا جائے پھر وہ شکار کو زخمی کر کے مالک تک پہنچا دے اور مالک کو ذبح کرنے کا موقع ملنے سے پہلے وہ شکار مر جائے تو مردار نہیں ہو گا۔ تربیت یافتہ کتے کا زخمی کرنا ذبح اضطراری کے حکم میں ہے، اور غیر تربیت یافتہ کتا اگر پکڑ لے اور شکار مر جائے تو مردار ہوگا اس کا کھانا جائز نہیں ہوگا۔ اس کا پکڑنا، زخمی کرنا ذبح اضطراری کے حکم میں نہیں ہے۔ باقی شکار کے گوشت کو کتے کے لعاب سے پاک کرنا، دھونا اور اس کی آلائش کو دور کرنا اپنی جگہ ضروری ہے اسی طرح کسی برتن میں منہ ڈال دے کتا معلم ہو یا غیر معلم تو اس کا دھونا بہر حال ضروری ہے۔

لما فی المشکوۃ(ص ۳۸۵) طبع قدیمی

عن ابی طلحۃ رضی اللہ عنہ قال قال النبی ﷺ لا تدخل الملائکۃ بیتا فیہ کلب و لا تصاویر

لما فی البخاری (۲/۸۲۳)طبع سعید

عن عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ قال سالت رسول اللہ ﷺ قلت انا قوم نصید بھذہ الکلاب فقال اذا ارسلت کلابک المعلمۃ و ذکرت اسم اللہ فکل مما امسکن علیک وان قتلن الا ان یأکل الکلب فانی اخاف ان یکون انما امسکہ علی نفسہ وان خالطھا کلاب من غیر ھا فلاتأکل.

لما فی فتح القدیر(۱/۱۱۲)طبع رشیدیہ

(سور الکلب نجس)ویغسل الاناء من ولوغہ ثلاثالقولہ علیہ الصلوۃ والسلام "یغسل الاناء من ولوغ الکلب ثلاثا"

ولما فی فتح القدیر(۱۰/۱۳۵)طبع. رشیدیۃ.

ولو ترکہ ناسیا حل ایضا علی ما بیناہ،وحرمۃ متروک التسمیۃ عامداً فی الذبائح،ولا بد من الجرح فی ظاھر الروایۃ لیتحقق الزکاۃ الاضطراری وھو الجرح فی ای موضع کان من البدن بانتساب ما وجد من الآلۃ الیہ بالاستعمال ..... (فظاھر الروایۃ)یرید روایۃ الزیادات فان قال:لو قتل الکلب او البازی الصیدمن غیر جرح لا یحل،و اشار فی الاصل الی انہ یحل،والفتوی علی ظاھر الروایۃ.

ولمافی حلبی الکبیر (ص ۱۹۲) سہیل اکیڈمی

(الکلب اذا اکل بعض عنقودالعنب یغسل ما اصاب فمہ ثلاثا)لتجنسہ بلعابہ کما یغسل الاناء من ولوغہ ثلثاً.

ولما فی بحر الرائق :(۱/۱۰۲ طبع سعید) و اما اذا اکل (الکلب)من شئی یغسل ثلاثا و یوکل

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۶۹۳

﴿کتا کسی بکری پر حملہ کر کے اس کا گوشت کھائے تو اس بکری کے گوشت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کتا کسی بکری پر حملہ کر کے اس کو زخمی کردے اور اس کا گوشت بھی کھالے لیکن بکری زندہ ہو اور بکری کا مالک اس کو ذبح کرلے تو کیا اس کا گوشت کھانا جائز ہوگا؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: مصوررشید کرک

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اگر بکری زندہ پائی گئی اور اس کو شرعی طریقے سے ذبح کیا گیا تو بکری کا گوشت کھانا جائز ہوگا، لیکن جس حصہ پر کتے نے کاٹا ہو یا زخمی کیا ہو اس جگہ

کو کاٹ کر پھینک دیا جائے گا اس لئے کہ کتے کا لعاب نجس بلکہ خطرناک زہر ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۳۰۸/۶،طبع: سعید)

"(ذبح)مریضة(فتحرکت اوخرج الدم حلت والاالان لم تدرحیاته) عندالذبح وان علم حیاته (حلت مطلقا)وان لم تتحرک ولم یخرج الدم وهذایأتی فی منخنقة ومتردیة ونطیحة والتی فقرالذئب بطنهافذکاة هذه الاشیاء تحلل وان کانت حیاتهاخفیفة وعلیه الفتوی لقوله تعالیٰ ــــ الاماذکیتم ــمن غیرفصل "۔

ولمافی العالمگیریة:(۲۹۱/۵،طبع:رشیدیه)

"ولوانتزع الذئب راس الشاة وهی حیة تحل بالذبح بین اللبة واللحیین قطع الذئب من الیة الشاة قطعة لایؤکل من الصبان"

ولمافی التنویر مع الدر،۲۲۲/۱۰،طبع: سعید

"(ویعتبرسؤربمسنر)اسم فاعل من اسار: ای ابقی لاختلاطه بلعابه ـــ(و) سؤر (خنزیر وکلب وسباع بهائم وشارب خمرفورشربهاوهرة فوراکل فارة نجس) مغلظ"۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد شعیب پشاوری

۱۴ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۹۶۱

﴿بارود کے ذریعہ شکار کردہ مچھلیاں حلال ہیں﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں عموماً لوگ مچھلیوں کے شکار کے لئے دریا میں بارود استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے کافی ساری مچھلیاں دھماکے کے سبب بے ہوش ہوکر دریا کے اوپر آجاتی ہیں جو کہ الٹی ہوئی ہوتی ہیں پھر ایک شکاری کتا ان کو پکڑ کر نکالتا ہے یا آدمی خود جا کر نکالتا ہے، کیا شکار کا یہ طریقہ شرعاً درست ہے؟ واضح رہے کہ دھماکے سے مچھلیاں چند لمحوں کے لئے بے ہوش ہوتی ہیں، نیز بارود کے قریب مچھلیاں مر بھی جاتی ہیں۔

﴿جواب﴾ مذکورہ طریقے سے شکار کی ہوئی مچھلیاں حلال ہیں کیونکہ ایک آفت کے سبب ان کی موت واقع ہوئی ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲۲۲/۹-۲۲۵،طبع امدادیه)

(ولا)یحل(حیوان مائی الاالسمک)الذی مات بآفةولومتولدافی ماء نجس ولوطافیة مجروحة،وهبانیة(غیرالطافی)علی وجه الماء الذی مات حتف انفه وهومابطنه من فوق،فلوظهره من فوق فلیس بطاف فیوکل کمایوکل مافی بطن الطافی ومامات بحرالماء اوبرده وبربطه فیه اوالقاء شیء فموته بآلة،وهبانیة.

وفی الشامیة:(وماماتت بحر الماء اوبرده)وهو قول عامة المشائخ وهواظهروارفق. تجنیس وبه یفتیٰ.شرنبلالیة عن منیة المفتی.

ولمافی الهندیة:(۵/۵۱۲،طبع قدیمی)

وماماتت من حرارة الماء اوبرودته اوکدورته ففیه روایتان روی عن ابی حنیفةؒوابی یوسف رحمهما الله تعالیٰ لایوکل.لان السمک لایموت بسبب برودة الماء وحرارته غالباً فیکون میتاًبغیر آفة ظاهرفلایحل کالطافی وروی عن محمدرحمه الله تعالیٰ یوکل لانه مات بآفةلانه قدیموت بسبب برودة الماء وکدورته فیحال بالموت علیه وهذاارفق بالناس،کذافی محیط السرخسی وعلیه الفتوی،کذافی جواهرالاخلاطی.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ والله اعلم بالصواب:محمد عزیز چترالی

۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر:

﴿بوجہ مجبوری بائیں ہاتھ سے ذبح کرنے میں کوئی حرج نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بچپن سے میرا بایاں ہاتھ زیادہ چلا ہے جس کی وجہ سے دائیں ہاتھ سے صحیح کام نہیں کرسکتا بلکہ خراب ہونے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے،جانور کو ذبح کرنا ہوتو بھی بائیں ہاتھ سے ذبح کرتا ہوں،پوچھنا یہ ہے کہ صورت مذکورہ میں بائیں ہاتھ سے ذبح کرنا ممنوع تو نہیں؟ مستفتی:عزت خان حتی پشاور

﴿جواب﴾ دائیں اور بائیں ہاتھ کی پہچان کرانا اور ہر ایک ہاتھ کے لائق کاموں کی عادت ڈالنا بچوں کی تربیت کا حصہ ہے جو کہ والدین کی ذمہ داری ہے،والدین نے اگر غفلت کی ہے اور موقع پر تربیت نہیں کی ہے تو اب آپ عاقل بالغ ہیں،لہٰذا خود اسکی عادت ڈالنے کی کوشش کرتے رہیں امید ہے دائیں ہاتھ میں بھی تیزی آجائیگی،البتہ ذبح چونکہ نازک کام ہے اور ابھی تک آپ نے دائیں ہاتھ چلانے کی عادت نہیں بنائی تو بائیں ہاتھ سے ذبح کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

لمافی صحیح البخاری:(۱/۱۱،طبع قدیمی)

حدثناسلیمٰن بن حرب قال حدثنا شعبة عن الاشعث بن سلیم عن ابیه عن مسروق عن عائشةرضی الله عنهاقالت کان النبی ﷺ یحب التیمن مااستطاع فی شانه کله فی طهوره وترجله وتنعله.

وفی حاشیته:علی مااستطاع(أی) مااستطاع ماامامرصول فهوبدل التیمن وامابمعنی مادام وبه احترازعمالایستطیع فیه التیمن.....الخ.

ولما فی فتح القدیر:(۹/۵۰۶،طبع رشیدیه)

لقوله علیه السلام ان الله تعالی کتب الاحسان علی کل شئ فاذاقتلتم فاحسنوا القتلة واذاذبحتم فاحسنوا الذبحة ولیحد احدکم شفرته ولیرح ذبیحته.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد شاکر اللہ

۱۹ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۷۳۲

﴿بے ہوشی کی حالت میں ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت حلال ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کوئی جانور سر پر چوٹ لگ جانے کی وجہ سے یا کسی دوائی وغیرہ کی وجہ سے بے ہوش ہو جائے اور اسی بے ہوشی کی حالت میں اسے ذبح کر دیا جائے تو کیا ایسے جانور کا گوشت کھانا جائز ہوگا؟　　　　مستفتی: مظفر زمان

﴿جواب﴾ بے ہوشی کی حالت میں حرکت اور چستی اگر چہ نہیں ہوتی لیکن حیات باقی ہوتی ہے اور ذبح کے وقت حیات خواہ تھوڑی سی ہی کیوں نہ ہو اگر باقی ہو تو حلال ہے اور اسکا گوشت کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لما فی البحر:(۸/۱۷۳،طبع سعید)

ان علم حیاته حل وان لم تتحرک ولم یخرج الدم یعنی اذاعلم حیاة الشاة وقت الذبح حلت بالذکاة تتحرک اولا خرج منها دم اولا کذا فی المحیط.

ولما فی التنویر مع الدر:(۹/۴۲۷،طبع امدادیه)

(ذبح شاة)مریضة(فتحرکت اوخرج الدم حلت والالا ان لم تدر حیاته)عندالذبح وان علم حیاته(حلت)مطلقا(وان لم تتحرک ولم یخرج الدم)وهذا یتأتی فی منخنقة ومتردیة ونطیحة والتی فقرالذئب بطنها فذکاة هذه الاشیاء تحلل وان کانت حیاتها خفیة وعلیه الفتوی.

ولما فی البدائع:(۵/۵۰،طبع سعید)

قیام اصل الحیاة فی المستأمن وقت الذبح قلت اوکثرت فی قول ابی حنیفةؒ وعندابی یوسفؒ ومحمدؒ لا یکتفی بقیام اصل الحیاة بل تعتبر حیاة مقدورة کالشاة المریضة والوقیذة والنطیحة وجرحة السبع اذالم یبق فیها الا حیاة قلیلة عرف ذلک بالصیاح او بتحریک الذنب اوطرف العین اوتنفس......فاذاذبحها وفیها قلیل حیاة علی الوجه الذی ذکرناتوکل عند ابی حنیفةؒ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: افتخار احمد گلگتی

۱۴۳۰/۲/۲۶ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۹۶۹

﴿کسی شکار کا سر ہاتھ میں پکڑ کر تن سے جدا کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں چھوٹے بچے شکار کرتے ہیں اور ذبح اس طریقے سے کرتے ہیں کہ پرندے وغیرہ کا سر ایک ہاتھ میں اور دھڑ دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر سر کو کھینچ کر جدا کر دیتے ہیں جس سے خون بھی نکل جاتا ہے، کیا اس طرح ذبح کرنا صحیح ہے کیونکہ چھوٹے بچوں کے ساتھ بڑے بھی اس شکار کو کھاتے ہیں۔

﴿جواب﴾ زندہ شکار ہاتھ میں آنے کے بعد ذبح کرنا ضروری ہے، ہاتھ سے سر کھینچ کر جدا کرنا کوئی ذبح نہیں ہے، اس طرح کرنے سے شکار مردار ہو جاتا ہے جس کا کھانا حرام ہے۔ اور ظلم کا گناہ الگ ہے۔

لمافی الهندية:(۵/۵۰۵،طبع رشيديه)

ينبغی ان يكون الصياد من اهل الذكاة وذلك بان يعقل الذبح والتسمية حتی لا يؤكل صيد الصبی والمجنون اذا كانا لا يعقلان الذبح والتسمية.

ولمافی التنوير مع الدر:(۶/۴۶۸،طبع سعيد)

(وان أدرك) المرسل او الرامی (الصيد حيا) بحياة فوق ما فی المذبوح (ذكاه) وجوبا (وشرط لحله بالرمی التسمية)

ولمافی التنوير مع الدر:(۶/۲۹۵-۲۹۶،طبع سعيد)

(و) حل الذبح (بكل ما أفری الأوداج) أراد بالاوداج كل الاربعة تغليبا (وانهر الدم) ای أساله (ولو) بنار او (بليطة) ای قشر قصب (أو مروة) هی حجر ابيض كالسكين يذبح بها (الا سنا وظفرا قائمين ولو كانا منزوعين حل) عندنا (مع الكراهة) لما فيه من الضرر بالحيوان كذبحه بشفرة كليلة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہائی عفی عنہ

۱۷ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ
فتویٰ نمبر: ۲۳۰۵

﴿غلیل یا بندوق سے شکار کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غلیل یا بندوق سے شکار کرتے ہوئے کبھی کبھار پرندے کا سر گردن سمیت اڑ جاتا ہے، اس صورت میں جانور کے کسی دوسرے عضو کو ذبح کرنے سے حلال ہوگا یا نہیں؟ جبکہ ہمارے علاقے میں یہ بات مشہور ہے کہ پرندے کی دائیں ٹانگ یا پر کاٹنے سے بھی ذبح شمار ہوتا ہے، ٹانگ یا پر کاٹنے سے وہ حلال

ہو جائے گا، یہ بات کہاں تک درست ہے؟ مستفتی: عزیز الرحمٰن

﴿جواب﴾ چونکہ پرندے کا سر گردن سمیت اڑ جانے کی بناء پر محل ذبح باقی نہیں رہتا، اس لئے کسی دوسرے عضو کو ذبح کرنے سے وہ حلال نہ ہوگا، لہٰذا مذکورہ رواج (دائیں ٹانگ یا پر میں ذبح کرنے کا) درست نہیں ہے۔ اس سے پرندہ حلال نہیں ہوتا۔

ولما في الهندية: (۵/۲۸۷، طبع رشيديه)

سنور قطع رأس دجاجة فانه لايحل بالذبح وان كان يتحرك كذافي الملتقط

لما في الهندية: (۵/۲۹۱، طبع رشيديه)

شاة قطع الذئب أوداجها وهي حية لاتذكى لفوات محل الذبح كذافي الوجيز لكردري.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۲ رجب ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۵۲۸

﴿شکار کے لئے کانٹے میں زندہ مچھلی لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارا مشغلہ مچھلیوں کا شکار کرنا ہے، ہم بڑی مچھلی کو شکار کرنے کیلئے کانٹے میں زندہ چھوٹی مچھلی لگا دیتے ہیں، ازروئے شرع یہ درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ بڑی مچھلی کے شکار کے لئے کانٹے میں زندہ چھوٹی مچھلی لگانا چونکہ ذی روح مچھلی کو عذاب میں مبتلا کرنا ہے جو کہ کراہت سے خالی نہیں ہے، مناسب یہ ہے کہ جب مچھلی بے جان ہو جائے تو اس وقت کانٹے میں لگا دے۔

لما في الفتاوى الهندية: (۵/۳۶۲، طبع رشيديه كوئٹه)

ويكره تعليم البازي بالطير الحي ياخذه ويعذبه ولاباس بان يعلم بالمذبوح كذافي المحيط السرخسي.

ولما في التنوير مع الدر: (۶/۴۷۲، طبع سعيد) (يكره تعليم البازي بالطير الحي) لتعذيبه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۶۶

﴿کوّے کی حلت وحرمت کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کافی عرصہ سے یہ بات مشہور ہو رہی ہے کہ کوا حلال ہے حالانکہ بعض فقہی عبارات سے کوے کی متعدد قسموں کا پتہ چلتا ہے اور جس کوے کی حلت کا ذکر ہے، اس سے کونسی

قسم کا کوا مراد ہے؟ آیا موجودہ قسم کا کوا مراد ہے یا دوسری قسم کا؟ نیز ان کے درمیان بآسانی فرق کیسے کیا جاسکے گا؟ تا کہ معلوم ہو کہ فلاں قسم حلال ہے اور دوسری قسم حرام۔ مستفتی: ابوہریرۃ اسلام آباد

﴿جواب﴾ شہری کوا مردار بھی کھاتا ہے اور دوسرے پرندوں کا شکار بھی کرتا ہے اگرچہ شاہین یا چیل کی طرح نہیں ہے لیکن چوزوں کو اٹھانا اور دیگر پرندوں کے چھوٹے بچوں کو اٹھانا اس سے مشاہدہ ہے، اس لئے یہ کوا حلال نہیں ہے، عربی میں ''غراب'' تین طرح کا ہوتا ہے اور تینوں کے حکموں کو الگ الگ بیان کیا ہے لیکن اردو میں لفظ ''کوا'' سن کر صرف شہری کوا ہی مراد ہوتا ہے، دیگر کوے ہم نے نہیں دیکھے یا ہم نہیں جانتے، البتہ ''غراب'' جنگلی بھی ہے، اس کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ مردار بالکل نہیں کھاتا، نہ دوسرے پرندوں کو شکار کرتا ہے، وہ حلال ہے اور ایک تیسری قسم بھی ''غراب'' کی بتائی گئی ہے کہ وہ دانہ کھاتا ہے کبھی کبھار مردار بھی کھالیتا ہے لیکن دوسرے پرندوں کا شکار نہیں کرتا، اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں لیکن احتیاط نہ کھانے میں ہی ہے، مزید یہ کہ عربی میں تو تینوں کا نام غراب ہے، کیا مذکورہ تینوں قسموں کو اردو میں کوا کہا جاتا ہے؟ ہمیں اس کی تحقیق نہیں ہے۔

لمافی الهداية:(۲/۴۳۹-۴۴۰ط طبع رحمانيه)

قال ولا بأس بغراب الزرع لانه يأكل الحب ولا يأكل الجيف وليس من سباع الطير قال ولا يأكل الابقع الذى يأكل الجيف وكذالغداف قال ابوحنيفةؒ لا باس باكل العقعق لانه يخلط فاشبه الدجاجة وعن ابى يوسف انه يكره لان الغالب أكله الجيف.

ولمافى القدورى(ص۲۲۰ طبع قديمى)

ولا باس باكل غراب الزرع ولا يؤكل الابقع الذى يأكل الجيف......وفى حاشيته تحت(قوله ولا يؤكل)ولا يأكل الابقع أى الغراب الابقع وهوالذى فيه بياض وسواد كذافى القهستانى وفى العناية والغراب ثلاثة انواع نوع يلتقط الحب ولا يأكل الجيف وليس بمكروه ونوع لا يأكل الاالجيف وهوالذى سماه المصنف الابقع وانه مكروه ونوع يخلط يأكل الحب مرة والجيف اخرى ولم يذكره فى الكتاب وهوغير مكروه عنده مكروه عند ابى يوسف "اعلم ان الغراب الذى يقال له "كوّا" فى الهندية وكان فى السندية "فنص" على حرمته رأس المحققين المخدوم محمدهاشم السندى التتوى فى رسالته فاكهة البستان.

ولمافى كنزالدقائق(ص۲۱۱ طبع قديمى)

وحل غراب الزرع لاالابقع الذى يأكل الجيف......وفى حاشيته تحته غراب الزرع آه لانه يأكل الحب وليس من سباع الطيرولا من الخبائث لاالابقع الذى أى لا يحل لانه يأكل

الجیف فصار کسائر الطیور لانه مخلوط بالخبائث لان لحمه ینبت من الحرام واعلم ان الغراب ثلاثة انواع نوع یاکل الجیف فحسب فانه لا یؤکل ونوع یاکل الحب فحسب فانه یؤکل ونوع یخلط بینهما وهو ایضا یاکل عند الامام وهو العقعق لانه یاکل الدجاج وعن ابی یوسف انه یکره اکله لانه غالب اکله الجیف والاول اصح

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۵ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۲۲

﴿حلال جانوروں میں سات چیزوں کے مکروہ تحریمی ہونے کے بارے میں بیان﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حلال جانوروں میں کون کونسی چیزیں مکروہ تحریمی یا حرام ہیں؟ — مستفتی: آفتاب الدین کینیڈا

﴿جواب﴾ حلال جانوروں میں سات چیزیں حرام ہیں: بہتا ہوا خون، غدود، مثانہ، پتہ، نر اسی طرح مادہ ہر ایک کے پیشاب کا راستہ، کپورے۔

ولما فی الشامی: (۶/۱۱ مطبع سعید)

[تتمة] ما یحرم اکله من اجزاء الحیوان الماکول سبعة الدم المسفوح والذکر والانثیان والقبل والغدة والمثانة والمرارة بدائع وسیاتی تمامه ان شاء الله تعالی آخر الکتاب

ولما فی البزازیة علی هامش الهندیة: (۶/۳۰۲ مطبع رشیدیه)

وعن مجاهد انه علیه الصلاة والسلام کره سبعة من الشاة الذکر والانثیین والقبل والغدة والمرارة والمثانة والدم المسفوح والمراد منه کراهة التحریم بدلیل انه جمع بین الاشیاء الستة وبین الدم فی الکراهة والدم المسفوح محرم

ولما فی بدائع الصنائع: (۵/۱۱ مطبع سعید)

واما بیان ما یحرم اکله من اجزاء الحیوان الماکول فالذی یحرم اکله منه سبعة الدم المسفوح والذکر والانثیان والقبل والغدة والمثانة والمرارة لقوله عز شانه ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث وهذه الاشیاء السبعة مما تستخبثه الطباع السلیمة فکانت محرمة

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۲۸

﴿مار ماہی کے حلال اور حرام ہونے کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ مار ماہی کو حرام سمجھتے ہیں اور بعض لوگ ان کو حلال سمجھتے ہیں تو آپ وضاحت فرمائیں کہ آیا مار ماہی حلال ہے یا

حرام؟ اور یہ بھی واضح کریں کہ مار ماہی مچھلی کی قسم ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مار ماہی حلال ہے اس لئے کہ یہ بھی مچھلی کی ایک قسم ہے اور مچھلی کی تمام اقسام حلال ہیں، اس کی ظاہری شکل وصورت اگرچہ سانپ کی طرح ہے لیکن یہ سانپ نہیں ہے۔

لما فی الفتاویٰ الولوالجیۃ:(۵۸/۲،طبع فاروقیہ پشاور)

وکذلک المار ماھی وسائر اجناس السمک یحل،لان ھذا نوع من السمک.

ولما فی مختصر القدوری:(ص ۲۲۰،طبع قدیمی) ولا بأس بأکل الجریث والمار ماھی.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۰۶/۶-۲۰۷،طبع سعید)

(ولا)یحل(حیوان مائی الا السمک)......(و)الا(الجریث)سمک اسود(والمار ماھی) سمک فی صورۃ الحیۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۲۵۰

﴿گھوڑے کی حلت وحرمت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ روس کی وہ آزاد ریاستیں جہاں مسلمان رہتے ہیں، وہ گھوڑے کو حلال سمجھتے ہیں اور کھاتے بھی ہیں جبکہ ہند و پاک کے لوگ ان کو حرام سمجھتے ہیں اور کھاتے بھی نہیں ہیں تو اس بارے میں وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: مدثر خلیل

﴿جواب﴾ گھوڑا چونکہ جہاد میں بہت کام آتا ہے اسلئے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اسکو مکروہ قرار دیا تھا تاکہ جہاد میں اسکی ضرورت پڑنے کی صورت میں اسکی کمی محسوس نہ ہو لیکن امام صاحبؒ سے رجوع بھی ثابت ہے، لہٰذا روس کی آزاد ریاستیں جو گھوڑے کو حلال سمجھتی ہیں وہ غلط نہیں ہے۔

لما فی صحیح المسلم:(۱۵۰/۲،طبع قدیمی)

عن جابرؓ بن عبداللہ ان رسول اللہ ﷺ نھی یوم خیبر عن لحوم الحمر الاھلیۃ واذن فی لحوم الخیل......قال أخبرنی أبوالزبیر أنہ سمع جابربن عبداللہؓ یقول اکلنا زمن خیبر الخیل وحمر الوحش ونھانا النبی ﷺ عن الحمار الاھلی.

ولما فی التنویر مع الدر:(۳۰۵/۶،طبع سعید)

(والخیل)وعندھما والشافعی تحل.وقیل ان اباحنیفۃ رجع عن حرمتہ قبل موتہ بثلاثۃ ایام وعلیہ الفتویٰ عمادیۃ ولا بأس بلبنھا علی الاوجہ.

ولما فی القول الراجح:(۲۸۹/۲،طبع دار العلوم حقانیہ)

ھو قول الصاحبینؒ مع الکراھۃ التنزیھیۃ.قال العلامۃ الحصکفیؒ والخیل وعندھما و

الشافعی تحل وقیل ان اباحنیفۃ رجع عن حرمتہ قبل موتہ بثلاثۃ ایام وعلیہ الفتوی۔

ولمافی حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح:(ص ۱۵۵ باب الأنجاس، طبع قدیمی)

کماذکرہ فخرالاسلام فی شرح الجامع الصغیران الفرس ماکول اللحم فی قولھم جمیعا یعنی عندابی حنیفۃ ایضاوانماکرہ للتنزیہ أی التحامی عن قطع مادۃ الجھاد، والکراھۃ لاتمنع الاباحۃ..... انہ روی انہ ﷺ نھیٰ عن لحوم الخیل، والبغال، وروی انہ علیہ الصلاۃ والسلام اذن فی لحم الخیل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان سواتی

۵ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ   فتویٰ نمبر: ۱۲۷۹

﴿پرندے اگر جال (دام) میں مرے ہوئے ملیں تو حلال نہیں﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں لوگ جال بچھاتے ہیں یعنی دام رکھتے ہیں پرندے وغیرہ کو پکڑنے کے لئے بسا اوقات دام رکھ کر کافی دیر بعد ہم جا کر دیکھتے ہیں تو پرندہ مرا ہوا ملتا ہے، کیا ایسی صورت میں یہ حلال ہوگا؟ حالانکہ ہم دام رکھتے وقت بسم اللہ پڑھتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ حلال ہے، جواب حوالہ کیساتھ مطلوب ہے۔ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ ایسی صورت میں حلال نہیں ہے بلکہ مردار ہے، تاہم اگر زندہ مل جائے تو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کریں، اس سے حلال ہوجائے گا، بسم اللہ اسی وقت یعنی ذبح کے وقت کی معتبر ہے نہ کہ دام رکھنے کے وقت کی۔

لمافی التنویر مع الدر:(۶/۴۷۹، طبع سعید)

(وضع منجلا فی الصحراء لیصیدبہ حمار وحش وسمی علیہ فجاء فی الیوم الثانی) قیداتفاقی اذلووجدہ میتامن ساعتہ لم یحل زیلعی (ووجدالحمارمجروحامیتالم یوکل) لأن الشرط أن یذبحہ انسان اویجرحہ، والافھو کالنطیحۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم: عبدالوہاب عفااللہ عنہ

۱۴۲۹ھ   فتویٰ نمبر:

﴿غیر مملوکہ زمین کو محبوس کر کے شکار سے منع کرنا﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے کے بعض لوگ دریاؤں کے کنارے جو غیر قابل انتفاع ریتیلی زمین ہوتی ہے، اس میں مرغابیوں اور بطخوں کے شکار کے لیے تالاب بناتے ہیں، جسمیں کافی

حد تک خرچہ بھی برداشت کرتے ہیں پھر دوسروں کو اس میں شکار کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا دوسرں کو اُسمیں شکار کرنے سے روکنا درست ہے؟ کیا مذکورہ شکارگاہ (تالاب) بنانے والوں کی ملکیت میں آجاتا ہے؟

﴿جواب﴾ مسئولہ صورت کے مطابق دریا کے کنارے پر واقع زمین میں جو تالاب بنانے کا ذکر ہے چونکہ وہ زمین غیر قابلِ انتفاع ہے اور علاقے کے لوگوں کے مفادات بھی اس سے وابستہ نہیں ہیں تو ایسی زمین پر تالاب بنانا ایسا ہے جیسا کہ کوئی پرندے وغیرہ شکار کرنے کے واسطے جال یا پھندا وغیرہ بچھادے جسے اسکی ملکیت اور قبضہ سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح مذکورہ صورت میں بھی تالاب بنانے والے کی عرف وشرع کی رو سے ملکیت سمجھی جاتی ہے قلیل مدت تک کیلئے، لہٰذا تالاب بنانے والے دوسروں کو روک سکتے ہیں شرعا یہ انکا حق ہے۔

لمافی الدرمع المرد:(۲۷/۱۰ طبع امدادیہ)

اعلم ان اسباب الملک ثلثة — وھوالاستیلاء حقیقة.....اوحکما بالتھیئة کنصب شبکة لصید.
وفی الشامیة:الاستیلاء الحکمی باستعمال ماھوموضع للاصطیاد حتیٰ ان من نصب شبکة فتعقل بہا صید ملکہ قصدبہا الاصطیاد اولا.

ولمافی الھندیة:(۲۸۷/۵ طبع رشیدیہ)

ارض غرقت وصارت بحرا ثم نضب الماء عنہا وخربت بوجہ آخر ثم جاء انسان وعمرھا قیل ھی للمالک القدیم وقیل لمن احیاھا کذافی القنیة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی عنہ

۱۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۴

﴿خارپشت حلال ہے یا حرام؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سہ (خارپشت یعنی جس کی پشت پر بڑے بڑے نوک دار کانٹے ہوتے ہیں) حلال جانور ہے یا حرام؟ ہمارے ہاں اس پر بڑا سخت اختلاف ہے بعض حضرات کہتے ہیں کہ چونکہ اس میں اوجڑی ہوتی ہے اس لئے یہ حلال ہے۔ براہ کرم جلد از جلد جواب دیکر ممنون فرمائیں۔ مستفتی: خالد الرحمٰن

﴿جواب﴾ خارپشت (جسکو پشتو میں شکونڑ کہتے ہیں) خبائث میں سے ہے، اس لئے حرام ہے اور کسی جاندار کا خبائث میں سے ہونا نہ ہونا استقرائی امر ہے اوجڑی حلت، حرمت کی کسوٹی نہیں ہے۔

لمافی الجوهرة النيرة:(۲/۲۳۱،طبع میر محمد)

(قوله ويكره اكل الضبع والضب والحشرات كلها...... قوله" والحشرات كلها" يعني المائي والبري كالضفدع وغيرها...... وكذالفيران والاوزاغ والعضابة والقنافذ والحيات ...... لان هذه الاشياء مستخبثة قال الله تعالى(ويحرم عليهم الخبائث)

ولمافي فتاوىٰ النوازل:(ص ۳۳۲،طبع حقانيه)

ويكره اكل الضب...... وكذاجميع الحشرات لانهامن الخبائث.

ولمافي خلاصة الفتاوىٰ:(۲/۲۰۴،الفصل الخامس فيمايوكل وفيمالايوكل،طبع رشيديه)

وفي شرح الطحاوي مالايوكل كل ذي ناب من السباع وذي مخلب من الطيوربيانه الاسد والذئب...... وسباع الهوام ايضاًبيانه الضب واليربوع...... والهوام التي سكناها في الارض بيانه الفارة والوزغة والقنفذوالحيات وجميع هوام الارض.وكذافي الفقه الاسلامي وادلته:(۲/۲۷۹۳،طبع رشيديه)

ولمافي حياة الحيوان الكبرىٰ:(۲/۳۲۰،مكتبه شامله)

(القنفذ)بالذال المعجمة وبضم الفاء وفتحها اليري منه ،كنيته ابوسفيان وابوالشوك ...... وهوصنفان:قنفذ يكون بارض مصرقدرالفار،ودلدل يكون بارض الشام والعراق في قدرالكلب القلطي والفرق بينهماكالفرق بين الجرذوالفاروهولايظهرالاليلاً ......قال الشافعي:يحل اكل القنفذلان العرب تستطيبه......وقال ابوحنيفةؒ والامام احمد لايحل.

ولمافيه ايضاً:(۱/۴۷۰،مكتبه شامله)

(الدلدل)عظيم القنافذ......وانماشبهته بالقنفذلانه اكثرمايظهرفي الليل ولانه يخفي رأسه في جسده مااستطاع وقال الجاحظ:الفرق بين الدلدل والقنفذ كالفرق بين البقر والجواميس......والجرذ والفار......واذارأى مايكرهه انقبض فيخرج منه شوك كالمسال يجرح من اصابه والشوك الذي علىٰ ظهره نحوالذراع......نص الشافعي علىٰ حله......وقال الرافعي:قطع الشيخ ابومحمدبتحريمه في الوسيط انه كان يعده من الخبائث.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم:خالدالرحمٰن کرکی عفی عنہ

۲۷رجب المرجب ۱۴۳۰ھ | فتویٰ نمبر:۲۳۸۹

﴿ہدہد حلال ہے یا حرام؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام کہ ہدہد حلال پرندہ ہے یا حرام؟ جبکہ دمیریؒ نے حیات الحیوان میں اسکو حرام قرار دیا ہے بعض کتابوں میں حلال لکھا گیا ہے، احناف کے ہاں صحیح قول کیا ہے؟ اگر حلال ہے تو پھر حیات الحیوان میں حرمت کا کیا جواب ہے؟ مستفتی: محمد سہیل نوشہرہ

﴿جواب﴾ احادیث میں تمام ایسے پرندوں کے کھانے کو منع فرمایا ہے جو دوسری جاندار

چیزوں کا شکار کرتے ہوں یا جن کی خوراک عموماً مردار اور گندگی ہو، ہدہد بظاہر مذکورہ خاصیتوں کا پرندہ نہیں ہے، اس لئے حرام قرار دینے کے لئے مضبوط دلیل نہیں ہے۔

حیات الحیوان علامہ دمیریؒ کی تالیف ہے آپ شافعی المذھب تھے امام شافعیؒ کے دلائل ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن شوافع کے علاوہ علماء احناف کے بعض معتبر فتاویٰ میں بھی اسکو مکروہ لکھا ہے جبکہ بعض دیگر معتبر فتاویٰ میں ہدہد کو مطلقاً حلال قرار دیا ہے، اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ اس کے کھانے سے گریز کیا جائے۔

لمافی الصحیح لمسلم:(۱۴۷/۲،طبع قدیمی)

عن ابن عباسؓ قال نهی رسول اللهﷺعن کل ذی ناب من السباع وکل ذی مخلب من الطیر.

ولمافی خلاصة الفتاوی:(۳۰۲/۴،طبع رشیدیه)

وفی فتاوی الولوالجی اکل الهدهدلاباس به لانه لیس بذی مخلب من الطیور.

ولمافی الجوهرة النیرة:(۲۳۸/۲،طبع میرمحمد)

ولاباس باکل العقعق والهدهدوالحمام والعصافیرلان عامة اکلها الحب الثمار.

ولمافی فتاوی النوازل:(ص ۳۳۲،طبع حقانیه)

لاباس باکل العقعق عندابی حنیفةؒ وکذاالهدهد.

ولمافی الهندیة:(۲۹۰/۵،طبع رشیدیه)

اکل الخطاف والصلصل والهدهدلاباس به لانهالیست من الطیورالتی هی ذوات مخلب کذافی الظهیرة.

ولمافی الشامی:(۳۰۶/۶،طبع سعید)

ویکره الصرد والهدهد.وکذافی البحرالرائق:(۱۷۱/۸-۱۷۲،طبع سعید)

ولمافی اعلاء السنن:(ج۱۷ص۱۷۲طبع دارالکتب العلمیةبیروت)

عن غررالافکارعندنا....ویکره الصردوالهدهد....وحرم الشافعیؒ الخطاف والببغاء والطوس والهدهد

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:خالدالرحمٰن کرکی عفی عنہ

۱۲ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۱۶۰

﴿نحوست کو ختم کرنے کے لئے ذبح کی ہوئی مرغی حلال ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے علاقے میں لوگ میت کو گاڑی میں کہیں لے جاتے ہیں تو پھر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ گاڑی بھاری ہوگئی ہے، اب کوئی بھی حادثہ ہوسکتا ہے تو وہ

اس گاڑی میں مرغی ذبح کرتے ہیں تا کہ اس کا خون گاڑی کے کسی حصے پر لگ جائے، ایسی مرغی کے گوشت کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد عظیم عبدل خیل

﴿جواب﴾ اس جانور کا گوشت کھانا حرام ہے جس پر جان بوجھ کر ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو یا اللہ کا نام تو لیا گیا ہو لیکن اس کو تقرب لغیر اللہ کیلئے ذبح کیا گیا ہو اور مذکورہ صورت میں تقرب لغیر اللہ مقصود نہیں ہے، محض ایک خیال فاسد کی وجہ سے ذبح کیا گیا ہے، اس لئے ایسی ذبح شدہ مرغی کا گوشت حلال ہے، عمل اگرچہ غلط ہے اور جہالت پر مبنی ہے، تاہم اس سے جانور کا گوشت حرام نہیں ہوتا۔

لمافی قوله تعالی:(سورة البقرة،آیت ۱۷۳)

انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل به لغیر الله......الآیة.

ولمافی قوله تعالی:(سورة الانعام،آیت ۱۴۵)

قل لا اجد فی ما أوحی الی محرما علی طاعم یطعمه الا أن یکون میتة أو دما مسفوحا او لحم خنزیر فانه رجس أو فسقا اهل لغیر الله به......الآیة.

ولمافی الشامی:(۹/۴۴۳،طبع امدادیه)

(قل لا أجد)(الانعام:۱۴۵)الآیة.ولقوله علیه الصلوة والسلام:"ماسکت الله عنه فهو مما عفا الله عنه".

ولمافی اعلاء السنن:(۱۷/۹۸-۹۹ طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

قال القاضی:ماذبحه الکتابی لعیده، أو نجم، وصنم، أو نبی، فسماه علی ذبیحته حرم لقوله تعالی:(وما اهل به لغیر الله)......وعلی هذا فلو ذبح لغیر الله متقربا به الیه لحرم،وان قال فیه:بسم الله.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفا اللہ عنہ

۱۰ صفر ۱۴۲۹ھ

فتوی نمبر:۱۲۰۱

﴿احکام الذبیحة﴾

﴿ذبح سے متعلق کچھ احکام﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب! میں ایک قصائی آدمی ہوں براہ کرم مندرجہ ذیل مسائل کا صحیح جواب عنایت فرمائیں: (۱) جانور ذبح کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ (۲) حلال جانور کے

اندر کتنی چیزیں حرام ہیں اور وہ کیا کیا ہیں؟(۳) ذبح کرتے وقت اگر گردن بھی کٹ جائے تو ایسے جانور کے گوشت کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ (۱) جانور ذبح کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جانور کو بائیں پہلو پر قبلہ رخ لٹا کر تیز چھری دائیں ہاتھ میں لے کر قبلہ رخ ہو کر "بسم الله الله اکبر" کہہ کر گلے پر چلائی جائے یہاں تک کہ گلے کی چاروں رگیں کٹ جائیں، ایک نرخرہ جس سے جانور سانس لیتا ہے، دوسری نالی جس سے دانہ پانی جاتا ہے اور دو شہ رگیں جو نرخرہ کے دائیں بائیں ہوتی ہیں اگر ان چار رگوں میں سے تین کٹ جائیں تو بھی ذبح درست ہے اور اس کا کھانا حلال ہے۔

البتہ اگر دو ہی رگیں کٹیں تو جانور مردار ہوگا اور اس کا کھانا جائز نہ ہوگا۔

لمافی الهداية:(۴۳۶/۲،طبع رحمانیه)

(والعروق التی تقطع فی الذكاة اربعة الحلقوم المرئ والودجان)لقوله عليه السلام "افر الاوداج بماشئت" وهی اسم جمع واقله الثلث فيتناول المرئ والوجين وهو حجة على الشافعیؒ فی الاكتفاء بالحلقوم المرئ الاانه لايمكن قطع هذه الثلثة الابقطع الحلقوم فيثبت قطع الحلقوم باقتضائه،الی أن قال ويستحب ان يحدالذابح شفرته لقوله عليه السلام ان الله كتب الاحسان على كل شيئی فاذاقتلتم فاحسنوا القتلة واذاذبحتم فاحسنوا الذبحة وليحداحدكم شفرته وليرح ذبيحته.

ولمافی التنويرمع الدر:(۴۲۲/۹ تا ۴۲۷،طبع امدادیه ملتان)

(و)ذكاة(الاختيار ذبح بين الحلق واللبة)—(وعروقه الحلقوم)كله وسطه اواعلاه اواسفله وهو مجرى النفس على الصحيح(والمرئ)هو مجرى الطعام والشراب (والودجان)مجرى الدم (وحل)المذبوح(بقطع ای ثلاث منها)اذللاكثر حكم الكل— (وندب احداد شفرته قبل الاضجاع)—(و)كره كل تعذيب بلافائدة مثل (قطع الرأس والسلخ قبل ان تبرد)ای تسكن عن الاضطراب وهو تفسير باللازم كمالا يخفى (و)كره (ترك التوجه الی القبلة)لمخالفته السنة وكذافی الهندية:(۲۸۷/۵،طبع رشيديه) (وهكذافی فتاوی الولوالجية:(۷۰/۳،طبع فاروقيه پشاور)

(۲) حلال جانور کے اندر سات چیزیں حرام ہیں: (۱) بہتا خون (۲-۳) نر و مادہ کے پیشاب کا راستہ (۴) کپورے (۵) غدود (۶) مثانہ (۷) پتہ۔

لمافی بدائع الصنائع:(۶۱/۵،طبع سعید)

فصل:واما بيان مايحرم اكله من اجزاء الحيوان المأكول فالذی يحرم اكله منه سبعة: الدم المسفوح والذكر والانثيان والقبل والغدة والمثانة والمرارة الخ.

(۳) ذبح کرتے وقت جانور کا سر اگر تن سے جدا ہو جائے تو اس سے ذبح پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس کا گوشت حلال اور کھانے کے قابل ہے، تاہم جانور کے ٹھنڈا ہونے سے پہلے اس کا سر کاٹنا غیر ضروری عذاب دینے کی وجہ سے مکروہ ہے۔

لما فی الهداية:(۴۲۷/۲،طبع رحمانيه)

ومن بلغ بالسكين النخاع اوقطع الرأس كره له ذلك وتوكل ذبيحته.

ولما فی التنوير مع الدر:(۲۹۶/۶،طبع سعيد)

(و)كره كل تعذيب بلافائدة مثل(قطع الرأس والسلخ قبل ان تبرد)اى تسكن عن الاضطراب وهوتفسير باللازم كما لايخفى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۷ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتوی نمبر: ۹۷

﴿ذبح کے وقت زندہ ہونے کا یقین کافی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل میرے ساتھ عجیب کام ہوا وہ یہ کہ زندہ بکری تھی جب میں نے ذبح کیا تو ذبح کرنے کے بعد نہ کوئی خون نکلا اور نہ کوئی حرکت کی جیسا کہ عموما ہوتی ہے میں کافی الجھن کا شکار رہا تو اسی وقت ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ اسکا کھانا جائز ہے یا نہیں تو اس صاحب نے کہاں کہ حرام ہے کیونکہ خون نہیں نکلا تو کیا اس صاحب کا یہ جواب درست ہے یا نہیں؟　　　　مستفتی: محمد صدیق

﴿جواب﴾ اگر ذبح کرتے وقت آپکو زندہ ہونے کا پورا یقین تھا تو یہ حلال ہے اور اس کا کھانا جائز ہے اور اس صاحب کا یہ کہنا کہ حرام ہے درست نہیں۔

لما فی الشامی:(۳۰۸/۶،طبع سعيد)

وان علم حياته (حلت) مطلقا (وان لم تتحرك ولم يخرج الدم) وهذا يتأتى فی منخنقة ومتردية و نطيحة، والتی فقر الذئب بطنها فذكاة هذه الاشياء تحلل ، وان كانت حياتها خفيفة وعليه الفتوى لقوله تعالى الا ما ذكيتم ۔۔من غير فصل

ولما فی خلاصة الفتاوى:(۲/،طبع رشيديه)

ولم يتحرك ولم يخرج الدم لا يحل هذا اذا لم يعلم حيوته وقت الذبح فان علمت حلت وان لم يتحرك ولم يخرج الدم.

ولما فی البحر الرائق:(۱۶۳/۶،طبع سعيد)

(وان علم حيوته حل وان لم تتحرك ولم يخرج) يعنی اذا علم حياة الشاة وقت الذبح

حلت بلاذكاة تحركت او لا خنج منها دم او لا كذافي المحيط

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید

۱۵ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۳۴

﴿ذبح کے وقت جانور کے سر کا کٹ جانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر جانور کو ذبح کرتے وقت اس کا سر کٹ جائے تو اس سے ذبیحہ پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: اختر حسین

﴿جواب﴾ جانور کو ذبح کرتے وقت سر کے کٹ جانے سے ذبیحہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس کا گوشت حلال اور کھانے کے قابل ہے لیکن جانور کے ٹھنڈا ہونے سے پہلے سر کا کاٹنا بوجہ غیر ضروری تعذیب کے کراہت سے خالی نہیں۔

لما في الهداية:(۴۳۷/۴ طبع رحمانيه)

ومن بلغ بالسكين النخاع أوقطع الرأس كره له ذلك وتؤكل ذبيحته.....وفي قطع الرأس زيادة تعذيب الحيوان بلافائدة وهي منهي عنه.

ولما في التنوير مع الدر:(۲۹۶/۶ طبع سعيد)

(و)كره كل تعذيب بلافائدة مثل(قطع الرأس والسلخ قبل ان تبرد)اى تسكن عن الاضطراب وهوتفسير باللازم كما لا يخفى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز

۱۶ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۹۲

﴿ذبح کے بعد گوشت کا دھونا ضروری ہے یا نہیں؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ذبح کے بعد جو گوشت جانور سے علیحدہ کیا جاتا ہے، پکانے کے وقت اس کا دھونا ضروری ہے یا نہیں؟ مستفتی زبیر سید صاحب

﴿جواب﴾ دھونا ضروری نہیں ہے، البتہ دھولیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

لما في حاشية الطحطاوى:(ص ۸۳ طبع قديمى)

(لاالباقى فى اللحم)لانه ليس بمسفوح ولمشقة الاحتراز عنه.

ولما في الخانية على هامش الهندية:(۱۹/۱ طبع رشيديه)

ومايبقى من الدم فى عروق المزكاة بعدالذبح لايفسدالثوب وان فحش وعن ابى يوسف رحمه الله يفسدالثوب اذافحش ولايفسدالقدر.

ولما فی الدر المختار:(۱/۲۱۹،طبع سعید)

(ودم)مسفوح من سائر الحیوانات الادم شهید مادام علیه،ومابقی فی لحم مهزول وعروق وکبدوطحال وقلب ومالم یسل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:عبداللہ عفی عنہ

۳۰ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۰۲۸

﴿حالت جنابت کا ذبیحہ حلال ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حالت جنابت میں ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے یا حرام؟　　　مستفتی:افتخار احمد سنل باغڑی

﴿جواب﴾ حالت جنابت میں ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے،ذبح کیلئے حدث اکبر یا اصغر سے طہارت شرط نہیں ہے۔

لما فی اعلاء السنن:(۱۷/۲۲۱،طبع دار الکتب العلمیة بیروت)

وتباح ذبیحة الجنب فیسمی،ویذبح تجوزله التسمیة ولایمنع منهالانه انمایمنع من القرآن لامن الذکرولهذاتشرع له التسمیة عنداغتساله ولیست الجنابةاعظم من الکفر والکافریسمی ویذبح فمن رخص فی ذبح الجنب...ولااعلم احدامنع من ذلک وتباح ذبیحة الحائض لانهافی معنی الجنب...قلت وکذلک النفساء

ولما فی تنویر الابصار:(۶/۲۹۶-۲۹۷،طبع سعید)

(وشرط کون الذابح مسلماحلالاخارج الحرم ان کان صیدااوکتابیاذمیا)

ولما فی کنز الدقائق:(ص۴۱۶،طبع قدیمی)

وحل ذبیحة مسلم وکتابی وصبی وامرأةواخرس واقلف.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد وارث خان

۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۴۳۷

﴿زخمی جانور کے حلال ہونے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے علاقہ میں ایک بیل پہاڑ کی بلندی سے نیچے وادی میں جا کر گر گیا،میں نے فورا بھاگ کر جانور کو ایک تیز دھار آلہ کی مدد سے ذبح کیا،جبکہ جانور کی حیات کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ آیا جانور زندہ ہے کہ نہیں لیکن ذبح کے وقت جانور نے کوئی حرکت نہیں کی اور خون بہت

زیادہ نکلا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ آیا صرف جانور سے خون کا نکلنا جانور کا گوشت حلال کرنے کیلئے کافی ہے، یا یہ ہے کہ جانور کا حرکت کرنا بھی حلت جانور کیلئے شرط ہے، براہ کرم وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ جس جانور کی حیات کا علم نہ ہو اگر بوقت ذبح اس سے صرف خون نکل جائے یا صرف حرکت کرلے تو اس سے جانور کا گوشت حلال ہو جاتا ہے اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بوقت ذبح جانور میں نہ پائی جائے تو جانور کا گوشت شریعت کی رو سے حلال نہیں ہے لہذا اسکا گوشت کھانا جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ خروج دم میں کچھ تفصیل ہے وہ یہ ہے کہ جانور سے ذبح کے وقت اگر خون دھار کی طرح تیزی سے نکلا ہے جس طرح زندہ جانور سے نکلتا ہے تو اس صورت میں جانور کا گوشت بالاتفاق حلال ہے اگر خون بغیر دھار کے نکلا ہے اور اسمیں تیزی کچھ نہ تھی تو اس طرح خون کا نکلنا حیات کی دلیل نہیں ہے کہ جسکی وجہ سے جانور پر حلت کا حکم لگایا جاسکے بلکہ یہ جانور کے مردہ ہونے کی علامت ہے لہذا اس کا گوشت کھانا ازروئے شرع جائز نہیں ہے۔

ولمافی الدر مع الرد:۲۰۸/۶(طبع سعید)

ذبح شاۃ مریضۃ فتحرکت أوخرج الدم حلت والا لاان لم تدر حیاتہ عند الذبح ...وفی الشامیۃ خروج الدم لایدل علی الحیاۃ الا اذاکان یخرج کمایخرج من الحی عندالامام وھوظاھر الروایۃ.

ولمافی الهندیۃ:۲۸۶/۵(طبع رشیدیہ)

وذکر فی بعض الفتاوی أنہ لابد من أحدالشیئین اماالتحرک واماخروج الدم فان لم یوجد لایحل کذافی البدائع وان ذبح شاۃ أوبقرۃ فخرج منھادم ولم تتحرک وخروجہ مثل مایخرج من الحی أکلت عند ابی حنیفۃ وبہ نأخذ،

ولمافی خلاصۃ الفتاوی:۳۰۶/۴(طبع حقانیہ)

رجل ذبح شاۃ أوبقرۃ وتحرکت بعد الذبح وخرج منھادم مسفوح تحل وکذاان تحرکت ولم یخرج الدم أوخرج الدم ولم یتحرک ...وفی شرح الطحاوی وخروج الدم لایدل علی الحیوۃ الااذاکان یخرج کمایخرج من الحی وھذاعند ابی حنیفہ وھو ظاھر الروایۃ،

واللہ اعلم بالصواب: فضل حق زیزاروی — الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر:۳۹۰۱ — ۱۳ صفر الخیر ۱۴۲۹ھ

﴿دوران ذبح یا بعد میں جانور حرکت کرے تو حلال ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی جانور میں بظاہر

زندگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے لیکن ذبح کرنے کے بعد اس سے خون نکل آئے یا وہ حرکت کرے تو کیا وہ جانور حلال تصور ہوگا یا نہیں؟ مستفتی: نجیب اللہ

﴿جواب﴾ ذبح کرنے سے پہلے جانور کی حیات کی علامات اگرچہ نظر نہ آتی ہوں لیکن ذبح کرنے کے بعد حرکت کرلے یا عام جانور کی طرح تیزی کے ساتھ خون کی دھار نکلے تو حلال ہونے کے لئے یہی کافی ہے، البتہ خون تیزی اور دھار کے بغیر صرف بہہ نکلے اور کوئی حرکت بھی نہ کرے تو جانور مردار شمار ہوگا، کھانا حلال نہیں ہوگا۔

لما في التنوير مع الشرح: (۹/۴۰۸ طبع سعید)

(ذبح شاة) مريضة (فتحركت أو خرج الدم حلت وإلا لا إن لم تدر حياته) عند الذبح

وفي الشامية: (قوله أو خرج الدم) أي كما يخرج من الحي، قال في البزازية: وفي شرح الطحاوي: خروج الدم لا يدل على الحياة إلا إذا كان يخرج كما يخرج من الحي عند الإمام وهو ظاهر الرواية، وكذا في البزازية عن المنتقى. (۹/۴۰۸ طبع رشیدیه)

ولما في خلاصة الفتاوى: (۴/۳۰۹ طبع رشیدیه)

رجل ذبح شاة أو بقرة فتحركت بعد الذبح وخرج منها الدم مسفوح تحل، وكذلك إن تحركت ولم يخرج الدم أو خرج الدم ولم يتحرك.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی

۲۵ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ | فتویٰ نمبر: ۲۰۹۸

﴿عورت کے ذبیحہ میں شرعاً کوئی قباحت نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ اگر عورت کسی جانور کو ذبح کرے تو خود اس عورت کے لئے اس جانور کا گوشت کھانا جائز ہے لیکن دوسرے لوگوں کو اس گوشت کا کھانا درست نہیں، سوال یہ ہے کہ آیا یہ رواج درست ہے یا نہیں؟ اور عورت کا ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے یا نہیں؟ اگر حلال ہے تو کیا خود اس عورت کے لئے ہے یا سب لوگوں کے لئے بھی؟ اگر حلال نہیں تو کیوں؟ مستفتی: رحمت ولی

﴿جواب﴾ علاقے کا یہ رواج درست نہیں ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور عورت کا ذبح کیا ہوا جانور خود اس عورت کے لئے بھی حلال ہے اور عام لوگوں (مردوں، عورتوں، بچوں) سب کے لئے حلال ہے، البتہ اس عورت کو ذبح کرنے کے طریقے سے واقف ہونا چاہیے۔

لمافی الھندیۃ:(۵۲/۶ طبع رشیدیہ) المرأۃ المسلمۃ والکتابیۃ فی الذبح کالرجل.

ولمافی الھدایۃ:(۴/۴۳۳ طبع رحمانیہ)

ویحل اذاکان یعقل التسمیۃ والذبحۃ یضبط وان کان صبیا او مجنونا او امرأۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۷ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر: ۴۱

﴿عورت کا ذبیحہ حلال ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں، علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ عورت کا ذبیحہ درست نہیں ہے، بعض اوقات گھر میں کوئی مہمان آجاتا ہے اور ذبح کرنے کے لئے کوئی مرد گھر میں نہیں ہوتا تو ہم بچے کو چھری اور مرغی دیکر باہر بھیجتے ہیں تاکہ کوئی مرد مرغی کو ذبح کردے، اب سوال یہ ہے کہ عورت کا ذبیحہ درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ عورت کا ذبیحہ درست ہے، اس کے ذبح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ صحیح طریقہ سے ذبح کرسکتی ہو۔

لمافی البحرالرائق:(۱۶۸/۸ طبع سعید)

(وحل ذبیحۃ مسلم وکتابی)(وصبی وامرأۃ واخرس واقلف) یعنی تحل ذبیحۃ ھولاء.

ولمافی التنویر مع الدر:(۶/۲۹۶-۲۹۷ طبع سعید)

(وشرط کون الذابح مسلما حلالا خارج الحرام... ولو) الذابح (مجنونا او امرأۃ او صبیا یعقل التسمیۃ والذبح) ویقدر.

ولمافی الھدایۃ:(۴/۴۳۳ طبع رحمانیہ)

وذبیحۃ المسلم والکتابی حلال... وان کان صبیا او مجنونا او امرأۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۲۶ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر: ۱۳۸۲.

﴿ذبح کرتے ہوئے قبلہ رخ ہونا سنت ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل جتنی بھی فارمی مرغیوں کی دکانیں ہیں ان میں اکثر بغیر قبلہ رخ کھڑے ہوکر مرغی ذبح کرتے ہیں، کیا اس طرح ذبح کرنا صحیح ہے؟ اور گوشت کا کیا حکم ہے؟ نیز مذبوحہ جانور میں کل کتنی چیزیں حرام ہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں ذبیحہ حلال ہے اور گوشت کھانا بھی جائز ہے، البتہ ذبح کرتے ہوئے

قبلہ رو نہ ہونا خلاف سنت ہے، بلا عذر سنت کا چھوڑنا اچھا نہیں ہے۔ مذبوحہ حلال جانور میں کل سات چیزیں حرام ہیں: (۱) بہتا خون (۲-۳) مذکر و مؤنث جانور کے پیشاب کا راستہ (۴) کپورے (۵) غدود یعنی گھٹیاں (۶) مثانہ یعنی جس میں پیشاب جمع ہوتا ہے (۷) پتہ حرام ہیں۔

لما فی الهندیة:(۵/ ۲۹۰ طبع رشیدیه)

واما بیان ما یحرم اکله من أجزاء الحیوان سبعة الدم المسفوح والذکر والأنثیان والقبل والغدة والمثانة والمرارة.

ولما فی بدائع الصنائع:(۵/ ۶۱ طبع سعید)

واما بیان ما یحرم أکله من أجزاء الحیوان المأکول فالذی یحرم أکله منه سبعة الدم المسفوح والذکر والأنثیان والقبل والغدة والمثانة والمرارة

ولما فی التنویر مع الدر:(۶/ ۲۹۹ طبع سعید) وکره (ترک التوجه إلی القبلة لمخالفته السنة

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: بشر محمود ذوبی غفرلہ ولوالدیہ

۹ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۳۰۳۳

﴿حکم ذبیحة الشیعة ونکاح نسائهم﴾

﴿شیعہ کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح﴾

﴿سوال﴾ هل یجوز اکل ذبیحة الشیعة ونکاح نسائهم؟

﴿جواب﴾ اعلم انه یؤکل ذبیحة المسلم لا الکافر وکذا النکاح. والشیعة ان اعتقد ما یوجب الکفر فلا یجوز اکل ذبیحتهم ولا نکاح نسائهم وان لم یعتقد ما یوجب الکفر فلا باس بنکاح نسائهم واکل ذبیحتهم.

لما فی الشامی:(۴/ ۶۱ طبع سعید)

وبهذا ظهر أن الرافضی إن کان ممن یعتقد الألوهیة فی علی أو أن جبریل غلط فی الوحی، أو کان ینکر صحبة الصدیق أو یقذف السیدة الصدیقة فهو کافر لمخالفته القواطع المعلومة من الدین بالضرورة بخلاف ما إذا کان یفضل علیا أو یسب الصحابة فإنه مبتدع لا کافر کما أوضحته الخ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد سنہ

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۲۱۵

﴿موجودہ اہل کتاب کے ذبیحہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اکثر یورپ ممالک

میں جانا ہوتا ہے اور وہاں پر ہوٹلوں میں جو گوشت کھانے کیلئے ملتا ہے یا تو وہ عیسائیوں کے ذبیحہ کا ہوتا ہے یا یہودیوں کے ذبیحہ کا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا موجودہ دور کے عیسائیوں اور یہودیوں کا ذبیحہ حلال ہے یا نہیں؟ برائے کرم جواب عنایت فرمائیں

﴿جواب﴾ عیسائی اور یہودی چونکہ اہل کتاب ہیں اور اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے۔ اس لئے کہ ذبیحہ کے حلال ہونے کیلئے شرط یہ ہے کہ ذبح کرنے والا یا تو حقیقتاً ملت توحید پر ہو جیسا کہ مسلمان یا صرف دعوی کے اعتبار سے ملت توحید پر ہو جیسا کہ کتابی یعنی یہود و نصاری اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں میں سے کسی کتاب پر یقین بھی رکھتا ہو اور ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام ذبیحہ پر نہ لیتے ہوں مثلاً عیسی علیہ السلام کا نام یا عزیر علیہ السلام کا نام اور اگر وہ غیر اللہ کا نام ذبح کرتے وقت لیتے ہوں تب بھی انکا ذبیحہ حلال نہ ہوگا بلکہ مردار ہوگا۔ موجودہ عیسائی اور یہودی اگر ان امور کا لحاظ رکھتے ہیں تو ان کا ذبیحہ حلال ہے ورنہ مردار ہے۔ بہرحال تقوی اور احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان کے ہوٹلوں میں کھانا نہ کھائیں اس لئے کہ گوشت کے علاوہ دال سبزی بھی اگر کھائیں گے تو وہ لوگ ہماری معلومات کے مطابق خنزیر کی چربی میں عموماً کھانے پکاتے ہیں۔ البتہ آپ کے کہنے پر وہ لوگ اگر برتن کو صاف کر کے دیگر پکانے کے تیل میں آپ کیلئے دال سبزی پکائیں تو کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما فی البحر (۱۶۸/۶ سعید)

(وحل ذبیحة مسلم وکتابی) لقوله تعالی وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم والمراد به ذبائحهم لان مطلق الطعام غیر المذکی یحل من ای کافر ولا یشترط ان یکون من اهل الکتاب ولا فرق فی الکتابی بین ان یکون ذمیا او حربیا ویشترط ان لا یذکر فیه غیر الله تعالی حتی لو ذکر الکتابی المسیح او عزیر لا یحل لقوله تعالی وما اهل به لغیر الله وهو کالمسلم فی ذلک فانه لو اهل به لغیر الله لا یحل،

ولما فی الدر مع الرد (۲۹۶/۶، ۲۹۷ سعید)

(وشرط کون الذابح مسلما ..... او کتابیا ذمیا او حربیا) الا اذا سمع منه عند الذبح ذکر المسیح (فلا تحل ذبیحتهما) لقوله الا اذا سمع منه عند الذبح ذکر المسیح) فلو سمع منه ذکر الله تعالی لکنه عنی به المسیح قالوا یوکل الا اذا نص فقال باسم الله الذی هو ثالث ثلاثة هندیه "والمفاد انه یوکل اذا جاء به مذبوحا غایته، کما اذا ذبح بالحضور وذکر اسم الله تعالی وحده

ولما فی الهندیه (۵/۲۵۲ ماجدیه)

ثم انما توکل ذبیحة الکتابی اذا لم یشهد ذبحه ولم یسمع منه شئی او شهد وسمع منه

تسمية الله تعالى وحده لانه اذالم يسمع منه شيئا يحمل على انه قدسمى الله تعالى تحسينا للظن به كمابالمسلم ولوسمع منه ذكراسم الله تعالى لكنه عنه بالله عزوجل المسيح عليه السلام قالوا:توكل الااذانص فقال :بسم الله الذى هوثالث ثلاثة فلاتحل ، فاما اذاسمع منه انه سمى المسيح عليه السلام وحده او سمى الله سبحانه وسمى المسيح لاتوكل ذبيحته۔

ولمافى الهداية(۴/۴۴۳رحمانيه)

ومن شرطه ان يكون الذابح صاحب ملة التوحيداما اعتقادا كالمسلم او دعوى كالكتابى ......قال وذبيحة المسلم والكتابى حلال لماتلونا ولقوله تعالى وطعام الذين اوتواالكتاب حل لكم

ويحل اذاكان يعقل التسمية والذبيحة يضبط ......امااذاكان لايضبط ولايعقل التسمية والذبيحة لاتحل لان التسمية على الذبيحة شرط بالنص۔

الجواب صحیح :مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب :دوست محمد روغانی

اجمادی الثانیہ ۱۴۲۵ھ | فتویٰ نمبر ۳۱۷۳

﴿ذبح کرتے وقت جانور کا سر الگ کرنا مکروہ ہے﴾

﴿سوال﴾ بعض لوگ جانور کو ذبح کرنے کے فوراً بعد اسکا سر جدا کردیتے ہیں ایسے ذبیحہ کے بارے میں کیا حکم ہے کیا یہ حلال ہوگا؟

﴿جواب﴾ ٹھنڈا ہونے سے قبل مذبوح جانور کا سر علیحدہ کرنا مکروہ ہے، مگر ذبیحہ حلال ہو جاتا ہے۔

لمافى التنوير مع الدر والرد:(۲۹۶/۶،طبع سعيد)

(و)كره كل تعذيب بلا فائدة مثل(قطع الرأس والسلخ قبل أن تبرد)أى تسكن عن الاضطراب وهوتفسير باللازم كمالايخفى ــ وفى الشامية:(قوله وكره الخ)هذاهوالاصل الجامع فى افادة معنى الكراهة عناية(قوله أى تسكن عن الاضطراب) كذافسره فى الهداية(قوله وهوتفسير باللازم)لأنه يلزم من برودتهاسكونهابلا عكس الخ.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم :شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

اجمادی الثانی ۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر :۳۵۵

﴿ذبح میں مدد کرنے والے کا تسمیہ کہنا واجب نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں سعودی عرب

میں ایک کمپنی میں کام کرتا ہوں ہمارے ساتھ چند غیر مسلم (ہندو) بھی ہیں، ایک مرتبہ ہم مسلمان اپنے لیے ایک دنبہ ذبح کر رہے تھے ذبح کرتے وقت دنبہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا تو ایک ہندو آیا اور دنبے کے پیروں کو پکڑ لیا اور میں نے بسم اللہ پڑھ کر چھری پھیر دی لیکن ہندو نے بسم اللہ نہیں پڑھی، تو کیا ہندو کے پیر پکڑنے اور بسم اللہ نہ پڑھنے سے جانور کے حلال ہونے میں کوئی فرق تو نہیں آئے گا؟

مستفتی: محمد کامران فیصل

﴿جواب﴾ جانور ذبح کرتے وقت جو شخص محض جانور کا ہاتھ پاؤں، سینگ وغیرہ پکڑ کر معین ومددگار بنتا ہے اس پر "بسم اللہ" پڑھنا واجب نہیں ہے بلکہ صرف ذبح کرنے والے کا "بسم اللہ" پڑھنا کافی ہے، البتہ جو آدمی قصاب یا ذبح کرنے والے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے یا چھری چلانے میں مددگار بنتا ہے اس پر "بسم اللہ" پڑھنا ضروری ہوتا ہے دونوں میں سے ایک بھی چھوڑے گا تو جانور حلال نہیں ہوگا، لہٰذا مذکورہ صورت میں جب ذبح کرنے والے یعنی آپ نے "بسم اللہ" پڑھ کر جانور ذبح کیا ہے تو یہ جانور حلال ہے اور اس کا کھانا بلاشبہ جائز ہے ہندو کے "بسم اللہ" پڑھنے یا نہ پڑھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة المائده الاية ۴)

فكلوا مما امسكن عليكم واذكروا اسم الله عليه.

ولما فی الفقه الحنفی وأدلته:(۲۰۱/۳ طبع دار الكلم الطيب بيروت)

"الشرط الثانی:كون الذابح مسلماً أو كتابياً.

ولما فی الدر المختار:(۲۲۷/۹ طبع امداديه)وشرط كون الذابح مسلماً حلالاً.

وفيه أيضاً ص ۲۸۲

وفيها اراد التضحية فوضع يده مع يد القصاب فی الذبح وأعانه علی الذبح سمی كل وجوباً، فلو تركها احدهما اوظن أن تسمية احدهما تكفی حرمت.

ولما فی فتاوی قاضيخان علی هامش الهنديه:(۲۵۵/۳ طبع رشيديه)

رجل اراد ان يضحی فوضع صاحب الشاة يده مع يد القصاب فی المذبح واعانه علی الذبح حتی صار ذابحاً مع القصاب قال الشيخ رحمه الله يجب علی كل واحد منهما التسمية حتی لو ترك احدهما التسمية لا تحل الذبيحة.

ولما فی مجموعة الفتاوی:(۲۱۳/۳)

تسمية معين ذابح ہم ضرورست ومعين ذابح آن ست كه دست خود بر آله ذبح نهد.

ولما فی امداد الاحکام(۲/۴۱۳)

''پیر پکڑنے والا معین ذابح نہیں ہے بلکہ معین ذابح سے مراد وہ ہے جو ذابح کرنے والے کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد نوید عفا اللہ عنہ

۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۴۰

﴿جھٹکے اور سستی کی وجہ سے متروک التسمیہ ذبیحہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جس مرغی کو جھٹکے کے ساتھ ذبح کیا جائے اس کا کیا حکم ہے، یا کاہلی کی وجہ سے بسم اللہ نہ پڑھی جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ مرغی کو جھٹکے سے ذبح کرنے کی تفصیل استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنی کتاب ''بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ'' میں بتائی ہے، چونکہ اس میں شرعی طریقہ سے ذبح کرنے کی رعایت نہیں کی جاتی اس لئے اس کا کھانا جائز نہیں ہے، اسی طرح کاہلی اور سستی کی وجہ سے ذبح کے وقت کوئی تسمیہ چھوڑ دے تو اس کا کھانا بھی جائز نہیں ہے۔

فی قولہ تعالی(الانعام، آیت ۱۲۱)﴿ولا تأکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ و انہ لفسق﴾

لما فی المحیط البرھانی:(۸/۴۵۶، کتاب الذبائح،الفصل ۳،طبع بیروت)

واذا اراد ان یذبح عددا من الذبائح لم تجزئہ التسمیۃ الاولی عما بعدھا.

لما فی الشامیۃ:(۶/۲۹۹، کتاب الذبائح،طبع سعید)

اقول:یمکن ان یفرق بین غیر العالم بالشرطیۃ اصلا و بین العالم بھا بالجملۃ فیعذر الاول دون الثانی لوجود علمہ باصل الشرطیۃ، علی ان الشرط فی التسمیۃ الفور کما یاتی و بذبح الاول انقطع الفور فی الثانیۃ مع علمہ بالشرطیۃ تامل، لکن ذکر فی البدائع انہ لم یجعل ظنہ الاجزاء عن الثانیۃ عذرا کالنسیان لانہ من باب الجھل بحکم الشرع و ذلک لیس بعذر بخلاف النسیان کمن ظن ان الاکل لایفطر الصائم فلیتامل.

لما فی بحوث فی قضایا فقھیۃ معاصرۃ:(ص ۲۲۳-۲۲۴، طبع مکتبۃ معروفیۃ)

ان الطرق الالیۃ للذبح فی الدجاج علیھا عدۃ ماخذ من الناحیۃ الشرعیۃ:

(ا)غمس الدجاج قبل ذبحہ فی الماء البارد الذی فیہ تیار من الکھرباء فانہ لایومن منہ ان یموت الدجاج بالکھرباء

(ب)تعذر التسمیۃ علی مایذبح عن طریق السکین الدوار.

(ج)الشبھۃ فی قطع العروق فی بعض الحالات.

وان ما نقلنا من تقارير المندوبين لهيئة كبار العلماء و توصيات اللجنة الدائمة للبحوث والافتاء يكفي لاثبات ان معظم الشهادات المكتوبة على علب اللحوم المستوردة من كونها مذكاة بالطريقة الشرعية لايوثق بها اطلاقا، و على هذا. فلايجوز اكلها ما لم يثبت بطريق موثوق انه مذبوح بالطريقة الشرع

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن حفظہ اللہ تعالی　　واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: جلال الدین خرسند

۲۲ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　فتوی نمبر: ۳۵۹۸

﴿حلق کے گرہ سے اوپر اگر ذبح ہو اتب بھی جانور حلال ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں۔ کہ ذبح فوق العقدہ کا شریعت میں کیا حکم ہے اور اس سے جانور کی حلت وحرمت پر کیا اثرات مرتب ہونگے۔ بعض لوگ ایسے جانور کو حرام سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔

﴿جواب﴾ ذبح میں چار چیزوں کا کاٹنا ہوتا ہے حلق کے دائیں بائیں جانب دو رگیں جن سے دماغ کی طرف خون کی سپلائی ہوتی ہے اور سانس وخوراک کی نالی عقدہ (گرہ) سے نیچے یہ چاروں چیزیں چونکہ الگ الگ ہوتی ہیں اس لئے کوشش یہ ہو کہ عقدہ (گرہ) کے ساتھ ہی نیچے ذبح کیا جائے تا کہ چاروں چیزوں کا یقینی طور پر الگ الگ کاٹنا ثابت ہو۔ عقدہ (گرہ) کے اوپر چونکہ حلق کا حصہ شروع ہو جاتا ہے سانس اور خوراک کی دونوں نالیاں عقدہ (گرہ) پر آ کر حلق کا حصہ بن جاتے ہیں اس لئے عقدہ (گرہ) کے اوپر کاٹنے سے حلق کٹ جاتا ہے دونوں نالیوں کا الگ الگ کٹنا ظاہر نہیں ہوتا لیکن دونوں یہاں آ کر حلق بن جاتے ہیں اس لئے حلق کے کٹنے سے من وجہ نالیاں بھی کٹ جاتی ہیں اور رگوں کے کٹنے میں کوئی اشتباہ نہیں ہے لہذا ذبح میں ایسی صورت پیش آ جائے تو مفتی بہ قول کے مطابق جانور حلال ہے چنانچہ شیخ الحدیث والفقہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ تعالی لکھتے ہیں کہ" میں نے خود اس کا مشاہدہ کیا ہے کہ ذبح فوق العقدہ سے اکثر رگوں کا قطع حاصل ہو جاتا ہے اور یہ حلال ہے"۔

اس طرح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالی نے امداد الفتاوی میں لکھا ہے کہ حلت وحرمت دونوں قولوں میں اختلاف کا مبنی صرف یہ ہے کہ ذبح فوق العقدہ میں حلقوم اور مری قطع ہونگے یا نہیں۔ سو یہ امر مشاہدہ کے متعلق ہے۔ مشاہدہ کے بعد اس میں

اختلاف کی گنجائش نہیں اور چونکہ مشاہدہ قطع کا روایات ثقات سے محقق ہو چکا اس لئے حلت کا حکم دیا جائے گا۔

لہٰذا عقدہ (گرہ) سے اوپر اگر ذبح ہو جائے تو جانور حلال ہے اس کا کھانا جائز ہے۔ حرام سمجھنا غلط ہے۔

لما فی الشامی (۲۹۵/۶ طبع سعید)

اقول: والتحریر للمقام: ان یقال: ان کان بالذبح فوق العقدہ حصل قطع ثلاثة من العروق فالحق ماقاله شراح الهداية تبعاللرستغفنی، والافالحق خلافه، اذلم یوجد شرط الحل باتفاق اهل المذهب، ویظهر ذلک بالمشاهدة اوسوال اهل العبرة، فاغتنم هذاالمقال ودع عنک الجدال.

ولما فی الهندیة (۲۸۷/۵ طبع رشیدیه)

فان قطع کل الاربعة حلت الذبیحة وان قطع اکثرها فکذالک عندابی حنیفة رحمه الله تعالی.

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته (۲۷۶۶/۴ طبع رشیدیه)

قال الحنفیة وبعض المالکیة: توکل، لانه لایشترط قطع الحلقوم ذاته فان قطع فوق الجوزه جاز لانه یشترط فقط قطع اکثرالاوداج وقدوجد.

ولما فی البزازیه علی هامش الهندیه (۳۰۶/۶ طبع رشیدیه)

وقدقال الامام: یکتفی بقطع الثلاث من الاربع ای ثلاث کان.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: محمد داؤد فاروقی ٹانکوی

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ   فتویٰ نمبر: ۳۰۸۱

﴿ذبح کا مسنون طریقہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ جانور کو ذبح کرتے وقت کس طرف لٹانا چاہیے اور ذبح کا صحیح مسنون طریقہ کیا ہے؟   مستفتی: ظہور احمد کیانی

﴿جواب﴾ ذبح کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ جانور کو بائیں پہلو پر نرمی کیساتھ قبلہ رخ لٹا کر ذبح کرنے والا خود بھی قبلہ رخ ہو "بسم اللہ اللہ اکبر" پڑھ کر جانور کے حلق پر تیز چھری وغیرہ چلائیں یہاں تک کہ چار چیزیں یعنی دو بڑی رگیں جن کے ذریعہ دل سے سر کی جانب خون کی سپلائی ہوتی ہے اور ایک خوراک کی نرم نالی اور ایک سانس کی سخت نالی یہ چاروں چیزیں کٹ جائیں مزید کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بعض قصائی نرخرہ کرتے ہیں اور بعض زیرہ کی ہڈی کے جوڑوں کے اندر سے شہ رگ کاٹتے ہیں جس سے جانور کی حرکت مکمل ختم ہو جاتی ہے، یہ ظلم ہے اس سے روکنا چاہیے اور اونٹ کے علاوہ باقی تمام جانوروں میں لٹا کر ذبح کرنا مسنون ہے اور اونٹ کو کھڑے ہونے کی حالت میں بائیں ہاتھ باندھ کر نحر کرنا مسنون ہے، نحر کا مطلب یہ ہے کہ سینہ کے قریب گردن کے نیچے حصے میں نرم جگہ ہے جہاں تمام رگیں ایک ساتھ ہیں کاٹنا چاہیے۔

لمافی الهندية:(۵/۲۸۷-۲۸۸،طبع رشيديه)

والسنة فى البعير كل منها أن ينحر قائما معقول اليد اليسرى والسنة فى الشاة والبقر أن يذبح كل منها مضجعا لأنه أمكن لقطع العروق ويستقبل القبلة فى الجميع كذافى الجوهرة النيرة۔المستحب أن يكون الذبح بالنهار۔۔۔ومنها الترفيق فى قطع الأوداج ويكره الاتكاء، ويستحب الذبح من قبل الحلقوم.

قال البقالى المستحب أن يقول بسم الله الله أكبر يعنى بدون الواو كذافى المحيط.

ولمافى البزازية:(۶/۳۰۵-۳۰۷،طبع قديمى)

ويستحب التوجيه الى القبلة۔۔۔المستحب أن يقول بسم الله الله أكبر الخ.

ولمافى تنوير الابصار:(۹/۴۲۷،طبع امداديه)

(والمستحب أن يقول بسم الله الله أكبر بلاواو، وكره بها)

ولمافى التنوير مع الدر:(۹/۴۳۹-۴۴۰،طبع امداديه)

(وحب)بالحاء(نحر الابل)فى سفل العنق(وكره ذبحها، والحكم فى غنم وبقر عكسه)فندب ذبحها(وكره نحرها لترك السنة)

وفى الشامية:واعلم أن النعام والاوز كالابل ينحر، والضابط كل ماله عنق طويل. أبو السعود عن شرح الكنز للابيارى، وفى المضمرات:السنة أن ينحر البعير قائما وتذبح الشاة أو البقر مضجعة . قهستانى.

ولمافى الفقه الاسلامى وأدلته:(۳/۶۶۱-۶۶۳،طبع دار الفكر بيروت)

السابع سنن التزكية(۱)التسمية۔۔۔والتكبير(۲)كون الذبح بالنهار(۳)توجيه الذابح والذبيحة نحو القبلة(۴)اضجاع الذبيحة على شقها الأيسر برفق(۵)نحر الابل قائمة معقولة الركبة اليسرى(۶)قطع الاوداج كلها والتذفيف أى الاسراع بالذبح(۷)احداد الشفرة(السكين العظيمة قبل الاضجاع(۸)الترفيق بالبهيمة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: عبد الرحمٰن کوستوی

۹ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ

فتویٰ نمبر: ۱۸۷۶

﴿جانوروں کو خصی کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا جانوروں کو خصی کرنا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ جانوروں کو منفعت کی غرض سے خصی کرنا جائز ہے بلاغرض خصی کرنا جائز نہیں۔

لما فی التنویر مع الدر:(۳۸۸/٦،طبع سعید)

(و)جاز(خصاء البهائم)حتى الهرة،وأما خصاء الآدمى فحرام قيل والفرس وقيدوه بالمنفعة والافحرام وفى الشامية:(قوله وجاز خصاء البهائم)عبر فى الهداية بالاخصاء، والصواب ماهنا كما فى النهاية وهو نزع الخصية،ويقال:خصى ومخصى(قوله قيل والفرس)ذكر شمس الأئمة الحلوانى أنه لابأس به عند أصحابنا،وذكر شيخ الاسلام أنه حرام.ط،(قوله وقيدوه)أى جواز خصاء البهائم بالمنفعة وهى ارادة سمنها أو منعها عن العض بخلاف بنى آدم فانه يراد به المعاصى فيحرم أفاده الاتقانى عن الطحاوى.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم:شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۱۵ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر:۳۱۸

﴿اوقات مکروہہ میں قربانی جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زوال کے وقت قربانی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ نماز کی طرح ''اوقات مکروہہ'' میں بھی قربانی ناجائز ہے۔ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔ مستفتی:عبدالسلام

﴿جواب﴾ زوال کے وقت قربانی کا جانور ذبح کرنا کوئی مکروہ نہیں ہے بعض لوگوں کا اس طرح کہنا کہ ''نماز کی طرح اوقات مکروہہ میں قربانی بھی مکروہ ہے۔'' یہ غلط اور بے بنیاد بات ہے۔

لما فی الهداية:(۴۲۵/۴،طبع:رحمانیه،لاہور)

وقت الاضحية يدخل بطلوع الفجر من يوم النحر الا انه لايجوز لاهل الامصار الذبح حتى يصلى الامام العيد فاما اهل السواد فيذبحون بعد الفجر وهى جائزة فى ثلاثة ايام يوم النحر ويومان بعده۔يجوز الذبح فى لياليها الا انه يكره لاحتمال الغلط فى ظلمة الليل.

ولما فى الهندية:(۲۹۵/۵،طبع:رشيديه،كوئٹه)

وقت الاضحية ثلاثه ايام العاشر والحادى عشر والثانى عشر اولها افضلها وآخرها دونها ويجوز فى نهارها وليلها بعد طلوع الفجر من يوم النحر الى غروب الشمس من يوم الثانى عشر الا انه يكره الذبح فى الليل.

ولما فى الخلاصة الفتاوى:(۳۱۱/۴،طبع:رشيديه،كوئٹه)

فى الاصل ايام النحر ثلاثة اولها افضلها ويجوز التضحية فى الليلتين المتخللتين

ویکرہ اذا طلع الفجر الثانی من یوم النحر فلاھل السواد ان یضحوا واھل المصر لا یضحون الابعد صلوۃ العید.

ولیالی تبیین الحقائق:(۲۷۸/۶،طبع:سعید کراچی)

ویجوز الذبح فی لیالیھا الاانہ یکرہ لاحتمال الغلط فی الظلمۃ وایام النحر ثلاثۃ ایام وایام التشریق ایضاً ثلاثۃ والکل لمضی باربعۃ ایام اولھانحر لاغیر وآخرھا تشریق لاغیر.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۴ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر:۳۰۲۱

﴿قربانی کے نصاب سے متعلق ایک اہم مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کے پاس چار، پانچ تولہ سونا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس عورت پر عید الاضحیٰ کی قربانی واجب ہے یا نہیں؟ علاقے کے بعض علماء کہتے ہیں کہ اس عورت کے پاس جتنی نقدی رقم ہے اسے اپنے شوہر کیلئے ہبہ کردے تو اس پر کوئی قربانی واجب نہیں ہوتی۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ جب تک سونا ساڑھے سات تولہ تک پہنچا نہ ہو اس وقت تک کوئی قربانی واجب نہیں۔ مستفتی: ولی محمد عمر ترخیل

﴿جواب﴾ قربانی کے واجب ہونے کے لئے قربانی کے دنوں میں صاحب نصاب ہونا شرط ہے، اور قربانی کا نصاب وہی ہے جو صدقۃ الفطر کا نصاب ہے یعنی ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر نقد روپے یا ضرورت اصلیہ سے زائد سامان چاہے تجارت کا ہو یا تجارت کے علاوہ جسکی مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی تک پہنچتی ہو کسی عاقل بالغ مسلمان کی ذاتی ملکیت میں خاص قربانی کے دنوں موجود ہو، اسی طرح مذکورہ اشیاء میں سے انفرادی طور پر بقدر نصاب اگر چہ نہ ہو لیکن مختلف چیزوں کو مثلاً سونا چاندی یا نقد روپے اور سونا یا چاندی ملا کر بھی اگر بقدر نصاب ہو تب بھی یہ شخص صاحب نصاب کہلائیگا اور قربانی اس پر واجب ہوگی۔ لہذا قربانی کے دنوں میں کسی خاتون کے پاس چار، پانچ تولہ سونا اگر ہے اور اسکی ذاتی ملکیت میں کچھ نقد روپے بھی ہیں تو اس پر قربانی واجب ہوگی، صرف سونا اگر ساڑھے سات تولہ سے کم ہے اور نقدی روپے یا چاندی وغیرہ اسکی ذاتی ملکیت میں نہیں ہے تو اس پر قربانی واجب نہ ہوگی، اس لئے کہ سونے کا نصاب شریعت نے ساڑھے سات تولہ مقرر کیا ہے، اور کوئی خاتون

قربانی کے ایام سے پہلے اپنی ملکیت میں صرف چار، پانچ تولہ سونا چھوڑ دے باقی نقد روپے یا چاندی وغیرہ اسکی ملکیت میں نہ رہے چاہے وہ خرچ کرے یا خیرات کرے تو وہ صاحب نصاب نہ رہیگی، اسی طرح اگر شوہر کو ہبہ کردیا تب بھی وہ صاحب نصاب نہ رہیگی بشرطیکہ واقعی اسکے قبضہ اور باقاعدہ ملکیت میں دیدیا ہو۔

لما فی المصنف عبدالرزاق:۱۰۷/۹ طبع المجلس العلمی

قال عن الثوری عن منصور عن ابراهیم قال: لا تجوز الهبة حتی تقبض والصدقة قبل ان تقبض. کذا فی نصب الرایة:۲۹۹/۴ قدیمی کتب خانه

ولما فی الهدایة:۲۸۶،۲۸۵/۳ طبع رحمانیة

الهبة عقد مشروع وتصح بالایجاب والقبول والقبض وقال بعد سطر "ولنا قوله علیه السلام لایجوز الهبة الا مقبوضة.

ولما فی العالمگیریة:۳۶۰/۵ طبع قدیمی کتب خانه

واما شرائط الوجوب: منها الیسار وهو ما یتعلق به وجوب صدقة الفطر دون ما یتعلق به وجوب الزکاة.

وکذا فیها (۳۶۱/۵) والموسر فی ظاهر الروایة من له مائتا درهم او عشرون دینارا او بشیئی یبلغ ذالک سوی مسکنه ومتاع مسکنه ومرکوبه وخادمه فی حاجته التی لا یستغنی عنها، فاما ما عدا ذالک من سائمة او رقیق او خیل او متاع للتجارة او غیرها فانه یعتد به من یساره.

ولما فی التنویر مع الدر:۳۰۳/۲ طبع سعید

وقیمة العرض تضم الی الثمنین ویضم الذهب الی الفضة وعکسه بجامع الثمنیة قیمة وقالا بالاجزاء.

ولما فی الشامی:۳۰۳/۲ طبع سعید

(قوله ویضم الخ) ای عند اجتماع ، اما عند انفراد احدهما فلا تعتبر القیمة اجماعاً بدائع لان المعتبر وزنه اداء ووجوبا کما مرّ وفی البدائع ایضا ان ما ذکر من وجوب الضم اذا لم یکن کل واحد نصابا بان کان أقل ، فلو کان کل منهما نصابا تاماً

بدون زیادة لا یجب الضم بل ینبغی ان یؤدی من کل واحد منهما زکاته ، فلو ضم حتی یؤدی کله من الذهب او الفضة فلا بأس به عندنا لکن یجب ان یکون التقویم بما هو انفع للفقراء رواجا والا یؤدی من کل منهما ربع عشرة.

ولما فی الفقه الحنفی وادلته:۳۳۵/۱ دار الکلم الطیب بیروت

وجب الزکاة فی مال المستفاد المجانس فی اثناء الحول مع الاصل فالنقدان الذهب والفضة والاوراق النقدیة وعروض التجارة جنس واحد فیضم بعضها الی بعض.

ولما فی البدائع:۶۵/۵ طبع سعید

وعلی هذا یخرج ما اذا لم یکن اهلا للوجوب فی اول الوقت ثم صار اهلا فی آخره بان کان کافرا او عبدا او فقیرا او مسافرا فی اول الوقت ثم اسلم او اعتق او ایسر او اقام فی آخره انه یجب علیه، ولو کان اهلا فی اوله ثم لم یبق فی آخره بان ارتد او اعسر او سافر فی آخره لا یجب .هکذا فی الهندیة:۳۶۲/۵ قدیمی کتب خانه

ولما فی الهندیة:۳۶۱/۵ طبع قدیمی

ولو اشتری الموسر شاة للاضحیة فضاعت حتی انتقض نصابه وصار فقیرا فجاءت ایام النحر فلیس علیه ان یشتری شاة اخری لان النصاب ناقص وقت الوجوب فلم یوجد شرط الوجوب وهو الغنی فلو انه وجدها وهو معسر وذالک فی ایام النحر فلیس علیه ان یضحی بها لانه معسر وقت الوجود.

ولما فی البدائع:۶۵/۵ طبع سعید

واما وقت الوجوب فایام النحر فلا تجب قبل دخول الوقت لان الموقتة لا تجب قبل اوقاتها کالصلوة والصوم ونحوها وایام النحر ثلاثة یوم الاضحی وهو الیوم العاشر من ذی الحجة والحادی عشر والثانی عشر وذالک بعد طلوع الفجر من الیوم الاول الی غروب الشمس من الثانی عشر.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

یکم ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۴۷۵

﴿قربانی کے نصاب کے بارے میں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک آدمی کے پاس ایک تولہ سے کچھ کم سونا ہو اور بھیڑ، بکریاں بھی ہوں (جن سب کی قیمت لگا کر چاندی کے نصاب کو پہنچتا ہو) تو ایسے شخص پر قربانی واجب ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ نقدی روپے اور سونے کی مالیت دونوں ملا کر اگر چاندی کے نصاب تک پہنچے یا گھریلوں زائد سامان وغیرہ اتنا ہے کہ مالیت چاندی کے نصاب کے برابر ہو جاتی ہے تو اس پر قربانی واجب ہے ورنہ نہیں۔

(لما فی تنویر مع الدر :۳۱۲/۶،۳۱۱/۶ طبع ایچ ایم۔ سعید)

کتاب الاضحیة من ذکر الخاص بعد العام (هی) لغة اسم لما یذبح ایام الاضحیة من تسمیة الشئی باسم وقته .وشرعا (ذبح حیوان مخصوص بنیة القربة فی وقت مخصوص وشرائطها:الاسلام والاقامة والیسار الذی یتعلق به)وجوب

(صدقة الفطر)كما مر (لاالذكورة فتجب على الانثى)خانية.

(وفما في الهندية:٥/٢٩٢،طبع رشيديه)

والموسر في ظاهر الرواية من له مائتا درهم او عشرون دينارا او شئى يبلغ ذلك سوى مسكنه ومتاع مسكنه ومركوبه وخادمه في حاجته التي لايستغني عنها فاما عدا ذلك من سائمة او رقيق او خيل او متاع للتجارة او غيرهافانه يعتد به من يساره.

(وفما في الرد:٦/٣١٢،طبع ايچ ايم سعيد)

(قوله واليسار الخ)بان ملك مائتي درهم او عرضا يساويها غير مسكنه وثياب اللبس اومتاع يحتاجه الى ان يذبح الاضحية ولو له عقار يستغله فقيل تلزم لو قيمته نصابا و قيل لويدخل منه قوت سنة تلزم و قيل قوت شهر فمتى فضل نصاب تلزمه .

(وفما في قاضي خان:٣/٢٢٩،طبع قديمى)

واما شرائطها فهى ثلاثة: اولها :الغنى والغنى فيها من له مائتا درهم او عرض يساوى مائتي درهم سوى مسكنه و خادمه وثيابه التي يلبسها واثاث البيت فالغنى فالاضحية ماهو الغنى في صدقة الفطر وقد ذكرنا.

(وفما في البزازيه:٢/٢٠٥،طبع قديمى)

قال الامام رضى الله عنه من ملك مائتي درهم او عرضايساويه غيرمسكنه وثيابه الذى يلبسها والمتاع الذى يحتاج اليه الى ان يذبح الاضحية يجب عليه والغنى والفقر والولادة والموت انما تعتبر في آخر ايام الاضحية فلو كان نصاب في اول يوم النحرفهلك اونقص منه لاتلزم ولو كان فقيرا فملك نصابا في ايامها تلزمه.

(وفما في المحيط البرهاني:٨/٤٥٥،طبع ادارة القرآن)

١٠٧٧٢.قال القدورى في شرحه:الاضحية واجبة عند اصحابنا رحمهم الله تعالى الافى احدى الروايتين عن ابى يوسفؒ فانهاسنة وشرط وجوبها اليسار عند اصحابنا والموسرفى "ظاهرالرواية" من له مائتا درهم اوعشرون دينارا اوشئى يبلغ ذلك [سوى مسكنه ومتاعه ومركوبه وخادمه في حاجته التي لايستغني عنها فاماعداذلك [من سائمة او رقيق اوخيل او متاع للتجارة او لغيرها فانه يعتد به في يساره.

(وفما في بدائع الصنائع بطبع،دارالكتب العلميه)

ومنها الغنى لما روى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم انه قال "من وجد سعة فليضح "شرط(عليه الصلاة والسلام) السعة وهى الغنى ولانا اوجبناهابمطلق المال ومن الجائز ان يستغرق الواجب جميع ماله فيودى الى الحرج فلابد من اعتبار الغنى وهو ان يكون في ملكه مائتا درهم او عشرون دينارا او شئى تبلغ قيمته ذلك سوى مسكنه وما يتاثث به وكسوته وخادمه وفرسه و سلاحه ومالا يستغنى عنه وهو نصاب صدقة الفطر وقد ذكرناه وما يتصل به من المسائل في صدقة الفطر.

(وفما في الهداية:٤/٤٤٣،طبع رحمانيه)

واليسار لما روينا من اشتراط السعة ومقداره ما يجب به صدقة الفطر وقد مر في الصوم.

(ولما فی الخانیۃ علی ھا مش الھندیۃ: ۳۴۴/۳ طبع ، رشیدیہ)

واما شرائطھا فھی ثلثة ـــــ اولھا الغنی والغنی فیھا من له ما ئتا درھم او عرض یساوی مائتی درھم سوی مسکنه وخادمه وثیابه التی یلبسھا واثاث البیت فالغنی فی الاضحیة ماھو الغنی فی صدقة الفطر وقد ذکرنا.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمان غفرلہ ولوالدیہ

۸صفرالخیر ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر ۳۸۸۶

﴿الگ الگ جمع پونجی رکھنے پر باپ، بیٹے دونوں پر قربانی واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین متین در پیش مسئلہ کے متعلق کہ باپ اور بیٹے دو مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں مثلاً ایک کی پرچون کی دوکان ہے، جبکہ دوسرا اسٹیٹ ایجنسی سے منسلک ہے۔ لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ دونوں کا خرچہ مشترک ہے اور گذران زندگی میں درپیش مسائل وہ باہم تعاون سے حل کرتے ہیں، مگر ان میں سے ہر ایک اپنی دوکان سے حاصل شدہ جمع پونجی کا حساب وکتاب الگ سے اپنے پاس ہی رکھتا ہے، جسکا دوسرے کو علم تک بھی نہیں ہوتا۔ اب استفسار طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا ان دونوں پر قربانی واجب ہوگی یا صرف ایک قربانی دونوں کی طرف سے کافی ہوگی؟ برائے مہربانی دلائل کی روشنی مکمل وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں باپ اور بیٹا ہر ایک آمدنی کا کچھ حصہ اپنے پاس الگ بھی اگر رکھتے ہیں اور ہر ایک کی جمع پونجی اب نصاب کی مالیت کے برابر ہے تو باپ بیٹے ہر ایک پر الگ الگ قربانی واجب ہے، ہاں اگر کسی ایک کے پاس بقدر نصاب مال اب تک جمع نہیں ہوا، اور اسی طرح پرچون کی دوکان میں موجود مال تجارت بھی بقدر نصاب نہیں ہے تو اس پر قربانی واجب نہیں ہے۔

لمافی الشامی :(۳۱۲/۶ طبع: ایچ ، ایم سعید کراچی)

وشرائطھا الاسلام والاقامة والیسار الذی یتعلق به وجوب صدقة الفطر لاالذکورة فتجب علی الانثی۔

ولما فی فتح القدیر:(۵۱۸/۹ طبع: رشیدیہ کوئٹہ)

اما شرائط الوجوب فالیسار الذی یتعلق به وجوب صدقة الفطر والاسلام والوقت وھوایام النحر.

ولما فی البحرالرائق:(۱۷۸/۸ طبع: ایچ ، ایم سعید کراچی)

تجب علی حر مسلم موسر مقیم عن نفسه لاعن طفله شاة سبع بدنة فجر یوم النحر فی آخر ایامه.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۸ ذی القعدہ ۱۴۳۴ھ فتویٰ نمبر: ۳۸۷۳

﴿آدمی امریکہ میں ہے اسکی قربانی پاکستان میں ہے کس وقت کریں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی امریکہ میں رہتا ہے لیکن اسکی قربانی پاکستان میں ہے اگر اسکی طرف سے قربانی کرنی ہو تو جب یہاں پاکستان میں قربانی کرنے کا ٹائم ہو جائے قربانی کرنا درست ہوگا یا وہاں کے ٹائم کا انتظار کرنا ہوگا جبکہ دونوں میں تقریباً بارہ گھنٹے کا فرق ہے کہ وہاں بارہ گھنٹے بعد عید ہے برائے کرم وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ قربانی میں جانور کے مکان کا اعتبار ہوتا ہے قربانی کرنے والے کے مکان اور وقت کا اعتبار نہیں ہوتا۔ لہذا قربانی کا جانور اگر پاکستان میں ہے اور قربانی کی نیت سے ذبح ہو رہا ہے اور یہاں پاکستان میں قربانی کا وقت ہو چکا ہے تو اس شخص کیطرف سے قربانی کرنی صحیح ہے اگر چہ امریکہ میں ابھی تک وقت داخل ہونے میں کچھ دیر ہو۔ ہاں ایسے شخص کی قربانی دوسرے روز کی جائے تو احتیاط اسی میں ہے۔

لما فی الهنديه ج۵/۲۹۶/قدیمی کتب خانه

ان الرجل اذا كان في مصر واهله في مصر أخر فكتب اليهم ليضحوا عنه فانه يعتبر مكان التضحية فينبغي ان يضحوا عنه بعد فراغ الامام من صلوته في المصر الذي يضحى عنه فيه

ولما في البحر ۸/۱۷۵/طبع ایچ ایم سعید

والمعتبر في ذلك [اى وقت الاضحية] مكان الاضحية حتى لو كانت في السواد والمضحي في المصر يجوز كما انشق الفجر وفي العكس لايجوز الا بعد الصلوة......لان وقتها من طلوع الفجر وانما اخرت في حق المصر لماذكرنا ولانها تشبه الزكوة فيعتبر في الاداء مكان المحل وهو المال لامكان الفاعل بخلاف صدقة الفطر حيث يعتبر فيها مكان الفاعل لانها تتعلق بالذمة والمال محل لها

ولما في المحيط البرهاني ۸/۴۶۳/طبع ادارة القران

قال القدوري فلو ان رجلا من اهل السواد دخل المصر لصلوة الاضحى وامر اهله ان يضحوا عنه جاز ان يذبحوا عنه بعد طلوع الفجر قال محمد رحمه الله تعالى :انظر في هذا الى موضع الذبح دون المذبوح عنه ولو كان الرجل بالسواد واهله بالمصر لم يجز ذبح الاضحية عنه الا بعد صلوة الامام وهكذا روى عن ابي يوسف رحمه الله تعالى وروى عنهما ايضا :ان الرجل اذا كان في مصر واهله في مصر اخر فكتب اليهم ان يضحوا عنه فانه يعتبر مكان الذبيحة ينبغي ان يضحوا بعد صلوة الامام في المصر الذي تذبح فيه

وروی عن الحسن انه قال: لاتجوز التضحية حتى يصلى فى المصرين جميعا احتياطا

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۸ ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۳۸۶۱

﴿قربانی اور صاحب قربانی الگ الگ ہوں تو کس کا اعتبار ہوگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا بڑا بھائی شہر میں رہتا ہے، اور اس کا قربانی کا جانور گاؤں میں تھا اب عید کے دن صبح صادق کے بعد قربانی کے جانور کو ذبح کر دیا اور ابھی تک شہر میں عید کی نماز نہیں ہوئی تھی تو کیا میرے بھائی کی قربانی ادا ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ آپ کے بھائی کی قربانی بلا کراہت صحیح ہوگئی ہے، عید کی نماز تک قربانی کو مؤخر کرنے کا حکم صرف شہر یا بڑے گاؤں والوں کے لئے ہے، جہاں عید کی نماز قائم کی جاتی ہے، دیہات میں نماز جمعہ وعید قائم نہیں ہوتی وہاں صبح سویرے سویرے قربانی کرنا بلا کراہت جائز ہے۔

لما فی الشامی: (۳۱۸/۶ طبع: سعید)

(قوله والمعتبر مكان الاضحية) فلو كانت فى السواد والمضحى فى المصر جازت قبل الصلاة وفى العكس لم تجز.

ولما فى فتاوى قاضى خان: (۲۳۰/۳، طبع: قديمى)

ولو كانت الاضحية فى السواد صاحبها فى المصر فامر اهله بالتضحية فذبح الاهل قبل صلاة العيد يجوز عندنا ويعتبر مكان المذبوح لامكان المالك.

ولما فى الهدايه: (۴۲۶/۴، طبع: رحمانيه)

ثم المعتبر فى ذلك مكان الاضحية حتى لو كانت فى السواد والمضحى فى المصر يجوز كما انشق الفجر ولو كان على العكس لا يجوز الا بعد الصلاة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: بندہ شاہ جہان ڈیروی

۱۴ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر: ۳۲۵۷

﴿قربانی کی ایک خاص صورت کا بیان﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ سات آدمیوں نے ایک گائے قربانی کی نیت سے خریدی اور شرکاء میں ایک شریک غریب ہے شرعاً اس کے ذمے قربانی واجب نہیں ہے بعد میں جانور کے اندر ایسا عیب پیدا ہوا کہ قربانی سے مانع ہے اب چھ

شرکاء، جن پر قربانی واجب ہے، کیلئے دوسرا جانور تجویز کرنا ضروری ہے اور ایک غریب شریک کیلئے اسی جانور کی قربانی کرنا درست ہے اب ان شرکاء کو شرعاً کیا حکم ہے وضاحت کیجئے۔

﴿جواب﴾ غریب آدمی قربانی کی نیت سے کوئی جانور خریدے تو اس کی قربانی اس پر واجب ہو جاتی ہے یعنی یہی جانور قربانی کیلئے متعین ہو جاتا ہے قربانی کے علاوہ کسی اور مقصد کیلئے استعمال میں لانا جائز نہیں ہوتا اور عیب پیدا ہونے کی صورت میں دوسرا بے عیب جانور خریدنا اس کے ذمے واجب نہیں ہوتا اسلئے کہ قربانی کی نیت سے خریدنے سے صرف اسی جانور کی قربانی واجب ہوتی ہے کوئی مستقل قربانی واجب نہیں ہوئی ہے، لیکن مذکورہ صورت میں اس فقیر نے جانور کا ایک حصہ خریدا ہے کوئی مستقل جانور نہیں خریدا اور مشترکہ جانور میں حصہ کی تعیین نہیں ہوسکتی حصہ اگرچہ ساتواں ہے لیکن پورے جانور میں شائع ہے عیب پیدا نہ ہوتا اور تمام شرکاء اس جانور کی قربانی کرتے تو فقیر کی قربانی بھی ہو جاتی لیکن عیب پیدا ہونے کی صورت میں مالدار لوگ اپنے اپنے حصے کو کم از کم بیچ سکتے ہیں ان پر صرف اسی جانور کی قربانی لازم نہیں تھی اب غریب آدمی کو اپنے ساتویں حصے کی قربانی کرنا ممکن نہیں رہا البتہ اپنے حصے کے بقدر صدقہ کرنے کا وجوب معلوم ہو رہا ہے یعنی پورے جانور کو تمام شرکاء فروخت کریں تو فقیر اپنے حصے کی رقم صدقہ کرے یا اس رقم سے دوسرے جانور میں حصہ ملالے یعنی حصے کے بقدر اگر رقم مل جائے، اسلئے کہ فقیر کے حق میں قربانی کے وجوب کا حکم دراصل نذر کی بنیاد پر ہے۔

لما فی تنویر الابصار ۶/۳۲۱ طبع سعید)

(وفقیر) عطف علیہ (شراہا لہا) لوجوبہا علیہ بذلک حتی یمتنع علیہ بیعہا (و) تصدق (بقیمتہا غنی شراہا او لا) لتعلقہا بذمتہ بشرائہا أو لا

ولما فی الردالمحتار ۶/۳۲۱ طبع سعید)

(قولہ عطف علیہ) أی علی فاعل تصدق (قولہ شراہا لہا) فلو کانت فی ملکہ فنوی ان یضحی بہا أو اشتراہا لہا ولم ینو الاضحیۃ وقت الشراء ثم نوی بعد ذلک لا یجب لأن النیۃ لم تقارن الشراء فلا تعتبر بدائع (لوجوبہا علیہ بذلک) أی بالشراء وہذا ظاہر الروایۃ لان شراءہ لہا یجری مجری الایجاب وہو النذر بالتضحیۃ عرفا کما فی البدائع۔

ولما فی تنویر الابصار ۶/۳۲۵ طبع سعید)

(ولو اشتراہا سلیمۃ ثم تعیبت بعیب مانع) کما مر (فعلیہ اقامۃ غیرہا مقامہا ان) کان (غنیا، وان) کان (فقیرا أجزأہ ذلک) وبعد اسطر وکذا لو ماتت فعلی الغنی غیرہا لا الفقیر

(ولما فی الرد المحتار ۶/۳۲۵ طبع سعید)

(قوله وان کان فقیرا أجزأه ذلک) لانها انما تعینت بالشراء فی حقه حتی لو أوجب اضحیة علی نفسه بغیر عینها فاشتری صحیحة ثم تعیبت عنده فضحی بها لا یسقط عنه الواجب لوجوب الکاملة علیه کالموسر وبعد اسطر (قوله فعلی الغنی غیرها لا الفقیر) أی ولو کانت المیتة منذورة بعینها کما فی البدائع ان المنذورة لو هلکت أو ضاعت تسقط الاضحیة بسبب النذر ،غیر انه ان کان موسرا تلزمه أخری بایجاب الشرع ابتداء لا با لنذر.

(ولما فی العالمگیریه۵/۲۹۹ قدیمی کتب خانه)

ثم کل عیب یمنع الاضحیة ففی حق الموسر یستوی ان یشتریها کذلک أو یشتریها وهی سلیمة فصارت معیبة بذلک العیب لا تجوز علی کل حال وفی حق المعسر تجوز علی کل حال کذا فی المحیط ،ولو اشتری اضحیة وهی سمینة فعجفت عنده حتی صارت بحیث لو اشتراها علی هذه الحالةلم تجزنه ان کان موسرا وان کان معسرا اجزأته اذ لا اضحیة فی ذمته فان اشتراها للاضحیة فقد تعینت الشاة للأضحیة حتی لو کان الفقیر أوجب علی نفسه اضحیة لا تجوز هذه.

ولما فی المحیط البرهانی۸/۴۵۹ ادارة القران)

وان کان المشتری فقیرا ذکر شیخ الاسلام خواهر زاده فی شرح کتاب الاضحیة ان فی ظاهر الروایة لاصحابنا تصیر واجبة الأضحیة وبعد اسطر اما اذا صرح بلسانه وقت الشراء انه لشتراها لیضحی بها ،فقد ذکر شمس الائمة الحلوانی انها تصیر واجبة ،وفیه ایضا الفقیر اذا اشتری اضحیة فضلت فلیس علیه ان یشتری مکانها أخری لان الوجوب علی الفقیر بالشراء والشراء یتناول هذا العین لوجب التضحیة بهذالعین فیسقط الوجوب بهلاکه.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٹکی

یکم صفر الخیر ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر: ۳۶۷۱

﴿ایصال ثواب کی نیت سے قربانی کا جانور لینے سے قربانی واجب نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی جو کہ خود صاحب نصاب ہے اور اس پر اپنی قربانی واجب ہے اس نے اپنے مرحوم والد صاحب کیطرف سے قربانی کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اس کیلئے اس نے جانور بھی خرید اتھا لیکن اب اسکا ارادہ تبدیل ہوا اور وہ والد صاحب کیطرف سے قربانی نہیں کرنا چاہتا؛ پوچھنا یہ ہے کہ والد صاحب کی طرف سے قربانی اس پر واجب ہوگئی یا نہیں؟ اگر کرلیا تو وہ قربانی والد صاحب کی شمار ہوگی یا قربانی تو اس

کی ہوگی لیکن والد کو صرف ثواب پہنچے گا؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: مولوی ظاہر شاہ

﴿جواب﴾ قربانی ایک سے زیادہ واجب نہیں ہوتی اس شخص پر اپنی قربانی واجب ہے والد صاحب کیطرف سے قربانی کی نیت سے جانور خریدنے سے مرحوم کو ثواب پہنچانا مقصود تھا اور یہ جائز بلکہ سنت سے ثابت ہے لھذا یہ شخص تو اپنی قربانی کے ثواب میں والد کو شریک کرے چاہے تو والد مرحوم کیطرف سے مستقل جانور قربانی کرلے دونوں طرح جائز اور ثواب کا کام ہے کوئی ضروری نہیں۔

لمافی البحر ج۸/۱۷۵

فلو قال كلاما نلسبا الله على ان اضحى بهذالشاة ولم يذكر بلسانه شيئا فاشترى شاة بنية الاضحية ان كان المشترى غنيا لاتصير واجبة باتفاق الروايات فله ان يبيعها ويشترى غيرها۔

ولمافى المحيط البرهانى ج۸/۴۶۳ طبع ادارة القران

سئل نصر عن التضحية عن الميت قال: يصنع به كما يصنع بالاضحية يريد به انه يتناوله من لحمه كما يتناول من لحم اضحيته فقيل له اتصير عن الميت؟ قال الاجر للميت واُلملك للمضحى وبه قال ابوسلمة وابن مقاتل وابن مطيع۔

ولمافى الفتح البارى ج۱۰/۱۲ (مكتبة رشيدية)

عن ابى هريرة رضى الله عنه ان النبى صلى الله عليه وسلم اذا اراد ان يضحى اشترى كبشين عظيمين سمينين اقرنين املحين موجوئين فذبح احدهما عن محمد وال محمد والاخر عن امته من شهدلله بالتوحيد وله بالبلاغ۔

ولمافى مشكوة المصابيح :۱۲۷ ايچ ايم سعيد

عن عائشة رضى الله عنها ان النبى صلى الله عليه وسلم امر بكبش اقرن يطأ فى سواد ويبرك فى سواد وينظر فى سواد فاتى به ليضحى به قال ياعائشه هلمى المدية ثم قال اشحذيها بحجر ففعلت ثم اخذها واخذ الكبش فاضجعه ثم ذبحه ثم قال: "اللهم تقبل من محمد وال محمد ومن امة محمد ﷺ ثم ضحى به قال المحشى نقلا عن الطيبى المراد المشاركة فى الثواب لان الغنم الواحد لايكفى عن اثنين فصاعدا.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۴ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۸۷۰

﴿میت کی طرف سے کی ہوئی قربانی کے گوشت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر میت کی طرف سے

قربانی کی جائے تو قربانی کرنے والا خود گوشت استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد حنیف

﴿جواب﴾ میت کیطرف سے قربانی عام طور پر ایصال ثواب کی غرض سے کیجاتی ہے اسکی قربانی ہو تو اس کا گوشت قربانی کرنے والا خود بھی کھا سکتا ہے اور دوسروں کو بھی دے سکتا ہے البتہ میت نے وصیت کی ہو اور قربانی میت کے ترکہ سے ہو تو ایسی صورت میں گوشت صرف غرباء اور مساکین کا حق ہے واجب التصدق ہے

لما فی الشامی: (۳۲۶/۶ طبع: ایچ ایم سعید)

من ضحی عن المیت یصنع کما یصنع فی اضحیۃ نفسہ من التصدق والأکل والاجر للمیت والملک للذابح قال الصدر: والمختار انہ ان امر المیت لا یاکل منہا والا یؤکل

ولما فی در المختار: (۳۳۵/۶ طبع: ایچ ایم سعید)

وعن میت بالامر الزم تصدقا والافکل منہا وھذا المخیر

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوھائی

۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر: ۳۱۲۳

﴿جانور بھاگ جائے تو ذبح اضطراری کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قربانی کے دن بیل کو ذبح کررہے تھے، کہ اچانک بیل بھاگ نکلا اور وہ بیل تقریباً دو کلو میٹر دور ایک تیار شدہ گنے کی فصل میں گھس گیا، اب فصل سے نکالنا مشکل ہوگیا جو بھی اس کے قریب جاتا وہ بیل ان کو قریب نہ آنے دیتا تو کوئی آدمی بھی اس کے قریب نہیں جاسکتا تھا اس کو پکڑے، وہاں ایک آدمی بظاہر مولوی نظر آتا تھا اس آدمی نے کہا کہ کیونکہ اب اس کا پکڑنا مشکل ہے، اب اس کا طریقہ یہ ہیکہ بندوق کی گولی سے اس کو زخمی کیا جائے پھر اس کو ذبح کردیں، تو کیا شریعت کی روشنی میں ان لوگوں کا طریقہ درست ہے؟ مستفتی: عبداللہ تونسوی

﴿جواب﴾ ایسی صورت میں جانور پر قابو پانے کیلئے زخمی کرنیکی گنجائش ہے تاکہ صحیح طریقہ سے پھر اس کو ذبح کرسکیں بلکہ ایسی صورت میں تو ذبح اضطراری کی بھی گنجائش ہے لیکن ذبح اضطراری کے جواز کیلئے کچھ شرائط ہیں انکی رعایت کیے بغیر جائز نہیں ہے۔

لما فی اعلاء السنن: (۱۰۸/۱۷ طبع: بیروت)

عن عبایۃ ان بعیرا من ابل الصدقۃ ند فطلبوہ، فلما اعیاھم ان یاخذوہ رماہ رجل بسھم

فاصاب مقتله فقتله فسأل النبي ﷺ عن أكله فقال: "إن لها أوابد كأوابد الوحش فاذا أحسستم منها شيئا من هذا فاصنعوا به كما صنعتم بهذا ثم كلوه".

ولما في الشامي: (۶/۳۰۴، مطبع: سعيد)

"(قوله ولو جرح نعم) النعم بفتحتين وقد يسكن قهستاني قال في الهداية اطلق فيما توحش من النعم وعن محمد أن الشاة اذا ندت في الصحراء فذكاتها العقر وإن ندت في المصر لا يحل بالعقر لأنها لا تدفع عن نفسها فيمكن أخذها في المصر فلا عجز والمصر وغيره سواء في البقر والبعير لأنهما يدفعان عن انفسهما فلا يقدر على أخذهما وإن ندا في المصر وبهذا التفصيل جزم في الجوهرة.

ولما في أيضا: (۶/۴۷۱)

(قوله أو بندقة) بضم الباء والدال طينة مدورة يرمى بها (قوله ولو كانت خفيفة) يشير الى أن الثقيلة لا تحل وإن جرحت.

ولما في الفقه الاسلامي: (۴/۲۷۶۶، مطبع: رشيديه)

والاضطرارية: الجرح في أي موضع كان من البدن عند العجز عن الحيوان كالتي صيد فتستعمل للضرورة في المعجوز عنه من الصيد والانعام، أي انها تستعمل عند الجمهور غير المالكية في الحيوان المتوحش أو الحيوان المستأنس اذا شرد ولم يمكن الحصول عليه، لأن التكليف بحسب الوسع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: شاہ جہان ڈیروی

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ | فتویٰ نمبر: ۳۳۱۰

﴿قربانی کے بیل سے جفتی کرانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قربانی کے متعین بیل کو جفتی کے لئے دینا جائز ہے؟ ہمارا قربانی کا بیل عید سے ایک دن پہلے ایک آدمی جفتی کے لئے لے گیا اور کہا کہ میں نے مولوی صاحب سے پوچھا ہے، انہوں نے کہا جفتی کے لئے دینا جائز ہے۔ براہ کرم بندہ کی رہنمائی فرمائیں۔ مستفتی: قاری محمد اشفاق قریشی صاحب

﴿جواب﴾ قربانی کے جانور کو استعمال میں لانا منع ہے لیکن جفتی کے لئے دینا منع نہیں ہے، اس عمل سے اگرچہ نسل بڑھ سکتی ہے، لیکن یہ جانور کا اپنا طبعی عمل ہے نفع حاصل کرنا شمار نہیں ہوتا۔

لما في التنوير مع الدر: (۶/۳۲۹، مطبع: سعيد)

(وكره جز صوفها قبل الذبح) لينتفع به فان جزه تصدق به ولا يركبها ولا يحمل عليها شيئا ولا يؤجرها فان فعل تصدق بالاجرة حاوي الفتاوى لانه التزم اقامة القربة بجميع اجزائها.

ولما فی البدائع:(۵ /۷۸،طبع سعید)

فلا یحل الانتفاع بها دامت متعینة ولهذا لایحل له اذاذبحهاقبل وقتها فان کان فی ضرعهالبن وهو یخاف ان لم یحلبهانضح ضرعها بالماء البارد حتی یتقلص اللبن

ولما فی الهندیه:(۵/۳۷۱،طبع:قدیمی)

ولو اشتری شاة للاضحیة یکره ان یحلبها او یجز صوفها فینتفع به لانه عینها للقربة فلا یحل له الانتفاع بجزء من اجزئها قبل اقامة القربة بها کما لا یحل له الانتفاع بلحمها اذا ذبحها قبل وقتها.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:بندہ شاہ جہان ڈیروی

۱۷صفرالخیر۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:۳۲۵۲

﴿قربانی کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی قربانی سے چند روز قبل قربانی کیلئے کوئی جانور مثلاً گائے یا بکری وغیرہ خرید کر لایا تو کیا یہ آدمی قربانی سے قبل اس جانور کا دودھ اپنے استعمال میں لاسکتا ہے؟ اگر نہیں تو اس دودھ کا کیا کرے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ اگر قربانی کیلئے گائے، بکری وغیرہ خریدی ہے تو قربانی سے قبل اس کا دودھ نکالنا اور اس سے فائدہ اٹھانا مکروہ ہے اگر جانور کے تھنوں میں دودھ اتر آیا ہے تو اس کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اگر خشک ہو جائے تو فبہا ورنہ نکال کر صدقہ کردے خود استعمال نہ کرے، واضح رہے دودھ سے جانور کو تکلیف ہو تو نکالا جائے ورنہ نہیں۔

لمافی الھندیۃ:(۵/۳۰۰۔۳۰۱،طبع رشیدیہ)

ولواشتری شاة للأضحیة یکرہ أن یحلبهاأویجزصوفهافینتفع به لأنه عینهاللقربة فلایحل له الانتفاع بجزء من اجزائهاقبل اقامة القربة بهاکمالایحل له الانتفاع بلحمها اذاذبحها قبل وقتهاومن المشایخ من قال هذافی الشاة المنذوربهابعینهامن المعسر والموسروفی الشاة المشتراة للأضحیة من المعسر،فأماالمشتراةمن الموسرللأضحیة فلابأس ان یحلبهاویجزصوفهاکذافی البدائع.والصحیح أن الموسروالمعسرفی حلبهاوجزصوفهاسواء هکذافی الغیاثیة.ولوحلب اللبن من الأضحیة قبل الذبح أوجز صوفهایتصدق به ولاینتفع به کذافی الظهیریة.واذاذبحهافی وقتهاجازله أن یحلب لبنهاویجزصوفهاوینتفع به لان القربة انتهت بالذبح والانتفاع بعداقامة القربة مطلق کالأکل کذافی المحیط.وان کان فی ضرعهالبن ویخاف ینضح ضرعهابالماء البارد فان تقلص والا حلب وتصدق.

ولما فی التنویر مع الدر والرد:(۶/۳۲۹،طبع سعید)

(ویکره الانتفاع بلبنها قبله) کما فی الصوف ومنهم من اجازهما للفنی لوجوبهما فی الذمة فلاتتعین زیلعی ـــــ وفی الشامیة:(قوله لوجوبهما فی الذمة فلاتتعین) والجواب أن المشترلة للأضحیة متعینة للقربة الی أن یقام غیرها مقامها فلایحل له الانتفاع بها مادامت متعینة ولهذا لایحل لحمها اذاذبحها قبل وقتها بدائع، ویأتی قریباأنه یکره أن یبدل بها غیرها فیفید التعین أیضاوبه اندفع ماامرعن المنح فتدبر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۱۵ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۳۳

﴿قربانی کی کھالوں کی قیمت کا مصرف﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قربانی کی کھالیں جب فروخت کردی جائیں ان کی قیمت کس قسم کے صدقہ میں شمار ہوگا؟ اور مسجدوں کی تعمیر وغیرہ میں ان کا صرف کرنا شرعا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: عادل دیروی

﴿جواب﴾ قربانی کی کھالوں کی قیمت صدقہ واجبہ میں شمار ہے اور چونکہ صدقات واجبہ میں تملیک (مالک بنا دینا) شرط ہے، اس لئے ان کو مسجد کی تعمیر وغیرہ میں صرف کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ مسجد کو دینے میں تملیک نہیں پائی جاتی۔

لما فی الهدایة:(۴/۴۵۱،طبع رحمانیه)

ولوباع الجلداواللحم بالدراهم اوبمالاینتفع به الابعداستهلاکه تصدق بثمنه لان القربةانتقلت الی بدله.

ولما فی العنایةعلی هامش فتح القدیر:(۹/۵۴۴،طبع رشیدیه)

(لان القربةانتقلت الی بدله)لان تملک البدل من حیث التمول ساقط فلم یبق الاجهةالقربةوسبیلهاالتصدق.

ولما فی التنویر مع الدر:(۶/۳۲۸،طبع سعید)

(فان بیع اللحم اوالجلدبه)ای بمستهلک(اوبدراهم تصدق بثمنه)

ولما فی الشامی:(۲/۳۳۹ تا ۳۴۴،طبع سعید)

(قوله ای مصرف الزکاةوالعشر)...... وهومصرف ایضاالصدقةالفطروالکفارة والنذر وغیرذلک من الصدقات الواجبة کمافی القهستانی.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲/۳۴۴،طبع سعید)

ویشترط ان یکون الصرف(تملیکا)لااباحة کمامر(لا)یصرف(الی بناء) نحو

(مسجد و) لاالی (کفن میت وقضاء دینه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: عبداللہ عفااللہ عنہ

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ
فتویٰ نمبر: ۹۵۹

﴿قربانی کی کھال غنی کو بھی دی جاسکتی ہے﴾

﴿سوال﴾ میں ایک مسجد میں امام ہوں مسجد زیر تعمیر ہے اہل محلہ مسجد کی تعمیر میں مدد نہیں کرتے کیا میں قربانی کے چمڑے جمع کر کے ان سے مسجد تعمیر کر سکتا ہوں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ اہل محلہ کو چاہیئے کہ مسجد کی تعمیر میں خوب حصہ لیں اوراخروی گھر بنانے کی کوشش کریں، قربانی کا گوشت اور چمڑا دونوں حکم میں برابر ہیں اپنے استعمال میں لانا چاہے تو جائز ہے، البتہ بیچ کر پیسہ استعمال کرنا جائز نہیں ہے، پیسہ واجب التصدق ہے۔ خود استعمال نہیں کرنا چاہے تو کسی کو بھی دے سکتا ہے خواہ لینے والا غنی ہو یا فقیر ہو پھر وہ چاہے تو بیچ کر پیسہ بھی استعمال کرسکتا ہے، مذکورہ صورت میں امام صاحب کو چرم قربانی لوگ دیتے ہیں اور وہ مسجد کی تعمیر میں صرف کرتے ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لما فی الهداية: (۴/۴۵۰-۴۵۱، طبع رحمانيه)

واللحم بمنزلة الجلد فی الصحيح ولو باع الجلد او اللحم بالدراهم او بما لا ينتفع به الا بعد استهلاكه تصدق بثمنه لان القربة انتقلت الى بدله...ويتصدق بجلدها لانها جزء منها او يعمل منه آلة تستعمل فی البيت.

ولما فی الهندية: (۵/۳۰۱، طبع رشيديه)

ويهب منها (ای من الاضحية) ماشاء للغنی والفقير والمسلم والذمی.

ولما فی الشامی: (۶/۳۲۸، طبع سعيد)

(قوله ويتصدق بجلدها) وكذا بجلالها وقلائدها فانه يستحب اذا اوجب بقرة ان يجللها ويقلدها واذا ذبحها تصدق بذلك كما فی التاتارخانية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: اسلام بادشاہ ہمیٹی

۹ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ
فتویٰ نمبر: ۱۹۹۷

﴿قربانی کا جانور تبدیل کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص نے ایک جانور بنیت قربانی خریدا لیکن قربانی سے پہلے اس شخص کو

دوسرا جانور جو پہلے سے سستا تھا ملا تو کیا وہ پہلے جانور کو بیچ یا چھوڑ کر دوسرے کی قربانی کر سکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر یہ شخص صاحب نصاب ہے تو اس کے لئے قربانی کا جانور بدلنا جائز ہے اور اگر صاحب نصاب نہیں ہے اور اس نے نفلی قربانی کی نیت سے خریدا ہے تو اس کی حق میں یہ جانور متعین ہو جائے گا، لہذا بدلنا جائز نہ ہوگا اور اگر بدل لیا اور دوسرا جانور پہلے سے سستا ہوا تو دونوں جانوروں کی قیمتوں میں جو فرق ہوگا اس کا صدقہ کرنا واجب ہوگا اور غنی کے لئے بھی افضل اور احوط یہی ہے گو کہ واجب نہیں۔

لما فی التنویر مع الدر والرد:(۳۲۱/۶،طبع سعید)

(وفقیر شراھا لھا)لوجوبھا علیه بذلک حتی یمتنع علیه بیعھا ــــ وفی الشامیة:قوله لوجوبھا علیه بذلک)ای بالشراء وھذا ظاھر الروایة لان شراءہ لھا یجری مجری الایجاب وھو النذر بالتضحیة عرفا.

ھکذا فی البدائع:(۳۲۱/۲،سعید)

ولما فی تقریرات الرافعی فی آخر الرد:(۳۰۲/۶،طبع سعید)

(قوله ظاھر الروایة)وفی خزانة الاکمل انه المختار وعند الجمهور لابد مع النیة ان یقول بلسانه واضحی بھا ولو اشتراھا الغنی بنیتھا لم تتعین باتفاق الروایات کما فی الخلاصة وان قال فی الاشباہ من القاعدۃ الاولی ان کان فقیرا ولو قد اشتراھا بنیتھا تعینت فلیس له بیعھا وان کان غنیا لم تتعین والصحیح انھا تتعین مطلقا اہ فان المنقول فی الغنی عدم التعین باتفاق الروایات اھ.

ولما فی الهندیة:(۲۹۳/۵،طبع قدیمی)

ولو اشتری شاۃ للاضحیة ثم باعھا واشتری اخری فی ایام النحر فھذا علی وجوہ ثلاثة. الاول اذا اشتری شاۃ ینوی الاضحیة والثانی ان یشتری بغیر نیة الاضحیة ثم نوی الاضحیة، والثالث ان یشتری بغیر نیة الاضحیة ثم یوجب بلسانه ان یضحی بھا..... ففی الوجه الاول فی ظاھر الروایة لاتصیر اضحیة مالم یوجبھا بلسانه.

ولما فی خلاصة الفتاوی:(۳۱۲/۴،طبع رشیدیه)

وفی الاصل اشتری اضحیة ثم باعھا جاز فی ظاھر الراوایة ولو اشتری مثلھا وضحی بھا ان کانت الثانی مثل الاولی او خیرا منھا جاز ولا یلزمه شئی اخر وان کان دون الاولی تصدق بفضل القیمتین، قال الامام السرخسی رحمه الله من اصحابنا من قال ھذا اذا کان المشتری فقیرا فان کان غنیا لیس علیه ان یتصدق بفضل القیمة والاصح عندی ان الغنی والفقیر سواء لان الغنی ممکن من تعیین الشاۃ.

ولما فی الخلاصة:(۳۱۸/۴،طبع رشیدیه)

وبالشراء بنیة الاضحیة ان کان المشتری غنیا لا یجب علیه باتفاق الروایات حتی

لوباعها واشتری بثمنها اخری والثانیة دون الاولی جاز ولایجب علیه شیء۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: مغیرہ شہاب غفرلہ ولوالدیہ

۲۷ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۸۲۰

﴿ایک جانور میں سات سے زیادہ آدمی شریک نہیں ہو سکتے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع متین درپیش مسئلہ کے بارے میں کہ آٹھ آدمیوں نے ملکر قربانی کا ایک جانور خرید لیا ان کو یہ خیال نہیں رہا کہ ہم آٹھ ہیں یا سات ہیں. جب گوشت کی تقسیم کرنے کی باری آئی تو پتہ چلا کہ ہم آٹھ ہیں اس کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہم فلاں فلاں سات ہیں اور فلاں آدمی کو نکال دیتے ہیں تا کہ ہم سات حصہ دار ہی رہیں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ اس صورت میں قربانی ہوئی یا نہیں ہوئی؟　　　مستفتی: عنایت اللہ کلاچوی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں کسی ایک کی بھی قربانی نہیں ہوئی اس لئے کہ قربانی ایک مخصوص جانور کو مخصوص وقت میں قربانی کی نیت سے ذبح کرنے کا نام ہے اور ذبح کرتے وقت یہ آٹھ آدمی تھے اسی طرح ہر ایک کا حصہ ساتویں حصہ سے کم ہو گیا اس لئے قربانی نہیں ہوئی ایسی صورت میں قربانی کے ایام باقی ہوں تو دوبارہ قربانی کرنا ضروری ہوتا ہے اور قربانی کے دن گذر چکے ہوں تو جانور کی قیمت صدقہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

لما فی التنویر: (۳۱۲/۶ طبع سعید)

وشرعا (ذبح حیوان مخصوص بنية القربة فی وقت مخصوص)

ولما فی البدائع: (۶۶/۵ سعید) لأن الواجب تعلق بالأراقة

ولما فی الهندية: (۲۹۷/۵ طبع رشيديه)

ولا يجوز بعير واحد ولا بقرة واحدة عن أكثر من سبعة ويجوز ذلك عن سبعة وأقل من ذلك

ولما فی مشكوة المصابيح: (ص ۱۲۷ طبع سعيد)

وعن جابر رضی الله عنه ان النبی صلى الله عليه وسلم قال: البقرة عن سبعة والجزور عن سبعة رواه مسلم وا بوداود

ولما فی التنوير مع الدر: (۳۲۱/۶ طبع سعيد)

(و) تصدق (بقيمتها غنی شرا ها أولا) لتعلقها بذمته بشرائها أولا، فا المراد بالقيمة شاة تجزی فيها

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق

۸ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ　　　فتویٰ نمبر ۳۸۷۸

﴿قربانی کے بڑے جانور میں سات سے کم شرکاء بھی ہوسکتے ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ قربانی کے بڑے جانور مثلاً گائے، بیل، اونٹ وغیرہ میں سات بندوں سے کم اشخاص شرکت کر سکتے ہیں مثلاً تین بندے ملکر ایک گائے خرید لیں اور تین ہی حصوں میں تقسیم کریں یا سات حصوں میں تقسیم کرنا ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ شریعت مقدسہ نے قربانی کے بڑے جانور میں سات شرکاء کی حد تک شرکت کو جائز قرار دیا ہے، اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے سات سے کم مثلاً تین چار ملکر ایک جانور کی قربانی کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں بشرطیکہ کسی کا حصہ ساتویں حصے سے کم نہ ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لما فی خلاصة الفتاوی:(۳۱۵/۴ طبع رشیدیه)

والبعیر والبقر یجزی عن سبعة اذا کانوا یریدون بها وجه الله تعالی اتحدت جهة القربة او اختلفت کالاضحیة والقران والمتعة والتقدیر بالسبع یمنع الزیادة کما یمنع النقصان حتی لو کانت الشرکاء فی البدنة او البقرة ثمانیة لم یجزهم ولو کان اقل من ثمانیة الا ان نصیب واحد منهم اقل من السبع لایجوز ایضا.

ولما فی الهندیة:(۳۰۴/۵ طبع رشیدیه)

یجب ان یعلم ان الشاة لاتجزئ الا عن واحد وان کانت عظیمة والبقر والبعیر یجزئ عن سبعة اذا کانوا یریدون به وجه الله تعالی والتقدیر بالسبع یمنع الزیادة ولا یمنع النقصان کذا فی الخلاصة.

ولما فی البدائع:(۷۱/۵ طبع سعید)

ولاشک فی جواز بدنة او بقرة عن اقل من سبعة بان اشترک اثنان او ثلاثة او اربعة او خمسة او ستة فی بدنة او بقرة لانه لما جاز السبع فالزیادة اولی وسواء اتفقت الانصباء فی القدر او اختلفت بان یکون لاحدهم النصف وللآخر الثلث وللآخر السدس بعد ان لاینقص عن السبع.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۱۸ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۸۳

﴿الأولیٰ ترک الأخذ من الشعر والظفر فی عشر ذی الحجة لمن قصد أن یضحیٰ﴾

﴿قربانی کرنے والے کیلئے ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں بال اور ناخن کو نہ کاٹنا بہتر ہے﴾

﴿سوال﴾ یقال اذا دخل ذو الحجة لایقلم ظفرو لایأخذ شعرو من فعل ذلک

یثاب هل هذا ثابت و ما الوجه فیه؟

﴿جواب﴾ نعم قد ورد فی الحدیث و ذکر الفقهاء ان الاولی لمن قصد ان یضحی ان لایاخذ من شعره ولا یقلم ظفره فی عشر ذی الحجه حتی یضحی وهذا اذا لم یستلزم ذلک التاخیر عن وقت الاباحة وهو اربعین یوما فان ترک الاظفار الی وراء الاربعین لایجوز.

لما فی الشامی:(۲/۱۸۱ طبع سعید)

فیکون مستحبا الا أن یستلزم الزیادة علیٰ وقت اباحة التأخیر ونهایته مادون الأربعین فلایباح فوقها.

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته:(۲/۲۸۷ طبع دار الفکر بیروت)

ویطلب الامتناع عن تقلیم الأظفار وحلق الرأس فی عشر ذی الحجة لما ورد فی صحیح لمسلم "قال رسول الله ﷺ اذا دخل العشر و اراد بعضکم أن یضحیٰ فلایأخذن شعراً ولا یقلمن ظفراً.

واما السوال عن الوجه منه والحکمة: فلاینبغی للمسلم أن یسئل عن حکمة کل مشروع مع أنه قد ذکر الفقهاء وجهه.

لما فی مرقاة المفاتیح:(۳/۵۱۱ طبع رشیدیه)

قال التوربشتی: ذهب بعضهم الی أن النهی عنهما للتشبه بحجاج بیت الله الحرام المحرمین والأولی أن یقال المضحی یری نفسه مستوجبة للعقاب وهو القتل ولم یؤذن فیه لفداها بالأضحیة وصار کل جزء منها فداء کل جزء منه فلذلک نهی عن مس الشعر والبشر لئلا یفقد من ذلک قسط ما عند تنزل الرحمة الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمہ

۲ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۸۶

﴿جس جانور کے پیدائشی طور پر سینگ یا دم نہ ہو اس کی قربانی جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایسا جانور جس کے پیدائشی طور پر سینگ نہ ہوں اسکی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح وہ جانور جسکے سینگ پیدائشی طور پر تو تھے لیکن زیبائش و آرائش کے واسطے جڑ سے ختم کر دیئے گئے ہوں؟ نیز ایسا جانور جسکی دم پیدائشی طور پر بہت زیادہ باریک اور اسقدر چھوٹی ہو گویا دم ہے ہی نہیں ایسے جانور کی قربانی درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ (۱) پیدائشی طور پر اگر سینگ نہ آئیں تو یہ جانور میں عیب شمار نہیں ہوتا، ایسے

جانور کی قربانی جائز ہے۔

لمافی الهداية:(۴۴۸/۴،طبع رحمانیه)

ویجوزان یضحی بالجماء وهی التی لا قرن لهالان القرن لایتعلق به مقصودوكذا مكسور القرن.

(۲) ایسا جانور جسکے سینگ ٹوٹ گئے ہوں یا کسی وجہ سے توڑے گئے ہوں اسکی قربانی کرنا جائز ہے بشرطیکہ جڑ سے نہ اکھڑے ہوں مسئولہ صورت میں سینگ اگر جڑ سے کاٹ دئے ہوں یعنی سر کی ہڈی تک کاٹ دئے ہوں تو اسکی قربانی جائز نہیں ہوگی کچھ اوپر سے کاٹ دئے ہوں تو قربانی جائز ہوگی۔

لمافی الشامی:(۲۶۷/۹،طبع امدادیه)

قوله:(ویضحی بالجماء)هی لا قرن لها خلقة،وكذا العظماء التی ذهب بعض قرنها بالكسراوغيره،فان بلغ الكسر الی المخ لم یجز القهستانی،وفی البدائع:ان بلغ الكسر المشاش لایجزئ والمشاش رؤس العظام مثل الركبتين والمرفقین اه.

(۳) ایسا جانور جسکی دم پیدائشی طور پر نہ ہو اسکی قربانی جائز نہیں۔

لمافی الهداية:(۴۴۷/۴،طبع رحمانیه)

لاتجزی مقطوعة الاذن والذنب اما الاذن فلقوله علیه السلام استشرفوا العین والاذن ای اطلبوا سلامتها واما الذنب فلانه عضو كامل مقصود فصار كالاذن.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:افتخار احمد کلکتی

۱۴۲۹/۱۲/۹ھ | فتویٰ نمبر:۱۹۴۰

﴿جس پر قربانی واجب نہ ہو قربانی کرنے کے بعد گوشت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ جس شخص پر قربانی واجب نہ ہو اور قربانی کی نیت سے جانور خرید کر قربانی کرے تو کیا وہ قربانی کا گوشت خود استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ فقہاء نے جس شخص پر قربانی واجب نہ ہو اور قربانی کی نیت سے جانور خریدلے نذر کے حکم میں فرمایا ہے اور عام ضابطہ ہے کہ نذر ماننے والا خود استعمال نہیں کرسکتا۔ مستفتی:محمد سجاد کشمیری

﴿جواب﴾ جس شخص پر قربانی واجب نہ ہو اس کے باوجود قربانی کی نیت سے جانور خرید لے تو اسی جانور کو قربان کرنا اس پر واجب ہو جاتا ہے اور اگر قربانی سے پہلے ہلاک ہو جائے یا بیماری وغیرہ کیوجہ سے ذبح کردے تو اس سے قربانی ساقط ہو جاتی ہے، دوسرا جانور خرید کر اس پر

قربانی کرنا ضروری نہیں۔

لمافی البدائع:(۶۶/۵،طبع سعید)

وان كان معسرا فاشترى شاة للاضحية فهلكت في ايام النحر او ضاعت سقطت عنه وليس عليه شئ اٰخر لما ذكرنا ان الشراء من الفقير للاضحية بمنزلة النذر فاذا هلكت فقد هلك محل اقامة الواجب فيسقط عنه وليس عليه شئ اٰخر بايجاب الشرع ابتداء لفقد شرط الوجوب وهو اليسار.

اسی طرح قربانی سے پہلے کوئی بھی نفع اس جانور سے حاصل کرنا جائز نہیں ہے اور کسی وجہ سے قربانی سے پہلے ذبح کر لیا تو اس کا گوشت خود استعمال نہیں کرسکتا اسکا صدقہ کرنا واجب ہے۔

لمافی الهندية:(۳۰۰/۵،طبع رشیدیه)

ولو اشترى شاة للاضحية يكره ان يحلبها او يجز صوفها فينتفع به لانه عينها للقربة فلا يحل له الانتفاع بجزء من اجزائها قبل اقامة القربة بها كما لا يحل له الانتفاع بلحمها اذا ذبحها قبل وقتها.

مندرجہ بالا حوالوں سے معلوم ہوا کہ جس شخص پر قربانی واجب نہ ہو اور وہ قربانی کی نیت سے جانور خرید لے تو یہ جانور نذر کے حکم میں ہے لیکن قربانی کے موقع پر قربانی کرنے کی صورت میں اس کا گوشت کھا سکتے ہیں، چنانچہ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ قربانی سے نذر ماننے کے باوجود خود کھانا جائز ہے اور یہ اس لئے کہ دراصل قربانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی ضیافت ہے، چنانچہ قران کریم میں ہے "فكلوا منها واطعموا البائس الفقير" اور حدیث میں ہے "اذا ضحى احدكم فليا كل من اضحيته".

لمافی البدائع:(۸۰/۵،طبع سعید)

ولصاحب الاضحية ان ياكل من اضحيته لقوله تعالى فكلوا منها ولانه ضيف الله جل شانه في هذه الايام كغيره فله أن ياكل من ضيافة الله عزشانه وجملة الكلام فيه ان الدماء انواع ثلاثة نوع يجوز لصاحبه ان ياكل منه بالاجماع ونوع لايجوز له ان ياكل منه بالاجماع ونوع اختلف فيه فالاول دم الاضحية نفلا كان او واجبا منذورا كان او واجبا مبتدأ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۲۴ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۹۸

﴿قربانی کا جانور اگر قربانی سے پہلے ہلاک ہو تو اس کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص جو صاحب نصاب نہیں وہ قربانی کیلئے

ایک بکرا خرید کر گھر لایا قربانی سے پہلے بکرا بیمار ہوا تو اس نے ضائع ہونے کے خدشہ سے ذبح کر دیا تو کیا اس شخص پر قربانی کا جانور خریدنے سے قربانی واجب ہوگئی اور اس پر دوبارہ جانور خرید کر قربانی کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ مستفتی: بدر منیر لکی مروت

﴿جواب﴾ جس شخص پر قربانی واجب نہ ہو اس کے باوجود وہ قربانی کی نیت سے جانور خرید لے تو اسی جانور کی قربانی کرنا اس پر واجب ہو جاتا ہے۔ لیکن قربانی سے پہلے وہ جانور اگر ہلاک یا ضائع ہو جائے تو اس سے قربانی ساقط ہو جاتی ہے، اس پر دوسرا جانور خرید کر قربانی کرنا لازم نہیں ہوتا، تاہم یہ واضح رہے کہ قربانی سے پہلے ذبح کرنے سے اسی جانور کا گوشت صدقہ کرنا واجب ہے، یہ شخص خود استعمال میں نہیں لا سکتا۔

لمافی الشامی: (۹/۴۷۱، طبع امدادیہ)

قوله: (فعلى الغني غيرها لا الفقير) اى ولو كانت الميتة منذورة بعينها لما فى البدائع ان المنذورة لو هلكت او ضاعت تسقط التضحية بسبب النذر، غيرانه ان كان موسرا تلزمه اخرى بايجاب الشرع ابتداء لا بالنذر، ولو معسرا لاشئ عليه اصلا اھ.

ولما فى البدائع: (۵/۶۶، طبع سعید)

وان كان معسرا فاشترى شاة للاضحية فهلكت فى ايام النحر او ضاعت سقطت عنه وليس عليه شئى اخر لما ذكرنا ان الشراء من الفقير للاضحية بمنزلة النذر فاذا هلكت فقد هلك محل اقامة الواجب فيسقط عنه وليس عليه شئى اخر بايجاب الشرع ابتداء لفقد شرط الوجوب وهو اليسار.

ولما فى الهندية: (۵/۳۰۰، طبع رشیدیہ)

ولو اشترى شاة للاضحية يكره ان يحلبها او يجز صوفها فينتفع به لانه عينها للقربة فلا يحل له الانتفاع بجزء من اجزائها قبل اقامة القربة بها كما لا يحل له الانتفاع بلحمها اذا ذبحها قبل وقتها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: حبیب الرحمٰن سواتی

۱۶ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر: ۱۷۸۲

﴿قربانی گائے، بیل، بکرے میں سے کس کی قربانی افضل ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ قربانی میں گائے کی قربانی افضل ہے یا بیل کی؟ اس طرح بکرے کی الگ قربانی افضل ہے یا گائے میں حصہ رکھنا؟ مستفتی: محمد طاہر

﴿جواب﴾ (۱) گائے اور بیل کی قیمت اگر برابر ہے تو پھر گائے کی قربانی افضل ہے۔

لما فی الدر المختار:(۲۱۷/۹،طبع امدادیه)

والأنثى من الابل والبقر أفضل. حاوی وفی الوهبانية أن الأنثى أفضل من الذكر اذا استويا قيمة والله اعلم.

(۲) قیمت اور گوشت کے اعتبار سے ایک بکرا اگر گائے کے ایک حصے کے برابر ہو تو بکرے کی قربانی افضل ہے۔

لما فی الترمع الرد:(۲۱۲/۹،طبع امدادیه)

الشاة أفضل من سبع البقرة اذا استويا فی القيمة واللحم ــ وفی الشامية: وكذا من تمام البقرة قال فی التاتارخانية وفی العتابية وكان الاستاذ يقول بأن الشاة العظيمة السمينة تساوی البقرة قيمة ولحما أفضل من البقرة لان جميع الشاة تقع فرضا بلا خلاف ــ فان كان سبع البقرة أكثر لحما فيه أفضل والاصل فی هذا اذا استويا فی اللحم والقيمة فاطيبهما لحما أفضل واذا اختلفا فيهما فالفاضل أولى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۱ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　　فتوی نمبر: ۴۲۷

﴿جس جگہ قربانی کا جانور ہے اس جگہ کا اعتبار ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید کراچی میں رہائش پذیر ہے اور اسکا ایک بھائی سرحد میں رہتا ہے، سرحد میں عید الاضحیٰ ایک دن پہلے تھی اور کراچی میں ایک دن بعد تھی، جب کراچی میں عید کا آخری دن تھا تو سرحد میں عید کا چوتھا دن تھا زید کو ادھر جانور مہیا نہیں ہوا اور اس نے بھائی کو فون پر بتایا کہ میری طرف سے قربانی کرلیں، بھائی نے زید کی طرف سے قربانی کردی، زید کی طرف سے یہ قربانی صحیح ہوگئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ قربانی کا جانور جس جگہ ہو اس جگہ کا اعتبار ہے اگر ادھر عید ہے تو قربانی صحیح ہے ورنہ نہیں، مذکورہ صورت میں زید کی جانب سے قربانی صحیح نہیں ہوئی کیونکہ جس دن قربانی کردی اس دن سرحد میں عید نہیں تھی۔

لما فی البحر الرائق:(۱۷۵/۸،طبع سعید)

والمعتبر فی ذلك مكان الاضحية حتى لو كانت فی السواد والمضحى فی المصر يجوز كما انشق الفجر وفی العكس لا يجوز الا بعد الصلوة ــ ولانها تشبه الزكاة فيعتبر فی الاداء مكان المحل وهو المال لا مكان الفاعل.

ولما فی بدائع الصنائع:(۷۶/۵،طبع سعید)

وانما يعتبر فی هذا مكان الشاة لا مكان من عليه هكذا ذكر محمد عليه الرحمة فی النوادر

وقال انما انظر الی محل الذبح ولا انظر الی موضع المذبوح عنه وهكذا روى الحسن عن ابی یوسف..... وان كان الرجل في مصر واهله في مصر آخر فكتب اليهم ان يضحوا عنه روى عن ابی یوسف انه اعتبر مكان الذبيحة فقال ينبغي لهم أن لا يضحوا عنه حتى يصلي الامام الذي فيه اهله وان ضحوا عنه قبل ان يصلي لم يجزه وهو قول محمد.

الجواب صحیح :عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :فرمان اللہ

۲ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر :۱۰۲۷

﴿غریب آدمی کا پالتو جانور میں قربانی کی نیت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی کے پاس ''جو صاحب نصاب نہیں ہے'' پالا ہوا بکرا ہے جس کے بارے میں اسکا یہ ارادہ کہ بقرعید میں اس کی قربانی کرونگا عید آنے سے پہلے وہ آدمی بیمار ہو گیا، اسے رقم کی ضرورت ہے تو کیا اس کے لئے یہ بکرا بیچنا جائز ہے یا اس کی قربانی کرنا لازم ہے؟

﴿جواب﴾ غریب آدمی جس کے ذمہ قربانی واجب نہ ہو اگر قربانی کی نیت سے جانور خرید لیتا ہے تو ایسا جانور قربانی کے لئے متعین ہو جاتا ہے، گھر کا پالا ہوا جانور ہو اس میں نیت کر لی یا خریدنے کے بعد قربانی کی نیت کر لی تو اس نیت سے جانور قربانی کیلئے خاص نہیں ہوتا، لہٰذا مذکورہ صورت میں یہ آدمی اپنے اس جانور کو بیچ کر رقم اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔

لما فی الهندية:(۲۹۱/۵،طبع رشیدیه)

ولو ملك انسان شاة فنوى أن يضحي بها أو اشترى شاة ولم ينو الأضحية وقت الشراء ثم نوى بعد ذلك أن يضحي بها لا تجب عليه سواء كان غنيا او فقيرا.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۶۴/۹-۲۶۵،طبع امدادیه)

(وفقير)عطف عليه(شراها لها)لوجوبها عليه بذلك حتى يمتنع عليه بيعها.

وفي الشامية:قوله(شراها لها)فلو كانت في ملكه فنوى ان يضحي بها او لو اشتراها ولم ينو الاضحية وقت الشراء ثم نوى بعد ذلك لا يجب لأن النية لم تقارن الشراء فلا تعتبر بدائع.

الجواب صحیح :عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :عبداللہ عفا اللہ عنہ

۳ رجب ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر :۱۰۳۰

﴿گاؤں میں قربانی کا مستحب وقت﴾

﴿سوال﴾ ایسے گاؤں اور بستیاں جہاں جمعہ اور عیدین کی نماز واجب نہیں ہے تو وہاں پر قربانی کونسے وقت میں کرنا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ ایسے گاؤں اور بستیاں جہاں جمعہ اور عیدین کی نماز واجب نہیں ہے تو وہاں پر

طلوع فجر کے بعد قربانی کرنا جائز ہے مگر مستحب وقت یہ ہے کہ سورج نکلنے کے بعد قربانی کرے۔

لما فی البحر الرائق:(۸/۱۷۵،طبع سعید)

(ولا یذبح مصری قبل الصلاۃ ویذبح غیرہ) یعنی لا یجوز لاھل المصر ان یذبحوا الاضحیۃ قبل ان یصلوا صلاۃ العید ویجوز لاھل القری والبادیۃ ان یذبحوا بعد صلاۃ الفجر قبل ان یصلی الامام صلوۃ العید.

ولما فی الهندیۃ:(۵/۲۹۵،طبع رشیدیہ)

والوقت المستحب للتضحیۃ فی حق اهل السواد بعد طلوع الشمس وفی حق اهل المصر بعد الخطبۃ کذا فی الظهیریۃ.

ولما فی التنویر مع الرد:(۹/۴۶۰-۴۶۱،طبع امدادیہ)

(واول وقتها بعد الصلاۃ ان ذبح فی مصر)—(وبعد طلوع فجر یوم النحر ان ذبح فی غیرہ) وفی الشامیۃ:(قوله:ان ذبح فی غیرہ) ای غیر المصر شامل لاهل البوادی وقد قال قاضیخان فاما اهل السواد والقری والرباطات عندنا یجوز لهم التضحیۃ بعد طلوع الفجر.

والله اعلم بالصواب: خضر حیات کمالوی — الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: — ۳ رجب ۱۴۲۸ھ

﴿۱۰ ذی الحجہ کی رات میں نیز شک کی صورت میں ۱۲ ذی الحجہ کو قربانی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ (۱) قربانی کے دنوں میں افضل دن کونسا ہے؟ (۲) دن میں تو قربانی جائز ہے، رات میں بھی جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو پھر ۱۰ ذی الحجہ کی رات میں قربانی کرنا درست ہوگا؟ (۳) جب کسی وجہ سے ۱۲ ذی الحجہ یعنی آخری دن مشکوک ہو جائے تو اس روز قربانی کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ قربانی کے دنوں میں سب سے افضل دن ۱۰ ذی الحجہ کا ہے، اس کے بعد ۱۱ ذی الحجہ اور پھر ۱۲ ذی الحجہ کا دن افضل ہے، رات میں بھی قربانی جائز ہے، البتہ بلا وجہ رات کو ذبح کرنا پسندیدہ نہیں ہے اور قربانی کا وقت دس ذی الحجہ کی صبح صادق کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔

اس لئے دس ذی الحجہ کی رات میں صبح صادق سے پہلے ذبح کرنا جائز نہیں ہے اور صبح صادق کے بعد ذبح کرنا جائز ہے بشرطیکہ اہل بستی پر جمعہ وعیدین واجب نہ ہوں اور جہاں پر جمعہ وعیدین واجب ہوں تو پھر ایسی آبادی میں نماز عید کے بعد قربانی جائز ہے، نماز سے پہلے جائز نہیں ہے۔

لمافی الھندیۃ:(۲۹۵/۵طبع رشیدیہ)

وقت الاضحیۃ ثلاثۃ ایام العاشر والحادی عشر والثانی عشر اولھا افضلھا وآخرھا ادونھا ویجوز فی نھارھا ولیلھا بعد طلوع الفجر من یوم النحر الی غروب الشمس من الیوم الثانی عشر الا انہ یکرہ الذبح فی اللیل.

(۳) قربانی تو ادا ہو جائیگی، البتہ اس صورت میں اگر سارا گوشت صدقہ کرلیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

لمافی الھندیۃ:(۲۹۵/۵طبع رشیدیہ)

واذا شک فی یوم الاضحی فالمستحب ان لایوخر الی الیوم الثالث فان اخر یستحب ان لایاکل منہ ویتصدق بالکل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رشید عالم مروت

۲۵ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۱۵

﴿مشترکہ قربانی میں گوشت کی تقسیم ضروری نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم تین بھائی عید الاضحیٰ میں اجتماعی گائے خرید کر لاتے ہیں پھر اپنے اور بیویوں کی طرف سے ان میں حصہ ڈال کر قربانی کرتے ہیں لیکن قربانی کا گوشت تقسیم نہیں کرتے بلکہ گھر میں رکھ کر ہر ایک بھائی اور انکے گھر والے مناسب مقدار میں وقتاً فوقتاً استعمال کرتے ہیں تو کیا یہ طریقہ صحیح ہے یا وزن کر کے آپس میں تقسیم ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ قربانی کا گوشت تقسیم کرنے کا حکم وہاں ہے جہاں ہر ایک شریک اپنا حصہ الگ وصول کرنا چاہتا ہو، آپ لوگ ایک ساتھ استعمال کرنا چاہتے ہیں کسی کو کم یا زیادہ استعمال کرنے پر اعتراض نہیں ہے تو شریعت بھی ایسے اتفاق کو پسند کرتی ہے، تقسیم کرنا کوئی مستقل حکم نہیں ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۳۱۷/۶-۳۱۸طبع سعید)

(وصح اشتراک ستۃ فی بدنۃ شریت لاضحیۃ)ای ان نوی وقت الشراء الاشتراک صح استحسانا والا(لا)(استحسانا وذا)ای الاشتراک(قبل الشراء احب ویقسم اللحم وزنا لا جزافا......)

وفی الشامیۃ:(قولہ ویقسم اللحم)انظر ھل ھذہ القسمۃ متعینۃ اولا،حتی لو اشتری لنفسہ ولزوجتہ واولادہ الکبار بدنۃ ولم یقسموھا تجزیھم اولا،والظاھر انھا لا تشترط لان المقصود منھا الاراقۃ وقد حصلت وفی فتاوی الخلاصۃ والفیض تعلیق القسمۃ علی ارادتھم وھو یؤید ماسبق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۴ رجب ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۶۴

﴿غنی آدمی کے لئے قربانی کا جانور بدلنا درست ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جانور قربانی کی نیت سے خریدا اور اس جانور کو قربانی کے لئے پالتا رہا، درمیان میں کسی اور جانور کو اسکے بدلے خرید لیا اس نیت سے کہ اسکی قربانی کریں گے، سوال یہ ہے کہ اس طرح جانور بدلنا کیسا ہے؟ اور پہلا جانور مہنگا فروخت کر دیا اور اس دوسرے جانور کو سستا خریدا تو پہلے والے کی بچی ہوئی رقم کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ قربانی کی نیت سے جانور خریدنے والا اگر غنی ہے تو اسکے لئے گنجائش ہے کہ اس جانور کے بدلے دوسرے جانور کی قربانی کرلے، البتہ چاہیے کہ پہلے والے جانور سے دوسرا جانور بہتر ہو لیکن خریدنے والا کوئی غریب ہو یعنی اس پر قربانی واجب نہ ہو تو اسکے لئے جانور تبدیل کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اسی جانور کی قربانی کرنا ضروری ہے۔

لہٰذا آپ اگر غنی ہیں اور اس جانور کے بدلے دوسرا جانور آپ نے قربانی کے لئے خریدا تو یہ جائز ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ پہلے والے جانور کی اضافی رقم صدقہ کر دیں۔

لما فی تقریرات الرافعی:(ص ۲۰۲ طبع سعید)

(قوله وهذا ظاهر الرواية) وفي خزانة الاكمل أنه المختار وعند الجمهور لا يدمع النية ان يقول بلسانه وأضحى بها ولو اشتراها الغنى بنيتها لم تتعين باتفاق الروايات كما فى الخلاصة وان قال فى الأشباه من القاعدة الاولى ان كان فقيرا وقد اشتراها بنيتها تعينت فليس له بيعها وان كان غنيا لم تتعين والصحيح انها تتعين مطلقا اه. فان المنقول فى الغنى عدم التعيين باتفاق الروايات اه من شرح الملتقى.

ولما فى البحر:(۱۷۹/۸ طبع سعيد)

ويكره ان يبدل بها غيرها ..... ولو باع اضحية واشترى بثمنها غيرها فان كان الثانى انقص من الاول تصدق بالفضل.

ولما فى الشامى:(۳۲۳/۶-۳۲۴ طبع سعيد)

ولو كان غنيا مع تصريحهم بانها واجبة فى ذمته غير متعينة عليه، حتى جاز له ان يبدلها بغيرها مع الكراهة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زئی

۴ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۶۳

﴿قربانی کے جانور میں دوسرے کو شریک کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی گائے خرید کر لایا اس نیت سے کہ اسمیں پانچ حصے اپنے ہونگے اور دو حصوں میں کسی کو شریک کرلیگا۔ گائے کی قیمت کے اعتبار سے فی حصہ کی قیمت گیارہ ہزار روپے بنتی تھی ایک آدمی نے کہا کہ میں دو حصے لینا چاھتا ہوں۔ لیکن میرے پاس صرف ۱۵ ہزار روپے ہیں وہ اس پر راضی ہوئے کہ ٹھیک ہے آپ دو حصوں کے ۱۵ ہزار روپے دے دیں، شرعاً اس معاملہ کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ یہ شخص اپنے جانور کا خود مالک و مختار ہے اس سے دو حصے قیمت خرید سے نسبتاً کم قیمت کیساتھ فروخت کرنا چاہے تو اسمیں کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ دو حصے پورے ہوں ساتویں حصہ سے کوئی حصہ کم نہ ہو۔

(مشکوٰۃ المصابیح باب فی الاضحیۃ الفصل اول)

عن جابر رضی الله عنه ان النبی صلى الله عليه وسلم قال البقرة عن سبعة والجزور عن سبعة

لما فی البزازیہ کتاب الاضحیۃ ج:۲/۲۰۸، ۲۰۹ ط قدیمی

اشترى بقرة لها ثم اشترك ستأجاز استحساناًان اصاب كلاسبع تام وان اصاب احدهم اقل من سبع لايصح بان مات عن ابن امراة وبقرة مشتركة مع الستة فضحيا بها لم يجز ولو اشترى ثلاثة بقرة ودفع احدهم اربعة والأخرثلاثة والأخر دينارا على ان الشركة على قدر المدفوعلايصح ولو بين اثنين او ثلاثة فضحوا جاز ،

لما فی التنویر مع الدر (ج۶/۳۱۷ سعید)

(وصح اشتراك ستة فی بدنه شريت لاضحية)ای ان نوى وقت شراء الاشتراك صح استحساناً والا لا (استحسا ناوذا) ای اشتراكه (قبل الشراء احب ويقسم الحم وزنا

لما فی الدرالمختار مع کتاب الاضحیۃ (۶/۳۲۷ سعید)

[فروع] ولو ان ثلاثة نفراشترى كل واحدمنهم شاةولواضحية احدبعشرة والاخربعشرين والاخربثلاثين وقيمة كل واحدةمثل ثمنها فاختلطت حتى لايعرف كل واحد شأته بعينها واصطلحوا على ان ياخذكل واحد منهم شاة يضحىٰ اجزاتهم ويتصدق صاحب الثلاثين بعشرين وصاحب العشرين بعشرة ولايصدق صاحب العشرة بشئی وان اذن كل واحد منهم ان يذبحهاعنه اجزاته ولاشى عليه ،كما لو ضحى اضحية غيره بغيرامره يناىع

فی الدر المختار کتاب الاضحۃ (۶/۳۱۵، ۳۱۶ طبع: سعید)

ولولا احد هم اقل من سبع لم يجز عن احد هم .

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ

۸ صفر ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر: ۳۸۹۳

﴿پیدائشی طور پر بغیر کان والے جانور کی قربانی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایسے جانور کی قربانی جائز ہے جس کے کان پیدائشی طور پر نہ ہوں؟

﴿جواب﴾ جس جانور کے کان پیدائشی طور پر نہ ہوں ایسے جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔

لمافی الهداية:(۴۴۸/۴ طبع رحمانيه)

والسكاء وهي التي لا اذن لها خلقة لاتجوز ان كان بعدهذا لان مقطوع اكثر الاذن اذا كان لايجوز فعديم الاذن اولى.

ولمافي الهندية:(۲۹۷/۵ طبع رشيديه)

ولاتجوز العمياء والعوراء البين عورها —— ومقطوعة الاذنين والالية والذنب بالكلية والتي لااذن لها في الخلقة.

ولمافي التنويرمع الدر:(۳۲۹/۹ طبع امداديه)

(ولا بالهتماء وبالسكاء) التي لا اذن لها خلقة فلولها اذن صغيرة خلقة اجزأت.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حسین

۷ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۵۷

﴿قربانی کا وقت گزرنے سے پہلے صاحب نصاب ہو جائے تو قربانی واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کے پاس صرف ایک تولہ سونا ہے اور اس کے علاوہ نقد رقم نہیں ہے، عید کے دن صاحب نصاب بن جاتی ہے مثلاً کسی نے عیدی دیدی تو اگر ان دونوں کو ملا لیا جائے تو چاندی کے نصاب تک مالیت پہنچ جاتی ہے تو کیا اس عورت پر قربانی واجب ہے یا نہیں؟ مستفتی: نعیم اللہ حقانی

﴿جواب﴾ قربانی کا وقت نکلنے سے پہلے کسی کا مال نصاب تک پہنچے تو اس پر قربانی واجب ہے خواہ آخری وقت میں صاحب نصاب بنے۔

لمافي البزازية على هوامش الهندية:(۲۸۲/۶ طبع رشيديه)

ولو كان لفقير الملك نصابا في ايامها تلزمه.

ولمافي بدائع الصنائع:(۶۵/۵ طبع سعيد)

انالم يكن اهلا للوجوب في اول الوقت ثم صار اهلا في اخره بان كان كافرا او عبدا اوفقيرا اومسافرا في أول الوقت ثم اسلم اواعتق اوايسر اواقام في اخره انه يجب عليه.

ولمافي خلاصة الفتاوى(۳۰۱/۴ طبع رشيديه)

واذاجاء يوم الاضحى ولامال له ثم استفادمائتي درهم ولادين عليه وجبت الفقر والغني

والموت انما یعتبر فی حق الاضحیۃ اخر ایام النحر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی

یکم ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۸۹

﴿نذر مانی ہوئی قربانی کی ہلاکت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں اور غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہوں میں نے نذر مانی کہ اس بکرے کو اللہ تعالیٰ کے لئے عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کروں گی، اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ بکرا مر گیا، اب میرے لئے شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا قربانی کرنا میرے ذمے واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ پہلے سے قربانی کرنا واجب نہ تھی لیکن آپ نے جب نذر مان کر اپنے اوپر قربانی واجب کر لی تو قربانی کا جانور ہلاک ہوجانے کے بعد اب نذر کا پورا کرنا آپ کے ذمہ سے ساقط ہو گیا، لہٰذا اب آپ پر کچھ لازم نہیں۔

لما فی جامع الترمذی: (۱/۱۸۴ طفاروقی کتب خانہ)

عن ثابت بن الضحاک عن النبی ﷺ قال لیس علی العبد نذر فیما لا یملک.

ولما فی البدائع: (۵/۶۶ طبع ایچ ایم سعید)

بان قال لله تعالى على ان اضحى بهذه الشاة وهو موسر او معسر فهلكت او ضاعت انه تسقط عنه التضحية بسبب النذر لان المنذور به معين لاقامة الواجب فيسقط الواجب بهلاكه كالزكاة تسقط بهلاك النصاب عندنا غير انه ان كان الناذر موسرا تلزمه شاة اخرى بايجاب الشرع ابتداء لا بالنذر.

ولما فی الشامی: (۹/۴۷۱ طبع امدادیہ ملتان)

ان المنذورة لو هلكت او ضاعت تسقط التضحية بسبب النذر، غير انه ان كان موسرا تلزمه اخرى بايجاب الشرع ابتداء لا بالنذر، ولو معسرا لاشيء عليه اصلا اه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ولی اللہ ڈیروی

۲۰ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۶۸۳

﴿نمازِ عید کے بعد اور خطبہ سے قبل قربانی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں، علماء کرام اور مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر عید کی نماز کے بعد اور خطبہ عید سے قبل قربانی کر لی جائے، تو ایسی قربانی کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ قربانی تو ہوجائے گی لیکن بہتر یہ ہے کہ اطمینان سے خطبہ عید سننے کے بعد قربانی کرے

لما فی التنویر مع الدر:(۱/ ۲۶۰-۲۶۱،طبع امدادیہ)

(واول وقتها بعد الصلاة ان ذبح فی مصر)ای بعد اسبق صلاة عید ولو قبل الخطبة لکن بعدها احب وفی الشامیة:قوله:(ولو قبل الخطبة) قال فی المنح وعن الحسن لو ضحی قبل الفراغ من الخطبة فقد اساء.

ولما فی بدائع الصنائع:(۵/ ۷۳،طبع سعید)

ولو ضحی قبل فراغ الامام من الخطبة او قبل الخطبة جاز لان النبی صلی الله علیه وسلم رتب الذبح علی الصلاة لا علی الخطبة فیما روینا من الاحادیث فدل ان العبرة للصلاة لا للخطبة.

ولما فی الهندیة:(۵/ ۲۹۵،طبع رشیدیہ)لو صلی ولم یخطب جاز الذبح کذا فی محیط السرخسی.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالرزاق عفی عنہ

۲ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۴۰۵

﴿قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے علاقے میں چند عیسائی گھرانے آباد ہیں اور عید قربانی کے دن یہ لوگ گھروں سے گوشت جمع کرتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ ان کو قربانی کا گوشت دینا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ قربانی کا گوشت غیر مسلم کو بھی دے سکتے ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ مسلمان دیندار لوگ ہی آپ کے کھانے میں شریک ہوں، البتہ تالیف قلوب کیلئے غیر مسلموں کو دیا اور ان سے دین اسلام کی طرف مائل ہونے کی امید ہے تو انکو دینے میں زیادہ ثواب ہے۔

لما فی المشکوٰۃ:(ص ۳۶۹،طبع سعید)

قال رسول اللہ ﷺ اکل طعامکم الابرار وصلت علیکم الملئکة وافطر عندکم الصائمون — قال رسول اللہ ﷺ فاطعموا طعامکم الاتقیاء واولوا معروفکم المومنین.

ولما فی الهندیة:(۵/ ۳۰۰،طبع رشیدیہ)

ویهب منها ماشاء للغنی والفقیر والمسلم والذمی کذا فی الغیاثیة.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالرزاق عفی عنہ

۲ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۴۰۶

﴿خصی جانوروں کی قربانی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لوگ بقرہ عید پر خصی

جانوروں کی قربانی کرتے ہیں تو کیا خصی جانوروں کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ خصی جانور کا گوشت نسبتاً زیادہ لذیذ ہوتا ہے، اسلئے اسکی قربانی جائز بلکہ اولیٰ ہے۔

لما فی الهداية:(۴۴۸/۲،طبع رحمانيه)

ويجوزان يضحى بالجماء......والخصى لان لحمهااطيب وقدصح ان النبى ﷺ ضحى بكبشين املحين موجونين.

ولما فى البحر:(۱۷۲/۸،طبع سعيد)

(ويضحى بالجماء)......(والخصى)وعن ابى حنيفةؒ هواولى لان لحمه اطيب وقدصح انه عليه الصلاة والسلام ضحى بكبشين املحين موجوأين"الاملح الذى فيه ملحة وهوالبياض الذى فيه شعيرات سودوهومن لون الملح والموجوء المخصى من الوجء وهوان يضرب عروق الخصية بشئ.

ولمافى تنويرالابصار:(۳۲۳/٦،طبع سعيد)(ويضحى بالجماء والخصى والثولاء)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۴۶۷

﴿ایک خصیہ والے جانور کی قربانی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر جانور کے خصیتین میں سے ایک نہ ہوتو اس کی قربانی درست ہے یا نہیں؟　　　　مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ جانور کو خصی کرانے کیلئے اس کے دونوں خصیے ایک عمل سے گذار کر باقاعدہ ناکارہ کیے جاتے ہیں جبکہ اسکی قربانی جائز ہے اور سنت سے ثابت ہے تو جس جانور کا ایک خصیہ پیدائشی نہ ہو اسکی قربانی بطریقہ اولیٰ جائز ہے۔

لما فى المحيط البرهانى جلد۸/۴۶۷طبع ادارة القرآن

ومن المشائخ من يذكر فى هذاالفصل اصلاً ويقول كل عيب يزيل المنفعت على الكمال اوالجمال على الكمال يمنع الاضحيه ومالا يكون بهذه الصفة لا يمنع

وكذا فى الهندية ۲۹۹/۵ كتاب الاضحية طبع مكتبة رشيدية

وكذا فى تبيين الحقائق ۴۸۲/٦ طبع ايچ ايم سعيد

ولما فى فتح القدير ۵۲۹/۹ مكتبة رشيدية

(ويجوز ان يضحى بالجماء)وهذه الصفة(والخصى)لأن لحمهااطيب وقد صح ان النبى صلى الله عليه وسلم ضحى بكبشين املحين موجونين

ولما في البحر الرائق ۸/۱۷۲، طبع ایچ ایم سعید

(و يضحي بالجماء) و في هذه الصفحة و الخصي و عن أبي حنيفة رحمه الله تعالى هو أولى لأن لحمه أطيب وقد صح أنه عليه الصلوة والسلام ضحى بكبشين أملحين موجوءين

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: شفقت اللہ

۲۳ ذوالحجہ ۱۴۳۳ھ فتوی نمبر: ۳۸ ۱۹

﴿باوجود صاحب نصاب ہونے کے گذشتہ سالوں کی فوت شدہ قربانی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ ایک آدمی صاحب نصاب کے باوجود مسلسل چھ سالوں میں قربانی نہیں کی، اب وہ گذشتہ چھ سالوں کی قربانی ساتویں سال میں ایک ساتھ کرنا چاہتا ہے آیا گذشتہ چھ سالوں کی قربانی ادا ہو جائے گی کہ نہیں؟

﴿جواب﴾ قربانی کے دنوں میں صاحب نصاب مالدار آدمی پر قربانی واجب ہے کسی شرعی عذر کے بغیر اس حکم کی تعمیل نہ کرنا باعث گناہ ہے آپ نے کئی سالوں سے اس حکم کی تعمیل میں غفلت برتی ہے جس کی وجہ سے سخت گناہ ہوا ہے، اب سچے دل سے توبہ و استغفار ضروری ہے اور ساتھ ساتھ درمیانی قیمت کی چھ بکریوں کی رقم فقراء و مساکین کو بطور صدقہ کرنا لازم ہے قربانی قضا کرنے کی یہی صورت فقہاء کرام نے بتائی ہے ساتوں عید پر یا تمام دنوں میں قضاء شدہ قربانیوں کی تلافی ذبح کرنے سے اب نہیں ہوگی۔

لما في الفقه الاسلامي وأدلته: (۲/۲۷۱۲، طبع رشیدیه)

ولو تركت التضحية حتى مضى وقتها تصدق بها - وأما الغني الذي لم يشتر الاضحية، فيتصدق بقيمة شاة على الصحيح كما في البدائع وهو قول الامام وصاحبيه لأن الأضحية واجبة على الغني.

ولما في الشامي: (۶/۳۲۱، طبع سعید)

(قوله وتصدق بقيمتها غني شراها أولا) كذا في الهداية وغيرها كالدرر وتعقبه الشيخ شاهين بأن وجوب التصدق بالقيمة مقيد بما اذا لم يشتر، أما اذا اشترى فهو مخير بين التصدق بالقيمة أو التصدق بها حية كما في الزيلعي أبو السعود -- (قوله فالمراد بالقيمة الخ)— فيبين أن المراد اذا لم يشترها قيمة شاة تجزئ في الأضحية كما في الخلاصة وغيرها قال القهستاني أو قيمة شاة وسط كما في الزاهدي والنظم وغيرهما.

ولما في الهداية: (۲/۲۲۴، طبع رحمانیه)

ولو لم يضح حتى مضت أيام النحر - وان كان غنيا تصدق بقيمة شاة اشترى أو لم

يشترلأنهاواجب على الغنى وتجب على الفقير بالشراء بنية التضحية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: علی خان غفرلہ ولوالدیہ

یکم صفر الخیر ۱۴۳۶ھ — فتویٰ نمبر: ۲۴۵۷

﴿شرکاء آپس میں قربانی کا گوشت وزن کر کے تقسیم کریں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قربانی کے سات شرکاء کو آپس میں قربانی کا گوشت کس طرح تقسیم کرنا چاہیے؟ کیا اندازے سے سات حصے کر کے آپس میں تقسیم کرنا جائز ہے؟ مستفتی: زاہد لیاری کراچی

﴿جواب﴾ قربانی کا گوشت آپس میں برابر وزن کر کے تقسیم کرنا چاہیے تا کہ تمام حصہ داروں کو برابر سرابر گوشت ملے اور اگر ترازو میسر نہ ہو تو اندازے سے تقسیم کرنے کی گنجائش صرف اس صورت میں ہے کہ ہر حصے میں کوئی زائد چیز مثلاً پائے، مغز وغیرہ رکھ کر تقسیم کریں۔

لمافي التنوير مع الدر: (۹/ ۴۶۰، طبع امدادیه)

(ويقسم اللحم وزنا لا جزافا إلا إذا ضم معه من الأكارع أو الجلد) صرفا للجنس لخلاف جنسه.

ولما في خلاصة الفتاوى: (۴/ ۳۱۵، طبع رشیدیه)

سبعة ضحوا وارادوان يقسموا اللحم بينهم ان اقتسموا وزنا جاز وان اقتسموا جزافا ان جعلوا مع اللحم شيئا من السقط كالرأس والأكراع يجوز وان لم يجعلوا لا يجوز فان جعلوا مع عذا ويحللوا الفضل بينهم بعضهم لبعض لم يجز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفی عنہ

۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۰۳

﴿قربانی میں میت کی شراکت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قربانی کے جانور میں سات آدمی شریک تھے، ان میں سے ایک شریک کا انتقال ہو گیا لیکن اسکی طرف سے اس کا حصہ برقرار رکھا گیا، سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں دیگر شرکاء کی قربانی متاثر تو نہیں ہوگی؟

﴿جواب﴾ میت کے حصے کو برقرار رکھنے اور اس کی طرف سے قربانی سے دیگر شرکاء کی قربانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا جملہ شرکاء کی قربانی درست ہے۔

لمافي التنوير مع الدر: (۹/ ۴۲۶، طبع سعید)

(وان مات احد السبعة) المشتركين في البدنة (وقال الورثة اذبحوا عنه وعنكم صح) عن

الكل استحسانا لتصدق القربة من الكل.

ولما في البدائع:(۵/۷۲،طبع سعید)

وذكر في الاصل اذا اشترك سبعة في بدنة فمات احدهم قبل الذبح فرضي ورثته ان يذبح عن الميت جاز استحسانا وكذا في الخلاصة:(۲/۳۱۵،طبع رشيديه)

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد حسن غفرلہ

۲۷ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ | فتوی نمبر: ۱۴۹۳

﴿جس بیل کے گھٹیا پر پاؤں یا سینگ نکل آئے ہوں اس کی قربانی جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ ایسا بیل جس کی کوہان نما گھٹیا پر پاؤں نما چیز یا سینگ خلقتاً نکل آئے ہوں تو ایسے جانور کی قربانی جائز ہے؟ اور یہ عیب شمار ہوگا یا نہیں؟ مستفتی رئیس کورنگی نمبرا

﴿جواب﴾ شریعت مطہرہ نے قربانی کے جانور میں اُس عیب کو معیوب قرار دیا ہے جو جانور کے منافع اور خوبصورتی میں رکاوٹ بنتا ہو چونکہ معمولی عیب شریعت میں عیب شمار نہیں ہوتا، اس لئے مذکورہ جانور کی یہ زائد تخلیق عیب نہیں ہے، لہٰذا اس کی قربانی جائز ہے۔

لما في التنوير مع الدر:(۶/۳۲۳-۳۲۴،طبع سعيد)

(ويضحي بالجماء والخصي والثولاء) اي المجنونة اذا لم يمنع من السوم والرعي، وان منعها لاتجوز التضحية بها (والجرباء السمينة) فلو مهزولة لم يجز، لان الجرب في اللحم نقص (لا بالعمياء والعوراء والعجفاء) المهزولة التي لا مخ في عظامها (والعرجاء التي لاتمشي الى المنسك) اي المذبح (والمريضة البين مرضها ومقطوع اكثر الاذن والذنب والعين) - اي التي ذهب اكثر نور عينها فاطلق القطع على الذهاب مجازا وانما يجوز بعد البن (او اكثر الالية) لان للاكثر حكم الكل بقاء وذهابا فيكفي بقاء الاكثر وعليه الفتوى مجتبى

ولما في البحر:(۸/۱۷۶-۱۷۷،طبع سعيد)

"ويضحي بالجماء- والخصي - والثولاء - لا بالعمياء، والعوراء، والعجفاء، والعرجاء.... لما روى عن البراء بن عازب انه عليه الصلاة والسلام قال اربع لاتجوز في الاضاحي العوراء البين عورها والمريضة البين مرضها والعجفاء البين ضلعها والكسيرة التي لاتنقى رواه ابوداؤد والنسائي وجماعة آخرو صححه الترمذي—" ومقطوعة اكثر الاذن او الذنب او العين او الالية" لقول علي رضي الله عنه امرنا رسول الله ﷺ أن نستشرف العين والأذن وأن لانضحي بمقابلة ولا مدابرة ولا شرقاء ولا خرقاء—لان العيب اليسير لايمكن التحرز عنه فجعل عفوا الخ

ولما في البزازية على هامش الهندية:(۶/۲۹۳-۲۹۴،طبع رشيديه)

(الخامس في عيوبها) خمسة عشر من الآفات لا يمنع منها عدم الاسنان لو اعتلف—

وقال محمد رحمه الله لايجوز في سبع من العيوب. العمياء، والعوراء ــ والعجفاء التي لاتنقى لايجوز ومقطوع رؤس الضروع ان اقل من النصف ــ وعن الامام رحمه الله ان الشاة اذالم يكن لهااذن ولاذنب خلقة يجوزوان لم يكن له خلقة عيناء لايجوز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۲ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۳۴۳

﴿ چار سینگ والے جانور کی قربانی جائز ہے ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دنبہ ہے اسکے مکمل طور پر چار سینگ ہیں اب پوچھنا یہ ہے کہ چار سینگ کا ہونا اس میں عیب شمار ہوتا ہے یا نہیں؟ اور اس دنبہ کی قربانی شریعت مطہرہ کی رو سے درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ شریعت مطہرہ نے قربانی کے جانور میں کسی ایسی خامی کو باقاعدہ عیب قرار دیا ہے جو جانور کے منافع اور خوبصورتی میں رکاوٹ کا باعث ہو تو مذکورہ جانور کی یہ زائد تخلیق ایسا عیب نہیں ہے بلکہ بعض دفعہ جانور میں زائد تخلیق اسکے جمال میں اور اضافہ کر دیتی ہے۔ لہذا اس دنبہ کی قربانی جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما في البزازية ۲/ ۱۱، ۱۲ مطبع قديمی

الخامس في عيوبها خمسة عشر من الآفات لايمنع منها :عدم الاسنان لو اعتلف ــ والجرباء ان سمينه والتي لاقرن لها من الاول يجوز فان انقطع او انكسر يجوز الااذا بلغ الدماغ وصغيرة الاذن والتي في اذنها ثقب او شقاق من الاعلى الى الاسفل يجوز وعديمة الاذن او احدى الاذنين يمنع الافي رواية من الامام ومحمد رحمهما الله والثولاء ــ والعرجاء التي تمشي بثلاث قوائم ولاتضع الرابعة على الارض لاوان كانت تضعها وضعا ضعيفا الاانها تتمايل مع ذلك يجوز والمحبوب العاجز عن الجماع والتي لهاسعال والعاجز عن الولادة لكبر سنها والتي لاينزل لها لبن تجوز والتي لها الية صغيرة تشبه الذنب يجوز وان لم يكن لها الية خلقة فكذلك ــ وقال محمد رحمه الله لايجوز في سبع من العيوب :العماء ــ والعوراء ــ والعجفاء ــ وعن الامام رحمه الله ان الشاة اذالم يكن لهااذن ولاذنب خلقة يجوز وان لم يكن له خلقة عنياء لايجوز

لمافي الهنديه ج۵/ ۲۹۹ كوئته

ومن المشايخ من يذكر لهذا الفصل اصلا ويقول كل عيب يزيل المنفعة على الكمال او الجمال على الكمال يمنع الاضحية وما لايكون بهذه الصفة لايمنع

لمافي المحيط البرهاني ۸/ ۶۴ طبع لادارة القران

ومن المشايخ من يذكر في هذا الفصل اصلاً ويقول :كل عيب يزيل المنفعة على

الکمال بمنع الاضحیۃ وما لایکون بھذہ الصفۃ لایمنع

لمافی التنویر مع الدر ۱/۳۲۳،۳۲۲ طبع سعید

(ویضحی بالجماء والخصی والثولاء) ای المجنونۃ (اذا لم یمنعھا من السوم والرعی وان منعھا لا) تجزئ التضحیۃ بھا (والجرباء السمینۃ) ـــ والعجفاء فلو مھزولۃ التی لامخ فی عظامھا (والعرجاء التی لاتمشی الی المنسک) ــ الخ

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: مفتی اللہ عثمان دہلوی

۱۸ صفر ۱۴۳۵ھ　　　　فتویٰ نمبر ۳۸۹۱

﴿قربانی سے متعلق چند مسائل﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ شرعِ متین درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ:

(۱) ہمارے ہاں سردیوں میں بکرے وغیرہ کا گوشت خشک کر کے ایک خاص ڈش بنائی جاتی ہے جسے لانڈی کہتے ہیں اگر کوئی لانڈی کی نیت سے قربانی کا جانور ذبح کر لے تاکہ سردیوں کے زمانے میں اسکے گوشت کی لانڈی بنا کر کھاؤنگا، کیا اس سے قربانی ادا ہو جائے گی؟

(۲) ایک غریب مریض شخص جس کو پیسوں کی ضرورت تھی میرے پاس آیا، میں نے اپنی قربانی کی رقم اس کو دیکر کہا کہ آپ ان پیسوں سے میری طرف سے قربانی کرلو یا اپنی ضرورت میں استعمال کرلو، بعد میں اس شخص نے قربانی کرنے کے بجائے پیسے اپنی ضروریات میں استعمال کرلیے تو اب میری قربانی ہوئی یا نہیں؟

(۳) اگر کسی شخص نے قربانی نہیں کی یا قربانی تو کی لیکن کسی وجہ سے فاسد ہوگئی اور عید بھی گذر گئی، اب اس کا کفارہ کیا ہوگا؟　　　　مستفتی: حبیب الرحمٰن ضلع ژوب بلوچستان

﴿جواب﴾ (۱) شریعت مطہرہ میں قربانی کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کا قرب و رضا ہے، اس نیت سے جانور ذبح کرلیا جائے تو قربانی کا فریضہ ادا ہو جائیگا، البتہ قربانی کا گوشت تین حصوں میں تقسیم کرنا مندوب ہے، ایک حصہ فقراء و مساکین پر خرچ کرلیا جائے، دوسرا حصہ اعزہ و اقرباء کو کھلایا جائے اور تیسرا حصہ اپنے لئے رکھ لیا جائے اور اگر سارا گوشت صدقہ کردے یا اپنے لئے اسٹور کرلے تو اس کی بھی اجازت ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اس شخص کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضاء جوئی ہو اور ساتھ ساتھ اس کے

گوشت سے لانڈی وغیرہ بنانا بھی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، ہاں صرف لانڈی کی غرض سے قربانی کے دنوں میں جانور ذبح کرلے قربانی مقصود نہ ہو تو اس سے قربانی نہیں ہوگی۔

لما فی الهداية:(۴/۴۵۰،طبع رحمانیه)

ويأكل من لحم الاضحية ويطعم الاغنياء والفقراء ويدخر لقوله عليه السلام كنت نهيتكم عن أكل لحوم الاضاحي فكلوا منها وادخروا.

ولما فی الشامی:(۹/۴۷۴،طبع امدادیه)

قوله:(وندب الخ)قال في البدائع والافضل أن يتصدق بالثلث ويتخذ الثلث ضيافة لأقربائه وأصدقائه ويدخر الثلث ويستحب ان يأكل منها ولو حبس الكل لنفسه جاز لان القربة في الاراقة والتصدق باللحم تطوع.

(۲) قربانی ایک شرعی عمل ہے بلا عذر شرعی ترک کرنا موجب گناہ ہے، صورت مرقومہ کے مطابق قربانی کے پیسے ایام عید کے اندر صدقہ کر دیے جائے تو اس سے قربانی کا فریضہ ذمہ سے ساقط نہیں ہوگا، بدستور ذمہ واجب رہیگا۔

چنانچہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں اگر قربانی کے دن گزر گئے ناواقفیت یا غفلت یا کسی عذر کی بناء پر قربانی نہ کرسکا تو قربانی کی قیمت فقراء و مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے لیکن قربانی کے تین دنوں میں جانور کی قیمت دینے سے یہ واجب ادا نہیں ہوگا اور اس حکم کی تعمیل نہ کرنے سے گنہگار ہوگا کیونکہ قربانی ایک مستقل عبادت ہے جیسے نماز پڑھنے سے روزہ اور روزہ رکھنے سے نماز ادا نہیں ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور تعامل پھر تعامل صحابہؓ اس پر شاہد ہیں۔

لما فی الهداية:(۴/۴۴۷،طبع رحمانیه)

ولو لم يضح حتى مضت ايام النحر ان كان أوجب على نفسه أو كان فقيرا وقد اشترى الاضحية تصدق بها حية وان كان غنيا تصدق بقيمة شاة اشترى أو لم يشتر لانها واجبة على الغنى وتجب على الفقير بالشراء بنية التضحية.

(۳) کسی کی قربانی کسی وجہ سے فاسد ہوگئی، اس شخص پر اگر قربانی واجب تھی تو ایام عید گزرنے کے بعد اس کی قیمت کا صدقہ دینا ضروری ہے اگر واجب نہیں تھی تو صدقہ دینا بھی واجب نہیں ہے۔

لما فی الدر المختار:(۹/۴۸۲،طبع امدادیه ملتان)

شرى اضحية وامر رجلا بذبحها فقال تركت التسمية عمدا لزمه قيمتها ليشترى الآمر بها أخرى ويضحي ويتصدق ولا يأكل لو ايام النحر باقية والا تصدق بقيمتها على الفقراء، خانية.

ولسافی خلاصۃ الفتاوی:(۲۱۸/۴-۲۱۹،طبع رشیدیہ کوئٹہ)

وفی فتاوی القاضی الامام الظہیر اذانوی أن یشتری شاۃ للأضحیۃ لایلزمہ بہذہ النیۃ شیء،ولواشتری شاۃ للاضحیۃ فماتت اوباعہا لایلزمہ اخری … والفقیر لوسرق شاتہ ولم یشترِ اخری لیس علیہ اخری.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:محمد اسلم چترالی غفرلہ

۱۵ربیع الاول ۱۴۲۹ھ   فتوی نمبر:۱۲۱۵

﴿مرحوم کی طرف سے قربانی کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم چار بھائی ہیں،اب ہم چاہتے ہیں کہ اس بقرعید میں اپنے حصوں کی قربانی کیساتھ کیساتھ اپنے دادا مرحوم کے لئے بھی حصہ رکھ لیں؟

﴿جواب﴾ ایصال ثواب کی غرض سے کسی مرحوم کی طرف سے قربانی کرنا شرعاً پسندیدہ ہے،بلاشبہ اسکا اجر وثواب مرحوم کو پہنچتا ہے،اس کے لئے مستقل الگ جانور کی قربانی کرے یا گائے وغیرہ میں کوئی حصہ لے کر دوسروں کیساتھ کرے،دونوں طرح جائز ہے۔

لسافی الشامی:(۳۲۶/۶،طبع سعید)

لفرع لمن ضحی عن المیت یصنع کمایصنع فی أضحیۃ نفسہ من التصدق والأکل والأجر للمیت والملک للذابح قال الصدر والمختار أنہ ان بأمر المیت لایأکل منہا والایأکل بزازیۃ.

ولسافی الفتاوی الولوالجیۃ:(۸۲/۳،طبع فاروقیہ پشاور)رجل ضحی عن المیت جاز اجماعاً.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۴ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ   فتوی نمبر:۲۷۶۰

﴿ایام نحر میں قربانی نہ کرنے کی صورت میں اس کی قضا کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ملکیت میں ایک تولہ سے زائد سونا اور تھوڑے سے پیسے ہے لیکن اتنی رقم نہیں جس سے میں قربانی کرسکوں جبکہ سونے کو میں نے والد صاحب کے پاس بطور حفاظت رکھا ہے،میرے بھائی نے بقرعید کے موقع پر مجھ سے عرض کیا کہ آپ پر قربانی واجب ہے،میں نے والد صاحب سے کہا کہ میرا سونا دے دیجئے تاکہ اس سے کچھ فروخت کرکے قربانی کا جانور خریدوں،والد صاحب نے فرمایا کہ اس سال چھوڑ دو اگلے سال کرلینا،اس وجہ سے میں ایام نحر میں قربانی نہ کرسکی۔

(۱) میرے لئے شرعاً کیا حکم ہے؟ (۲) نیز یہ بھی فرمائیں کہ قربانی کس شخص پر واجب ہوتی ہے؟

﴿جواب﴾ صرف ایک تولہ سونا سے کوئی صاحب نصاب نہیں بنتا، اس لئے آپ پر قربانی واجب نہیں تھی، البتہ اس کے ساتھ آپ کے پاس اپنی ذاتی ملکیت میں کچھ چاندی یا نقد روپے بھی خاص عید کے دن اگر تھے تو آپ شرعاً مالدار شمار ہوتی ہیں اور قربانی آپ کے ذمہ واجب تھی۔

اب چونکہ عید گذر گئی، لہٰذا قضا کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ درمیانی بکری کی قیمت غریب مستحق کو صدقہ کریں۔

لما فی الدرمع الرد:(۹/۴۶۵،طبع امدادیه)(و)تصدق(بقیمتها غنی شراها أو لا)

وفی الشامیة:قوله:(فالمراد بالقیمة الخ)بیان لما أجمله المصنف،لأن قوله "تصدق بقیمتها" ظاهر فیما اذا شراها لأن قیمتها تعلم،أما اذا لم یشترها فما معنی أنه تصدق بقیمتها فانها غیر معینة.فبین أن المراد اذا لم یشترها قیمة شاة تجزیء فی الأضحیة کما فی الخلاصة وغیرها.قال القهستانی:أو قیمة شاة وسط کما فی الزاهدی والنظم وغیرهما.

ولما فی الخلاصة:(۴-۳/۳۱۱،کتاب الأضحیة،فی وقت الأضحیة،طبع رشیدیه)

ولم یشتر أضحیة حتی مضت أیام النحر تصدق بقیمة ما یصلح للأضحیة.

ولما فی الهدایة:(۴/۴۴۳،کتاب الأضحیة،طبع رحمانیه)

قال:ألأضحیة واجبة علی کل حر مسلم مقیم موسر فی یوم الأضحی عن نفسه وعن ولده الصغار.....ووجه الوجوب قوله علیه السلام من وجد سعة ولم یضح فلا یقربن مصلانا ومثل هذا الوعید لا یلحق بترک غیر الوجب.

ولما فی الشامی:(۶/۳۱۲،کتاب الأضحیة،طبع سعید)

(قوله والیسار الخ)بأن ملک مائتی درهم أو عرضاً یساویها غیر مسکنه وثیاب اللبس أو متاع یحتاجه الی أن یذبح الأضحیة.....الخ.

ولما فی بدائع الصنائع:(۵/۶۴،کتاب الأضحیة،طبع سعید)

فلا بد من اعتبار الغنی وهو أن یکون فی ملکه مائتا درهم أو عشرون دینارا أو شیء تبلغ قیمته ذلک سوی مسکنه وما یتأثث به وکسوته وخادمه وفرسه وسلاحه وما لا یستغنی عنه وهو نصاب صدقة الفطر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۱۲ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ　　　فتویٰ نمبر:۲۹۱۰

﴿قربانی کو ساقط کرنے کے لئے حیلہ اختیار کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ (۱) سسر بہو سے کہتا ہے کہ آپ سونا مجھے ہبہ کر دو تو

آپ پر قربانی واجب نہیں ہوگی بلکہ میرے اوپر ہوگی (جب کہ سسر پر پہلے سے قربانی واجب ہے) اور میں یہ سونا آپ سے ملکیۃً نہیں لونگا بلکہ بعد میں واپس کردونگا پھر عید کے بعد سسر واپس بھی کردیتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اس طرح حیلہ کرکے بہو سے قربانی ساقط ہوئی؟ جبکہ بہو کے پاس سونے کے علاوہ کوئی ایسا مال بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے قربانی واجب ہو۔

(۲) دوسری بات یہ پوچھنی ہے کہ قربانی کو ساقط کرنے کیلئے اس طرح کا حیلہ اختیار کرنا جائز ہے؟ بینوا وتوجروا۔ مستفتی: عبدالرزاق صاحب کراچی

﴿جواب﴾ عارضی اور وقتی طور پر کسی کو کوئی چیز دیدی تو وہ اس کا مالک قرار نہیں پاتا اور دینے والے کی ملکیت سے وہ چیز نہیں نکلتی، لہذا چند دنوں کیلئے سونا سسر کو دینے سے سونے کا مالک سسر نہیں ہوا، سونا بدستور بہو کی ملکیت میں ہے، قربانی اس پر واجب ہے۔

اور قربانی یا کوئی دوسرا شرعی واجب حکم ساقط کرنے کیلئے حیلے اختیار کرنا مکروہ تحریمی ہے دینی احکامات سے فرار کے مترادف ہے کسی مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شرعی احکام کو ایک بوجھ سمجھے۔

لما فی مجمع الانھر: (۲/۲۶۷، طبع المنار)

لوقال الرجل: اعطنی الف درھم۔۔۔ فقال اعطیتک فھذا علی الودیعۃ.

ولما فی درر الحکام (۲/۲۵۱، طبع ماجدیہ)

ینعقد الایداع کنایۃ: کما لوقال شخص لآخر اعطنی ھذہ العشرۃ دراھم او اعطنی ھذا الثوب واعطاہ یکون ودیعۃ لان اعطاء الدراھم او الثوب وان کان محتملاً للھبۃ ایضا ولکن بما ان الودیعۃ ادنی عن الھبۃ تکون الودیعۃ متیقنۃ والھبۃ مشکوکۃ.

ولما فی التنویر مع الدر: (۵/۶۶۲، طبع سعید)

(ورکنھا الایجاب صریحا) کأودعتک (او کنایۃ) کقولہ لرجل اعطنی الف درھم او اعطنی ھذا الثوب مثلاً فقال: اعطیتک کان ودیعۃ بحر. لان الاعطاء یحتمل الھبۃ لکن الودیعۃ ادنی وھو متیقن فصار کنایۃ.

ولما فی البزازیۃ: (۲/۲۰۶، طبع قدیمی)

لہ دین حال علی مقر ملی، ولیس عندہ ما یشتریھا بہ لا یلزمہ الاستقراض ولا قیمۃ الاضحیۃ اذا وصل الدین الیہ ولکن یلزمہ ان یسال منہ ثمن الاضحیۃ اذا غلب علی ظنہ انہ یعطیہ، وکذا فی درر الحکام: (۲/۲۱۰، طبع ماجدیہ) وکذا فی الفقہ الحنفی وادلتہ: (۲/۹۷-۹۸، طبع دار الکلم الطیب)

ولما فی روح المعانی: (۲۳-۲۲/ص۲۷۷، سورۃ ص، طبع رشیدیہ)

وعندی أن کل حیلۃ أوجبت ابطال حکمۃ شرعیۃ لا تقبل.

ولما فی المبسوط للسرخسی (۲۹-۳۰/ص ۲۱۰ طبع دار المعرفۃ بیروت)

وانما یکره ذلک ان یحتال.....فی باطل حتی یموّهه.

ولما فی الهندیة: (۲۲۲/۶ طبع قدیمی)

کره بعض اصحابنا رحمهم الله تعالٰی الحیلة فی اسقاط الزکاة ورخص فیها بعضهم .....ومشائخنا رحمهم الله تعالٰی اخذوا بقول محمدؒ.

ولما فی البنایة (۱۱۷/۱۲ طبع حقانیه)

(الحیلة فی اسقاط الزکاة) فعند ابی یوسف رحمه الله تعالٰی لا تکره وعند محمد رحمه الله تعالٰی تکره وقیل الفتوٰی علیٰ قول ابی یوسف رحمه الله تعالٰی فی الشفعة وعلیٰ قول محمد رحمه الله تعالٰی فی الزکاة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ذیشان احمد ملازئی

۲۵ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۸۰۳

﴿ قربانی کے بکرے کے لئے ایک سال کا پورا ہونا شرط ہے ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص نے قربانی کیلئے بکرا خریدا مگر جب گھر میں لایا تو پتہ چلا کہ اسکے دانت نہیں ہے یعنی سال سے کم تھا پھر اس شخص نے دوسرا جانور خرید کر اسکی قربانی کی، پوچھنا یہ ہے کہ پہلے جانور کے ساتھ کیا کرے اسکو بھی ذبح کرے گا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ بکرے وغیرہ کا دو دانت کا ہونا شرط نہیں ہے، البتہ ایک سال عمر کا ہونا قربانی کیلئے شرط ہے، اس بکرے کی عمر ایک سال اگر نہیں تھی تو یہ قربانی کا جانور شمار نہیں ہوتا اور اس شخص نے دوسرا جانور خرید کر قربانی کر لی تو اب پہلے والے بکرے کا وہ چونکہ مالک ہے تو جس طرح چاہے استعمال میں لائے اسے اختیار ہے۔

لما فی البدائع: (۷۰/۵ طبع سعید)

فلا یجوز شئی مما ذکرنا من الابل والبقر والغنم من الاضحیة الا الثنی من کل جنس الا الجذع من الضأن خاصة اذا کان عظیما.....الثنی من الشاة والمعز ما تم له حول وطعن فی السنة الثانیة......وتقدیر هذه الاسنان بما قلنا لمنع النقصان لا لمنع الزیادة حتی لو ضحی باقل من ذلک سنا لا یجوز ولو ضحی باکبر من ذلک سنا یجوز ویکون افضل.

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته: (۲۷۲/۴ طبع رشیدیه)

قال الحنفیة المعز ما اتم سنة وطعن دخل فی الثانیه......الخ.

ولما فی البزازیۃ:(۲/۳۰۸طبع قدیمی)

ومن الغنم ماتمت علیہ سنۃ والذکر منہ افضل اذا کان خصیاوجاز منہ الثنی فصاعدا ولا یجوز مادون الثنی من کل شئی.

ولما فی الشامی:(۶/۳۲۱طبع سعید)

(قولہ من الضأن)ھوماله الیۃ منح.قیدبہ لانہ لایجوز الجزع من المعز وغیرہ بلاخلاف کما فی المبسوط.قھستانی.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ .واللہ اعلم بالصواب:محمد عمران غفرلہ ولوالدیہ

۱۲صفرالخیر۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۸۶۵

﴿قربانی کرنے کے بعد غریب آدمی صاحب نصاب ہوجائے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک غریب آدمی نے قربانی کیلئے جانور خریدا اور اسکو عید کے پہلے دن ذبح کیا،اب اتفاق سے یہ آدمی تیسرے دن صاحب نصاب ہوگیا،پوچھنا یہ ہے کہ اس ادمی کیلئے پہلی قربانی کافی ہے یا نہیں؟دوسری بھی کریگا؟

﴿جواب﴾ صورۃ مسئولہ میں اس شخص پر دوسری قربانی واجب نہیں ہے،پہلی قربانی اس کے لئے کافی ہے۔

لما فی الشامی:(۶/۳۱۶طبع سعید)

ولوضحی الفقیرثم أیسرفی اخرہ علیہ الاعادۃ فی الصحیح لانہ تبین ان الاولی تطوع بدائع ملخصالکن فی البزازیۃ وغیرھاان المتاخرین قالوالاتلزمہ الاعادۃ وبہ ناخذ.

ولما فی البحر الرائق:(۸/۱۷۸طبع سعید)

اشتری شاۃ للاضحیۃ وھوفقیرفضحی بھاثم أیسرفی ایام النحرقال بعضھم علیہ غیرھاوقال بعضھم لیس علیہ غیرھا وبہ ناخذفی العتابیہ وھوالمختار.

ولما فی البزازیۃ:(۲/۳۱۱طبع قدیمی)

اشتری الفقیرفی ایامھاشاۃ لھاوضحی بھاثم ایسرفی ایامھاقال الغومینی علیہ اخری والمتاخرون قالوالا وبہ ناخذ.

ولما فی تبیین الحقائق:(۶/۲۷۵طبع سعید)

ولوکان فقیرافایسرفیھاتجب لانہ ادرک وقتھاوھوغنی لان الموجودفی بعض الوقت کالموجودفی اولہ وقیل لاتجب علیہ لان الوجوب یتعلق بطلوع الفجرفالفقیرلیس من اھلہ فجعلہ فی ھذہ الروایہ نظیرصدقۃ الفطر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد عمران غفرلہ ولوالدیہ

۲۰محرم الحرام۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۷۸۶

﴿قربانی کے لئے بکرے کی عمر ایک سال ہونا شرط ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ گیارہ ماہ والے بکرے کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ ایک مفتی صاحب نے فرمایا اگر شمسی حساب سے گیارہ ماہ ہو چکے ہوں تو قربانی جائز ہے اور اگر قمری ماہ سے ہوئی ہوں تو ناجائز، مفتی صاحب کا یہ قول کس حد تک ٹھیک ہے؟ مستفتی: سیف اللہ

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ شریعت مطہرہ میں مختلف جانوروں کی قربانی کے سلسلے میں انکی مختلف عمروں کا ذکر ہے کہ ان مخصوص عمروں سے کم والے جانوروں کی قربانی جائز نہیں، البتہ اگر اس عمر کی حد تک پہنچے یا اس سے زیادہ ہو تو جائز ہے اور بکرے وغیرہ کے بارے میں عمر کی حد ایک سال بیان کی گئی ہے اگر ایک دن بھی کم ہو تو قربانی درست نہ ہوگی، لہٰذا مفتی صاحب کی بات کا بظاہر یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ شمسی حساب سے گیارہ ماہ گذرنے کے بعد چاند کے حساب سے چند دن باقی ہوتے ہیں، وہ بھی گذرے ہوں گے تو قربانی صحیح ہوگی ورنہ نہیں۔

لما فی التنویر مع الدر:(۶/۳۲۱-۳۲۲،طبع ایچ ایم سعید)

(وصح الجذع)ذوستة أشهر(من الضأن)ان كان بحيث لو خلط بالثنايا لا يمكن التمييز من بعد.(و)صح(الثني)فصاعدا من الثلاثة والثني(هو ابن خمس من الابل، وحولين من البقر والجاموس وحول من الشاة)

وفی الشامية:وفی البدائع:تقدير هذه الأسنان بما ذكر لمنع النقصان لا للزيادة فلو ضحى بسن أقل لا يجوز.

ولما فی البدائع:(۵/۷۰،طبع ایچ ایم سعید)

وتخصيص هذه القربة بسن دون سن أمر لا يعرف الا بالتوقيف فيتبع ذلك.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عباد اللہ غفرلہ ولوالدیہ

۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۸۰۰

﴿جانور کی رقم صدقہ کرنے سے عقیقہ کی سنت ادا نہ ہوگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں ایک شخص کا کہنا کہ عقیقہ میں مخصوص جانور کا خون بہانا ادائیگی سنت کیلئے ضروری نہیں ہے بلکہ اگر کسی نے عقیقہ کی نیت سے جانور خرید کر بعینہ اسکو صدقہ کر دیا یا جانور کی رقم کسی فقیر کو عقیقہ کی نیت سے صدقہ کر دیا تو اس سے بھی سنت کی ادائیگی ہو جاتی ہے اب پوچھنا یہ

ہیکہ آیا عقیقہ میں سنت پر عمل کرنے کیلئے جانور کا خون بہانا ادائیگی سنت کیلئے ضروری ہے یا یہ ہیکہ نفس جانور یا اسکی قیمت صدقہ کرنے سے بھی سنت پوری ہوجاتی ہے۔ مستفتی: زبیر احمد سواتی

﴿جواب﴾ عقیقہ مخصوص صفات کے جانور کو عقیقہ کی نیت سے ذبح کرنے کا نام ہے لہذا شریعت مطہر کی روشنی میں زندہ جانور کا صدقہ کردینے سے عقیقہ کی سنت ادا نہ ہوگی اسی طرح جانور کی قیمت کے برابر رقم صدقہ کرنے سے بھی سنت ادا نہ ہوگی اس شخص کی بات قطعاً صحیح نہیں ہے۔

لمافی البخاری: ۸۲۵/۲ (طبع رحمانیه)

عن محمد بن سیرین قال حدثنا سلمن بن عامر الضبی قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم مع الغلام عقیقة فاهریقوا عنه دما وأمیطوا عنه الأذی.

لمافی البدائع: ۶۶/۵ (طبع سعید)

لو تصدق بعین الشاة أو قیمتها لا یجزیه لأن الوجوب تعلق بالاراقة.

لمافی الدر مع الرد: ۱۳/۶ (طبع سعید)

أی اراقة الدم من النعم قال فی الجوهرة والدلیل علی أنها الاراقة لو تصدق بعین الحیوان لم یجز.

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: فضل حق زیزاروی

۱۳ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر: ۳۹۰۰

﴿عقیقہ اور قربانی کے جانور میں فرق نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عقیقہ اور قربانی کے جانور میں کوئی فرق ہے؟ جب کہ ''امداد الفتاویٰ'' میں ہے کہ شرائط واجبہ فی الاضحیہ عقیقہ میں محض مستحب ہے، وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: ایاز

﴿جواب﴾ عقیقہ اور قربانی کے جانور میں فرق نہیں ہے، عقیقہ میں بھی ایسے ہی جانور کو ذبح کرنے کا حکم ہے جس جانور کی قربانی جائز ہو، کم عمری یا عیب کی وجہ سے کسی جانور کی قربانی اگر جائز نہیں ہے تو ایسے جانور کو عقیقہ میں ذبح کرنے سے عقیقہ نہیں ہوتا، صرف صدقہ وخیرات ہوگا، ہاں فرق اس اعتبار سے ہے کہ قربانی صاحب نصاب پر واجب ہے، عقیقہ واجب نہیں ہے سنت یا مستحب ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ''امداد الفتاویٰ'' ۶۱۹/۳ میں

ایک سوال کے جواب میں ضمناً یہ بھی فرمادیا ہے کہ ''شرائط واجبہ فی الاضحیہ عقیقہ میں محض مستحب ہیں'' دراصل یہاں پر عقیقہ کی کھال کی قیمت کے بارے میں صرف رائے کے انداز میں فرمادیا ہے، باقاعدہ کوئی فتویٰ نہیں دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں ''اس لئے تصدق بالقیمۃ بھی مستحب ہوگا'' ایسا نہیں فرمایا کہ مستحب ہے بلکہ رائے کے انداز میں فرمایا ہے کہ مستحب ہوگا۔

دیکھئے! اسی فتاویٰ میں اگلے صفحہ یعنی صفحہ: ۶۲۰ پر یہی مسئلہ بحوالہ ''اشعۃ اللمعات'' اس طرح بیان فرمایا ہے ''وہر چہ دراضحیہ معتبراست از شرائط احکام درعقیقہ نیز معتبرست'' یعنی قربانی کے لئے جو شرائط معتبر ہیں عقیقہ کے لئے بھی انہی کا اعتبار ہے، لہٰذا حکیم الامت بھی قربانی اور عقیقہ کے جانور میں کوئی فرق نہیں بتاتے۔

لما فی الشامی ،(قبیل کتاب الحظر والاباحۃ ،۳۳۶/۶،طبع: سعید)

''ویستحب لمن ولدله ولدان یسمیه یوم اسبوعه ویحلق رأسه ویتصدق عندالائمة الثلاثة بزنة شعره فضة اوذهبا ثم یعق عندالحلق عقیقة اباحة علی مافی الجامع المحبوبی اوتطوعا علی مافی شرح الطحاوی''۔

ولما فی الشامی :(۳۳۶/۶ طبع سعید)

''وهی شاة تصلح للاضحیة تذبح للذکروالانثیٰ سواء فرق لحمها نیئا اوطبخه بحموضة اوبدونها مع کسر عظمها اولا واتخاذ دعوة اولا''۔

ولما فی اوجزالمسالک ،(العمل فی العقیقة ،۲۶۷/۹،طبع: دارالکتب العلمیة بیروت)

''قال مالک: ــــ فانما هی بمنزلة النسک والضحایا لایجوزفیها عوراء ولاعجفاء ولامکسورة القرن ولامریضة ــــ ویاکل اهلها من لحمها ویتصدقون منها'' وقال ابن رشد: اما من هذا النسک وصفته فسن الضحایا وصفتها ولااعلم فی هذا خلافا فی المذهب ولاخارجا منه''

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب : کمیل الدین کلکتی

۲۰ صفرالخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۴۵

﴿عقیقہ میں چند آدمی مل کر ایک جانور ذبح کرسکتے ہیں﴾

﴿سوال﴾ اگر چند آدمی شریک ہوکر عقیقہ میں ایک گائے ذبح کریں تو درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ قربانی کی طرح عقیقہ میں بھی چند آدمیوں کی شرکت گائے وغیرہ میں جائز ہے۔

لما فی الهندیة:(۳۰۴/۵، کتاب الأضحیة طبع رشیدیه)

ولو أرادوا القربة الاضحیة أوغیرها من القرب أجزأهم سواء کانت القربة واجبة أوتطوعا أو

وجب على البعض دون البعض وسواء اتفقت جهات القربة أو اختلفت بأن أراد بعضهم الاضحية وبعضهم جزاء الصيد وبعضهم هدى الاحصار وبعضهم كفارة عن شيء أصابه في احرامه وبعضهم هدى التطوع وبعضهم دم المتعة أو القران وهذا قول أصحابنا الثلاثة رحمهم الله تعالیٰ وكذلك ان أراد بعضهم العقيقة عن ولد ولد له من قبل كذا ذكر محمد رحمه الله تعالیٰ في نوادر الضحايا الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۱جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۶

﴿لڑکے کے عقیقہ میں دو بکرے ذبح کرنا ضروری نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کیا لڑکے کے عقیقے میں دو بکرے ذبح کرنا ضروری ہے؟ کیا ایک بکرا یا بکری ذبح نہیں کر سکتے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ لڑکے کے عقیقے میں دو بکرے یا دو بھیڑ یا دو دنبے ذبح کرنا افضل ہے، ضروری نہیں ہے یعنی اگر گنجائش نہ ہو تو ایک بکرا یا ایک بکری یا ایک بھیڑ یا بڑے جانور میں سے ایک حصہ بھی کافی ہے، اس سے بھی عقیقہ ہو جاتا ہے۔

لمافي جامع الترمذي: (۱/۱۸۳ مطبع فاروقی ملتان)

عن ام كرز رضي الله عنها انها سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن العقيقة فقال عن الغلام شاتان وعن الجارية واحدة لا يضركم ذكراناً كن ام اناثاً هذا حديث صحيح...... عن علي بن ابي طالب رضي الله عنه قال عق رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الحسن بشاة وقال يا فاطمة احلقي رأسه وتصدقي بزنة شعره فضة فوزناه فكان وزنه درهماً او بعض درهم

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۱۶ جمادی الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۸۹۳

﴿عقیقہ میں ایک بکرا ذبح کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص لڑکے کی پیدائش پر عقیقہ کی نیت کرے اور وہ دو بکروں کا عقیقہ نہ کر سکے یہاں تک کہ سات دن گذر جائیں پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس کے بعد بھی عقیقہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ نیز دو بکروں کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کیا ایک بکرے کا عقیقہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟

مستفتی: قاری محمد خورشید آزاد کشمیر

﴿جواب﴾ ساتویں دن عقیقہ کی فضیلت زیادہ ہے، پہلے ساتویں دن عقیقہ نہ کر سکا تو بعد

میں بھی ساتویں دن کی رعایت کی جائے تو افضل ہے، تاہم عقیقہ کسی بھی دن ہوسکتا ہے، لڑکے کے لئے دو بکرے اور لڑکی کے لئے ایک بکرا اصل حکم ہے لیکن ایک سے بھی عقیقہ ادا ہو جائے گا۔

لما فی التنقیح الحامدیۃ:(۲/۲۳۲-۲۳۳،طبع حقانیہ)

مسألۃ العقیقۃ تطوع ان شاء فعلها وان شاء لم یفعل وھی ان یذبح شاۃ اذا اتی علی الولد سبعۃ ایام وعند الشافعی سنۃ ثم اذا اراد ان یعق عن الولد فانه یذبح عن الغلام شاتین وعن الجاریۃ شاۃ......ولو ذبح عن الغلام شاۃ وعن الجاریۃ شاۃ جاز لان النبی ﷺ عق عن الحسن والحسین کبشا کبشا......ولا یکون فیه الا السلیمۃ من العیوب لانه اراقۃ دم شرعا کالاضحیۃ ولو قدم یوم الذبح قبل یوم السابع او اخره عنه جاز الا ان یوم السابع افضل......ویقول عند ذبحه اللھم ھذه عقیقۃ ابنی فان دمها بدمه ولحمها بلحمه وعظمها بعظمه وجلدها بجلده وشعرها بشعره، اللھم اجعلها فداء لابنی من النار.

ولما فی الشامی:(۶/۳۳۶،طبع سعید)

[خاتمه] یستحب لمن ولد له ولد ان یسمیه یوم اسبوعه ویحلق راسه ویتصدق عند الائمۃ الثلاثۃ بزنۃ شعره فضۃ او ذھبا ثم یعق عند الحلق عقیقۃ اباحۃ علی ما فی الجامع المحبوبی، أو تطوعا علی ما فی شرح الطحاوی وھی شاۃ تصلح للاضحیۃ تذبح للذکر والانثی سواء فرق لحمها نیئا او طبخه بحموضۃ أو بدونها مع کسر عظمها او لا واتخاذ دعوۃ او لا وبه قال مالک وسنها الشافعی واحمد سنۃ مؤکدۃ شاتان عن الغلام وشاۃ عن الجاریۃ غرر الافکار ملخصا وکذا فی اعلاء السنن:(۱۷/ ۱۳۱ دار الکتب العلمیۃ بیروت)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۳۵

﴿عقیقہ کے وقت بچے کے بالوں کو چاندی کیساتھ وزن کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں بعض لوگ جب بچے کا عقیقہ کرتے ہیں، اور بچے کے بالوں کو وزان کرتے ہیں اور پھر جتنی مقدار بالوں کی ہوتی ہے، وہ اس کے بدلے میں اتنی مقدار کی چاندی صدقہ کرتے ہیں، وہ لوگ اس عمل کو ضروری سمجھتے ہیں، میرا ایک دوست مولوی صاحب ہے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کے یہ عمل کرنا کوئی ضروری نہیں، تو کیا ان لوگوں کا عمل شریعت کی روشنی میں درست ہے؟ حوالہ جات کے ساتھ رہنمائی فرمائیں۔

مستفتی: محمد عبدالجلیل میانوالی

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ تمام امور سنت سے ثابت ہیں، لیکن فرض، واجب کے

درجہ میں نہیں ہیں، اس لئے ضروری نہیں سمجھنا چاہیے مستحب یا سنت کہہ سکتے ہیں۔

لما فی جامع الترمذی (۱/۱۸۳ طبع فاروقی)

عن علی بن ابی طالب قال عق رسول اللہ ﷺ عن الحسن بشاة وقال يا فاطمة احلقی رأسه وتصدقی بزنة شعره فضة فوزنته فكان وزنه درهما او بعض درهم.

ولما فی اعلاء السنن (۱۷/۱۱۵ طبع بیروت)

واخرج الحاكم ايضا عن محمد بن اسحاق ـــــ عن علی بن ابی طالب قال: عق رسول الله ﷺ عن الحسين بشاة وقال يا فاطمة احلقی رأسه تصدق بزنة شعره فوزناه فكان درهما.

ولما فی الفقه الاسلامی (۲/۷۵۱ طبع رشیدیه)

ويستحب حلق رأس المولود فی اليوم السابع من ولادته ،وان يسمى فيه بعد ذبح العقيقة ،ويتصدق بوزن شعره ذهبا او فضة ،لانه ﷺ امر فاطمة ،فقال:"زنی شعر الحسين ،وتصدقی بوزنه فضة"،كما قال لها لما ولدت الحسن:"احلقی شعر رأسه، فتصدقی بوزنه من الورق "ای الفضة وقيس بالفضة :

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہ جہان ڈیروی

۸ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۵۴

﴿بچے کی ختنہ اور دیگر خوشی کے موقع پر دعوت کرنا مستحب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں بچے کی ختنہ کے موقع پر دعوت کی جاتی ہے، کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں، اس کی کیا حیثیت ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ بچے کی ختنہ کے موقع پر دعوت کرنا مستحب ہے اور اس کو بدعت کہنا درست نہیں، اس لئے کہ یہ خوشی کا موقع ہوتا ہے اور خوشی کے مواقع پر دوست احباب کو جمع کر کے دعوت کر دینے میں کوئی قباحت نہیں، البتہ اسکو ضروری نہیں سمجھنا چاہیے۔

لما فی المرقاة: (۶/۳۲۹ طبع رشیدیه)

وعن عبدالله بن عمرؓ ان رسول الله ﷺ قال اذا دعى احدكم الى الوليمة فليأتها. (متفق عليه) وفی رواية مسلم فليجب عرسا كان اونحوه ای كالعقيقة والختان.

ولما فی اعلاء السنن: (۱۱/ص ۱۲ طبع دار الكتب العلمية)

فحكم الدعوة للختان وسائر الدعوات غير الوليمة انها مستحبة لما فيها من اطعام الطعام والاجابة اليها مستحبة غير واجبة وهذا قول مالك والشافعی وابی حنيفة واصحابة

وقد دعی احمد الی ختان فاجاب واکل فاما الدعوة فی حق فاعلها فلیست لها فضیلة تختص بها لعدم ورود الشرع بها ولکن هی بمنزلة الدعوة بغیر سبب حادث فاذا قصد فاعلها شکر نعمة الله علیه واطعام اخوانه وبذل طعامه فله اجر ذلک انشاء الله تعالی قلت وکل ذلک موافق لمذهبنا معشر الحنفیة وما کان خلافا نبهت علیه کما تری۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق غفرلہ

۱۵ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۵۵

﴿عذر کی وجہ سے ختنہ نہ کرانے کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرے دو بیٹے ختنے کے زخم (خون نہ رکنے) کی وجہ سے فوت ہو گئے ہیں، اب تیسرا بیٹا ہے، گھر والی ختنہ کرنے سے روک رہی ہے، ایسی صورت میں کیا ختنہ نہ کرنے کی گنجائش ہے یا ختنہ کرنا ضروری ہے؟ مستفتی محمد رحمان

﴿جواب﴾ ختنہ کرنا مستقل سنت اور اسلام کے شعائر وخصائص میں سے ہے، اس کو ترک نہیں کرنا چاہیے، آپ شاید بہت کم عمری میں بچوں کا ختنہ کرادیتے ہیں، عام طور پر کم عمری میں ختنہ کرانے میں اگرچہ آسانی ہوتی ہے اور زخم بھی جلدی ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن یہ خیال رکھنا کہ بچے کی صحت بھی اس کی متحمل ہو ضروری ہے۔

آپ کے بچوں میں اسکے علاوہ کوئی خاص وجہ ہو اور ختنہ کرنے کی صورت میں موت واقع ہونے کا قوی اندیشہ ہو جس کا صحیح فیصلہ ماہر ڈاکٹر ہی کر سکتے ہیں تو یہ عذر ہوگا اور ختنہ نہ کرانے کی گنجائش ہوگی۔

لما فی التنویر مع الدر: (۷۵۱/۶، طبع سعید)

(و) الاصل أن (الختان سنة) کما جاء فی الخبر (وهو من شعائر الاسلام) وخصائصه (فلو اجتمع اهل بلدة علی ترکه حاربهم) الامام فلا یترک الا لعذر وعذر شیخ لا یطیقه ظاهر.

ولما فی الهندیة: (۳۵۷/۵، طبع رشیدیه)

الشیخ الضعیف اذا اسلم ولا یطیق الختان ان قال اهل البصر لا یطیق یترک لان ترک الواجب بالعذر جائز فترک السنة اولیٰ کذا فی الخلاصة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد شاکر اللہ

۲۴ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۰۲

﴿بدفعلی کی ہوئی جانور کی قربانی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک نوجوان نے قربانی

کے جانور سے غیر فطری عمل کیا، اب پوچھنا یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: ایک سائل سم اب گوشہ

﴿جواب﴾ اس غیر فطری عمل کا علم اس آدمی کے علاوہ بھی اگر کسی کو ہو تو بجائے قربانی کے اس کو ذبح کرکے جلا دینا چاہیے تاکہ لوگوں پر اس کی شناعت ظاہر ہو، ہاں لوگوں کو علم نہ ہو تو جانور کا کوئی قصور نہیں ہے، قربانی ہو جائے گی، البتہ اس شخص نے بڑا گناہ کیا ہے، توبہ واستغفار کا اہتمام کرتا رہے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۲۶/۴، طبع سعید)

(و) لا یحد بوطء (بہیمۃ) بل یعزر وتذبح ثم تحرق، ویکرہ الانتفاع بہا حیۃ ومیتۃ مجتبی.

وفی الشامیۃ: (قولہ وتذبح ثم تحرق) ای لتطع امتداد التحدث بہ کلما رؤیت ولیس بواجب کما فی الہدایۃ وغیرہا ـــ فان کانت توکل جاز اکلہا عندہ، وقالا: تحرق أیضا الخ.

ولما فی فتح القدیر: (۲۵۲/۵، طبع رشیدیہ)

ومن وطئ بہیمۃ فلا حد علیہ الأأنہ یعزر لما بینا .... والذی یروی أنہ تذبح البہیمۃ وتحرق فذلک لقطع امتدادلتحدث بہ کلما رؤیت فیتأذی الفاعل بہ ولیس بواجب، واذا ذبحت وہی مما لاتوکل ضمن قیمتہا ان کان مالکہا غیرہ لأنہا ذبحت لأجلہ وان کانت مما توکل أکلت وضمن عند أبی حنیفۃ وعند أبی یوسف لاتوکل، والمراد بالمروی ماروی أصحاب السنن الأربعۃ عن عکرمۃ عن أبن عباسؓ عنہ علیہ الصلاۃ والسلام ((من أتی بہیمۃ فاقتلوہ واقتلوہا)) قلت لہ ماشان البہیمۃ قال: ماأراہ قال ذلک الا أنہ کرہ أن یؤکل لحمہا أوینتفع بہا وقد عمل بہا ما عمل، ولعل قول ابن عباس ہذا ہو المتمسک لأبی یوسفؒ فی عدم أکلہا، الاأن المعنی الذی عینہ الأصحاب من قطع التعبیر أقرب الی النفس، رواہ ابن ماجہ وضعف أبوداود ہذا الحدیث بطرق اخر..... الخ.

ولما فی البدائع: (۳۴/۷، طبع سعید)

وکذا وطء البہیمۃ ــــ ثم ان کانت البہیمۃ ملک الواطی، قیل انہا تذبح ولاتوکل ولا روایۃ فیہ عن أصحابنا رحمہم اللہ تعالی لکن روی محمدؒ عن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ أنہ لم یحد واطیء البہیمۃ وأمر بالبہیمۃ حتی أحرقت بالنار.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

۲۹ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ

واللہ اعلم بالصواب: محمد بلال شاہ جنوبی وزیرستان

فتویٰ نمبر: ۲۹۵۳

کتاب الحظر و الاباحۃ

اللہ تعالیٰ کا نام سن کر ”جل جلالہ“ کہنا واجب ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اللہ تعالیٰ کا نام سن کر مجلس میں ”جل جلالہ“ یا اسی طرح کے دیگر تعظیمی کلمات کہنا فرض عین ہے؟ ایک مولانا صاحب سے اس طرح سنا ہے کیا یہ بات صحیح ہے؟

مستفتی: مولوی زاھد اللہ

جواب آپ نے صحیح سنا ہے اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک کوئی سنے تو تعظیمی کلمات کہنا واجب ہے۔ البتہ یہ ایسا واجب ہے جس کی قضاء نہیں ہے اس لئے کہ ہر وقت اور ہر موقع اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور حمد وثناء کا ہے۔

لما فی الهندیه کتاب الكراهیه ۵/۳۱۵،طبع رشیدیه کوئٹه

ویستحب ان یقول قال الله تعالی ولا یقول قال الله بلا تعظیم بلا ارداف وصف صالح للتعظیم كذا فی الوجیزلكردی رجل سمع اسما من اسماء الله تعالی یجب علیه ان یعظمه ویقول سبحان الله وما اشبه ذلك ـــ لو سمع اسم الله مرارا یجب علیه ان یعظم ویقول سبحان الله وتبارك الله عند كل سماع كذا فی خزانة الفتاوی.

ولما فی الشامی :(۱/۵۱۷،طبع:سعید کراچی)

قال الزاهدی:وفی النظم اذا تكرر اسم الله تعالی فی مجلس واحد او فی مجالس یجب لكل مجلس ثناء علی حدة ولو تركه لا یبقی دینا علیه ـــ وحاصله انه لما كان ثناء الله تعالی واجبا كل وقت لا یمكن ان یقع ما یفعله ثانیا قضاء عما تركه اولا،لان الشیئ فی محله لا یمكن ان یضایقه غیره علیه.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب، محمد اویس غفر لہ ولوالدیہ

۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۳۷۳۷

بے وضو آدمی کوٹنگ کی ہوئی قرآنی آیات کو نہیں چھو سکتا

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرآنی آیات یا عربی میں لکھی ہوئی دعا پلاسٹک کوٹنگ کی ہوئی ہو تو اسکو چھو سکتے ہیں یا پڑھ سکتے ہیں؟ جبکہ وضو کیا ہوا نہ ہو۔

مستفتی محمد حنیف ڈیفنس فیز ۲

جواب قرآن کریم کی پلاسٹک کوٹنگ کی ہوئی آیات کو بغیر وضو کے چھونا منع ہے، ہاتھ

لگائے بغیر پڑھنا جائز ہے، قرآن کریم کے علاوہ دعا وغیرہ کو بغیر وضو کے ہاتھ بھی لگا سکتے ہیں، البتہ وضو کے ساتھ ذکر ودعا کا ثواب زیادہ ہے۔

لما فی الدر مع الرد: (۱/۱۷۳-۱۷۴، طبع سعید)

(و) یحرم (به) ای بالاکبر (وبالاصغر) مس مصحف: ای ما فیه آیة کدرهم وجدار...... (الا بغلاف متجاف) غیر مشرز..... وفی الشامیة: (قوله ای ما فیه آیة الخ) ای المراد مطلق ما کتب فیه قرآن مجازا، من اطلاق اسم الکل علی الجزء او من باب الاطلاق والتقیید..... (قوله غیر مشرز) ای غیر مخیط به وهو تفسیر للمتجافی قال فی المغرب: مصحف مشرز اجزاء ه مشدود بعضها الیٰ بعض من الشیرازة ولیست بعربیة اه. فالمراد بالغلاف ما کان منفصلا کالخریطة وهی الکیس ونحوها، لان المتصل بالمصحف منه حتی یدخل فی بیعه بلا ذکر.

ولما فی التنویر مع الدر: (۱/۱۷۴، طبع سعید)

(ولا یکره النظر الیه) ای القرآن (لجنب وحائض ونفساء) لان الجنابة لا تحل العین (ك) ما لا تکره (ادعیة) ای تحریما والا فالوضوء لمطلق الذکر مندوب.

وهکذا فی الهدایة: (۱/۶۴، طبع رحمانیه)

ولما فی شرح المنیة: (ص۵۸، طبع سهیل اکیڈمی)

(ولا یجوز لهم) ای للجنب والحائض والنفساء (مس المصحف الا بغلافه) وکذا کل ما فیه آیة تامة من لوح او درهم ونحو ذلک لقوله تعالیٰ (لا یمسه الا المطهّرون)..... (وکذلک) لا یجوز مس المصحف الا بغلافه والدرهم الا بصرته (للمحدث) ایضا لما تقدم من الدلیل لانه غیر طاهر (هذا اذا کان الغلاف غیر مشرز) ای غیر محبوك مشدود بعضه الی بعض (وان کان الغلاف مشرزا) لا یجوز الاخذ به ولا مسه قال فی الهدایة هو الصحیح.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۷ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۷۹

﴿قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق جلانا جائز ہے یا نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرآن مجید کے وہ اوراق جو بوسیدہ ہو جائیں، پھٹ جائیں اور اتنے پرانے ہو جائیں جو نا قابل انتفاع ہوں تو ان کا کیا کیا جائے؟ کیا ان کو جلانا جائز ہے؟ بینوا توجروا

مستفتی: عبداللہ

﴿جواب﴾ قرآن مجید کے وہ اوراق جو بوسیدہ، پھٹے ہوئے اور نا قابل انتفاع ہوں انکو کسی پاک کپڑے میں لپیٹ کر کسی محفوظ جگہ میں میت کی طرح دفن کر دینا چاہیے اور اگر دفن کرنا

ممکن نہ ہو تو پھر اسکے ساتھ کوئی وزنی چیز باندھ کر اس کو بہتے ہوئے گہرے پانی یا کنویں کی تہہ میں احترام کے ساتھ پہنچا دینا چاہیے اور بہتر یہ ہے کہ اگر قرآن ہاتھ سے لکھا ہوا ہو تو پہلے اس کو پانی میں دھو ڈالے اور پھر کاغذات وغیرہ دفنا دے اور وہ پانی پی لیا جائے کیونکہ اس میں ہر مرض کی دوا اور دلی بیماریوں کی شفا ہے۔

ہمارے معاشرے میں جلانا وقار اور احترام کے منافی سمجھا جاتا اس لیے اس کی اجازت نہیں ہے۔

لما فی الدر المختار:(۲۲۲/۶،فروع،طبع سعید)

الکتب التی لا ینتفع بها یمحی عنها اسم الله وملائکته ورسله ویحرق الباقی ولا باس بان تلقی فی ماء جار کما هی أو تدفن وهو احسن کما فی الانبیاء.

ولما فی الشامی:(۲۲۲/۶،طبع سعید)

وفی الذخیرة: المصحف اذا صار خلقا وتعذر القراءة منه لا یحرق بالنار الیه اشار محمد وبه نأخذ، ولا یکره دفنه، وینبغی أن یلف بخرقة طاهرة ویلحد له، لانه لو شق ودفن یحتاج الیٰ اهالة التراب علیه.

ولما فی المرقاة:(۱۰۸/۵،باب جمع القرآن،طبع رشیدیه)

وحصول ظاهر الاهانة یتعین الغسل بل ینبغی ان یشرب مائه فانه دواء من کل داء وشفاء لما فی الصدور.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد شعیب پشاوری

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۰۸

﴿حالت جنابت میں انا للہ الخ پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب! میں ناپاکی کی حالت میں تھا کہ ایک آدمی کی وفات کی خبر سنی تو میں نے "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا، ناپاکی کی حالت میں مذکورہ عمل کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ وفات کی خبر سننے پر جنبی اگر "انا للہ وانا الیہ راجعون" بطور دعاء پڑھے تو شرعاً اسکی اجازت ہے، البتہ تلاوت کی نیت سے اسکے لئے ایک ساتھ پوری آیت پڑھنا جائز نہیں ہے۔

لما فی حلبی کبیر:(ص۵۷،طبع سہیل اکیڈمی)

(ونحوها علی نیة الدعاء) وکذا لوسمع خبرا سار افقال: الحمد لله او خبر سوء فقال: انا لله وانا الیه راجعون. وکذا اقرأه: بسم الله الرحمن الرحیم علی وجه الثناء لا علی قصد القرآن.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۱۷ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۴۱

﴿انگلیوں کو چٹخانا نماز میں مکروہ ہے اور عام حالت میں بھی ناپسندیدہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ انگلیوں کو چٹخانا صرف مسجد میں منع ہے یا عام حالت میں بھی منع ہے شریعت کی رو سے اسکا کیا حکم ہے۔

﴿جواب﴾ نماز میں انگلیاں چٹخانا بالاتفاق مکروہ ہے۔اور بیرون نماز میں بھی انگلیاں چٹخانا کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے۔بعض علماء کرام نے نماز کے علاوہ عام حالت میں بھی اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔

ولما فی الشامی (ج ۱/۶۴۲ مطلب اذاتر ددالحکم بین سنۃ وبدعۃ سعید)

وفرقعۃ الاصابع وتشبیکھا ولو منتظرا الصلاۃ او ماشیاً الیھا للنھی ـفلو لدون حاجۃ بل علی سبیل العبث کرہ تنزیھاً.

ولما فی الھندیہ: ۱/۱۰۶ الفصل الثانی فیما یکرہ فی الصلاۃ ومالا یکرہ

ویکرہ أن یشبک أصابعہ وأن یفرقع کذا فی فتاویٰ قاضیخان ـــ والفرقعۃ خارج الصلاۃ کرھھا کثیر من الناس.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ فاروقی

۸ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۹۲

﴿دکان میں نقش لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنی دکان میں ایک نقش برکت کی غرض سے لگایا ہے جس میں الم، حم وغیرہ کلمات لکھے ہوئے ہیں۔کیا شرعاً ایسا کرنا درست ہے؟

مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ ایسے نقوش جن میں قرآنی آیات یا مسنون دعاؤں کے کلمات ہوں فی نفسہ ان کا لگانا درست ہے۔بشرطیکہ ادب واحترام پوری طرح ملحوظ ہو۔البتہ برکت کے حصول کے لیے شرعی طریقے کے مطابق تجارت کرنا ضروری ہے۔اور یہ بھی یاد رہے کہ ایسی چیزوں کو لکھ کر لگانے کی اگر برکت ہے تو اس سے زیادہ برکت پڑھنے اور ورد کرنے میں ہے۔

لما فی الشامی: (۶/۳۶۳، طبع: سعید، کراچی)

ولا بأس بالمعاذات اذا کتب فیھا القرآن او اسماء اللہ تعالی ویقال رقاھا ـــ ولا یدری ماھو ولعلہ یدخل سحراو کفر او غیر ذلک ـــ واما ما کان من القرآن او من شئ من الدعوات فلا بأس بہ.

وكما في لوجز المسالك:(۱۲/۱۳۵ ۱۴۵ مطبع العلميه بيروت)

وقد اجمع العلماء على جواز الرقى عند اجتماع ثلاثه شروط:أن يكون بكلام الله تعالى. او اسمائه او صفاته وبلسان العربى،أو بما يعرف معناه من غيره وان يعتقد ان الرقية لاتؤثر بذاتها بل بذات الله تعالى.

وكما في حاشية البخارى لاحمد السهارنفورى:(۱/۳۰۴،طبع:قديمى،كراچى)

ـ فيه جواز الرقية وبه قالت الائمه الاربعة.....قال محمد في الموطا لا باس بالرقى بما كان في القرآن وبما كان من ذكر الله.

وكما في جامع الترمذى:(۲/۱۹۱ مطبع فاروقى ملتان)

من عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده ان رسول الله ﷺقال اذا فزع احدكم في النوم فليقل اعوذ بكلمات الله التامة من غضبه وعقابه وشر عباده ومن همزات الشياطين وان يحضرون فانها لن تضره فكان عبد الله عمرو يلقنها من بلغ من ولده ومن لم يبلغ منهم كتبها في صك ثم علقها في عنقه.

وكما في الشامى:(۱/۱۶۸ مطبع سعيد،كراچى)

(قوله رقية الخ)الظاهر أن المراد بها ما يسمونه الآن بالهيكل والحمائلي المشتمل على الآيات القرآنية.......ويستفاد منه أن ما كتب من الآيات بنية الدعاء والثناء لا يخرج عن كونه قرآنا بخلاف قرائته بهذه النية فالنية في تغيير المنطوق لا المكتوب اه من شرح سيد عبد الغنى.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:تنویر الرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۲۵صفر الخیر ۱۴۳۳ھ | فتویٰ نمبر:۳۵۶۳

﴿اپریل فول کا حکم﴾

﴿سوال﴾ علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ موجودہ مہینہ یعنی اپریل کے آتے ہی لوگ اپریل فول مناتے ہیں،اپریل فول کا مطلب یہ ہے کہ اپریل کا مہینہ آتے ہی لوگ ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے ہیں،جھوٹ بولکر ایک دوسرے کو غم یا خوشی کی خبر دی جاتی ہے جس سے بعض اوقات دوسرے کو تکلیف اور پریشانی بھی ہوتی ہے،پوچھنا یہ ہے کہ شریعت کی روشنی میں ایسا مذاق،دھوکہ دہی مباح ہے یا گناہ؟ مستفتی:محمد نعیم بہاؤلنگر

﴿جواب﴾ شریعت کی نظر میں کسی مسلمان کو ایذاء پہنچانا قطعاً حرام ہے،اپریل فول کی حقیقت صرف دھوکہ دہی،مذاق اڑانا اور جھوٹ بولکر دوسرے کو پریشان کرنا ہے جو کہ حرام ہے،

اس لئے اس قسم کے مذاق اور جھوٹ سے بچنا از حد ضروری ہے۔
نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ آدمی اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک مذاق اور جھگڑے میں بھی جھوٹ بولنا ترک نہ کرے، نیز اپریل فول میں غیروں کی مشابہت کی وجہ سے بھی گناہ ہے۔

لما فی صحیح البخاری (۱/۱ طبع قدیمی) قال النبی ﷺ "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده

الجواب صحیح۔ عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ

۱۱ جمادی الاولی ۱۴۳۰ھ　　　　فتوی نمبر: ۲۲۴۷

﴿موبائل سیٹ میں محفوظ قرآن پاک کو بغیر وضو کے چھونا﴾

﴿سوال﴾ میرے پاس اسکرین ٹچ موبائل ہے، اسمیں ٹیکسٹ قرآن پاک محفوظ ہے، تلاوت کیوقت انگلی یا اسٹک سے آیات اور سورتیں منتخب کی جاتی ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ بغیر وضو کے اسکرین پر انگلی یا اسٹک لگانا جبکہ وہاں قرآن پاک کی عبارت لکھی ہوتی ہے جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ موبائل سیٹ چونکہ مصحف نہیں ہے اور غیر مصحف میں براہ راست منقوش کلمات کو ہاتھ لگانا منع ہے، باقی حصہ کو ہاتھ لگانا جائز ہے، موبائل سیٹ میں براہ راست کلمات قرآن مس نہیں ہوتے بلکہ درمیان میں شیشہ حائل ہوتا ہے، لہٰذا بغیر وضو کے انگلی لگانا جائز ہے، البتہ زیادہ ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ اسٹک ہی استعمال کی جائے۔

لما فی البحر الرائق: (۱/ ۲۰۱-۲۰۲، طبع سعید)

"یجوز مس المصحف کله المکتوب وغیره بخلاف غیره فانه لایمنع الامس المکتوب کذا ذکره فی السراج الوهاج۔۔۔ یجوز للمحدث الذی یقرأ القران من المصحف تقلیب الاوراق بقلم او عود او سکین."

ولما فی الشامی: (۱/ ۱۷۳، طبع سعید)

لکن لایحرم فی غیر المصحف الا بالمکتوب ای موضع الکتابة کذا فی باب الحیض من البحر.

الجواب صحیح۔ عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرہ اللہ

۳ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتوی نمبر: ۹۴۲

﴿بے وضو آدمی کے لئے آیت قرآنیہ یا حدیث لکھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل مسئلہ کے متعلق کہ پلاسٹک کا لفافہ غلاف

کے حکم میں ہے یا نہیں؟ نیز بے وضوء شخص قرآن کریم کی آیت یا حدیث مبارکہ لکھ سکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ (۱) پلاسٹک کا لفافہ جو تین طرف سے بند اور ایک طرف سے کھلا ہوا ہو وہ تو غلاف کے حکم میں ہے لیکن جو چاروں طرف سے بند اور جلد کے ساتھ چپکا ہوا ہو وہ غلاف کے حکم میں نہیں۔

(۲) بے وضوء آدمی حدیث مبارکہ لکھ سکتا ہے، البتہ قرآن کریم کی آیت لکھنے کی اگرچہ گنجائش ہے بشرطیکہ تحریر پر ہاتھ نہ آئے، تاہم خلاف ادب ہونے کی وجہ سے احتیاط بہتر ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱/۱۷۵،طبع سعید)

(و)لاتکره(کتابة قرآن والصحیفة أواللوح علی الأرض عندالثانی)خلافاًلمحمد وینبغی ان یقال ان وضع علی الصحیفة مایحول بینها وبین یده یؤخذبقول الثانی والافبقول الثالث قاله الحلبی.

وفی الشامیة:(قوله خلافاًلمحمد)حیث قال أحب الی ان لایکتب لأنه فی حکم الماس للقرآن حلبیة عن المحیط قال فی الفتح:والأول أقیس،لأنه فی هذه الحالة ماس بالقلم وهوواسطة منفصلة فکان کثوب منفصل الأان یمسه بیده(قوله وینبغی الخ) یؤخذ هذا مماذکرناه عن الفتح،ووفق ط بین القولین بمایرفع الخلاف من أصله بحمل قول الثانی علی الکراهة التحریمیة،وقول الثالث علی التنزیهیة،بدلیل قوله أحب الی الخ (قوله علی الصحیفة)قیدبهالأن نحو اللوح لایعطیٰ حکم الصحیفة،لأنه لایحرم الا مس المکتوب منه ط.

ولمافی شرح المنیة علیٰ هامش الحلبی:(ص۵۱،طبع نعمانیه)

وکذلک لایجوزمس المصحف الابغلافه والدرهم الابصرته للمحدث ایضاًلماتقدم من الدلیل هذااذاکان الغلاف غیرمشرزوان کان الغلاف مشرزاًلایجوزالأخذبه ولامسه.

ولمافی حلبی:(ص۵۸،طبع سهیل اکیڈمی)

وذکرفی الجامع الصغیرالمنسوب الیٰ قاضی خان لابأس للجنب ان یکتب القرآن والصحیفة اواللوح علی الأرض والوسادة عندأبی یوسف)خلافاًلمحمدٌلأنه لیس فیه مس القرآن والصحیفة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد کاشف عزیز

۸ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ | فتویٰ نمبر:۲۱۴۱

﴿بغیر وضو کے کتابت قرآن، کتابت حدیث کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا کسی کے لئے بغیر وضوء کے قرآن پاک کی آیت یا حدیث پاک کو کسی چیز یعنی

کاغذ وغیرہ پر لکھ لے تو جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کس طریقے سے؟ اگر ناجائز ہے تو دلیل کیا ہے؟

﴿جواب﴾ جس کاغذ وغیرہ پر قرآنی آیات لکھی جارہی ہوں اگر کاتب کا ہاتھ اسے نہ چھو رہا ہو تو ایسی کتابت بلا وضوء جائز ہے اور اگر کاتب کا ہاتھ اسے لگ رہا ہو تو ناجائز ہے، البتہ کتب فقہ وحدیث ودیگر کتب اسلامیہ کا یہ حکم نہیں ہے بلکہ انہیں بلا وضوء کے چھونا بھی جائز ہے، تاہم بہتر ان میں بھی یہ ہے کہ بحالتِ وضوء انہیں ہاتھ لگایا جائے، دیگر کتب شرعیہ میں صرف ان جگہوں کو چھونا ناجائز ہوگا جن میں آیاتِ قرآنی لکھی ہوئی ہوں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱/۱۷۵-۱۷۶ طبع سعید)

(و) لاتکرہ (کتابۃ قران والصحیفۃ أو اللوح علی الارض عند الثانی) خلافا لمحمد وینبغی ان یقال: ان وضع علی الصحیفۃ مایحول بینہا وبین یدہ یؤخذ بقول الثانی والا فبقول الثالث قالہ الحلبی۔ (والتفسیر کمصحف لا الکتب الشرعیۃ) فانہ رخص مسہا بالید لا التفسیر کمافی الدرر عن مجمع الفتاوی۔

وفی الشامیۃ: وفی السراج عن الایضاح ان کتب التفسیر لایجوز مس موضع القران منہا ولہ ان یمس غیرہ وکذا کتب الفقہ الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی

۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۹

﴿جواب کے آخر میں واللہ اعلم بالصواب لکھنا اکابر کا طریقہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مفتی حضرات جب کسی مسئلے کا جواب لکھ دیتے ہیں تو آخر میں ”واللہ اعلم بالصواب“ یا ”واللہ الموفق“ کے الفاظ لکھتے ہیں تو اس کے لکھنے کا منشاء کیا ہوتا ہے؟ کیا مفتی کو اس مسئلے میں شک ہوتا ہے اس لیے لکھتا ہے؟

﴿جواب﴾ جواب کے آخر میں مذکورہ الفاظ لکھنا فتویٰ لکھنے کے آداب میں سے ہے اور ہمارے اکابر کا طریقہ مسلوکہ ہے اور فقہائے کرام نے بھی اس بات کی تصریح کی ہے کہ جب مفتی کسی سوال کا جواب لکھ چکے تو اس کو چاہیے کہ اس کے آخر میں ”واللہ اعلم“ لکھے اور عقائد سے متعلق مسئلہ ہو تو ”واللہ الموفق“ لکھے، اور اس سے لکھے ہوئے مسئلے میں کوئی شک وشبہ پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ لازم آتا ہے کہ مفتی کو اس مسئلہ میں شک ہے بلکہ وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر محیط ہے اور میرا علم اللہ کے علم کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں یہاں صرف یہی

مقصود ہوتا ہے شک وشبہ کا اظہار مقصود نہیں ہوتا۔

لما في حاشية الطحطاوي على الدر:(۲۹/۱،طبع رشيديه)

ينبغي أن يكتب عقب جوابه والله اعلم وقيل يكتب في العقائد والله الموفق ونحوه.

ولما في الهنديه:(۳۰۹/۳،طبع رشيديه)

واذا أجاب المفتي ينبغي أن يكتب عقيب جوابه والله اعلم أو نحو ذلك.

ولما في البحرا لرائق:(۲۶۸/۶،فصل في المستفتي،طبع رشيديه)

وليكتب الحمد لله وليختم بقوله والله اعلم.

ولما في اصول الافتاء وآدابه:(ص:۲۲۳،مكتبه معارف القرآن)

آداب كتاب الفتوى ـ ينبغي أن يكتب عقب جوابه "والله اعلم" أو نحوه،وقيل في العقائد يكتب "والله الموفق" ونحوه.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۹ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷۳۳

﴿اوقات مکروہہ میں تلاوت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت تلاوت قرآن پاک کرنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ طلوع وغروب کے وقت تلاوت قرآن شریف اگرچہ جائز ہے لیکن اوقات مکروہ میں بہ نسبت تلاوت قرآن کے دعاء اور درود وتسبیح افضل ہے۔

لما في الدر مع الرد:(۳۵/۲ـ۳۶،طبع امداديه)

وفيه عن البغية:الصلاة فيها على النبي ﷺ أفضل من قراءة القرآن وكأنه لأنها من اركان الصلاة،فالأولى ترك ما كان ركنا لها وفي الشامية:قوله:(الصلاة فيها)أي في الاوقات الثلاثة،وكالصلاة الدعاء والتسبيح كما هو في البحر عن البغية.قوله:(وكأنه الخ)من كلام البحر.قوله:(فالأولى)أي فالأفضل ليوافق كلام البغية،فإن مفاده أنه لا كراهة أصلا،لأن ترك الفاضل لا كراهة فيه.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۴

﴿حرام کمائی کو ذاتی استعمال میں لانا حرام ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ، میں ایک عیالدار آدمی ہوں اور

دورہ حدیث میں پڑھتا ہوں، والد صاحب کے غریب ہونے کی وجہ سے گھر کے سارے اخراجات بڑا بھائی برداشت کرتا ہے، چونکہ بھائی کی اکثر کمائی حرام ہے اور اس سے وہ گھر کا خرچہ چلاتا ہے، لہٰذا میرے لئے شرعاً کیا راستہ ہے؟ سائل: میر اسلم جباروی

﴿جواب﴾ آپ کے بھائی نے دوسروں کا مال ناجائز طریقے سے حاصل کر کے حرام مال اگر جمع کیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اصل مالک تک وہ مال پہنچا دے، اصل مالک معلوم نہیں ہے یا ان تک رسائی ممکن نہیں ہے اور آئندہ کیلئے بھی ان تک رسائی کی کوئی صورت متوقع نہیں ہے تو پورا مال ان کی طرف سے فقراء و مساکین کو بطور صدقہ دیدے اور ساتھ ساتھ یہ عزم کرے کہ جب بھی اصل مالک کو واپس کرنے کی کوئی صورت بنے گی تو اپنی طرف سے اس کا حق واپس کر دونگا پھر واقعی ایسی صورت اگر بن گئی تو اصل مالک کو حقیقت بتادے اور صدقہ کا اجر وثواب یا مال دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا اسے حق حاصل ہے، مال واپس کرنے کا مطالبہ اگر کرے تو مال دینا آپ پر واجب ہوگا اور صدقہ کا اجر وثواب آپ کیلئے ہوگا۔

چونکہ آپ بھی بظاہر مستحق معلوم ہوتے ہیں اس لئے آپ یا آپ کی اولاد پر خرچ کرنا بھی صدقہ میں شمار ہوگا، آپ کی بھائی کو چاہئے کہ حرام مال سے خلاصی حاصل کرنے کی غرض سے بطور صدقہ آپ اور آپکی اولاد پر وہ خرچ کرتا رہے لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے کہ اصل مالک معلوم نہ ہو یا اس تک رسائی ممکن نہ ہو اور ذاتی استعمال میں لانا تو کسی بھی صورت میں آپ کے بھائی کیلئے جائز نہیں ہے۔

لما فی الشامی: (۳۰۱/۷ طبع امدادیہ)

والحاصل انه ان علم ارباب الاموال وجب رده عليهم والا فان علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه.

ولما فی الشامی: (۳۰۱/۷-۳۰۲، طبع امدادیہ)

سئل الفقيه ابوجعفر عمن اكتسب ماله من امراء السلطان ومن الغرامات المحرمات وغير ذلك هل يحل لمن عرف ذلك ان ياكل من طعامه؟ قال: احب الىّ فى دينه ان لا ياكل ويسعه حكما ان لم يكن ذلك الطعام غصبا اورشوة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد

۱۴۳۰/۱/۱۳ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۸۴۰

﴿چمڑے کا غلاف قرآن مجید سے الگ ہو تو ہاتھ لگانا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ میرے پاس ایک چھوٹا قرآن شریف ہے میں چاہتا ہوں کہ اسکو اپنی اصل جلد کے علاوہ دوسرا چمڑے کا کور (غلاف) بنواؤں پھر اسکو ہمیشہ جیب میں ساتھ رکھوں، کیا میرے لئے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد حنیف کراچی

﴿جواب﴾ قرآن مجید پر جلد کے علاوہ چمڑے وغیرہ کا غلاف چڑھانا کوئی منع نہیں ہے اور ہر وقت پاس رکھنا بھی اچھا عمل ہے بشرطیکہ اس کی حرمت کا پورا اہتمام اور لحاظ ہو اور بغیر وضوء اس کو ہاتھ لگانے کی نوبت پیش نہ آتی ہو اور احترام کے منافی جگہوں میں بھی نہ لیجایا جائے۔

واضح رہے کہ چمڑے کے کور میں عموماً قرآن مجید جلد سمیت اس طرح محفوظ کیا جاتا ہے کہ غلاف بھی جلد کا حصہ ہو جاتا ہے، اس لئے کہ جلد کے دونوں گتے کور میں باقاعدہ داخل کر دیئے جاتے ہیں، ایسی صورت میں بغیر وضو کے چمڑے کو بھی ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے، البتہ غلاف کی طرح چمڑہ الگ ہو تو چمڑے کو ہاتھ لگانا جائز ہے۔

لمافی مراقی الفلاح:(ص ۶۰ طبع قدیمی)(ومسها الابغلاف)للنهی عنه بالنص.

ولمافی حلبی کبیر:(ص۵۸-۵۹-۶۰ طبع سهیل اکیڈمی)

(والخريطة احق من الغلاف)فی انه لایکره اخذالمصحف بهاالوجودحاللين.....

(ولايجوزلهم)ای للجنب والحائض والنفساء (مس المصحف الابغلافه)

.....(هذا)يعنی جوازالاخذ بالغلاف(اذاكان الغلاف غيرمشرز)ای غيرمحبوك مشدودبعضه الی بعض مشتق من الشيرازةوهی اعجمية(وان كان الغلاف مشرزا)لايجوزالاخذبه ولامسه قال فی الهداية هوالصحيح يعنی ان الغلاف مايكون متجافيا الامايكون متصلابه لانه صارتبعاللمصحف.

(ويكره دخول المخرج)ای الخلاء(وفی اصبعه خاتم فيه شئ من القرآن)اومن اسمائه تعالی(لمافيه من ترك التعظيم)وقيل لايكره ان جعل فصه الی باطن الكف ولوكان مافيه شئ من القرآن اومن اسمائه تعالی فی جيبه لابأس به وكذالوكان ملفوفافی شئ والتحرزاولی.

ولمافی حاشية الطحطاوی:(ص ۳۰ طبع قدیمی)

(ويكره الدخول للخلاء ومعه شئ مكتوب الخ)ـــثم محل الكراهة ان لم يكن مستوراً فان كان فی جيبه فانه حينئذلابأس به وفی القهستانی عن المنية الافضل أن لايدخل الخلاء وفی كمه مصحف الااذااضطرونرجوأن لايأثم بلااضطرار.

وفی الفقہ الاسلامی وأدلتہ:(۱/۲۰۲،طبع دار الفکر بیروت)

ألا یحمل مکتوباً ذکر اسم اللہ علیہ،أو کل اسم معظم کالملائکۃ والعزیز والکریم ومحمد وأحمد لما روی أنس أن النبی ﷺ کان اذا دخل الخلاء وضع خاتمہ(رواہ ابن ماجہ وأبوداود والترمذی)وکان فیہ محمد رسول اللہ فان احتفظ بہ واحترز علیہ من السقوط فلا بأس.

وفی البحر الرائق:(۱/۲۰۲،طبع سعید)

ولو کانت رقیۃ فی غلاف متجاف لم یکرہ دخول الخلاء بہ والاحتراز عن مثلہ أفضل کذا فی فتح القدیر—وفی التوشیح وتکرہ المسافرۃ بالقرآن الی دار الحرب صوناً عن وقوعہ فی أیدی الکفرۃ واستخفافہ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عبدالرحمٰن کوہستوی

۲۶ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۲۱۰۱

﴿جھوٹ بول کر مزدوری لینا حرام ہے﴾

﴿سوال﴾ میں الیکٹریشن ہوں بعض لوگ مجھ سے کام کرواتے ہیں لیکن مزدوری نہیں دیتے بلکہ صرف اس چیز (پرزہ سامان) کی قیمت دیتے ہیں جو میں نے لگایا ہے تو میں اپنی مزدوری وصول کرنے کیلئے یہ تدبیر کرتا ہوں کہ جو پرزہ میں خرید کر مشین وغیرہ میں لگاتا ہوں اسکی اصل قیمت سے زیادہ بتاتا ہوں اور اس میں اپنی مزدوری شامل کرتا ہوں،مثلاً اگر وہ پرزہ دوسو کا ہے اور میری مزدوری بھی دوسو روپے ہے تو میں اس پرزے کی قیمت تین سو بتاتا ہوں اور سو روپے مزدوری بتاتا ہوں کیا میرے لئے ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی:ذاکر اللہ سواتی

﴿جواب﴾ وضاحت کیساتھ یوں کہنا کہ اس پرزہ کی قیمت خرید اتنی ہے اور حقیقت میں اتنی نہ ہو،جھوٹ ہے،سخت گناہ ہے بلکہ کمائی بھی حرام ہے،آپ صرف اتنا کہہ دیا کریں کہ اتنے پیسے آپکے ذمہ ہیں،مزدوری اور قیمت پرزہ ملا کر بتا دیا کریں اور تفصیل نہ بتائیں تو جائز ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۶/۱۱۰،طبع سعید)

(قولہ ویقول قام علی بکذا)ولا یقول اشتریتہ لانہ کذب وھو حرام ولذا قدمنا أنہ اذا قوم الموروث ونحوہ یقول ذلک وکذا اذا رقم علی الثوب شیأ وباعہ برقمہ فانہ یقول رقمہ کذا وسواء کان مارقمہ موافقاً لما اشتراہ بہ أو لا بحیث کان صادقاً فی الرقم کما فی الفتح.

ولمافی فتح القدیر:(۶/۴۶۰،طبع رشیدیہ)

(و)اذا ضم ماذکر(یقول قام علی بکذا ولا یقول اشتریتہ بکذا تحرزا عن الکذب.

ولمافی الشامی:(۷/۳۵۲،طبع امدادیہ)

ولا یقول قام علیّ بکذا ولا قیمتہ کذا ولا اشتریتہ بکذا تحرزاً عن الکذب اھ.وبہ یظھر أن ما

یلیه کلام الشارح من أنه یقول: قام علیّ بکذا غیر مراد، بل یظهر لی أنه لا یقول ذلک فی مسألة الهبة أیضاً، لأنه یوهم أنه ملکه بهذه القیمة مع أنه ملکه بلا عوض ففیه شبهة الکذب، ویؤیده قول الفتح.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن کوہاٹی

۲۸ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۳۰

﴿انگریزی سیکھنا جائز ہے، البتہ انگریزوں کی تہذیب سے بچنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ انگلش بقدرِ ضرورت یا ضرورت سے زیادہ صرف بطورِ زبان سیکھنا جائز ہے یا نہیں؟ جیسے اردو وغیرہ۔

﴿جواب﴾ انگریزی تعلیم سے اگر دین کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو جائز نہیں ہے، یہ اندیشہ نہ ہو تو دنیوی اور معاشی جائز مقاصد کے لئے سیکھنا جائز ہے اور اگر دینی مقاصد کے لئے ہو تو کارِ ثواب ہے کسی بھی زبان کا سیکھنا کوئی منع نہیں ہے، البتہ انگریزوں کی تہذیب کو اپنانا منع ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ کسی قوم کی تہذیب سے متاثر ہوئے بغیر انکی زبان حاصل کرنا مشکل ہے، لہٰذا اس کا خیال رہے۔

لما فی المظهری: (۱/۱۰۸ مطبع رشیدیه)

ویتعلمون ما یضرهم ای السحر فانه موجب لکفرهم ولا ینفعهم شیئا وفیه اشارة الی ان تعلّم العلوم الغیر النافعة کالطبیعی والریاضی ونحو ذلک مکروه لاضاعة الوقت ومن ثم قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اللهم انی اعوذبک من علم لا ینفع رواه الحاکم فی المستدرک فی حدیث ابن مسعود فائدة العلم الذی لا ینتفع نوعان نوع منه لا ینتفع احد من الناس حیث لا یتصور الانتفاع منه کالطبیعی ونحوه ونوع منه لا ینتفع العالم اذ لم یعمل بعلمه والله اعلم واما العلوم الضارة فلا شک فی حرمتها کالسحر والشعبدة والالهیات الفلاسفة الا اذا کانت بنیة صالحة.

ولما فی مشکوة المصابیح: (ص ۳۹۹ باب السلام مطبع سعید)

عن زید بن ثابت (رضی الله عنه) قال امرنی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان اتعلّم السریانیة وفی روایة انه امرنی ان اتعلم کتاب یهود وقال انی ما امنُ یهود علی کتاب قال فما مربی نصف شهر حتی تعلمت فکان اذا کتب الی یهود کتبت واذا کتبوا الیه قرأت له کتابهم رواه الترمذی.

ولما فی مرقاة المصابیح: (۸/۳۷۷-۳۷۸ مطبع رشیدیه)

قیل فیه دلیل علی جواز تعلم ما هو حرام فی شرعنا للتوقی والحذر عن الوقوع فی

الشر. كذا ذكره الطيبي في ذيل كلام المظهر وهو غير ظاهر اذ لا يعرف في الشرع تحريم تعلم لغة من اللغات سريانية أو عبرانية أو هندية أو تركية أو فارسية وقد قال تعالى﴿ومن آياته خلق السموات والأرض واختلاف ألسنتكم﴾[الروم ۲۲] أي لغاتكم بل هو من جملة المباحات نعم يعد من اللغو ومما لا يعني وهو مذموم عند أرباب الكمال الا اذا ترتب عليه فائدة فحينئذ يستحب كما يستفاد من الحديث.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن کوہاٹی

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۱۳۹

﴿چوری کا مال خفیہ طریقہ سے مالک تک پہنچا دینے سے چور بری ہو جاتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی شخص نے دوسرے کا مال چوری کیا پھر بعد میں اسے ندامت ہوئی اور مالک کو واپس کرنا چاہتا ہے لیکن بتا کر واپس کرنے سے شرمندگی ہوتی ہے تو کسی اور طریقہ سے مالک تک پہنچا دے کہ مالک کو پتہ نہ چل سکے تو کیا یہ آدمی بری الذمہ ہو جائے گا یا نہیں؟　　　　مستفتی: محمد عثمان

﴿جواب﴾ چوری کا مال کسی بھی طریقے سے مالک تک پہنچا دیا جائے تو اس سے چوری کرنے والا شخص بری الذمہ ہو جاتا ہے، مالک کو بتا کر واپس کرنا کوئی ضروری نہیں ہے بلکہ بہتر یہی ہے کہ اس کو خبر نہ ہو، البتہ اللہ تعالیٰ سے چوری کرنے پر معافی مانگے۔

لما في الدر المختار مع الدر: (۱۸۲/۶-۱۸۳ طبع سعید)

(ويبرأ برده ولو بغير علم المالك) في البزازية غصب دراهم انسان من كيسه ثم ردها فيه بلا علمه برئ وكذا لو سلمه اليه بجهة أخرى كهبة أو ايداع أو شراء وكذا لو اطعمه فأكله.

ولما في الدر المختار مع الدر: (۱۱۰/۴ طبع سعید)

(وترد العين لو قائمة) وان باعها أو وهبها لبقائها على ملك مالكه.

ولما في الهداية: (۵۲۳/۲ طبع رحمانيه)

وانا قضى على رجل بالقطع في سرقة فوهبت له لم يقطع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد کشمیری

۷ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۱۴۳

﴿حصول ملازمت کے لئے طبی معاینہ کرانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں نے ایک سعودی کمپنی

میں ملازمت کے لئے درخواست دی کمپنی والوں نے جہاں دیگر کوائف دیکھے، وہاں میرا میڈیکل ٹیسٹ بھی لیا ہے جس میں انہوں نے میرے ستر کے حصے کا بھی معائنہ کیا۔

پوچھنا یہ ہے کہ کیا میڈیکل ٹیسٹ لینے کے لئے ڈاکٹر کے سامنے کشف ستر جائز ہے جبکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر میں منع کروں یا انکار کروں تو وہ باز نہیں آئینگے اور مجھے ملازمت سے محروم ہونا پڑے گا، اس صورت میں کشف ستر کا گناہ مجھے ہوگا یا صرف ان کو ہی ہوگا، یہ معاملہ آجکل ہر بڑی کمپنی میں ملازمت کے متمنی کو پیش آتا ہے اور فوج میں بھی غالباً یہی قانون ہے، کیا ملازمت کا حصول ایسا عذر ہے جس کیلئے میڈیکل ٹیسٹ کے موقع پر کشف عورت جائز ہو؟ مستفتی: سعید احمد

﴿جواب﴾ شریعت نے انسان کو ستر چھپا رکھنے کا حکم دیا ہے اور ساتھ ساتھ مرد و عورت میں اسکی تحدید کا بھی ذکر کیا ہے، البتہ جہاں شدید ضرورت ہو مثلاً ڈاکٹر کے سامنے موضع ستر بقدر ضرورت کھولنے کی گنجائش ہے لیکن جہاں پر ضرورت اس حد تک نہیں کہ اس پر صحت یا زندگی کا مدار ہو وہاں یہ گنجائش نہیں ہے اگر آپ کو ایسا کاروبار ملتا ہے جس میں اس غیر شرعی کام کے ارتکاب کی نوبت پیش نہیں آتی اور اس سے آپکا گزارہ بھی چلتا ہے تو ایسے کاروبار کی کیا ضرورت ہے جس میں آدمی کو غیرت، فطرت اور شریعت کے خلاف کرنے کی نوبت پیش آئے اور جہاں پر قانونی مجبوری ہو تو آدمی وہاں معذور ہوتا ہے، وبالِ گناہ قانون بنانے والوں پر ہوگا، لہٰذا آپ کی سخت کوئی مجبوری اگر نہ ہو تو بلا ضرورت بے حیا بننے سے گریز کریں۔

لما في الفقه الاسلامي وادلته: (۵۷۹/۱، طبع رشيديه)

يجب الستر بحضرة الناس اجماعا وفي الخلوة على الصحيح..... ويجب ستر العورة في الصلوة وغيرها ولو في الخلوة الا لحاجة كاغتسال وتغويط واستنجاء..... واجمع العلماء على وجوب ستر المرأة مطلقا في الصلوة وغيرها.

ولما في التنوير مع الدر: (۷۵/۲-۷۶، طبع امداديه)

(وستر عورته) ووجوبه عام ولو في الخلوة على الصحيح الالغرض صحيح.

وفي الشامية: قوله: (ووجوبه عام) اي في الصلوة وخارجها قوله: (ولو في الخلوة) اي اذا كان خارج الصلوة يجب الستر بحضرة الناس اجماعا وفي الخلوة على الصحيح.....

قوله: (الالغرض صحيح) كتغوط واستنجاء.

واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد

فتویٰ نمبر: ۱۸۸۳

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

۷ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ

﴿سحری کے وقت لوگوں کو اٹھانے کے لئے ڈھول بجانا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے ہاں رمضان میں میراثی ڈھول بجا کر لوگوں کو سحری کے لئے اٹھاتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے اور اس غرض سے ڈھول بجانا جائز ہے؟ نیز ثواب ملیگا یا نہیں؟ جواب دیکر ممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ سحری کے لئے لوگوں کو بیدار کرنے کی خاطر ڈھول بجانا جائز ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں اور ڈھول بجانے سے یہی مقصد ہو تو بلاشبہ ثواب بھی ملیگا۔

لما فی الشامی:(۶/۳۵۰،طبع سعید)

أقول:وهذا يفيد ان آلة اللهو ليست محرمة لعينها بل لقصد اللهو منها اما من سامعها او من المشتغل بها وبه تشعر الاضافة ألاترى ان ضرب تلك الألة بعينها حل تارة وحرم أخرى باختلاف النية بسماعها والامور بمقاصدها وفيه دليل لساداتنا الصوفية الذين يقصدون امورهم اعلم بها فلا يبادر المعترض بالانكار كي لا يحرم بركتهم فانهم السادة الاخيار أمدنا الله تعالى بامداداتهم وأعاد علينا من صالح دعواتهم وبركتهم (قوله وتمامه فيما علقته على الملتقى) حيث قال بعد عزوه مامر الى الملاعب للامام البزنوي وينبغي ان يكون بوق الحمام يجوز كضرب النوبة وعن الحسن لابأس بالدف في العرس ليشتهر به وفي السراجية هذا اذالم يكن له جلاجل ولم يضرب على هيئة التطرب اه. أقول:وينبغي ان يكون طبل المسحر في رمضان لايقاظ النائمين للسحور كبوق الحمام تامل.

ولما في الاشباه والنظائر:(ص ۲۱ طبع قديمي)الامور بمقاصدها.

ولما في البحر الرائق:(۸/۱۸۹ طبع سعيد)

وفي الذخيره وغيرها لابأس بضرب الدف في العرس والوليمة والاعياد وكذالا بأس بالغناء في العرس والوليمة والاعياد حيث لافسق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی

۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۱۶۹

﴿عذر کی وجہ سے اعضاء بننے سے پہلے اسقاط حمل کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری پہلے ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی جس کے سات آٹھ مہینے بعد دوسرا حمل ٹھہر گیا جس کی وجہ سے بیٹی کی صحت پر کافی اثر پڑا، اب بیٹا تقریباً چھ سات مہینے کا ہے کہ دوبارہ ایک مہینے سے حمل ٹھہرا ہے اور قوی خدشہ ہے کہ بیٹے کی صحت پر اس کا برا اثر ہوگا، پوچھنا یہ ہے کہ کیا ایسی صورت میں مجھے حمل ساقط کرنے کی شرعاً

اجازت ہے؟ نیز کن اعذار کیوجہ سے حمل ساقط کرنے کی گنجائش ہے؟ مستفتی: ابوعکاشہ

﴿جواب﴾ واضح رہے کی شریعت نے چند اعذار کیوجہ سے اسقاط حمل کی اجازت دی ہے جیسے کہ عورت بہت کمزور ہو جس کی وجہ سے وہ حمل کی تکالیف کو برداشت نہیں کر سکتی ہو یا چھوٹا دودھ پینے والا بچہ ہو اور حمل ٹھہرنے کیوجہ سے اس کے صحت پر برا اثر پڑھنے کا قوی اندیشہ ہو تو اسقاط حمل جائز ہے بشرطیکہ حمل کے اعضاء مکمل نہ ہوئے ہوں اور بچے میں ابھی واضح طور پر جان نہ آئی ہو جس کی مدت تقریباً چار مہینے مکمل ہونے سے پہلے ہے۔

لما فی الشامی: (۱۷۶/۳، طبع سعید)

(قوله وقالوا الخ) قال فی النهر: بقی هل یباح الاسقاط بعد الحمل؟ نعم یباح مالم یتخلق منه شئی ولن یکون ذلک الا بعد مائة وعشرین یوما وهذا یقتضی انهم ارادوا بالتخلیق نفخ الروح والا فهو غلط، لان التخلیق یتحقق بالمشاهدة قبل هذه المدة کما فی الفتح، واطلاقهم یفید عدم توقف جواز اسقاطها قبل المدة المذکورة علی اذن الزوج---- ومن الاعذار ان ینقطع لبنها بعد ظهور الحمل ولیس لأبی الصبی مایستأجر به الظئر ویخاف هلاکه.

ولما فی الشامی: (۴۲۹/۶، طبع سعید)

(قوله وجاز لعذر) کالمرضعة اذا ظهر بها الحبل وانقطع لبنها ولیس لأبی الصبی ما یستأجر به الظئر ویخاف هلاک الولد قالوا یباح لها ان تعالج فی استنزال الدم ما دام الحمل مضغة او علقة ولم یخلق له عضو وقدروا تلک المدة بمائة وعشرین یوما وجاز لأنه لیس بآدمی وفیه صیانة الآدمی خانیة (قوله حیث لا یتصور) قید لقوله: وجاز لعذر والتصور کما فی القنیة ان یظهر له شعر أو اصبع أو رجل أو نحو ذلک۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی عفا اللہ عنہ

۱۶ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۳۰۰

﴿گاڑی، بس وغیرہ میں تلاوت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ اگر دوران سفر کوئی سورۃ یٰسین ہاتھ میں لیکر تلاوت کرے تو کیا اس طرح کرنے سے بے ادبی اور گناہ تو نہیں ہوگا؟

﴿جواب﴾ دوران سفر گاڑی میں تلاوت کرنا زبانی ہو خواہ قرآن مجید ہاتھ میں لیکر تلاوت کرے کوئی بے ادبی یا گناہ نہیں ہے، البتہ دل دل میں تلاوت کرے یا اتنی آواز کیساتھ کہ خود ہی سن سکے، آواز کے ساتھ ایسے ماحول میں جہاں ادب کیساتھ سننے کا اہتمام کوئی نہ کرتا ہو یا اس کا

اہتمام کرنا دشوار ہو بلاشبہ خلاف وضع بلکہ گناہ ہے، اس طرح تلاوت کرنے سے گریز کریں۔

ولما في الشامي: (۱/۵۴۶، طبع سعيد)

في شرح المنية: والاصل ان الاستماع للقرآن فرض كفاية لانه لاقامة حقه بان يكون ملتفتا اليه غير مضيع وذلك يحصل بانصات البعض كما في رد السلام حين كان لرعاية حق المسلم كفى فيه البعض عن الكل الا انه يجب على القارى احترامه بان لا يقرأه في الاسواق ومواضع الاشتغال فاذا قرأه فيها كان هو المضيع لحرمته، فيكون الاثم عليه دون اهل الاشتغال دفعا للحرج. وكذا في صحيح البخاري: (۲/۲۵۶، رحمانيه)

ولما في حلبي الكبير: (ص ۴۹۵-۴۹۶، طبع سهيل اكيڈمی)

وقرأة القرآن من المصحف افضل لانه جمع بين عبادتي القرأة والنظر في صلوة المصحف... والقرأة ماشيا او وهو يعمل عملا ان كان متنبها لا يشغل قلبه المشي والعمل جائزة و الا تكره والقرأة في الحمام ان لم يكن فيه احد مكشوف العورة وكان الحمام طاهرا تجوز جهرا او خفية وان لم يكن كذلك فان قرأ في نفسه فلا بأس به ويكره الجهر وكذا تكره القرأة في المسلخ والمغتسل ومواضع النجاسة. وكذا في البحر: (۱/۲۰۲، طبع سعيد)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی عفا اللہ عنہ

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۱۸۳

﴿قبائلی علاقوں میں مطلقہ بیٹیوں کیساتھ ظلم کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ ہمارے قبائلی علاقوں میں بیٹیوں کے ساتھ یہ ظلم ہوتا ہے کہ شادی کے بعد باپ اس کو میراث وغیرہ سے محروم کرتا ہے اور شوہر کی طرف سے اسکو طلاق ملنے کی صورت میں اگر وہ باپ کے گھر آجائے تو اسکے ساتھ غلام جیسا سلوک کیا جاتا ہے اور زبردستی اسکا نکاح دوسری جگہ کرادیا جاتا ہے خواہ وہ آدمی لنگڑا ہو یا بوڑھا اس سے مہر لیکر پہلے شوہر کو جس نے اسکو طلاق دی واپس کیا جاتا ہے کیا یہ رسم شرعاً جائز ہے؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ شریعت نے جس طرح دیگر ورثاء کے حصے مقرر کئے ہیں، اسی طرح بیٹی کیلئے بھی میت کے ترکہ میں سے متعین حصہ مقرر کیا ہے، وہ کسی کے محروم کرنے سے محروم نہیں ہوتی، اس کمزور و مظلوم صنف کا حق دنیا میں دبانا اگر آسان ہے آخرت میں تو لازماً دینا ہوگا دراصل اسلامی معاشرے میں یہ رسم ہندؤوں کے ساتھ اختلاط کے نتیجے میں آئی ہے۔

لہٰذا اس کو ختم کرنا ہر ایک کی ذمہ داری ہے اور علاقے میں رائج اس ظلم کو مٹانے کی کوشش کوئی

بھی مسلمان اگر کرے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے اجر کا مستحق ہوگا، بیٹی اگر مطلقہ ہونے کی صورت میں باپ کے گھر آئے اور باپ اس پر خرچ کرے تو حدیث میں اسکو عظیم صدقہ قرار دیا گیا ہے۔

ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ جو آدمی اپنی بیٹیوں کے بارے میں کسی رنج میں مبتلا ہو جائے پھر وہ آدمی ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے تو یہ اس آدمی کیلئے جہنم کی آگ سے حائل بن جائیں گی اور انکی رضامندی کے بغیر جبراً دوسری جگہ انکی شادی کروانے سے نکاح منعقد نہیں ہوتا، البتہ شرم وحیا کی وجہ سے بادلِ ناخواستہ اگر وہ اسکو قبول بھی کرلیں تو نکاح تو منعقد ہو جائیگا لیکن مستقبل میں اکثر ایسے رشتوں کے نتائج اچھے نہیں ہوتے، لہٰذا ایسے ناجائز عمل سے اجتناب ضروری ہے۔

لمافی قوله تعالی:(سورة النساء،آیت ۱۱)

یوصیکم الله فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین۔۔۔الأیة.

ولمافی کنز العمال:(۱۶/۱۸۶ طبع رحمانیه)

یاسراقة!الااخبرك باعظم الصدقة!ان من اعظم الصدقة اجرابنتك فانها مردودة الیك لیس لها کاسب غیرك.(۴۵۲۵۷)وفیه ایضا:(۴۵۲۵۵)من ابتلی من هذه البنات بشیء فاحسن الیهن کن له ستر امن النار.وفیه ایضا:(۴۵۲۵۶)من کانت له انثیٰ فلم یوئدها ولم یهنها ولم یؤثرولده علیها ادخله الله الجنة.

ولمافی البحر:(۳/۱۱۰ طبع سعید)

(ولاتجبر بکربالغة علی النکاح)ای لاینفذ عقدالولی علیها بغیر رضاها عندنا.

ولمافی التنویر مع الدر:(۳/۵۸ طبع سعید)

(ولاتجبر البالغة البکر علی النکاح)لانقطاع الولایة بالبلوغ.

ولمافی فتح القدیر:(۳/۱۶۱ طبع رشیدیه)

ومعنی الاجبار ان یباشر العقد فینفذ علیها شاءت اوأبت ومبنی الخلاف ان علة ثبوت ولایة الاجبار أهو الصغر أو البکارة فعندنا الصغر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبیداللہ عابد

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۹۵

﴿حرام مال کو صدقہ کرنا واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ میں ایک دینی مدرسے میں پڑھنے کے ساتھ عیالدار بھی ہوں، میرے بھائی

مجھے ایسی زمین کے کچھ حصے کا مالک بنانا چاہتے ہیں جسکے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے وہ زمین حرام مال سے خریدی ہے، کیا میرے لئے اس زمین کا لینا جائز ہے؟ سائل: میر اسلم جباروی

﴿جواب﴾ آپ کے بھائی پر لازم ہے کہ اس مال کے اصل مالکان اگر ان کو معلوم ہیں اور ان تک رسائی ممکن ہے تو یہ مال ان تک پہنچائیں ایسا ممکن نہ ہو تو اس ارادہ سے فقراء و مساکین کو صدقہ کر دیں کہ جب کبھی اصل مالکان تک رسائی ممکن ہو جائے تو ان کو بتا دے پھر وہ مال واپس لینا چاہیں یا صدقہ کا ثواب، انہیں اختیار ہوگا، آپ بھی بظاہر مستحق معلوم ہوتے ہیں، لہٰذا دیگر مستحقین کی طرح آپ کو یہ مال دیکر صدقہ کر سکتے ہے، البتہ ذاتی استعمال میں لانا آپ کے بھائی کے لئے کسی طرح جائز نہیں ہے۔

لما فی الشامی: (۶/۳۸۵-۳۸۶ طبع سعید)

وعلی ھذا قالوا لو مات الرجل وكسبه من بيع الباذق او الظلم او اخذ الرشوة يتورع الورثة، ولا يأخذون منه شيئا وهو اولى بهم...... وفي الذخيرة: سئل ابو جعفر عمن اكتسب ماله من امر السلطان والغرامات المحرمة وغير ذلك هل يحل لمن عرف ذلك ان يأكل من طعامه؟ قال: احب اليّ في دينه ان لا يأكل ويسعه حكما ان لم يكن غصبا او رشوة اھ.

ولما فی الشامی: (۵/۹۹ طبع سعید)

والحاصل انه ان علم ارباب الاموال وجب رده عليهم، والا فان علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه وان كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم اربابه ولا شيأ منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التنزه عنه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبید اللہ عابد

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۲۸

﴿کسی کو ناجائز نومولود کا علم ہو تو کیا کرے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کو ناجائز حمل تھا، جب بچہ پیدا ہوا تو اس عورت نے بدنامی سے بچنے کے لئے اس نومولود کو کسی پارک یا شاہراہ وغیرہ پر زندہ حالت میں چھوڑ دیا اور ڈاکٹر کو اس صورتحال کی خبر دی، اب پوچھنا یہ ہے کہ ایسی صورت میں ڈاکٹر کی کیا ذمہ داری ہے؟ کیا وہ اس عورت کی رازداری کرے اور اس کے غلط اقدام کے بارے میں کسی کو نہ بتائے یا اس معصوم زندہ بچے کے بارے میں حکومت کے متعلقہ

محکمہ کو باخبر کرے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: عامر رحمان پشاوری

﴿جواب﴾ اس معصوم کی جان بچانے کی خاطر حکومت یا ایسے اداروں کو اطلاع کرنا ضروری ہے جو اس قسم کی خدمات رفاہی طور پر انجام دیتے ہیں، راز فاش کرنے میں معصوم بچے کی جان کا قوی اندیشہ ہے اور پردہ پوشی کے بھی خلاف ہے، البتہ جہاں ایسے بچوں کے لئے حکومتی یا رفاہی کوئی انتظام نہ ہو اور دیکھنے والا خود بھی اس معصوم بچے کا نفقہ وغیرہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو اس زنا کار عورت کے بارے میں اس کی برادری والوں کو بتانا ضروری ہے تا کہ وہ پرورش کرنے پر اس کو مجبور کریں۔

لما فی سنن ابن ماجة(ص:۱۸۳،طبع:قدیمی)

"عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ: من ستر مسلما ستره الله فی الدنيا والآخرة".

ولما فی الخانية:(۲۹۵/۳،طبع:قدیمی)

"وينبغی للملتقط اذا كان لا يريد الانفاق من مال نفسه ان يرفع الامر الی الامام فيعطی الامام نفقته من بيت المال".

ولما فی التنوير مع الدر:(۷۹۹/۶،طبع: قدیمی)

"(ويرث ولد الزنا واللعان بجهة الام فقط) لما قدمناه فی العصبات انه لا اب لهما".

ولما فی الهداية:(۱۰۲/۳،طبع:قدیمی)

"الشهادة فی الحدود يخير فيها الشاهد بين الستر والاظهار لانه بين حسبتين اقامة الحدود والتوقی عن الهتک والستر افضل".

ولما فی الشامی:(۶۱۲/۳،طبع:سعید)

"فان كان له ام موسرة فنفقته عليها وكذا ان لم يكن له اب الا انها ترجع فی الاول".

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد شعیب عفی عنہ

۱۵ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۸۳

﴿زیر ناف بالوں کے حدود﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم نے سنا ہے کہ شرم گاہ کے بال اگر چاول کے دانے سے بڑھ جائیں تو نماز نہیں ہوتی، دریافت یہ کرنا ہے کہ پاس (یعنی کولہوں) کے بال بھی اس حکم میں داخل ہیں یا نہیں؟ نیز زیر ناف بالوں کے حدود کیا ہیں؟

﴿جواب﴾ زیر ناف بالوں کی جو حد مقرر ہے وہ ناف کے نیچے سے لے کر رانوں کی

جڑوں تک ہے، اسی طرح اعضائے مخصوصہ اوران کے اردگرد بالوں کوجن کے تلوث کا استنجاء کے وقت خطرہ ہوتا ہے صاف کرنا ضروری ہے، کولہوں کے بالوں کو یہ حکم شامل نہیں ہے، ہر ہفتہ صفائی افضل ہے اور چالیس دن تک چھوڑنے کی گنجائش ہے اس سے زیادہ تاخیر کرنا گناہ ہے نماز کے ساتھ اس حکم کا تعلق نہیں ہے، لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ شرمگاہ کے بال اگر چاول کے دانے سے بڑھ جائیں تو نماز نہیں ہوتی۔

لما فی رد المحتار (٦/٤٠٧، طبع سعید)

و یستحب (حلق عانته و تنظیف بدنه بالاغتسال فی کل اسبوع مرة) والافضل یوم الجمعة و جاز فی کل خمسة عشرة و کره ترکه وراء الاربعین (قوله و کره ترکه) ای تحریما لقول المجتبی و لا عذر فیما وراء الاربعین و یستحق الوعید.

و لما فیه ایضاً (٢/٤٨١)

و العانة: الشعر القریب من فرج الرجل و المراة و مثلها شعر الدبر بل هو اولی بالازلة لئلا یتعلق به شئی من الخارج عند الاستنجاء بالحجر.

و لما فی حاشیة الطحطاوی (٥٢٧، طبع قدیمی)

ثم العانة هی الشعر الذی فوق الذکر و حوالیه، و حوالی فرجها و یستحب لزالة شعر الدبر خوفا من ان یتعلق به شئی من النجاسة الخارجة فلا یتمکن من لزالته بالاستجما.

و لما فی الهندیة (٥/٣٢٧، طبع قدیمی)

و یحلق عانته و ینظف بدنه بالاغتسال فی کل اسبوع مرة.....و یبتدی، فی حلق العانة من تحت سرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ والله اعلم بالصواب: شاہد خان سواتی

١٨رجب المرجب ١٤٣٢ھ فتویٰ نمبر: ٣١١٩

﴿زیرناف بالوں کو صاف کرنے کیلئے ''بال صفاء پاؤڈر'' استعمال کرنا درست ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست کو بلیڈ کے استعمال سے الرجی ہوتی ہے، جسکی وجہ سے اس سے دانہ نکل آتا ہے اور پھر وہ کئی دن تک چلنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا وہ زیرناف بالوں کیلئے ''بال صفاء پاؤڈر'' یا کوئی اور چیز استعمال کرسکتا ہے؟ اور اگر شرعاً ''بال صفاء پاؤڈر'' استعمال کرنا مردوں کیلئے ناجائز ہے تو زیادہ سے زیادہ کتنے دن تک زیرناف بالوں کو چھوڑنے کی گنجائش ہے؟ تاکہ مجبوری کیوجہ

سے اس پر عمل کیا جاسکے۔ مستفتی: صدام حسین

﴿جواب﴾ آپ کے دوست کو اگر بلیڈ کے استعمال سے الرجی ہوتی ہے تو "بال صفاء پاؤڈر" یا ایسی کسی دوسری چیز سے زیر ناف بالوں کو صاف کرنا کوئی منع نہیں ہے۔ ایسے بالوں کو ہفتہ وار صاف کرنا چاہئے زیادہ تاخیر ہو جائے تو چالیس دن تک گنجائش بتائی گئی ہے اس سے زیادہ تاخیر کرنا گناہ ہے اور روزانہ صاف کرنے میں زیادہ فائدہ ہے۔

لما في الهندية:(۵۷/۵ طبع رشيديه)

ويحلق عانته وينظف بدنه بالاغتسال في كل أسبوع مرة فإن لم يفعل ففي كل خمسة عشر يوما ولا يعذر في تركه وراء الاربعين فالا سبوع هو الافضل والخمسة عشر الاوسط والاربعون الابعد ولا عذر فيما وراء الاربعين ويستحق الوعيد كذا في القنية.

وفيه ايضا:(۵۸/۵ طبع رشيديه)

وفي الابط يجوز الحلق والنتف أولى ويبتدى في حلق العانة من تحت السرة ولو عالج بالنورة في العانة يجوز كذا في الغرائب.

لما في التنوير مع الدر:(۴۰۶/۶ طبع سعيد كراچي)

ويستحب حلق عانته وتنظيف بدنه بالاغتسال في كل اسبوع مرة والافضل يوم الجمعة وجاز في كل خمسة عشرة وكره تركه وراء الاربعين.

لما في حاشية الطحطاوي:(۵۲۶،۵۲۲ طبع قديمي كتب خانه)

ويحلق عانته وينظف بدنه في كل اسبوع مرة ويوم الجمعة افضل ثم في خمسة عشر يوما والزائد على الاربعين آثم والسنة في حلق العانة ان يكون بالموسى لانه يقوى واصل السنة يتأدى بكل مزيل لحصول المقصود وهو النظافة.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

اجمادی الثانی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۷۲

﴿مقامات اقوام معذبہ کی سیر بہ نیت عبرت جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ محترم مفتی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپ سے یہ مسئلہ معلوم کرنا ہے کہ آیا آثار قدیمہ مثلاً بھنبھور "دیبل" یا موئن جو داڑو، ہڑپہ وغیرہ کے آثار قدیمہ بغرض سیر و تفریح "پکنک" دیکھے جاسکتے ہیں؟ کیونکہ کچھ عرصہ پہلے میں نے اس خواہش کا اظہار اپنے دفتری ساتھی سے کیا تو انہوں نے ایسا کرنے سے منع کر دیا جسکی وجہ بیان کرتے ہوئے انکا کہنا تھا کہ چونکہ یہ

آثار قدیمہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے باعث تباہ ہوئے ہیں لہذا ایسی جگہوں پر جانے کی ممانعت ہے براہ کرم رہنمائی فرمائیں۔ مستفتی: انور سعید قریشی

﴿جواب﴾ یہ بات تو صحیح ہے کہ جس علاقہ یا قوم پر اللہ کا عذاب آیا ہو اور عذاب سے وہ علاقہ برباد ہو گیا ہو تو بلا ضرورت وہاں نہیں جانا چاہئے ضرورت کیلئے اتفاق سے جانا ہو جائے یا عبرت حاصل کرنے کی غرض سے چلا جائے تو جلدی گزرنا چاہئے اور عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتے ہوئے نکلنا چاہئے لیکن سوال میں ذکر کردہ علاقے واقعی عذاب زدہ ہیں؟ اس بارے میں ہمارے پاس کوئی تحقیقی بات نہیں ہے۔

لما فی تکملۃ فتح الملھم شرح صحیح المسلم: (۶/۲۶۰، طبع: دار العلوم کراچی)

بـاب لاتـدخـلـوا مسـاكـن الـذيـن ظـلـمـوا أنـفسـهـم الا بـاكـين "حدثنا يحى بن أيوب ....أخبرني عبدالله بن دينار أنه سمع عبد الله بن عمر يقول "قال رسول الله ﷺ لأصـحـاب الـحـجر لا تدخلوا على هولاء القوم المعذبين الا أن تكونوا باكين فان لم تكونوا باكين فلاتدخلوا عليهم أن يصيبكم مثل ما أصابهم ،

قال شيخ الاسلام محمد تقى العثمانى حفظه الله تعالى فى شرح هذا الحديث "وفى هذاالحديث دلالة على أن منازل الأقوام المعذبة لاينبغى أن يدخلها المرأ الا لضرورة أو للاعتبار"

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: علی حیدر چارسدوی

۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۹۰

﴿چاپلوسی کرتے ہوئے اپنے کو ذلیل کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص مالدار آدمی سے کہتا ہے "میں تمھارا کتا ہوں" کیا ایسا کہنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: قاری محمد دین ابوبکر مسجد

﴿جواب﴾ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور جس طرح انسان کے لئے دوسرے کا استہزاء اور مزاح اڑانا جائز نہیں

اسی طرح اپنے بارے میں بھی دوسروں کے سامنے ایسے ذلت آمیز اور اہانت انگیز الفاظ کہنا جائز نہیں جن سے بجائے تواضع وانکساری کے ذلت نفس اور احساس کمتری پیدا ہو جائے خاص طور پر ایسے لوگوں کے سامنے جن سے کوئی دنیاوی غرض کا لالچ مطلوب ہو جیسا کہ مذکورہ سوال میں کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں اعلیٰ وادنیٰ ہونے کا مدار صرف اور صرف تقویٰ پر ہے باقی تمام

انسان خواہ امیر ہوں یا غریب، سب برابر ہیں اسی طرح یہ غیرت نفس، وقار و سنجیدگی کے بھی خلاف ہے کہ کسی کے سامنے اپنے آپ کو کسی دنیاوی غرض کے حصول کیلئے ذلیل کرے۔

لمافی صحیح المسلم :(۳۵/۱، طبع:قدیمی)

وزاد ابن معاذ فی حدیثه عن ابیه قال وقال رسول الله ﷺ للاشج اشج عبدالقیس "ان فیک لخصلتین یحبهما الله، الحلم والاناة"

ولما فی الشامی: (۳۸۳/۶، طبع:سعید)

(قوله التواضع لغیر الله حرام) ای اذلال النفس لنیل الدنیا و الا فخفض الجناح لمن دونه مامور به سید الانام علیه الصلاة والسلام ویدل علیه ما رواه البیهقی عن ابن مسعود رضی الله عنه "من خضع لغنی ووضع له نفسه اعظاماً له وطمعاً فیما قبله ذهب ثلثا مروءته وشطر دینه"

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب :بندہ علی حیدر چارسدوی

۷ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر :۳۱۵۱

﴿قبر سے نکال کر پوسٹ مارٹم کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو پوسٹ مارٹم کے لئے قبر سے نکالنا جائز ہے؟

مستفتی :محمد خادم حسین روڈوی

﴿جواب﴾ پوسٹ مارٹم خود غیر شرعی ناجائز کام ہے، دین اسلام اسکی اجازت نہیں دے رہی چہ جائیکہ اس کے لئے میت کو قبر سے نکالنے کی اجازت دیدے۔

لما فی التنویر الابصار :(۲۳۸/۲،طبع: سعید)(ان تکون الارض مغصوبة اواتخذت بشلعة)

ولما فی الشامی :(۲۳۸/۲،طبع: سعید)

(قوله کان تکون الارض مغصوبة) وکما اذا سقط فی القبر متاع او کفن بثوب مغصوب او دفن معه مال.

ولما فی الهندیه: (۴۷۰/۲،طبع: رشیدیه)

المیت بعد مادفن بمدة طویلة او قلیلة لا یسع لخراجه من غیر عذر ویجوز لخراجه بالعذر ان یظهر ان الارض مغصوبة او اخذها الشفیع بالشفعة کذا فی الواقعات الحسامیة.

ولما فی البحر الرائق :(۲۹۰/۲،طبع: سعید)

(قوله ولا یخرج من القبر الا ان تکون الارض مغصوبة) ای بعد ما اهیل التراب علیه لا یجوز اخراجه بغیر ضرورة للنهی عن نبشه وصرحوا بحرمته.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :بندہ شاہ جہان ڈیروی

۱۷ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر :۳۶۶۵

﴿شوہر جنتی نہ ہو تو بیوی کا نکاح دوسرے جنتی سے کیا جائے گا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درجہ ذیل مسائل کے بارے میں (۱) ایک عورت جو کہ حساب وکتاب کے بعد جنت میں چلی جائے اور اسکا شوہر جہنم میں چلا جائے تو اس عورت کا نکاح جنت میں کس کیساتھ کیا جائے گا؟

(۲) جس عورت نے دنیا میں کئی شادیاں کی ہوں اگر وہ ان سب شوہروں کے ساتھ جنت میں داخل ہو جائے تو وہ عورت ان میں سے کس کی بیوی ہوگی؟

(۳) وہ عورتیں جنکا دنیا میں نکاح ہی نہیں ہوا ہے یعنی وہ کنوارہ پن کی حالت میں وفات پائیں تو انکا عقد جنت میں کن کے ساتھ کیا جائے گا؟ مستفتی: حاجی خادم حسین صاحب

﴿جواب﴾ جس عورت کا شوہر جہنمی ہو اور عورت خود جنتی ہو تو اس عورت کا عقد جنت میں کسی جنتی آدمی سے کر دیا جائے گا جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ فرعون کی بیوی آسیہؓ جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی تھیں جنت میں آپ علیہ السلام کی ازواج مطہرات میں سے ہونگی۔

لما فی روح المعانی (۹۷/۲۸ رشیدیہ)

وجاء فی بعض الآثار ان مریم وآسیة زوجا رسول الله ﷺ فی الجنة ،اخرج الطبرانی عن سعد ابن جنادة قال :قال رسول الله ﷺ "ان الله زوجنی فی الجنة مریم بنت عمران وامرأة فرعون واخت موسی علیه السلام"

اور جس عورت نے دنیا میں کئی شادیاں کی ہوں اس کے بارے میں دو قسم کی روایات ہیں ایک روایت میں آتا ہے کہ جس شوہر کے اخلاق اچھے ہوں دنیا میں تو جنت میں اسی کی بیوی ہوگی یا اس کو اختیار دیا جائے گا پھر وہ جس شوہر کو پسند کرے گی جنت میں اسی کی بیوی ہوگی۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ دنیا میں جو اس کا آخری شوہر تھا اسکی بیوی ہوگی دونوں روایتوں میں تطبیق یہ ہے کہ اختیار اس صورت میں دیا جائے گا اگر شوہروں نے اس کو طلاق دی ہو اور آخری شوہر کی بیوی اس صورت میں ہوگی کہ جب وہ اس کے نکاح میں فوت ہوئی ہو یا آخری شوہر بغیر طلاق دئے ہوئے فوت ہو گیا ہو اور عورت نے اس کے بعد کسی اور سے نکاح نہ کیا ہو۔

لما فی الفتاوی الحدیثیة (۱/۷، قدیمی)

واخرج الخرائطی فی مکارم الاخلاق والبزار والطبرانی عن انسؓ ان ام حبیبةؓ قالت

"یا رسول اللہ ﷺ المرأة یکون لها الزوجان في الدنیا تموت ویموتان فیجتمعون في الجنة لأیهما تکون؟ فقال رسول اللہ ﷺ لأحسنهما خلقا کان عندها في الدنیا ذهب حسن الخلق بخیر الدنیا والآخرة" ولا یعارض ذلک ما أخرجه ابن سعد عن أبي الدرداء سمعت رسول اللہ ﷺ یقول المرأة لآخر أزواجها في الآخرة" لإمکان الجمع بأن الأول فیمن طلقوها ولم تمت في عصمة أحد منهم والثاني في من ماتت في عصمته أو مات عنها ولم تتزوج بعده ثم رأیت ما یؤیده وهو ما أخرجه ابن سعد في "طبقاته" عن أسماء بنت أبي بکر کانت تحت الزبیر بن العوام وکان شدیدا علیها فأتت أباها فشکت ذلک إلیه فقال یا بنیة اصبري فإن المرأة إذا کان لها زوج صالح ثم مات عنها ولم تتزوج بعده جمع بینهما في الجنة"

اور جو عورتیں بغیر نکاح کے دنیا سے رخصت ہوگئی ہیں ان کا بھی جنت میں جانے کے بعد کسی جنتی آدمی سے نکاح کروایا جائے گا جیسا کہ مریمؑ بنت عمرانؑ

لما في تفسیر ابن کثیر (۷/۵۵۴ رشیدیه)

عن بریدة عن أبیه ثیبات وأبکارا قال وعد اللہ نبیه ﷺ في هذه الآیة أن یزوجه بالثیب آسیة امرأة فرعون وبالأبکار مریم بنت عمران وفي حاشیته والمراد في الآیة کون ذلک في الحیاة الدنیا لا في الآخرة.

ولما في روح المعاني (۲۷/۲۴۱ رشیدیه)

وقال الشعبي والکلبي ذلک نفاه صرت الطرف من نساء الدنیا لم یمسهن منذ أنشئن النشأة الآخرة خلق قبل ... یعني الإنسي زوجته التي کانت له في الدنیا وبعض غیر عام من نسائها المؤمنات أیضا وکذا الجني—

ولما في الفتاوی الحدیثیة (۲۲۵ قدیمي)

فأجاب بقوله الطفل یکون في الحشر علی خلقته ثم عند دخول الجنة یزاد فیها حتی یکون کالبالغ ثم یتزوج من نساء الدنیا ومن الحور.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد روحانی

۳ رجب ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۴۲۲۷

﴿بغیر مطالبہ کے محکمہ کے آفیسر کو کچھ دینا رشوت نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص جو کہ ٹھیکدار ہے کسی محکمہ والوں سے کوئی کام ٹھیکہ پر لیتا ہے لیکن کام ٹھیکہ پر لینے کے بعد وہ اپنی مرضی سے اس محکمہ کے آفیسر کو کچھ رقم بطور ھدیہ کے دیتا ہے جسکی انہوں نے پہلے کوئی شرط نہیں لگائی تھی اب پوچھنا یہ

ہے کہ کیا یہ رقم رشوت کے زمرہ میں آتا ہے یا نہیں؟ اور افیسر کیلئے یہ رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ آفیسر کا پہلے سے ایسا کوئی مطالبہ اگر نہیں تھا اور آپ محض اپنی خوشی سے اس کو کچھ دینا چاہیں تو یہ حد یہ ہے رشوت نہیں ہے لینے دینے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ البتہ بعض محکموں میں رشوت لینا دینا اس قدر معروف اور رائج ہوتا ہے کہ آفیسر کو مطالبہ کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہر ٹھیکدار جانتا ہے کہ اتنا فیصد تو آفیسر کو دینا پڑتا ہے نہیں دینگے تو آئندہ کوئی کام نہیں ملے گا اس ڈر اور خوف کی وجہ سے بعد میں اس آفیسر کا حصہ نکالتا ہے تو اس طرح لینے دینے کیلئے فقہاء کرام کا مشہور ضابطہ ہے "المعروف كالمشروط" لہذا ایسی صورت میں مطالبہ اگرچہ صاف لفظوں میں نہیں ہوتا لیکن عرفا و دلالۃ ہوتا ہے اس لئے یہ حد یہ نہیں ہوگا بلکہ رشوت کے زمرے میں آئیگا، ہاں واقعی کوئی مطالبہ نہ ہو تو جائز ہے کوئی گناہ نہیں ہے۔

لما في الشامي (۳۶۲/۵ طبع سعيد)

وفي المصباح الرشوة بالكسر مايعطيه الشخص الحاكم ليحكم له اويحمله على مايريد ــ ولو قضى حاجته بلاشرط ولاطمع فاهدى اليه بعدذلك فهوحلال لاباس به ومانقل عن ابن مسعودؓ من كراهته فو.رع.

ولمافي فتح القدير (۲۵۴/۷ طبع رشيديه)

وفي شرح الاقطع:الفرق بين الرشوة والهدية ان الرشوة يعطيه بشرط أن يعينه ،والهدية لاشرط معهاانتهى وفيه ايضاعلى صفحة(۲۳۶)ولوقضى حاجته بلاشرط ولاطمع فأهدى اليه بعدذلك فهو حلال لابأس به ومانقل ابن مسعودؓ من كراهته فورع.

ولمافي البحر (۲۶۲/۶ طبع سعيد)

وفي وصايا الخانية قالوابذل المال لاستخلاص حق له على آخر رشوة ــ وان طلب منه أن يسوى أمره ولم يذكرله الرشوة واعطاه بعد مايسوى اختلفوافيه قال بعضهم لايحل له أن يأخذ وقال بعضهم يحل له وهوالصحيح لانه يريد مجازاة الاستحسان فيحل.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد روغانی

۱۲ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ	فتویٰ نمبر: ۴۲۴۰